

تفسیر نمونہ مومنوں کی  
پیام قرآن

آیت الہدیٰ ناصر مکارم شیرازی  
مولانا سید صفدر حسین نقوی  
مہتاب القرآن ٹرسٹ

تفسیر موضوعی

جلداول

زیر نظر

آیتناصر مکارم شیرازی

# پیام قرآن

نگارش

اہل قلم کی ایک جماعت

ترجمہ

علامہ سید صفدر حسین نجفیؒ

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 افضل مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ 0321-4481214, 042-37314311

# جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب-----تفسیر موضوعی: پیام قرآن  
جلد-----اول  
مؤلف-----آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی  
مترجم-----علامہ سید صفدر حسین نجفی اعلیٰ اللہ مقامہ  
فنی معاون-----قلب علی سیال  
کمپوزنگ-----فضل عباس سیال (المحمد گرافکس لاہور)  
سال اشاعت-----جون 2012ء  
ناشر-----مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور  
ہدیہ مکمل سیٹ (جلد اول تا دہم)-----3000 روپے

اس کتاب کی اشاعت کیلئے مدینۃ العلم فاؤنڈیشن کراچی نے بطور قرض  
حسنہ تعاون فرمایا ہے ہماری دعا ہے کہ خداوند عالم ان کی توفیقات خیر میں  
اضافہ فرمائے اور ان کے مرحومین کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔ ادارہ۔

## ملنے کا پتہ

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ 0321-4481214, 042-37314311

[www.misbahulqurantrust.com](http://www.misbahulqurantrust.com)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## عرض ناشر

قارئین کرام!۔۔۔۔۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد للہ! مصباح القرآن ٹرسٹ۔۔۔۔۔ عرصہ دراز سے دور حاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر و تالیفات کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں ایک عظیم اور پُر وقار مرکز کی حیثیت سے اُمت مسلمہ کیلئے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔

دور حاضر میں جب تفسیر قرآن کی بات ہو تو ذہن میں انہی کتب کا تصور آتا ہے جو عموماً صدرِ اول سے لے کر آج تک لکھی جا رہی ہیں کہ جن میں سورتوں اور آیتوں کی ترتیب کے مطابق نوبت بہ نوبت ان کی تفسیر کی جاتی ہے۔ مگر تفسیر قرآن کا یہی ایک طریقہ نہیں ہے بلکہ اس کتاب الہی کی تفسیر کے پانچ طریقے ہیں۔ ۱۔ تفسیر مفرداتی ۲۔ تفسیر ترتیبی ۳۔ تفسیر موضوعی ۴۔ تفسیر ارتباطی ۵۔ تفسیر کلی۔

تفسیر کے پہلے دو طریقے عام طور پر متعارف ہیں۔ بلاشبہ تفسیر قرآن کا قدیمی طریقہ یہ رہا ہے کہ بالترتیب ایک کے بعد دوسری سورۃ کی تفسیر کرتے ہوئے پورے قرآن کی تفسیر مکمل کی جاتی ہے۔ لیکن آیت اللہ جعفر سبحانی اور آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی نے تفسیر کی ایک نئی روش اپنائی ہے کہ جس میں کسی اصل و فرع یا مضمون و عنوان سے تعلق رکھنے والی آیات قرآنی کو ایک مقام پر لاکر ان کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ چونکہ اس میں ہر عنوان اور موضوع کی جملہ آیات اور ان کی تفسیر یکجا کر دی گئی ہے، لہذا اس کو تفسیر موضوعی کا نام دیا گیا ہے۔

ادارہ ہذا کے ذریعے تفسیر موضوعی کا 12 جلدوں پر مشتمل پہلا سلسلہ (قرآن کا دائمی منشور) منظر عام پر آچکا ہے۔ تفسیر موضوعی کا زیر نظر سلسلہ (پیام قرآن) جو کہ آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی کی سعی جمیل کا نتیجہ ہے، اس کی دس جلدیں (جلد اول تا جلد دہم) قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہیں۔

زیر نظر کتاب ”تفسیر موضوعی۔ پیام قرآن جلد اول“ کا اردو ترجمہ علامہ سید صفدر حسین نجفی اعلیٰ اللہ مقامہ نے کیا ہے۔ جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کتاب کی اشاعت میں مدینۃ العلم فاؤنڈیشن کراچی نے بطور قرض حسنہ تعاون فرمایا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم و تحقیق حسب سابق ”مصباح القرآن ٹرسٹ“ کی اس کوشش کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے اور اس گوہر نایاب سے بھرپور علمی و عملی استفادہ فرمائیں گے۔ اور ادارہ کو اپنی قیمتی تجاویز و آراء سے ضرور مستفید فرمائیں گے۔

مزید برآں مصباح القرآن ٹرسٹ کی ویب سائٹ تیاری کے آخری مراحل میں ہے۔ جون 2012ء تک آپ ہماری تمام کتب ہماری ویب

سائٹ [www.misbahulqurantrust.com](http://www.misbahulqurantrust.com) کے ذریعے گھر بیٹھے پڑھ سکتے ہیں۔۔۔۔۔ والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان



## فہرست

### تفسیر موضوعی: پیام قرآن جلد نمبر 1

صفحہ نمبر	عنوان
48	۵۔ بعثت انبیاء کا مقصد تعلیم و تربیت ہے
49	۶۔ قرآن کے نازل ہونے کا مقصد غور و فکر ہے
50	۷۔ معراج پیغمبر کا مقصد ہی معرفت تھا۔
50	۸۔ دعوت اسلام کا آغاز علم کی دعوت سے ہوا
51	۹۔ علم نور اور روشنائی ہے
51	۱۰۔ کائنات کے سرا کا ادراک صرف عالم ہی کر سکتے ہیں
52	۱۱۔ سب سے پہلا معلم خداوند عالم ہے
52	۱۲۔ انسان دوسری مخلوقات پر علم ہی کے ذریعہ
53	متناز ہوتا ہے
53	۱۳۔ خدا کا قرب معرفت کے تناسب سے حاصل ہوتا ہے
54	۱۴۔ انبیاء زیادہ سے زیادہ علم کے خواہاں ہوتے ہیں
55	۱۵۔ انسان کی نجات کی گنجی معرفت ہے
57	۱۶۔ علم ہر صوت میں قابل فخر ہے
58	۱۷۔ قیادت کی اولین شرط معرفت ہے
59	۱۸۔ علم ہی سے ایمان کے سوتے پھوٹتے ہیں
59	۱۹۔ علم سے تقویٰ اور خوفِ خدا کے سوتے پھوٹتے ہیں
61	۲۰۔ علم زہد کا منبع ہوتا ہے
62	۲۱۔ علم مادی ترقی کا سرچشمہ ہوتا ہے
62	پیش لفظ
62	تفسیر کی قسمیں
64	تفسیر موضوعی کیا ہے؟
64	تفسیر موضوعی علمائے متقدمین کے کلام میں:
64	تفسیر موضوعی کی مشکلات
65	تفسیر موضوعی کی قسم اب تک پروان کیوں نہیں چڑھ سکی؟
67	سب کام خدا کے نام سے!
68	الفاظ کی تشریح
68	آیات کی تفسیر اور ان کی جمع آوری
68	صرف خدا ہی کے نام سے کیوں شروع کریں؟
68	توضیحات
68	بسم اللہ کی زبردست اہمیت!
68	معرفت (شناخت) کا مسئلہ
68	قرآنی نقطہ نظر سے معرفت ضروری ہے
68	(علم کی اہمیت کے بارے میں چالیس قرآنی نکات)
68	۱۔ حصول علم ضروری ہے
68	۲۔ غور و فکر سے کام نہ لینے پر سرزنش کی گئی ہے
68	۳۔ تعلیم و تعلم کی تاکید
68	۴۔ تخلیق کائنات کا مقصد ہی علم اور معرفت ہے

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
89	۲۔ محدود انسانی علم	64	۲۲۔ علم، طاقت کا سرچشمہ ہوتا ہے
90	الفاظ کے معنی	65	۲۳۔ علم تزکیہ نفس کا سرچشمہ ہوتا ہے
91	تفسیر اور آیات کی جمع بندی	66	۲۴۔ علم صبر و شکیبائی کا سرچشمہ ہے
94	اس ساری بحث کا نتیجہ	66	۲۵۔ علم و معرفت خیر کثیر ہیں
	۳۔ انسانی علم کے محدود ہونے پر فلاسفہ اور	67	۲۶۔ جہنمی لوگ جاہل ہیں
95	دانشوروں کی گواہی	69	۲۷۔ جہالت انسان کی پستی کا سبب ہے
99	چند ضروری باتیں	69	۲۸۔ جہالت نابینائی ہے
99	۱۔ علمی غرور کا سد باب:	70	۲۹۔ جہالت کی زندگی ارذل العمر ہے
100	۲۔ تیز تر علمی حرکت:	71	۳۰۔ جہالت کفر کا سرچشمہ ہے
101	۲۔ معرفت کے منابع اور ذرائع	72	۳۱۔ جہالت ہی شکست کا اصل سبب بنتی ہے
101	(معرفت کے چھ راستے)	73	۳۲۔ جہالت کی بدولت اخلاقی برائیاں پھیلتی ہیں
102	احساس اور تجربہ	73	۳۳۔ جہالت تعصب اور ہٹ دھرمی کا موجب
105	الفاظ کی تشریح	75	ہوتی ہے
105	تفسیر اور جمع بندی	76	۳۴۔ جہالت بہانہ جوئی کا سبب ہوتی ہے
107	نتیجہ	77	۳۵۔ جہالت اندھی تقلید کا سبب ہوتی ہے
108	چند توضیحات	78	۳۶۔ جہالت اختلاف و انتشار کا سبب ہوتی ہے
108	فلاسفہ اور حسن کا منبع:	79	۳۷۔ جہالت سے بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں
112	معرفت کا دوسرا منبع عقل و خرد ہے	80	۳۸۔ جہالت بے ادبی کا سبب ہے
115	الفاظ کے معانی	80	۳۹۔ جہالت اجتماعی مصائب اور پشیمانیوں کا
117	عقل کے افعال	81	سبب ہوتی ہے
119	آیات کی تفسیر اور جمع بندی	81	۴۰۔ جہالت اقدار کو بدل دیتی ہے
119	عقل کا قرآنی معیار:	82	۱۔ آیات کی جمع بندی اور نتیجہ
123	مزید وضاحتیں	83	چند وضاحتیں
123	۱۔ فلسفی نقطہ نگاہ سے عقلی ادراکات	86	اور اب وضاحت:

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
162	۲۔ آیا شناخت فطری کا وجود ہے؟	125	۲۔ اسلامی روایات میں عقل کا مقام
165	ایک اور سوال	128	۳۔ حاکمیت عقل کے مخالفین
166	۳۔ اسلامی روایات میں، فطرت اور وجدان	130	معرفت کا تیسرا منبع تاریخ اور تاریخی آثار
168	معرفت کا پانچواں منبع آسمانی وحی	130	۱۔ مرتب صورت میں:
170	الفاظ کے معانی اور تشریح	130	۲۔ تکوینی صورت میں:
174	آیات کی تفسیر اور جمع بندی	132	الفاظ کی شرح
174	آفتاب وحی	134	آیات کی تفسیر اور جمع بندی
177	تفصیلات	137	توضیحات
177	۱۔ قرآن مجید میں وحی کی قسمیں	138	۱۔ تاریخ کا آئینہ جہان نما:
179	۲۔ وحی کی حقیقت کیا ہے؟	140	۲۔ تاریخ کے پرکشش نکات
	۳۔ وحی کے بارے میں شرق و غرب کے فلاسفہ	141	۳۔ تاریخ کے ناخالص پہلو
181	کیا کہتے ہیں؟	143	۴۔ فلسفہ تاریخ
184	۴۔ وحی کے غریزی ہونے کا مفروضہ	144	۵۔ نقلی اور علمی تاریخ اور فلسفہ تاریخ
	۵۔ پیغمبر کو کیسے یقین ہوتا ہے کہ وحی خدا کی طرف	146	ایک سوال کا اور اس کا جواب
187	سے ہے؟		۲۔ نبی البلاغہ اور اسلامی روایات میں تاریخ کا
	۶۔ اسلامی روایات میں قرآن مجید معرفت کا اہم	146	بیان
188	ترین منبع ہے		معرفت عطا کرنے والی تاریخ کے بارے میں
190	۷۔ غیر انبیاء کی وحی (یا وحی الہامی)	152	حرفِ آخر
193	۸۔ پیغمبر اسلام پر وحی کیونکر نازل ہوتی تھی؟	153	معرفت کا چوتھا منبع فطرت، ضمیر اور باطنی شعور
194	۹۔ غریزی الہامات	156	الفاظ کی تشریح
199	چھٹا منبع کشف شہود	157	آیات کی تفسیر اور جمع بندی
202	الفاظ کی تشریح	161	نتیجہ گفتگو
204	آیات کی تفسیر اور جمع بندی	161	تشریحات
204	غیب کا مشاہدہ	161	۱۔ فطرت و وجدان اور ضمیر کی قسمیں

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
256	آیات کی تفسیر اور ان کی جمع بندی	212	نتیجہ
258	۳۔ تکبر، غرور اور قدرت کے نشے کا پردہ	212	چند توضیحات
259	آیات کی تفسیر اور جمع بندی	۱۔ روایت میں کشف و شہود کے چند دلچسپ	
259	مغرور اور تکبر حق کو نہیں سمجھتے	نمونے	212
260	۴۔ احادیث کی رو سے غرور کے پردے	۲۔ پردے کیونکر اٹھتے ہیں؟	217
261	۵۔ جہالت اور غفلت کے پردے	۳۔ قرآن میں سات سے بچے خواب	221
262	آیات کی تفسیر اور جمع بندی	۷۔ سلطان مصر کا خواب	227
263	احادیث اور جہالت کے پردے	نتیجہ	229
264	۶۔ نفاق کے پردے	۴۔ ”رحمانی“ اور ”شیطانی“ مکاشفے	230
266	آیات کی تفسیر اور جمع بندی	معرفت کی راہ میں رکاوٹیں اور آفتیں	236
266	دل کے اندھے منافقین	کلی طور پر معرفت کے پردے	237
269	۷۔ تعصب اور ہٹ دھرمی کے پردے	الفاظ کے معانی اور تشریح	239
271	آیات کی تفسیر اور جمع بندی	آیات کی تفسیر اور ان کی جمع بندی	241
271	چلتے پھرتے مردے	معرفت کی آفات کا بالترتیب اثر و رسوخ (کجی،	
273	نتیجہ کلام	زنگ، بیماری، پردہ اور تالہ)	241
275	۸۔ اندھی تقلید کے پردے	آخری نتیجہ	249
277	الفاظ کے معانی اور تشریح	معرفت کی راہ میں رکاوٹیں اور آفتیں (تفصیل	
278	آیات کی تفسیر اور جمع بندی	کے ساتھ)	251
278	دنیا کو تقلید نے برباد کر دیا	الف: وہ صفات جو معرفت سے مانع ہیں:	251
279	تشریح	۱۔ خواہش پرستی کا حجاب	251
279	۱۔ تقلید کی مختلف قسمیں	الفاظ کے معانی اور تشریح	253
281	۲۔ صحیح تقلید کی شرائط	آیات کی تفسیر اور ان کی جمع بندی	253
283	۳۔ اندھی تقلید کے اسباب	۱۔ ہوی پرستی دل کی آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے	255
283	۱۔ فکری نابالغی:	۲۔ حب دنیا کا پردہ	256

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
306	۱۴۔ سطحی نگاہ اور تدبر سے کام نہ لینے کا پردہ	283	۲۔ شخصیت پرستی:
306	آیات کی تفسیر اور جمع بندی	283	۳۔ آباؤ اجداد سے شدید تعلق:
310	۱۵۔ ارتداد کا پردہ	283	۴۔ گروہ بندی یا قبائلی تعصبات:
310	آیات کی تفسیر اور تشریح	284	۹۔ عیش پرستی کا پردہ
311	۱۶۔ جھوٹ اور افترا پردازی کا پردہ	285	آیات کی تفسیر اور جمع بندی
312	آیات کی تفسیر اور جمع بندی		بچوں کی طرح ہمیں بھی جہاد سے معاف رکھا جائے
312	جھوٹ کی فریب کاری	285	
315	۱۷۔ گمان کا ضخیم پردہ	286	۱۰۔ آرزوؤں کا حجاب
316	آیت کی تفسیر اور جمع بندی	287	آیات کی تفسیر اور جمع بندی
318	بیرونی حجاب	287	لبی آرزوئیں
318	۱۸۔ فاسد اور گمراہ رہنماؤں کا پردہ	289	مزید تشریح
319	آیات کی تفسیر اور جمع بندی	289	آرزوؤں کا حجاب روایات کی رو سے
319	اہل جہنم کا باہمی جھگڑا	291	دوسرا حصہ
321	تشریح	291	وہ اعمال جو معرفت کے لیے حجاب بن جاتے ہیں
321	”مستضعفین“ اور ”مستکبرین“ قرآن کی نگاہ میں	291	۱۱۔ گناہوں کا حجاب
323	قائدین کا مقام اسلامی روایات میں	292	آیات کی تفسیر اور جمع بندی
324	۱۹۔ گمراہ دوستوں کا حجاب	292	گناہ انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتے ہیں
324	آیات کی تفسیر اور جمع بندی	295	تشریح
326	تشریح	295	روایات کی رو سے گناہ کا حجاب ہونا
326	ہمارے طرز فکر میں دوستوں کا کردار	299	۱۲۔ کفر اور روگردانی کا حجاب
328	پروپیگنڈے اور ماحول کا پردہ	300	آیات کی تفسیر اور جمع بندی
329	آیات کی تفسیر اور جمع بندی	300	گناہ کیونکر حجاب بن جاتا ہے؟
329	زہریلا پروپیگنڈا	304	۱۳۔ تجاوز اور سرکشی کا پردہ
336	مزید تشریح	304	آیت کی تفسیر اور اس کا نتیجہ

صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر	عنوان
366	احادیث کی رو سے علم اور ایمان کا رابطہ	336	حقائق کو چھپانے میں پروپیگنڈے کا اثر
367	۳۔ صبر و شکر اور معرفت کا رابطہ	338	۲۰۔ شیطان و سوسوں کا حجاب
369	آیات کی تفسیر اور جمع بندی	340	الفاظ کے معانی اور تشریح
	”آفاق“ اور ”انفس“ کی سیر اور صابر و شاکر ہم	341	آیات کی تفسیر اور جمع بندی
369	سفر	341	باطل کو کیسے زینت دیتے ہیں؟
372	نتیجہ کلام	346	مزید تشریح
372	۴۔ معرفت خود معرفت کی راہیں ہموار کرتی ہے	346	شیطان کون ہے؟
373	آیات کی تفسیر اور جمع بندی	348	۳۔ ایک اور اہم نکتہ
373	پہلے آشنا بنو پھر پتہ چلے	348	۵۔ معرفت کے ذرائع
375	نتیجہ کلام	350	۱۔ تقویٰ اور معرفت کا رابطہ
		350	الفاظ کے معانی اور تشریح
		351	آیات کی تفسیر اور جمع بندی
			تقویٰ اختیار کرو تا کہ نور علم تمہارے دلوں میں
		353	روشن ہو
		357	مزید تشریح
		357	۱۔ احادیث میں علم اور تقویٰ کا رابطہ
		358	۲۔ علم اور تقویٰ کا باہمی رابطہ
		360	۳۔ علم اور تقویٰ کی باہمی تاثیر
			۴۔ علم اور تقویٰ کے باہمی رابطہ سے ناجائز مفاد
		360	اٹھانا
		361	۲۔ ایمان اور معرفت
		363	آیات کی تفسیر اور جمع بندی
		363	ایمان کی تاثیر
		366	مزید تشریح

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## اہداء

- ان لوگوں کے نام جو قرآن مجید سے عشق کی حد تک محبت کرتے ہیں۔
- ان لوگوں کے نام جو اس چشمہ زلال سے زیادہ آب حیات نوش کرنا چاہتے ہیں۔
- ان لوگوں کے نام جو قرآن مجید کو زیادہ سے زیادہ جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔

- ۱۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد رضا آشتیانی
  - ۲۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد جعفر آملی
  - ۳۔ حجۃ الاسلام آقائے عبدالرسول حسنی
  - ۴۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد اسدی
  - ۵۔ حجۃ الاسلام آقائے حسین طوسی
  - ۶۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد محمدی
- کے تعاون اور ہمکاری کے ساتھ



## پیش لفظ

- ۱۔ تفسیر کی مختلف قسمیں۔
- ۲۔ تفسیر موضوعی کیا ہے؟
- ۳۔ تفسیر موضوعی کے ذریعہ کن مشکلات کو حل کیا جاسکتا ہے؟ (تفسیر موضوعی کا دائرہ)
- ۴۔ تفسیر موضوعی کا ماضی۔ (کب سے اس تفسیر کی داغ بیل ڈالی گئی؟)
- ۵۔ تفسیر موضوعی کا صحیح طریقہ کار۔
- ۶۔ تفسیر موضوعی کی مشکلات۔
- ۷۔ تفسیر قرآن کی یہ قسم اب تک پروان کیوں نہیں چڑھ سکی؟

## تفسیر کی قسمیں

جب بھی تفسیر قرآن کی بات ہوتی ہے تو ذہن فوری طور پر اسی عام تفسیر (ترتیبی تفسیر) کی طرف متوجہ ہوتا ہے جس میں قرآنی آیات کو ترتیبی صورت میں زیر بحث لایا جاتا ہے اور قرآنی مطالب اور حقائق کی وضاحت کی جاتی ہے یعنی وہی طریقہ کار جو اوائل اسلام سے اب تک ایک معمول اور مروج چلا آ رہا ہے اور اسلام کے عظیم علماء اور دانشور لوگوں نے۔ قرآن پاک کی تفسیر کے نام سے سینکڑوں بلکہ ہزاروں کتابیں تالیف کی ہیں۔

البتہ ایک اور قسم بھی کم و بیش معمول اور رائج چلی آ رہی ہے جو ”مفردات قرآن“ کی تفسیر کہلاتی ہے۔ یعنی قرآنی الفاظ کو علیحدہ اور جدا گانہ صورت میں الفباء کی ترتیب کے ساتھ زیر بحث لاتی ہے اس کا ایک واضح نمونہ کتاب ”مفردات راغب“ وجہ القرآن“ اور تفسیر غرائب القرآن“ کی ہے۔

اور ابھی تازہ چند ایک اور کتابیں بھی منصفہ شہود پر آتی ہیں جن میں سے ایک تو ”تحقیق فی کلمات القرآن الکریم“ اور دوسری ”شرطی“ یاد ارہ المعارف قرآن مجید بھی ہیں۔

قرآن مجید کی کئی اور قسم کی تفسیریں بھی ہیں جن میں سے ایک تفسیر موضوعی ہے جس میں اسلام کے اصول و فروع، اجتماعی، اقتصادی، سیاسی و اخلاقی مسائل ایسے مختلف موضوعات سے متعلق آیات قرآنی کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور انہیں زیر بحث لایا جاتا ہے۔ تفسیر کی ایک اور قسم بھی ہے، ہم نے جس کا نام ”تفسیر ارتباطی“ یا تفسیر مسلسل رکھا ہے اور وہ تفسیر کی وہ قسم ہے جس میں قرآن مجید کے مختلف موضوعات کو باہمی رابطے کی صورت میں دیکھا جاسکتا ہے۔

مثلاً جب ”ایمان“ تقویٰ“ اور عمل صالح“ کے موضوعات کو تفسیر موضوعی میں علیحدہ علیحدہ صورتوں میں زیر بحث لا کر ان پر سیر

حاصل تبصرہ کرایا جاتا ہے اور مذکورہ تین مطالب کو قرآنی آیات کی روشنی میں اور ان کی طرف ہونے والے قرآنی اشارات کے پرتو میں ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کیا جاتا ہے تو ان کا باہمی رابطہ واضح ہو جاتا ہے ظاہری بات ہے کہ جب ان موضوعات کو آپس میں مربوط کریں گے تو کئی تازہ حقائق ہمارے سامنے آجائیں گے جو زبردست اہمیت کے حامل رہنما اصول ثابت ہوں گے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ کائنات اور موجودات عالم کے مطالعہ کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم انہیں آپس کے باہمی رابطے کے تناظر میں دیکھیں۔ سورج ہو یا چاند، زمین ہو یا انسان اور انسانی معاشرے درحقیقت ایک دوسرے سے جدا اور علیحدہ موضوعات نہیں ہیں اور مجموعی طور پر ایک ایسی اکائی کو تشکیل دیتے ہیں جن کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے اور صحیح مطالعہ کا طریقہ بھی یہی ہے کہ ہم ان سب کو ان کے باہمی رابطے کی صورت میں دیکھیں اور ان کی تحقیقات اور تجزیہ و تبصرہ کریں۔

کتاب ”تدوین“ یعنی قرآن مجید میں بیان شدہ مطالب بھی اسی قسم کے ہیں اور تمام قرآنی موضوعات کے درمیان نہایت ہی دقیق اور ظریف رابطہ میں موجود ہے لہذا ان کی باہمی رابطے کے تناظر میں تفسیر کی جانی چاہیے

تفسیر کی ایک اور قسم بھی ہے جس کا نام ”تفسیر کلی“ یا ”قرآن کا آفاقی تصور“ ہے اور اس قسم کی تفسیر میں مفسر قرآن مجید کے تمام مطالب کی کائنات کے رابطے کے تناظر میں تفسیر کرتا ہے یا واضح ترین الفاظ میں یوں کہیے کہ کتاب تدوین اور ”کتاب تکوین“ کو آپس میں مربوط کرتا ہے اور دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ مطالعہ کرتا ہے اور دونوں کو آپس میں مربوط کر کے تفسیر کرتا ہے۔

اس لحاظ سے مجموعی طور پر قرآن مجید کی پانچ طرح کی تفسیریں متصور ہو سکتی ہیں:

۱۔ مفردات قرآن کی تفسیر۔

۲۔ ترتیبی تفسیر۔

۳۔ موضوعی تفسیر۔

۴۔ ارتباطی تفسیر۔

۵۔ کلی تفسیر یا قرآن کی آفاقی تفسیر۔

لیکن مذکورہ پہچگانہ تفسیروں میں سے صرف پہلی اور دوسری قسم کی تفسیریں ہمارے درمیان معروف ہیں جبکہ تیسری قسم کی تفسیر کسی حد تک یعنی موضوعی تفسیر ابھی اپنے ابتدائی مراحل طے کر رہی ہے اور چونکہ ابھی تازہ اس تفسیر کی طرف علماء اسلام کی توجہ مبذول ہوئی ہے جس سے یہ امید بندھ گئی ہے کہ اس پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی جائے گی اور یہ تفسیر اس طرح سے اپنے راتفا کے تدریجی مراحل طے کر کے مستقبل میں اپنے شایان شان مقام تک جا پہنچے گی۔

رہیں قرآن مجید کی چوتھی اور پانچویں قسم کی تفسیریں تو ابھی تک ان کی طرف مفسرین کی توجہ نہیں ہوئی ہے اور یہ کام موجودہ اور آئندہ نسلوں کے ذمہ ہے کہ جب کافی حد تک تفسیر موضوعی ترقی اور کمال کی سرحدوں کو چھونے لگے تو وہ بھی ان کا تاحد امکان حق ادا کر دیں گے۔

## تفسیر موضوعی کیا ہے؟

یہ سوال کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور سوال کو پیش کیا جائے اور وہ یہ کہ آخر کیا وجہ ہے کہ خود قرآن مجید کو موضوعی صورت میں کیوں جمع نہیں کیا گیا، اور عام کتابوں کی طرح اس کی تدوین کیوں نہیں کی گئی؟ یہی نہیں بلکہ یہ (قرآن) تمام دوسری عام کتابوں سے یکسر مختلف ہے!

جواب: اس سوال کا جواب یہ ہے کہ عام کتابوں کو تدوین و تالیف کے لئے ایک یا کئی مؤلفین مختلف موضوعات کو پیش نظر رکھتے ہیں جو ایک قدر جامع میں شریک ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر علم طب میں مختلف، امراض کو پیش نظر رکھتے ہیں جن کا ”انسانی سلامتی“ کے ساتھ تعلق ہوتا ہے پھر ان موضوعات سے متعلق مسائل کو مختلف ابواب اور فصلوں میں تفسیر کرتے ہیں (مثلاً امراض قلب، امراض اعصاب، امراض معدہ، امراض تنفس، امراض جلد وغیرہ)

پھر ہر باب اور فصل کو مقدمہ اور نتائج کے اعتبار سے زیر بحث لاتے ہیں اور اس پر تفضیل سے گفتگو کرتے ہیں تب کہیں جا کر ”طب“ کے نام پر کوئی کتاب مرتب اور مدون ہوتی ہے لیکن قرآن کا معاملہ اس سے یکسر جدا ہے کیونکہ وہ ۲۳ سال کے عرصہ میں مختلف اجتماعی ضروریات گوناگوں حوادث اور مختلف مراحل میں بالترتیب نازل ہوتا رہا اور اسلامی معاشرہ کے قدم بقدم آگے بڑھتا رہا پھر کمال یہ کہ وہ کسی خاص زمانے اور کسی خاص مکان کے ساتھ مخصوص بھی نہیں۔

اگر ایک مرتبہ قرآن مجید کی بحث کا تمام تر دار و مدار بت پرستی اور شرک سے محاذ آرائی اور توحید کی تمام اقسام سمیت تعلیم پر ہوتا اور اس دوران جو آیات اور سورتیں نازل ہوتیں ان کا محور مبداء اور معاد کی بحث ہوتا (جیسے وہ سورتیں جو اوائل بعثت میں مکہ میں ۱۳ سال تک نازل ہوتی رہیں)

پھر دوسری مرتبہ جہاد اور اندرونی و بیرونی دشمنوں اور منافقین سے گرامر گفتگو پر مبنی بحث کا تذکرہ ہوتا۔

جب جنگ احزاب (خندق) پیش آئی تو سورہ احزاب نازل ہوئی اور اس کی سترہ آیتیں اس جنگ کے سبق آموز حوادث تربیتی مسائل اور اس کے نتائج پر مشتمل ہیں۔

جب صلح حدیبیہ کا ماہر پیش آیا اور سورہ فتح نازل ہوئی اور اس کے بعد فتح مکہ کا ماجرا رونما ہوا اور غزوہ حنین پیش آ گیا تو سورہ ”اذا جاء نصر اللہ“ کی آیات اور کئی دوسری آیات نازل ہوئیں۔

الغرض اسلام کی پیش رفت اور اسلامی معاشرہ کے تحریک کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کی آیات نازل ہوتی اور احکام دیتی رہیں اور صحیح معنی میں اس انسانی پروگرام کو پانچ تیکمیل تک پہنچاتی رہیں۔

مندرجہ بالا تصریحات کو پیش نظر رکھتے ہوئے تفسیر موضوعی کا مقصد واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ تمام قرآن مجید میں مختلف آیات جو ایک موضوع پر مشتمل ہیں اور مختلف حوادث اور مواقع پر نازل ہوتی رہی ہیں انہیں یکجا کر کے مختلف زاویوں سے مجموعی طور پر قرآن مجید کا نقطہ نظر

کیا جائے مثلاً معرفتِ خداوندی کے بارے میں ان دلائل پر مبنی آیات کو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ملایا جائے جو برہانِ فطرت، برہانِ نظم، برہانِ وجوب و امکان اور دیگر براہین پر مشتمل ہیں اور چونکہ ”القرآن یفسر بعضہ بعضاً“ یعنی قرآنی آیات ایک دوسرے کی خود تفسیر کرتی ہیں لہذا اس موضوع کی تمام جہات واضح ہو جاتی ہیں۔

اسی طرح کچھ آیات ایسی ہیں جو جنت یا جہنم صراط اور نامہ اعمال سے متعلق ہیں انہیں باہمی طور پر مربوط کر دیا جائے یا جو آیات اخلاقی مسائل مثلاً تقویٰ، اخلاقِ حسنہ اور شجاعت وغیرہ سے تعلق رکھتی ہیں انہیں آپس میں ملایا جائے اور احکام جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، خمس اور انفال وغیرہ کو آپس میں مربوط کیا جائے یا کچھ آیات جو عدالتِ اجتماعی دشمن کے ساتھ جہاد اور نفس کے ساتھ جہاد جیسے مسائل سے متعلق ہیں، انہیں آپس میں اکٹھا کیا جائے وغیرہ۔

یہ تو مسلم بات ہے کہ یہ آیات مختلف مناسبت کے موقعوں پر قرآن مجید پر نازل ہوتی رہیں۔ لہذا جب ان میں سے ہر ایک حصے کو بطور جدا گانہ اکٹھا کر کے پھر انہیں آپس میں مربوط کر کے ان کی تفسیر کی جائے تو اس سے مزید نئے حقائق کا انکشاف ہوگا لہذا ہمیں سے تفسیر موضوعی کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے اس کی مزید تفصیل انشاء اللہ آئندہ بحث میں آئے گی۔

تفسیر موضوعی اور مشکلات کا حل: اب یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ تفسیر موضوعی کے ذریعہ کن مشکلات کو حل کیا جاسکتا ہے؟ اگرچہ اس سوال کا جواب تو مندرجہ بالا سطور میں اچھی طرح واضح ہو چکا ہے البتہ مزید تشریح کے لئے مندرجہ امور قابل توجہ ہیں۔

قرآن مجید کی کچھ آیات میں کسی ایک چند جہاتی موضوع کی طرف ایک جہت کو ذکر کیا گیا ہے مثلاً مسئلہ شفاعت کے سلسلہ میں بعض آیات میں صرف امکان شفاعت کے اصولوں کو بتایا گیا ہے۔

بعض دوسری آیات میں ”شفیع“ (شفاعت کرنے والوں) کی شرائط کو بیان کیا گیا ہے (ملاحظہ سورہ سبأ آیت ۲۳، سورہ مریم

﴿﴾ ”القرآن یفسر بعضہ بعضاً“ کا جملہ ابن عباس سے مروی ہے اور چونکہ ان کے پیغمبر اسلام اور امیر المؤمنین سے قرآنی مسائل کے بارے میں صحیحی تعلقات تھے لہذا بعید نہیں ہے کہ یہ جملہ دونوں بزرگواروں میں سے کسی ایک کا ہو۔ البتہ اس مفہوم کا ایک جملہ نوح البلاغہ میں موجود ہے کہ امیر علیہ السلام فرماتے ہیں: ”و ذکر ان الكتاب یصدق بعضہ بعضاً“ (خداوند عالم نے اپنے پیغمبر سے فرمایا ہے کہ قرآن کے مختلف حصے ایک دوسرے کی تصدیق کرتے اور ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔ (ملاحظہ نوح البلاغہ خطبہ نمبر ۱۸)

بعض علماء نے اپنی کتابوں میں ”القرآن یفسر بعضہ بعضاً“ کے جملہ کو حدیث کی صورت میں بیان کیا ہے جیسا کہ مرحوم شہرستانی نے اپنی کتاب ”تنزیہ التنزیل“ کے صفحہ ۱۰۶ پر اسے روایت کے عنوان سے ذکر کیا ہے، لیکن اس کا ماخذ اور حوالہ پیش نہیں کیا۔ اسی طرح نوح البلاغہ میں ایک اور مقام پر بھی اسی بات کی طرف اشارہ ملتا ہے جہاں پر قرآن مجید کے بارے میں امیر المؤمنین فرماتے ہیں ”وینطق بعضہ بعض و یشہد بعضہ علی بعض“ یعنی اس کی بعض آیات بعض دوسری آیات کے متعلق گفتگو کرتی ہیں اور بعض، بعض کی گواہی دیتی ہیں۔ (ملاحظہ نوح البلاغہ خطبہ نمبر ۱۳۳)

(آیت ۸۷)

بعض آیات میں ان لوگوں کی شرائط کو بیان کیا گیا ہے جن کی شفاعت کی جائے۔ (ملاحظہ ہو سورہ انبیاء آیت ۲۸، سورہ مؤمن

(آیت ۱۸)

بعض آیات میں سوائے خدا کے دوسرے تمام لوگوں کی شفاعت کی نفی کی گئی ہے (ملاحظہ ہو سورہ زمر آیت ۴۴)

بعض دوسری آیات میں غیر خدا کے لیے بھی شفاعت کا ثبوت ملتا ہے۔ (ملاحظہ ہو سورہ مدثر آیت ۴۸)

تو ایسی صورت میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ شفاعت سے متعلق مسائل میں بہت سے ابہام پائے جاتے ہیں حقیقت شفاعت سے لے کر اس کی شرائط اور دوسری خصوصیات سمیت ہر موضوع میں ابہام پایا جاتا ہے لیکن جب ہم شفاعت کی تمام آیات کو قرآن مجید سے یکجا کر کے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ مربوط کر کے ان کی آپس میں تفسیر کریں تو یہ ابہام برطرف ہو جائے گا اور یہ مشکل بڑی آسانی سے حل ہو جائے گی۔

بعینہ یہی صورت حال جہاد اور دوسرے اسلامی احکام سے متعلق آیات کے ہے یا برزخ یا علم خدا یا علم غیب اور یہ کہ آیا علم غیب خدا کے علاوہ کسی اور کے لیے بھی ممکن ہے یا نہ؟ پس ان موضوعات سے متعلق آیات کو اگر ایک جا کر کے پھر ان کے بارے میں غور و فکر کیا جائے تو ممکن ہے کہ حق مطلب ادا ہو جائے اور تمام ممکنہ ابہام تفسیر موضوعی کے ذریعہ ہو جائیں۔

بلکہ اصولی طور پر ”محکم“ اور ”متشابہ“ آیات کے سلسلہ میں بھی یہ مسئلہ حل کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس بارے میں حکم بھی یہی ہے کہ آیات متشابہات کی محکم آیات کے ذریعہ تفسیر کی جائے جو بذات خود ایک موضوعی تفسیر ہے۔

بہر صورت جب کسی ایک موضوع سے متعلق اور مربوط آیات کی انہی کے ذریعہ تفسیر کی جائے تو ان کے درمیان سے کوئی نہ کوئی تازہ بات سامنے آجاتی ہے، ایسی نئی نئی باتیں جن سے قرآنی معارف کے سوتے پھوٹتے ہیں اور بہت سے عقیدتی اور اسلامی احکام کے مشکل مسائل حل کیے جاسکتے ہیں۔

اس لحاظ سے آیات قرآنی کو چند مختلف کلمات سے تشبیہ دی جاسکتی ہے کہ جن کے مختلف اور جداگانہ معانی ہوتے ہیں لیکن جب انہیں ایک دوسرے کے دوش بدوش ملا کر پھر ان کے معانی کیے جائیں تو ان سے کئی نئے مفہوم اور مطالب حاصل ہوتے ہیں۔

یا انہیں ”آکسیجن“ اور ”ہائیڈروجن“ جیسے مواد سے تشبیہ دی جاسکتی ہے کہ جب ان دونوں مواد کو آپس میں ملا دیا جائے تو ان سے ایک تیسرا مادہ حاصل ہوتا ہے جسے پانی کہتے ہیں۔ اگرچہ آکسیجن اور ہائیڈروجن بذات خود زندگی کے لئے مفید اور معاون مواد ہوتے ہیں لیکن ان کے باہمی امتزاج سے زندگی کے لئے ایک تیسری اہم شے پانی کا وجود عمل میں آجاتا ہے۔

الغرض قرآن مجید کے بہت سے اسرار و رموز کی گھنٹیوں کو یہ طریقہ اختیار کیے بغیر نہیں سلجھا یا جاسکتا اور نہ ہی یہ راستہ اختیار کیے بغیر ان کی گہرائیوں تک پہنچا جاسکتا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ تفسیر موضوعی کی اہمیت کے لیے اسی قدر کافی ہے۔ البتہ ذیل میں ہم تفسیر موضوعی کے فوائد کو خلاصہ کے طور پر یوں پیش کر سکتے۔

۱۔ بادی النظر میں قرآنی آیات میں جو ابہام نظر آتا ہے اسے دور کرتی ہے اور متشابہ آیات کے حل کا راستہ نکالتی ہے۔  
 ۲۔ قرآن مجید میں مذکور مختلف موضوعات اور مسائل کی خصوصیات، شرائط اسباب و علل اور نتائج سے باخبر کرتی ہے۔  
 ۳۔ توحید و خدا شناسی، معاد، عبادات، جہاد، حکومت اسلامی اور اس قسم کے دوسرے اہم ترین موضوعات کی تفسیر بتاتی ہے۔  
 ۴۔ ایک طرح کی آیات کو آپس میں ملانے سے قرآن مجید کے کئی اور جدید اسرار سے پردہ اٹھاتی اور اس کے تازہ پیغام سے مطلع کرتی ہے۔ تفسیر موضوعی کا ماضی: یعنی تفسیر موضوعی کب سے رائج ہوئی؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تفسیر موضوعی کا کب سے رواج ہوا اور وہ کس دور میں رائج ہوئی؟ تو عرض ہے کہ ہمیں سب سے پہلے اس کا سراغ خود قرآن مجید ہی میں نظر آتا ہے اور جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں متشابہ آیات کی محکم آیات، کے ذریعہ تفسیر کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو بذات خود ایک قسم کی تفسیر موضوعی ہے۔

اس کے بعد آئمہ ہدیٰ علیہم السلام کے کلام میں بھی اس قسم کے بہت سے نمونے ملتے ہیں جن کے تحت ہمیں کسی موضوع کے متعلق آیات کو یکجا کر کے ان سے استفادہ کا طریقہ بتایا گیا ہے اور ذیل کے چند نمونے شاید اس دعویٰ کے ثبوت کے لیے کافی ہیں۔

۱۔ ایک تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ مشہور معروف روایت ہے جو آپ نے عبد اللہ بن مسعود کو بطور موعظہ فرمائی ہے اور جسے بحار الانوار کی جلد ۹۶..... پر درج کیا گیا ہے، یہ ایک طویل اور مطالب سے لبریز روایت ہے جس میں اس قسم کی تفسیر کے بہت سے نمونے ملتے ہیں جن کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ روایت گلی طور پر تفسیر موضوعی کے محور کے گرد گھوم رہی ہے جس کا ایک نمونہ یہ بھی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا کی مذمت میں ارشاد فرماتے ہیں کہ اے ابن مسعود! حق وہ شخص ہے جو اس جلد گزر جانے والی دنیا کا طلبگار ہو، چنانچہ آپ اس زرق برق دنیا کی بے بنیادی پر درج ذیل آیات سے استدلال فرماتے ہیں:

أَمَّا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهُمْ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ  
 وَالْأَوْلَادِ ط... [۱]

یہ دنیا تو صرف ایک کھیل تماشہ ہے، زینت ایک دوسرے پر فخر کے اظہار کا ذریعہ اور مال و اولاد کے سلسلے میں ایک دوسرے پر برتری طلبی کا وسیلہ ہے.....

وَلَوْلَا أَنْ يَكُونَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً لَجَعَلْنَا لِمَنْ يَكْفُرُ بِالرَّحْمَنِ لِبُيُوتِهِمْ  
 سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُونَ ﴿۳۳﴾ وَلِبُيُوتِهِمْ أَبْوَابًا وَسُرُورًا

## عَلَيْهَا يَتَكَوَّنُونَ ﴿٣٥﴾ ۱

اگر مادی نعمتوں سے کفار کی بہرہ مندی اس بات کا سبب نہ بنتی کہ تمام لوگ یکسر گمراہ ہو جاتے، تو ہم کافر ہونے والوں کے لیے ایسے گھرتیار کرتے جن کی چھت چاندی کی ہوتی اور سیڑھیاں بھی جن سے وہ اوپر چڑھتے اور ان کے گھروں کے لیے دروازے اور تخت (خوبصورت اور نفرتی) قرار دیتے جن پر تکیہ لگاتے۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ

جَهَنَّمَ ۚ يَصِلُهَا مَذْمُومًا مَدْحُورًا ﴿١٨﴾ ۲

جو شخص اس جلد فنا ہونے والی مادی دنیا کو طلب کرتا ہے تو ہم جسے چاہیں اسے اس میں سے کچھ مقدار دے دیتے ہیں پھر اس کے لیے دوزخ مقرر کر دیں گے جس میں وہ مذموم اور راندہ درگاہ ہو کر ہمیشہ جلتا رہے گا۔

اسی طرح ”بغیر علم کے بات کہنے“ کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

اے ابن مسعود! جب تک تم کسی چیز کے متعلق اچھی طرح معلومات حاصل نہ کر لو اس وقت تک کوئی بات نہ کرو، اور جب تک کوئی بات کانوں سے نہ سناؤ اور آنکھوں سے نہ دیکھو اس وقت تک کوئی کلمہ منہ سے نہ نکالو۔

چنانچہ اس سلسلہ میں بہت سی قرآنی آیات کو پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۗ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ

كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ﴿٣٦﴾ ۳

جو تم نہیں جانتے اس کی پیروی نہ کرو، کیونکہ کان، آنکھ اور دل سب سے پوچھا جائے گا۔

سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْأَلُونَ ﴿١٩﴾ ۴

عنقریب ان کی گواہی لکھی جائے گی اور وہ جوابدہ ہوں گے۔

نیز ارشاد فرماتا ہے:

۱ سورہ زخرف ۳۳، ۳۴

۲ سورہ بنی اسرائیل ۱۸

۳ سورہ بنی اسرائیل ۳۶

۴ سورہ زخرف ۹۱



مَا يَلْفُظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ ﴿۱۸﴾<sup>[۱]</sup>

انسان کوئی بات بھی منہ سے نہیں نکالتا مگر یہ کہ اس کے پاس ایک نگران فرشتہ تیار ہوتا ہے۔  
نیز فرماتا ہے:

وَأَنْحَنُ أَقْرَبَ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ ﴿۱۶﴾<sup>[۲]</sup>

ہم انسان ہے اس کی دل کی رگ (یا گردن کی رگ) سے بھی زیادہ فریب ہیں۔

اسی طرح ”ذکر خدا“ راہ خدا میں خرچ کرنے اور مکارم اخلاق جیسے موضوعات پر بھی اسی حدیث شریف میں قرآنی آیات کو یکجا کر کے پیش کیا گیا ہے۔<sup>[۳]</sup>

۲۔ دوسرا مقام وہ ہے جس میں امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے ”قرآن مجید میں کفر“ کے معانی بیان فرماتے ہوئے متعلقہ آیات کو ایک جگہ جمع کرتے ہوئے فرمایا:

قرآن میں کفر کی پانچ قسمیں بیان کی گئی ہیں:

کفر کی پہلی قسم کا نام ”انکار“ ہے پھر اس کی اپنی دو قسمیں ہیں ایک تو خود خدا، بہشت، دوزخ اور قیامت کا انکار ہے، جیسا کہ قرآن نے ان کی اپنی زبانی نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ: ”وما يهلكننا الا الدهر“<sup>[۴]</sup> (ہمیں تو صرف عالم طبیعت ہی مارتا ہے)

کفر کی دوسری قسم یقین اور معرفت کے باوجود انکار ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے ”ووجدوا بها واستيقنتها انفسهم ظلما وعلوا“<sup>[۵]</sup> (انہوں نے ظلم اور برتری طلبی کی بنا پر انکار کیا، جبکہ دل میں انہیں اچھی طرح یقین تھا۔)

کفر کی تیسری قسم کا نام ”معصیت اور ترک اطاعت ہے جیسا کہ خداوند عالم بنی اسرائیل کے ان لوگوں کے متعلق ارشاد فرماتا ہے جو بعض احکام الہی پر تو عمل کرتے تھے اور بعض کو چھوڑ دیتے تھے، ”افتومنون ببعض الكتاب وتكفرون ببعض“<sup>[۶]</sup> (آیات کتاب خدا کے کچھ حصے پر تو عمل کرتے ہو اور کچھ حصہ کے کافر ہوتے ہو؟)

کفر کی چوتھی قسم کا نام ”برائت اور بیزاری“ ہے جیسا کہ خداوند عالم نے بت پرستوں کے مقابلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے

[۱] سورہ ق ۱۸

[۲] سورہ ق ۱۶

[۳] بحار الانوار جلد ۴ ص ۹۲ تا ۱۱۰

[۴] سورہ جاثیہ ۲۳

[۵] سورہ نمل ۱۳

[۶] سورہ بقرہ ۸۵



اس قول کو بیان فرمایا ہے کہ ”کفرنا بکم“ [۱] (ہم تم سے بیزار ہیں) نیز یہ بھی فرمایا ہے، ”یوم القیامۃ یکفر بعضکم ببعض“ [۲] بروز قیامت تم میں سے بعض لوگ دوسرے بعض لوگوں سے (عقائد و اعمال کی وجہ سے) بیزار ہوں گے۔

رہی کفر کی پانچویں قسم تو وہ بمعنی ”نعمت کا ناشکری“ کے ہے جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے ”لئن شکرتکم لازیدنکم ولئن کفرتکم ان عذابی لشدید“ [۳] (یعنی اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں اپنی نعمتیں زیادہ دوں گا اور اگر کفر کرو گے تو میرا عذاب بہت سخت ہے۔)

پھر امام علیہ السلام نے شرک کی وہ قسمیں بیان کی ہیں جو قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں اور شرک پر مبنی تمام آیات کو ایک جگہ پر جمع کر کے اس کو شرک اعتقادی شرک عملی ”شرک اطاعت اور شرک ریا کی قسموں میں تقسیم کیا ہے اور قرآنی آیات کی روشنی میں ان کی تشریح کی ہے۔ [۴] جیسا کہ آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں امیر المؤمنین علیہ السلام نے کفر و شرک پر مشتمل آیات کو یکجا کر کے ان پر نگلی نگاہ ڈالی ہے اور ساتھ ہی واضح فرمایا ہے کہ ان دو کلمات کا ایک وسیع مفہوم ہے چنانچہ کفر کے عمومی معنی ہر قسم کے حق کو چھپانا ہے خواہ وہ اعتقادی اور عملی مسائل میں ہو یا خدا کی نعمتوں کے سلسلے میں۔ اور ”شرک“ خدا کیلئے ہر قسم کا شریک ٹھہرانا ہے خواہ وہ اعتقادی اور عملی مسائل کے سلسلے میں ہو یا تو انہیں کی اطاعت کے بارے میں۔

امامؑ کے کلام میں تفسیر موضوعی کا خوبصورت چہرہ ان دو نمونوں سے بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے اور یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ یہ تفسیر کس حد تک انسانی فہم و دانش اور قرآن کی عمیق آیات کو سمجھنے کے لیے مؤثر اور کارگر ہے؟ اس کا ایک اور قابل توجہ نمونہ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی وہ مشہور و معروف حدیث ہے جو آپؑ نے جناب ہشام بن حکم سے بیان فرمائی ہے اس حدیث میں آپؑ نے اولی الالباب سے متعلقہ آیات کو یکجا کر کے عقل و خرد کے مقام کو ثابت فرمایا ہے چنانچہ آپؑ ہشام سے فرماتے ہیں:

دیکھو! خداوند عالم نے اولوالباب صاحبان (عقل و خرد) کو کس بہترین انداز میں یاد فرمایا ہے اور ان کے قد و قامت پر کیسا بہترین لباس پہنایا ہے وغیرہ.....

پھر آپؑ نے قرآن مجید کی سات آیات کو ایک جگہ اکٹھا کر کے اولوالباب کے مقام کی اہمیت کو اجاگر فرمایا ہے اور وہ آیت یہ ہیں

[۱] سورہ ممتحنہ ۴

[۲] سورہ عنکبوت ۲۵

[۳] سورہ ابراہیم ۷

[۴] بحار الانوار، ج ۶۹، ص ۱۰۰ تا ۱۰۲ (کافی حد تک خلاصہ کے ساتھ)

سورہ بقرہ کی آیت ۲۶۹ آل عمران کی آیت آل عمران آیت ۱۹۰ اور مومن کی آیت ۵۴۔<sup>[۱]</sup>  
مندرجہ بالا آیات کی جمع آوری اور انہیں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو قرار دے کر ان کے معانی اخذ کرنے سے اولوالالباب کے معنی سمجھنے میں انسان کو کس قدر عمیق معلومات حاصل ہوتی ہیں اور اولوالالباب کے مقام و منزلت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور یہ صرف تفسیر موضوعی ہی کا کام ہے۔

## تفسیر موضوعی علمائے متقدمین کے کلام میں:

ہر چند کہ تفسیر موضوعی پر اگندہ صورت میں اور خاص خاص موضوعات کے لحاظ سے علمائے متقدمین کے کلام میں بڑی حد تک موجود ہے لیکن پھر بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ کم از کم ہماری معلومات کی حد تک کسی نے بھی تفسیر موضوعی کو اس کے تمام موضوعات اور زاویوں کے مطابق پیش نہیں کیا۔ جو لوگ اس موضوع میں پیش قدم رہے ہیں ان میں سے ایک مرحوم علامہ مجلسی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بحار الانوار کی جس فصل کو بھی شروع کیا ہے پہلے اس موضوع سے متعلق آیات کو یکجا کیا ہے پھر ان پر ایک کلی نظر ڈالی ہے اور بعض مقامات پر مفسرین کے نظریے کو بھی پیش کیا ہے اور اس طرح سے انہوں نے آیات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

مثلاً ۶۷ ویں جلد میں جب انہوں نے قلب ”سبح“ اور بصر ”کے بارے میں گفتگو کی ہے اور قرآن مجید سے ان کے معانی بیان کیے ہیں تو اس سلسلے میں قرآن سے بیسیوں آیات کو جمع کر ڈالا اور کافی سے ایک روایت بیان کرنے کے بعد ان کے کلی معنی کی تشریح کی اور تقریباً دس صفحات میں اس پر تفصیلی گفتگو کی۔<sup>[۲]</sup>

اسی طرح جلد ۵۸ میں حقیقت خواب اور اس کی تعبیر کی فصل میں پہلے تو قرآن کریم کی دس آیات کو اس بارے میں قلمبند فرمایا ہے پھر کئی صفحات میں ان کی تفسیر بیان کی ہے۔<sup>[۳]</sup>

بانیسویں جلد کے پہلے باب میں جہاں پر انہوں نے ہجرت کے بعد یہود، نصاریٰ اور مشرکین کی سرگزشت کو بیان کیا ہے وہاں پر قرآن مجید کے مختلف مقامات سے اس موضوع کی بیسیوں آیات کو یکجا کر کے ان کی تفسیر اور تفصیلی گفتگو کی ہے۔<sup>[۴]</sup>  
اس عظیم الشان محقق نے کتاب کی دوسری فصول میں بھی یہی طریقہ کار اپنایا ہے۔

گزشتہ علماء کے کلام میں تفسیر موضوعی کے اور نمونوں میں سے وہ کتابیں ہیں جو آیات الاحکام کے عنوان سے لکھی گئی ہیں۔ ان

[۱] اصول کافی جلد ۱ ص ۱۵ (کتاب العقل والہیئل)

[۲] بحار الانوار جلد ۶ ص ۳۳ تا ۳۴۔

[۳] بحار الانوار جلد ۵۸ صفحہ ۱۵۱ تا ۱۵۸۔

[۴] بحار الانوار جلد ۲۲ صفحہ ۱ تا ۶۲۔

کتابوں میں فقہی احکام مثلاً نماز اور اس کے اجزاء و شرائط روزہ حج نکاح اور طلاق کے اجزاء و شرائط حدود و دیات اور اسلامی قضا وغیرہ سے تعلق رکھنے والی آیات کو موضوعی صورت میں جمع کر کے ان پر تحقیقی کام کیا گیا ہے۔

اس بارے میں جو کتاب سب سے پہلے تصنیف کی گئی ہے وہ بظاہر محمد بن صائب کلبی کی کتاب ”احکام القرآن“ ہے جو حضرت امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام کے اصحاب سے تھے۔ ان کی وفات ۱۴۶ھ میں ہوئی حتیٰ کہ اہلسنت کے مشہور امام شافعی متوفی ۲۰۴ھ..... سے پہلے یہ کتاب لکھی جانی شروع ہوئی۔

ان کے بعد بھی بزرگ فقہاء اور علماء کے ایک گروہ نے آیات الاحکام کے سلسلہ میں کتابیں لکھیں (کبھی تو اسی نام سے اور کبھی دوسرے ناموں سے) محدث تہرانی یعنی آقا بزرگ تہرانی نے اپنی کتاب ”الذریعہ“ میں ان کی تعداد تیس سے زیادہ ذکر کی ہے۔<sup>[۱]</sup> موجودہ فقہاء اور علماء میں سے سب سے زیادہ مشہور کتاب مرحوم محقق اردبیلی کی آیات الاحکام ہے جس کا نام ”زبدۃ البیان“ ہے اور مرحوم فاضل مقدار کی آیات الاحکام المعروف کنز العرفان ہے۔

اس کتاب میں ہے کہ علماء کے درمیان مشہور یہ ہے کہ قرآن مجید میں فقہی احکام کے بارے میں پانچ سو آیات نازل ہوئی ہیں البتہ اس بارے میں یہ تعداد مکررہ آیات کو حساب کر کے بتائی گئی ہے اگر تکراری آیات کو شمار نہ کیا جائے تو پھر یہ تعداد کم بنتی ہے۔<sup>[۲]</sup> اسی طرح ”اعجاز قرآن از نظر علوم امروز“ جیسی کتابیں بھی موجود ہیں جن میں وہ آیات جمع کی گئی ہیں جو درحاضر کے علمی انکشافات سے تعلق رکھتی ہیں جن انکشافات کو قرآن مجید کے علمی معجزات کا حصہ سمجھا جاتا ہے اور جامعہ و تارتخ یا حقوق در قرآن مجید ایسے عنوانات ہیں جو تفسیر موضوعی کے سلسلے میں مسلسل تلاش و کوشش کی نشاندہی کرتے ہیں۔

قصص قرآن کے سلسلے میں بھی کتابیں لکھی جا چکی ہیں جن میں قرآنی آیات کے ذریعہ انبیاء علیہم السلام کی داستانوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

لیکن پھر بھی یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کتاب تفسیر موضوعی کی صرف ایک محدود اور معین حد کی نشاندہی کرتی ہے نہ کہ قرآنی موضوعات کے بارے میں ایک مکمل اور جامع تفسیر ہے۔ البتہ ان آخری دنوں میں تفسیر موضوعی کے سلسلے میں قابل قدر اور وسیع پیمانے پر کوشش عمل میں لائی جا چکی ہے جو ہر لحاظ سے قابل تحسین ہیں۔

اس سلسلے میں جن کتابوں کا نام لیا جاسکتا ہے ان میں سے ایک ”مفہم القرآن“ ہے جس کی اب تک عربی اور فارسی میں کئی جلدیں چھپ کر منظر عام پر آ چکی ہیں۔ نہایت ہی قیمتی کتاب ہے۔

اس قدر تحسین و آفرین کے باوجود پھر بھی یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ موضوعی صورت میں پھر بھی یہ تفسیر اپنے بچپن کے ادوار سے گزر

[۱] الذریعۃ الی تصانیف الشیعہ جلد ۱ ص ۴۰، ۴۴

[۲] کنز العرفان جلد ۱ ص ۵۔

رہی ہے اور سالہا سال کی مدت درکار ہے تب کہیں جا کر تفسیر تریقی کی مانند اپنا شانِ شانِ مقام پیدا کرے گی اور اس صورت میں ممکن ہے کہ علماء و مفسرین جہد مسلسل اور علمائے منتقدین و متاخرین کے تجربات سے استفادہ کرتے ہوئے اس سلسلے کو آگے بڑھائیں اور مطلوب کو کمال کو حد تک پہنچائیں۔

آپ اس کتاب میں جو کچھ ملاحظہ فرمائیں گے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے امید کی جاسکتی ہے کہ اسے دوسری کڑیوں سے ملا کر ایک شانِ یانِ توجہ سلسلہ کو تشکیل دیا جاسکتا ہے لیکن اس بارے میں جو زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ صاحبانِ نظر تکراری کاموں سے پرہیز کریں اور ہر شخص ایک نئے موضوع پر خاصہ فرسائی کرے تاکہ نئے موضوعات سامنے آتے رہیں اور اس طرح سے یہ طولانی راہ طے ہوتی رہی۔

تفسیر موضوعی کا صحیح طریقہ کار۔

تفسیر موضوعی کے لیے دو قسم کے طریقہ کار سامنے آتے ہیں۔

ایک طریقہ تو وہ ہے کہ جسے بعض مفسرین نے انتخاب کیا ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے اپنے کلام میں اعتقادی موضوعات مثلاً (توحید و معاد وغیرہ) یا اخلاقی موضوعات مثلاً (تقویٰ اور حسن خلق وغیرہ) کو پیش کیا پھر ان کی فلسفہ یا کلام کی روشنی میں تجزیہ اور تہلیل کی یا اخلاقی نقطہ نظر سے ان تجزیہ کیا بعد میں شاہد کے طور پر قرآنی آیات کو ذکر کیا۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے کسی ایک موضوع کے بارے میں سارے قرآن میں موجود تمام آیات کو جمع کیا جائے اور کسی قسم کے پیشگی فیصلہ کے بغیر تمام آیات کی ایک ایک کر کے تفسیر کی جائے پھر ان کے آپس میں رابطے کو پیش نظر رکھ کر ان سے نتیجہ اخذ کیا جائے۔

ایسی صورت میں مفسر اپنی طرف سے کسی رائے کا اظہار نہیں کر پاتا بلکہ سائے کی مانند وہ قرآنی آیات کے پیچھے پیچھے چلتا ہے اور سب کچھ قرآن سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی تمام تر کوشش آیات قرآنی کے مطالب کو کشف کرنے میں صرف ہوتی ہے اور اگر دوسروں کے کلام حتیٰ کہ احادیث سے بھی کمک حاصل کرتا ہے تو وہ بھی دوسری اور ثانوی حیثیت سے ہوتی ہے۔

پیام قرآن میں ہم نے اسی دوسرے طریقہ کار کو اپنایا ہے اس کتاب میں ہر مقام پر تمام قرآنی آیات کو جو کسی ایک موضوع کے بارے میں وارد ہوئی ہیں، سب سے پہلے لکھا گیا ہے اور ان آیات کے سایہ میں تمام مطالب کو بیان کیا گیا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ طریقہ کار ہمیں پہلے طریقہ کی نسبت بہتر انداز میں قرآنی حقائق تک پہنچا سکتا ہے اتفاق سے یہی دونوں طریقے عام تفسیروں میں بھی اپنائے گئے ہیں (یعنی ترتیبی تفسیروں میں جو آیات اور سورتوں کی ترتیب کے مطابق لکھی گئی ہیں) کچھ لوگ تو قرآنی آیات کو اپنی نثریات سے مطابقت دیتے ہیں اور کچھ لوگ اپنے نظریات کو قرآنی آیات کے تابع بناتے ہے اور مسلم بات ہے کہ تفسیر قرآن کا صحیح راستہ ہے قرآن مجید نور اور کتاب مبین ہے قرآن مجید کا تعلق ان حقائق سے ہے جو انسان کو سعادت عطا فرماتے ہیں ارشاد رب العزت ہے "قد جاء کھ من اللہ نور و کتاب

مبین، ﴿۱۱﴾، (خدا کی طرف سے تمہارے پاس نور اور واضح کتاب آچکی ہے)

## تفسیر موضوعی کی مشکلات

تین اہم مشکلات ایسی ہیں جو تفسیر موضوعی کے مفسر کو پیش آتی ہیں۔

۱۔ تفسیر موضوعی یہ نہیں ہے کہ انسان ”مجمع القرآن“ کو سامنے رکھ کر مثلاً تقویٰ اور جہاد کے موضوعات سے متعلق جمع شدہ آیات کی تفسیر لکھنا شروع کر دے کیونکہ بسا اوقات قرآن مجید کی کئی آیات ایسی بھی ہوتی ہیں جو ان موضوعات پر گفتگو تو کرتی ہیں لیکن ان میں تقویٰ یا جہاد کا لفظ استعمال نہیں ہوا اور ایسی مثالیں قرآن میں بہت ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر ایک مثال سے وضاحت کی جائے اور وہ یہ کہ ہم جانتے ہیں کہ خداوند عالم رحمان ”رحیم“ ارحم الرحیم ہے اور یہی معنی قرآن مجید کی اکثر آیات میں ملتے بھی ہیں لیکن ایسی آیات بھی ہیں جو اس حقیقت کو بیان تو کرتی ہیں لیکن ان میں ”رحم“ کا مادہ استعمال نہیں ہوا مجملہ ان آیات کے سورہ نحل کی ۶۱ ویں آیت ہے جس میں خداوند عالم فرماتا ہے:

”ولو يؤاخذ الله الناس بظلمهم ما ترك عليهما من دابة“

اگر خداوند عالم لوگوں کو ان کے ظلم کی سزا دینے لگ جائے تو روئے زمین پر کسی بھی چلنے والے کو باقی نہ رکھے۔

اور یہی چیز سورہ فاطر کی ۴۵ ویں آیت میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ بیان کی گئی ہے یعنی:

”ولو يؤاخذ الله الناس بما كسبوا ما ترك على ظهرا من دابة“

چنانچہ یہ دونوں آیتیں بندوں کے بارے میں خداوند عالم کی انتہائی رحمت اور مہربانی کا پتہ دیتی ہیں لیکن ان میں رحم کے لفظ کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا گیا۔

۲۔ تفسیر موضوعی کی دوسری مشکل آیات کو یکجا کر کے ان سے نتیجہ حاصل کرنا ہے اور اس کام کے لیے نہایت وقت طلب، ظریف ذوق اور آیات قرآنی اور تفاسیر سے متعلق وسیع علم و آگاہی کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ جب ایک موضوع سے متعلق کئی آیات ہوتی ہے اور ہر ایک آیت کا اپنا خصوصی انداز بھی ہوتا ہے تو اس وقت یہ صورت حال اور بھی پیچیدہ ہو جاتی ہے۔

﴿۱۱﴾ سورہ مائدہ آیت ۱۵۔

﴿۱۲﴾ مجمع قرآن ایسی کتابیں ہوتی ہیں جن میں حروف تہجی کے لحاظ سے آیات کو جمع کیا جاتا ہے۔ (مترجم)

﴿۱۳﴾ یہ بات قابل غور ہے کہ اس آیت میں ”لوگوں کے ظلم“ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بعد کی آیت میں اس کی بجائے ”اكتساب“ آیا ہے۔ چنانچہ جب ان دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا یا جائے تو معلوم ہوگا کہ بہت سے ایسے کام، جو لوگوں سے سرزد ہوتے ہیں، وہ کسی نہ کسی طرح کے ظلم سے خالی نہیں ہوتے۔

اور پھر جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں تفسیر موضوعی ایک نوخیز موضوع ہے جس پر نہ تو زیادہ کام کیا گیا ہے اور نہ ہی زیادہ کوشش کی گئی ہے اور یہی چیز ان لوگوں کے کام کو مشکل اور پیچیدہ بنا دیتی ہے جو اس پر کام کرنا چاہتے ہیں اور اس تفسیر کا معمول کی اُس تفسیر سے بڑا فرق ہے جس پر آغازِ نزول ہی سے کام ہونا شروع ہو گیا تھا۔

۳۔ ایک اور بڑی مشکل یہ بھی ہے کہ اس آسمانی کتاب یعنی قرآن مجید میں جو موضوعات بیان ہوئے ہیں ان کی نہ تو کوئی حد ہے اور نہ ہی حساب اعتقادی مسائل سے لے کر عملی مسائل تک اور اخلاقی مسائل سے لے کر سیاسی اجتماعی اقتصادی مسائل، آداب معاشرت، جنگ و صلح، تاریخ انبیاء اور اسرارِ تخلیق کائنات کے تمام مسائل تک، ہر ایک چیز کے متعلق کئی کئی موضوعات ہیں جن پر قرآن مجید نے بحث کی ہے اور ان سب پر تحقیقی کام کے لیے بہت وقت اور وسیع حوصلے کی ضرورت ہے۔

تفسیر موضوعی میں کبھی ایک آیت کئی مباحث میں قابل توجہ ہوا کرتی ہے اور اسے مختلف صورتوں اور خصوصی فصول میں کئی بار زیر بحث لایا جاتا ہے جبکہ تفسیر ترتیبی میں صرف ایک بار ہی تفسیر ہو جاتی ہے۔

## تفسیر موضوعی کی قسم اب تک پروان کیوں نہیں چڑھ سکی؟

اس سوال کا جواب کسی حد تک گزشتہ مباحث سے واضح ہو چکا ہے اور وہ یہ کہ تفسیر موضوعی کے راستے میں جو بے حد حساب مشکلات چلی آرہی ہیں ہمیشہ اس کی ترقی کے آڑے آتی رہی ہیں، خاص کہ جبکہ تفسیر موضوعی کے لیے ایسی دقیق اور جامع فہرست ہونی چاہیے جس کے ذریعہ آسانی کے ساتھ ہر آیت کو نکالا جاسکے ماضی میں اس قسم کی کوئی کتاب موجود نہیں تھی لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس وقت یہ موجود ہیں۔

لطف کی بات ہے کہ ہم قرآن مجید کی مشہور و معروف مجتمہ "المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم" میں ہم پڑھتے ہیں کہ:

”اگرچہ گزشتہ علماء نے قرآن مجید کے دیگر علوم کی تو بڑی اہمیت دی ہے لیکن قرآن کی ایسی فہرست مرتب کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جس سے قرآن کی آیات کو کسی سورت سے آسانی کے ساتھ تلاش کیا جاسکے اس کی وجہ یہ ہے کہ غالباً وہ لوگ حافظ قرآن ہوتے تھے۔“

ہمیں نہیں معلوم کہ یہ فیصلہ کس حد تک قابل قبول ہے لیکن فرض کر لیا جائے کہ اگر انسان حافظ قرآن بھی ہو پھر بھی مجتمہ ہر صورت میں تفسیر موضوعی کا ایک ضروری ہتھیار ہوتی ہے (ہر چند کہ تنہا کافی نہیں ہے) اور یہ کام ماضی میں انجام نہیں دیا گئے اور اگر انجام دیا بھی گیا ہے تو نامکمل حد تک یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید سے دلچسپی رکھنے والے مغربی اور غیر مسلم دانشوروں نے اس آسمانی کتاب کی مجتمہ مرتبہ کرنے کے لیے کافی محنت سے کام لیا ہے جن میں سے ایک توجہ طلب نمونہ جرمنی مستشرق فلوگل کی لکھی ہوئی کتاب نجوم الفرقان فی اطراف القرآن ہے اور مسلمانوں کی لکھی ہوئی کتابوں میں سے مفتاح کنوز القرآن اور فتح الرحمن کا نام لیا جاسکتا ہے۔

المجتمہ المفہرس لالفاظ القرآن الکریم کے مقدمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہی کتابوں نے مؤلف کی ہمت بندھائی جس سے وہ قرآن پاک کی جامع مجتمہ تیار کر کے علماء اسلام کے ہاتھوں تک پہنچانے کے قابل ہوئے۔

اور اب آخری بات یہ ہے کہ تفسیر موضوعی میں تمام تر مشکلات کے باوجود اس کے آثار اور برکتیں اسی نسبت سے بہت زیادہ ہیں خصوصاً علماء اور محققین کے لیے اور جو حقائق اس کے پرتو میں منصفہ شہود پر آتیں گے ان کے ایمان قلبی مسرت اور اس بارے میں کام کو جاری و ساری رکھنے کے شوق میں اضافہ کا سبب بنیں گے اور ان کے دل میں آتش عشق کو مزید شعلہ ور کر دیں گے۔

کیونکہ کسی ایک موضوع کے بارے میں جداگانہ طور پر قرآنی آیات ایک ایسے نقطہ کی مانند ہیں کہ جب ان سب کو یکجا کر کے ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو قرار دیا جائے تو ان تمام نقاط کے مجموعے سے ایک نئی شکل وجود میں آجاتی ہے جو پہلے موجود نہیں تھی اور یہی چیز سب سے اہم قابل توجہ اور مسرت بخش ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام روز اول ہی سے تفسیر موضوعی کی طرف ہماری رہنمائی فرما چکے ہیں اور اپنے کلام میں اس کے ایسے مختلف نمونے بھی پیش فرمادیئے ہیں جو نہایت ہی دل پذیر اور زیبا نمونے ہیں اور ان میں سے بعض کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔

اب جبکہ ہم اس مقدمہ کو اختتام پر پہنچا رہے ہیں اپنے آپ کو ایک نہایت ہی اہم اور مشکل کام کے روبرو پاتے ہیں۔ مسلم ہے کہ اسے انجام تک پہنچانے کے لیے ہم اپنی توانائیوں پر قطعاً بھروسہ نہیں کر سکتے جب تک توفیق الہی لطف پروردگار اور اس کی عنایات ہمارے شامل حال نہ ہوں اس موقع پر ہم اپنے تمام وجود اس کے حضور التجا کرتے ہیں اور اس کی بارگاہ اقدس میں ہاتھ اٹھا کر عرض کرتے ہیں:

خداوند! اس راہ میں تو خود ہی ہماری دستگیری فرما! اور ہمیں صراط مستقیم یعنی ان لوگوں کے راستے کی ہدایت فرما جن پر تُو نے اپنی نعمتوں کی بارش کی ہے اس راہ میں قدم قدم پر لغزشیں ہیں ہمیں ان لغزشوں اور گمراہی کے دروں میں سقوط کرنے سے تُو خود ہی ہماری حفاظت فرما! اور اس کام کو بطور احسن پایہ تکمیل پہنچانے کی توفیق عنایب فرما۔ آمین یا رب العالمین۔



## سب کام خدا کے نام سے!

اشارہ

قرآن مجید نے (سورہ برائت کے علاوہ) ہر سورت کے آغاز اور کئی دوسری آیات کے ضمن میں ہمیں اس بات کی تعلیم دی ہے کہ ہم تمام کاموں کا آغاز اللہ کے نام سے کریں اور اپنی روح و جان کی فضا کو اس کے نام سے معطر کریں۔

اس اللہ کے نام سے جو کمال کی تمام صفات کا جامع ہے۔

اس خدا کے نام سے جو رحمن اور رحیم ہے۔

اس کے نام سے جو ہر چیز پر قادر و توانا ہے۔

اس کے نام سے جو ہر چیز اور ہر ایک سے باخبر اور آگاہ ہے۔

یہ مقدس نام قلب کو چمک، روح کو صدق و صفا اور جان کو نشاط و نازگی عطا فرماتا ہے۔

اس کی خاص اور عام رحمت کی یاد ایک امید بھری دنیا اپنے ہمراہ لاتی ہے اور اس کی قدرت و توانائی کی یاد انسان کو مشکلات کے ہجوم کے مقابلے میں قدرت و طاقت عطا کرتی ہے۔

بالآخر اس کی ہر شخص اور ہر چیز سے علم و آگاہی کی یاد ہمیں اس بات کی خوشخبری دیتی ہے کہ ہم کبھی بھی تنہا نہیں ہیں۔

یقیناً جب ہم ہر کام کو اسی نقطہ نظر سے شروع کریں گے تو وہ ضرور اپنے انجام کو پہنچے گا اور جس سعی و کوشش اور تلاش کو اس نظر سے شروع کریں گے تو ضرور کامیاب ہوں گے۔

اسی لیے بہتر یہی ہے کہ اس کتاب کی سب سے پہلی بحث و گفتگو کا آغاز اسی موضوع (ہر کام کا آغاز خدا کے نام سے کریں۔

سب سے پہلے اسی موضوع سے متعلق آیات پر تحقیقی نظر ڈالی جائے گی پھر ان کا ترجمہ کیا جائے گا اور اس کے بعد تفسیر اور جمع آوری پر توجہ دی جائے گی چوتھے اور آخری مرحلے میں ان مطالب کی تکمیلی بحث ہوگی جن کا عنوان توضیحات ہوگا اور انشاء اللہ العزیز ساری کتاب میں تمام موضوعات پر اسی طریقہ کار کو اپنایا جائے گا۔



## آیات

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ  
(سورہ براءت کے علاوہ تمام سورتوں کی پہلی آیت)

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝۱ (سورہ علق ۱)

وَقَالَ ارْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللّٰهِ هَجْرًا لِّهَا وَمُرْسِيًّا ۝۲ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳  
(سورہ ہود ۲)

قَالَتْ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُوْا اِیُّی الْاَلْقِی اِلَیْ كِتٰبٍ كَرِيْمٍ ۝۴ اِنَّهُ مِنْ سُلَیْمٰنَ وَاِنَّهُ بِسْمِ  
اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝۵ اَلَّا تَعْلَمُوْا عَلَیْ وَاْتُوْنِیْ مُسْلِمِيْنَ ۝۶  
(سورہ نمل ۲۹، ۳۰، ۳۱)

## ترجمہ

خدا کے نام کے ساتھ جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔  
اس خدا کے نام کے ساتھ پڑھ جس نے پیدا کیا۔  
(نوٹ نے) کہا خدا کے نام کے ساتھ اس کشتی میں سوار ہو جاؤ اور اس کے چلنے اور روکنے کے وقت اسی خدا کی یاد  
کرو کیونکہ میرا پروردگار بخشنے اور رحم کرنے والا ہے۔  
(ملکہ سبانی) کہا اے سردارو! ایک قیمتی خط میری طرف پھینکا گیا ہے یہ خط سلیمان کی طرف سے ہے اور یوں  
(لکھا گیا) ہے کہ خدا کے نام کے ساتھ جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے میرا پیغام یہ ہے کہ مجھ پر برتری  
طلب نہ کرو اور (حق کے سامنے) سر جھکائے میرے پاس آؤ۔

## الفاظ کی تشریح

اسم۔ بہت سے علمائے لغت اس بات کے قائل ہیں کہ دراصل یہ لفظ سمو (بروزن علو) یعنی رفعت اور بلندی سے لیا گیا ہے چونکہ

کسی چیز کا نام رکھنا اس کی معرفت پہچان اور مقام کی بلندی کا سبب ہوتا ہے لہذا لفظ اسم اس معنی میں استعمال ہوتا ہے۔  
**رحمن الرحیم** الفاظ رحمت کے کلمہ سے مشتق کیے گئے ہیں اور مشہور یہ ہے کہ رحمان ہو ہوتا ہے جس کی رحمت عام ہو اور ہر ایک کو شامل ہو جبکہ رحیم اسے کہتے ہیں کہ جس کی رحمت خاص ہو بنا بریں خدا کی رحمانیت اس بات کا موجب ہوتی ہے کہ اس کی نعمتیں دوست اور دشمن دونوں کو شامل ہوتی ہے خواہ وہ مومن ہوں یا کافر لیکن اس کی رحیمیت اس بات کا سبب ہوتی ہے کہ وہ صرف مومنین کے شامل حال ہو خواہ وہ دنیا کی خاص نعمتیں ہوں یا آخرت کی مخصوص نعمتیں اور خدا سے دور اور اس سے بے خبر لوگ ان نعمتوں سے محروم ہوتے ہیں چنانچہ اس فرق کے شاہد مندرجہ ذیل امور ہیں۔

۱۔ رحمان مبالغہ کا صیغہ ہے اور رحیم مشبہ ہے اور مبالغہ کے صیغہ میں زیادہ تاکید پائی جاتی ہے جو اس قسم کی رحمت کی وسعت پر صفتِ دلیل ہے بعض علماء ان دونوں کلمات کو صفت مشبہ سمجھتے ہیں یا دونوں ہی کو مبالغہ کا صیغہ جانتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ تصریح بھی کر دی ہے کہ رحمان میں رحیم کی نسبت مبالغہ زیادہ پایا جاتا ہے۔<sup>[۲]</sup>

۲۔ بعض علماء نے یہ بھی کہا ہے چونکہ رحیم صفت مشبہ کا صیغہ ہے اور دوام و استمرار پر دلالت کرتا ہے لہذا مومنین کے لیے مخصوص ہے اور رحمان جو کہ مبالغہ کا صیغہ ہے، اس میں اس قسم کی دلالت نہیں ہے۔

۳۔ رحمان خدا کا مخصوص نام ہے جو کسی اور پر نہیں بولا جاتا جبکہ رحیم کا اطلاق خدا اور غیر خدا دونوں پر کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ رحمان کے مفہوم میں وسیع رحمت پائی جاتی ہے۔

۴۔ عربی ادبیات میں یہ قاعدہ معروف ہے کہ ”زیادة المبانی تدل علی زیادة المعانی“ کہ جس کلمے کے حروف زیادہ ہوتے ہیں اس کا مفہوم بھی زیادہ ہوتا ہے چونکہ رحمان کے پانچ حروف ہیں اور رحیم کے چار حروف ہیں لہذا رحمان کے مفہوم میں زیادہ وسعت پائی جاتی ہے۔<sup>[۳]</sup>

[۱] بعض علماء سے ”وسم“ (بمعنی علامت) سے مشتق سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ معنی صحیح معلوم نہیں ہوتے کیونکہ اس کی جمع ”اسماء“ اور تصغیر ”سمی“ یا ”سمیہ“ آتی ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ ”واو“ جو کہ اس کے اول میں ہے، اس کا جز نہیں ہے اور بعض لوگ اسے ”شیماء“ کے لفظ سے مشتق سمجھتے ہیں جو آرامی اور عربی لغت ہے اور تعریب کی صورت میں ”اسم“ اور ”سما“ بن گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو کتاب التحقیق فی کلمات القرآن الکریم) لیکن یہ صورت بھی بعید از حقیقت نظر آتی ہے، کیونکہ اس پر کوئی شاہد موجود نہیں ہے۔ اس دعویٰ کی ایک اور دلیل کہ یہ مادہ ”وسم“ سے مشتق نہیں ہے، یہ ہے کہ لفظ ”اسم“ کا ہمزہ درمیان کلام میں ساقط ہو جاتا حالانکہ اگر وہ ”وسم“ کے مادہ سے مشتق ہوتا اور ہمزہ واو کی جگہ ہوتا تو وہ ساقط نہ ہوتا۔

[۲] ملاحظہ ہو تفسیر مجمع البیان ص ۲۰، تفسیر روح المعانی ص ۵۵ اور تفسیر المیزان جلد ۱ ص ۱۶

[۳] تفسیر شبر ص ۸، تفسیر روح المعانی جلد ۱ ص ۵۶

۵۔ علماء نے اس فرق کو قرآن مجید کی بعض آیات سے بھی استفادہ کیا ہے کیونکہ رحمان کا لفظ قرآنی آیات میں عام طور پر مطلق صورت میں استعمال ہوا ہے جبکہ رحیم کا لفظ بہت سے مقامات پر مقید طور پر استعمال ہوا ہے جیسے ”ان اللہ بالناس لروءف رحیم“ یعنی خداوند لوگوں پر مہربان اور رحیم ہے (بقرہ ۱۴۳) یا ”وكان بالموءمنین رحیمًا“ یعنی خداوند تعالیٰ مؤمنین پر رحیم ہے۔ (احزاب ۴۳) یا ”ان اللہ كان بكم رحیمًا“ یعنی پروردگار عالم تم پر رحیم ہے (نساء ۲۹) جبکہ ”رحمان“ ان قیود کے بغیر ذکر ہوا ہے جو اس کی رحمت کے عام ہونے کی دلیل ہے۔

۶۔ بعض روایات بھی اس تفاوت پر شاہد ہیں چنانچہ ہم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں پڑھتے ہیں:

**”الرحمن اسم خاص بصفة عامة، والرحيم اسم عام بصفة خاصة“**

رحمان خاص اسم ہے (جو خدا سے ہی مخصوص ہے) لیکن عام صفت ہے (اس کی رحمت کا مفہوم دوست و دشمن دونوں کے لیے ہے) لیکن رحیم عام اسم ہے مگر خاص صفت ہے (یہ نام خدا اور غیر خدا دونوں پر بولا جاتا ہے لیکن اس کی رحمت کا مفہوم صرف مؤمنین کے لیے خاص ہے)۔ [۱]

لیکن ان تمام تر تصریحات کے باوجود اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کبھی یہ دونوں الفاظ ایک معنی کے لیے بھی بولے جاتے ہیں جیسا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی دعائے عرفہ میں منقول ہے کہ:

**”یا رحمن الدنيا والاخرة ورحیمہما“**

”یعنی اے وہ خدا جو دنیا و آخرت کا رحمان اور دونوں کا رحیم ہے۔“

لیکن یہ بات بھی ممکن ہے کہ یہ ایک استثنائی صورت ہو۔ بنا بریں مذکورہ بالا تفاوت کے منافی نہیں ہوگا۔

”ہجرھا“ و ”موسھا“ یہ دونوں الفاظ یا تو اسم زمان ہیں یا اسم مکان ہیں جن کا معنی ہے حرکت کی جگہ اور رکنے کا مقام یا دونوں کا وقت۔ [۲]

پہلا کلمہ جریان سے اور دوسرا سو (بروزن رسم) سے مشتق ہے جس کا معنی ثبات و برقراری ہے اسی لیے پہاڑوں کو رواسی (راسیۃ کی جمع) کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ثبات اور مکمل برقراری کے حامل ہوتے ہیں۔

[۱] تفسیر مجمع البیان، جلد ۱ ص ۲۱۔

[۲] بعض مفسرین نے انہیں صرف اسم زمان بتایا ہے (جیسے تفسیر مجمع البیان میں ہے)۔ بعض نے فقط اسم مکان بتایا ہے (جیسے تفسیر المیزان میں ہے) اور بعض نے اسم زمان اور اسم مکان بتایا ہے (جیسے تفسیر شبر میں ہے)۔

## آیات کی تفسیر اور ان کی جمع آوری

### صرف خدا ہی کے نام سے کیوں شروع کریں؟

پہلی آیت (بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ) (میں جو سوائے سورہ برائت کے) تمام سورتوں کے آغاز میں آئی ہے ہم اس بات کا اعلان و اظہار کرتے ہیں کہ اپنے کام کو رحمان اور رحیم خدا کے نام سے شروع کر رہے ہیں اور اس کے انجام کے لیے بھی اسی سے مدد کے طالب ہیں۔<sup>[۱]</sup>

ہمارے جو بھی کام اور منصوبے ہوں سب فانی اور ناپائیدار ہوتے ہیں، محدود اور چھوٹے ہوتے ہیں، لیکن جب انہیں قائم و دائم پائیدار، جاوداں لا محدود اور بے حد و انتہا ذات کے ساتھ ملا دیتے ہیں تو وہ اسی کارنگ اختیار کر لیتے ہیں اور اسی کی عظمتِ جاودانی سے بہرہ مند ہو جاتے ہیں۔

ہماری توانائیاں جس قدر بھی ہوں، پھر بھی ہم کمزور ہیں، لیکن جب یہ ناپ چیز قطرے خداوند متعال کی با عظمت قدرت کے اوقیانوس سے مل جاتے ہیں تو اپنے اندر عظمت پیدا کر لیتے ہیں اور ہمیں ایک تازہ روح، جدید ادراک اور نئی آمدگی عطا کرتے ہیں یہ ہے ہر کام کے آغاز میں بسم اللہ کا فلسفہ!

دوسری آیت میں بعثت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آغاز میں جبرائیل امین علیہ السلام کے حضور سرکارِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب کی بات ہو رہی ہے جب انہوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی آغوش میں لے کر دبا یا اور کہا پڑھو! اپنے پروردگار کے نام کے ساتھ جس نے کائنات کو خلق فرمایا۔

تو اس طرح سے جبرائیل امین بھی بعثت کے موقع پر سب سے پہلا پروگرام آنحضرتؐ کے پاس کے کر آئے اس کا آغاز بھی خدا کے نام سے ہے۔

تیسری آیت میں حضرت نوح علیہ السلام کی داستان کا تذکرہ ہے۔ جب کافر اور سرکش قوم کی ہلاکت کے لیے طوفان اور عذاب الہی کا

[۱] بعض علماء کا نظریہ ہے کہ یہاں پر ایک جملہ ”ابتداء“ (میں ابتداء کرتا ہوں) محذوف ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ”استعین“ (میں مدد طلب کرتا ہوں) محذوف ہے۔ البتہ اگر ایسی صورت ہو کہ جہاں پر خداوند عالم اس جملہ (بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ) کو بیان کر رہا ہو (جیسے سورہ حمد کے علاوہ دوسری تمام سورتوں میں) تو وہاں پر ”ابتداء“ محذوف سمجھا جائے گا، لیکن خصوصی طور پر سورہ حمد میں چونکہ بندوں کی زبانی یہ جملہ ادا ہو رہا ہے، لہذا پہلے معنی میں بھی ہو سکتا ہے اور دوسرے معنی میں بھی اور دونوں معانی میں بھی۔ بنا بریں ”بِسْمِ اللّٰهِ“ میں موجود ”بِا“ یا تو ”استعانت“ کے معنی میں ہوگی یا پھر ”مصاحبت“ کے معنی میں۔ (غور کیجیے گا)۔

وقت قریب آیا اور حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی تیار کی اور اپنے مٹھی بھر ساتھیوں جن کی تعداد اسی (۸۰) سے زیادہ نہیں تھی سے کہا کہ کشتی پر سوار ہوں اور فرمایا ”خدا کے نام کے ساتھ اس پر سوار ہو جاؤ کہ تمہارا چلنا بھی خدا کے نام سے ہے اور ٹھہرنا بھی اسی کے نام سے ہے پھر وہ خدا کی مغفرت اور رحمت سے مدد حاصل کرتے ہوئے کہتے ہیں ”ان ربی الغفور الرحیم“۔

چوتھی آیت حضرت سلیمانؑ کے اس خط کے تذکرے پر مشتمل ہے جبکہ ہد ہد نے قوم سبا اور اس کی بت پرستی کی انہیں اطلاع دی تو آپؑ نے ملکہ سبا کے نام تحریر فرمایا۔

چنانچہ جب یہ خط ملکہ سبا کے ہاتھ پہنچ گیا تو اس نے اپنے ارکان حکومت اور درباریوں کو بلایا اور کہا یہ نہایت قیمتی خط ہے جو سلیمانؑ کی طرف سے مجھ تک پہنچا ہے اور اس کا مضمون یہ ہے کہ: خداوند رحمان و رحیم کے نام سے میرا پیغام یہ ہے کہ مجھ پر برتری طلب نہ کرو اور حق کے آگے سر جھکائے میرے پاس آؤ۔

مندرجہ بالا چاروں آیات سے مجموعی طور پر یہ بات اچھی طرح سمجھی جاسکتی ہے کہ ہر کام کو خدا کے نام سے شروع کیا جانا چاہیے، خواہ یہ کام تعلیم اور ہدایت الہی ہو (جیسے قرآن کی تمام سورتوں میں) یا خدا حضور بندوں کی دعا ہو (جیسے سورہ حمد ہے) یا دعوت رسالت کا آغاز اور وحی کا پہلا پیغام ہو (جیسے سورہ علق کی ابتدا ہے) یا بحران اور طوفان سے نجات حاصل کرنے کے لیے حرکت کا آغاز اور کشتی سے اتر کر کسی نئے کام کے شروع کرنے کے لیے رکنے کا آغاز ہو (جیسے حضرت نوح علیہ السلام کی داستان ہے) خواہ خط کا آغاز اور حق کے آگے سر جھکانے کی دعوت ہو (جیسے ملکہ سبا کے نام حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط ہے)

الغرض کام کا آغاز خداؑ کی طرف سے ہو یا ”مخلوق خداؑ“ کی طرف سے جبرائیلؑ کی طرف سے ہو یا نوحؑ اور سلیمانؑ جیسے انبیاء کی جانب سے خاص انسانوں کی طرف سے ہو یا عام لوگوں کی طرف سے بغیر کسی استثناء کے ہر کام کو خدا کے نام سے شروع کیا جانا چاہیے اور خود کو اس کی پاک و مقدس ذات سے مربوط کر کے اس کی قدرت و علم کے ناپیدا کنار سمندر سے آگاہی اور توانائی حاصل کرنی چاہیے۔

اور یہ ہیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور و معروف حدیث کے معنی جو آپؐ نے فرمایا کہ:

**”کل امر ذی بال لم یذکر فیہ بسم اللہ فهو ابتر“**

ہر اہم کام جس میں خدا کا نام نہ لیا جائے وہ نامکمل اور ادھورا رہتا ہے۔ [۱]

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ مذکورہ آیات میں خدا کے نام کے بعد جو اوصاف بیان کیے گئے ہیں ٹھیک ان کاموں سے مناسبت رکھتے ہیں جنکے آغاز میں بسم اللہ واقع ہوئی ہے مثلاً حضرت نوح علیہ السلام کی داستان میں خدا کے ”غفور رحیم“ ہونے کا ذکر ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھیوں کے رحمت الہی میں شامل ہونے کی طرف اشارہ ہے اور سب سے پہلی وحی کے نزول کی داستان میں اس خدا کے نام کا تذکرہ ہے جو انسان کا خالق مربی اور پروردگار ہے اور ہم جانتے ہیں کہ مسئلہ وحی بھی ایک قسم کی تربیت کا آغاز ہے بنا بریں ”تربیت تشریحی“ اور تربیت

[۱] سفینۃ البحار، جلد ۱، مادہ ”سما“۔

تکوینی ”ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔

بہر صورت ہر کام کی ابتدا میں خدا کو یاد کرتے وقت اس کے مناسب اوصاف سے استفادہ کرنا ہمارے اور دوسرے تمام انسانوں کے لیے ایک درس ہے۔

## توضیحات

### بسم اللہ کی زبردست اہمیت!

روایات میں قرآن مجید کی اس آیت کو اس قدر اہمیت دی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے خدا نے اسم اعظم کے ہم پلہ قرار دیا ہے جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

”بسم اللہ الرحمن الرحیم اقرب الی اسم اللہ الاعظم من ناظر العین الی

بیاضہا“

بسم اللہ الرحمن الرحیم خدا کے اسم اعظم سے آنکھ کی سفیدی کے اس کی پتلی سے بھی زیادہ نزدیک ہے۔<sup>[۱]</sup>  
ایک اور حدیث میں حضرت امام علی بن موسیٰ (رضا) علیہ السلام فرماتے ہیں:

”اقرب من سواد العین الی بیاضہا“

آنکھ کی سیاہی اس کی سفیدی سے اتنا نزدیک نہیں جتنا بسم اللہ اسم اعظم کے نزدیک ہے۔<sup>[۲]</sup>  
”بسم اللہ...“ کے ساتھ شروع کرنے کی اہمیت اس حد تک ہے کہ بعض روایات کی رو سے اسے چھوڑ دینے کی صورت میں ممکن ہے کہ انسان خدا کی طرف سے سزا کا مستحق ہو جائے جیسا کہ ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں:

عبداللہ بن یحییٰ حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام کی مجلس میں حاضر ہوا۔ آپ کے سامنے ایک چار پائی رکھی ہوئی تھی آپ نے فرمایا: اس پر بیٹھ جاؤ ناگاہ چار پائی اُلٹ پڑی وہ زمین پر گر پڑا سر پر چوٹ آگئی اور سر سے خون بہنے لگا۔

امیر المؤمنین نے پانی منگوایا، اس کا سر دھویا پھر فرمایا میرے پاس آؤ اپنا دست مبارک اس کے سر پر رکھا اس نے پہلے تو شدید درد کا احساس کیا

[۱] تفسیر برہان جلد ۱ ص ۴۱ حدیث ۹، ۲۔

[۲] تفسیر برہان جلد ۱ ص ۴۱ حدیث ۹، ۲۔

پھر ٹھیک ہو گیا۔ آپؐ نے فرمایا ”اس خدا کا شکر ہے جو ہمارے شیعوں کے گناہ دنیا میں انہیں درپیش ناگوار حادثات کی وجہ سے دھو ڈالتا ہے اور انہیں پاک و پاکیزہ بنا دیتا ہے۔“

عبداللہ نے عرض کی امیر المؤمنین! آپؐ نے مجھے آگاہ تو کر دیا لیکن یہ تو فرمائیے کہ میں نے کونسا ایسا گناہ کیا ہے جس کی وجہ سے مجھے یہ ناگوار حادثہ پیش آیا تاکہ آئندہ اس کا ارتکاب نہ کروں۔

آپؐ نے فرمایا! تم نے چار پائی پر بیٹھے وقت بسم اللہ الرحمن الرحیم نہیں کہا، تمہیں معلوم نہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا کی طرف سے مجھے بتایا کہ ہر اہم کام جس میں بسم اللہ نہ کہا جائے وہ ادھورا رہ جاتا ہے اور اپنے انجام کو نہیں پہنچ پاتا۔

یہ سن کر عبداللہ نے کہا ”میں آپؐ کے قربان جاؤں آئندہ کبھی اسے ترک نہیں کروں گا۔“

امامؑ نے فرمایا ”تو ایسی صورت میں تم فائدے میں رہو گے اور سعادت و خوش بختی تمہارے ہمراہ رہے گی۔“ [۱]

لیکن یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اسم اعظم یا بسم اللہ جو اسم اعظم کے نزدیک تر ہے خالی الفاظ نہیں ہوا کرتے جنہیں زبان پر جاری کیا جائے اور صرف لفظوں ہی کے ذریعہ مشکلات حل ہو جائیں یا خیر و برکت کے دروازے کھل جائیں یا بگڑی سنور جائے بلکہ ان پر قلبی اعتقاد اور دل کی گہرائیوں سے ان پر ایمان و عمل بھی ضروری ہے۔

یعنی بسم اللہ کا مفہوم اس قدر انسان کی روح و جان میں اتر جائے کہ جب بھی اس جملہ کو زبان پر جاری کرے تو اپنے تمام وجود کو خدا کی پناہ و عافیت میں پائے اور اپنی تمام ہستی اور وجود کے ساتھ اس کی پاک ذات سے مدد طلب کرے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ صرف کہنے پر ہی نہیں بلکہ لکھنے پر بھی تاکید کی گئی ہے کہ ہر تحریر کو خدا کے نام کے ساتھ شروع کیا جائے جیسا کہ بقیوں کے نام حضرت سلیمان کا خط ہے۔ چنانچہ ہم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں پڑھتے ہیں:

”لاتدع البسملۃ ولو کتبت شعرا“

بسم اللہ کو ترک نہ کرو خواہ ایک شعر ہی کیوں نہ لکھو۔

پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا:

”قبل از اسلام لوگ اپنے خطوط کا آغاز ”بسمک اللہم“ کے جملہ سے کیا کرتے تھے لیکن جب ”انہ من

سلیمان وانہ بسم اللہ الرحمن الرحیم“ کی آیت نازل ہوئی تو لوگوں نے اپنے خطوط کو بسم اللہ الرحمن

الرحیم کے سرنامہ سے لکھنا شروع کیا۔“ [۲]

[۱] بحار الانوار، جلد ۳، ص ۳۰۵ (قدرے تلخیص کے ساتھ)۔

[۲] سفینۃ البحار، مادہ ”سما“۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت امام ہادی (علی نقی) علیہ السلام نے اپنے ایل ملازم کو بہت سے مسائل بتائے پھر اس سے فرمایا بتاؤ میں نے کیا کہا ہے؟ وہ نہ بتا سکا۔ امام نے دوات کو آگے بڑھا کر یہ لکھا:

”بسم اللہ الرحمن الرحیم، انشاء اللہ یہ بات تمہارے ذہن نشین رہے کہ تمام کام خدا کے ہاتھ میں ہیں.....“

وہ کہتا ہے کہ جب میں نے یہ کیفیت دیکھی تو مسکرانے لگا امام نے فرمایا مسکراتے کیوں ہو؟ میں نے کہا کوئی ایسی بات نہیں امام نے فرمایا نہیں! اپنے مسکرانے کی وضاحت کرو تو میں نے کہا آپ کے قربان جاؤں آپ کے اس طریقہ کار نے مجھے وہ حدیث یاد دلا دی جسے آپ کے جید بزرگوار حضرت امام رضا علیہ السلام کے ایک صحابی نے ان ہی سے نقل کیا کہ، کہ وہ جب بھی کوئی حکم صادر فرمایا کرتے تھے تو لکھا کرتے تھے بسم اللہ الرحمن الرحیم یاد رکھو کہ انشاء اللہ..... (پھر ضروری باتیں تحریر فرمایا کرتے تھے) اسی لیے میں مسکرایا ہوں۔“

امام علی نقی علیہ السلام نے مجھے فرمایا:

”لو قلت ان تارك التسمية كتارك الصلوة لكنت صادقا“

”اگر میں کہوں کہ بسم اللہ کا تارک تارک الصلوٰۃ کے مانند ہے تو سچ ہوگا۔“

بسم اللہ کی اہمیت اس حد تک ہے کہ پیغمبر خدا کی ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ:

”اذا قال المعلم للصبي بسم الله الرحمن الرحيم (وقال الصبي بسم

الله الرحمن الرحيم) كتب الله براءة للصبي وبراءة لابويه براءة

للمعلم من الجهنم“

”جب استاد بچے سے کہتا ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم (اور وہ یہ کہے) تو خداوند عالم اس بچے کے لیے اس کے

والدین کے لیے اور استاد کے لیے جہنم سے آزادی کا حکم صادر فرمادیتا ہے۔“

ہم اپنی گفتگو اس کلام کے ذریعہ خاتمہ دیتے ہیں جو کئی مفسرین کے درمیان مشہور ہے اور وہ یہ کہ:

تمام آسمانی کتابوں کے معانی قرآن مجید میں جمع ہیں۔

تمام قرآن کے معانی سورہ حمد میں۔

تمام سورہ حمد کے معانی بسم اللہ میں۔



تمام بسم اللہ کے معانی بسم اللہ کی ”با“ میں جمع ہیں۔ [۱]

تمام قرآن اور تمام آسمانی کتابوں کے مفہوم کا بسم اللہ کی باء میں مجتمع ہونا شاید اس لیے ہو کہ عالم آفرینش میں تمام مخلوقات اور عالم تشریح میں تمام تعلیمات خداوند متعال کی ذات والاصفات سے استمداد ہی کی بدولت جامد عمل پہنچتی ہیں کیونکہ سارے جہانوں میں وہی ذات پاک علتہ العلل (تمام علتوں کی علت اور تمام غایتوں کی غایت) ہے۔ اور معلوم ہے کہ بسم اللہ کی ”با“ بھی خدا سے استعانت اور مدد حاصل کرنے کے لیے ہے۔

اور یہ بات غور طلب اور لائق توجہ ہے۔

آیا بسم اللہ..... تمام سورتوں کا جزو ہے؟ مفسرین اور قرآنی علوم کے ماہرین نے سورتوں کی آیات کو شمار کرتے وقت بسم اللہ کو سوائے سورہ حمد کے باقی سورتوں کی جزو شمار نہیں کیا، البتہ سورہ حمد کے بارے میں تقریباً تمام فقہاء کا اجماع اور اتفاق ہے کہ بسم اللہ اس کی جزو ہے اسی لیے وہ سورہ حمد کی سات آیات بتاتے ہیں جن میں سے ایک بسم اللہ الرحمن الرحیم بھی ہے۔

نیز اس سورت کا ایک نام ”السیح المشانی“ بھی ہے (سیح اس لیے کہ اس کی سات آیتیں ہیں اور مشانی اس لیے کہ اپنی اہمیت کے پیش نظر یہ سورہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دو بار نازل ہوئی)

لیکن یہ بات تسلیم کرنا پڑے گی کہ قرآن مجید کی تمام قدیم اور جدید طباعتوں میں اسے ہر سورت کے آغاز میں لکھنا اس کے جزو ہونے کی قاطع دلیل ہے۔

عبداللہ بن عمر سے منقول ہے کہ جب وہ نماز کو شروع کرتے تھے تو تکبیر تحریمہ (تکبیرۃ الاحرام) کے بعد بسم اللہ الرحمن الرحیم ضرور پڑھا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ اگر اسے نہ پڑھا جائے تو پھر اسے قرآن میں کیوں لکھا گیا ہے؟ [۲]

اہل سنت کے مشہور و معروف عالم سیوطی نے اپنی تفسیر درمنثور کی پہلی جلد میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کے سورہ حمد کی جزو ہونے پر معتدد دلائل کا ذکر کیا ہے۔

اہلبیت اطہار اور آئمہ ہدیٰ علیہم السلام سے بھی بہت سی روایات بسم اللہ کے سورہ حمد اور دوسری سورتوں کے جزو ہونے پر وارد ہوئی ہیں۔ اسی لیے تمام علماء شیعہ کا اس کے تمام سورتوں کے جزو ہونے پر اتفاق و اتحاد ہے [۳]۔

بطور نمونہ ہم یہاں اہلسنت کی روایات میں سے ایک روایت کو درج کرتے ہیں اور وہ یہ کہ:

[۱] تفسیر روح المعانی، جلد ۱، ص ۳۷۔

[۲] سنن بیہقی، جلد ۲، ص ۴۳، ۴۷۔

[۳] شیخ طوسی کی کتاب ”خلاف“، جلد ۱، ص ۱۰۲، مسئلہ ۸۲، سنن بیہقی، جلد ۲، ص ۴۲، ۴۵، ۴۶۔ درمنثور، جلد ۱، ص ۷، ۸۔ البیان فی تفسیر القرآن، ص ۵۵۲۔

”جابر بن عبد اللہ انصاری سے کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے پوچھا جب تم نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہو تو نماز کی قرأت کیونکر کرتے ہو؟ میں نے عرض کی کہ الحمد للہ رب العالمین پڑھتا ہوں اور (بسم اللہ..... چھوڑ دیتا ہوں) تو آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا ”بسم اللہ الرحمن الرحیم کہا کرو۔ ہر طرح کی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اصرار کے ساتھ بسم اللہ..... کو بہت سی نمازوں میں بلند آواز سے پڑھا کرتے تھے چنانچہ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں:

”ان رسول اللہ کان یجہر ببسم اللہ الرحمن الرحیم“

یعنی رسول اللہؐ ہمیشہ بسم اللہ..... کو بلند آواز سے پڑھا کرتے تھے۔ [۱]

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک صحابی کہتے ہیں کہ:

”میں آنحضرتؐ کے پیچھے نماز پڑھا کرتا تھا اور وہ مغرب و عشاء اور صبح اور جمعہ کی نمازوں میں بسم اللہ الرحمن الرحیم

بلند آواز سے پڑھا کرتے تھے۔“ [۲]

دلچسپ بات یہ ہے کہ نبیؐ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ:

ایک مرتبہ حضرت معاویہ مدینہ میں لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے سورہ حمد کی اول میں تو انہوں نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کہا لیکن دوسری سورت میں نہ تو بسم اللہ کو پڑھا اور نہ ہی تکبیر کہی بلکہ سیدھے رکوع میں چلے گئے جب سلام کہہ کر نماز ختم کی تو جماعت کی صفوں سے مہاجرین نے ان پر ہر طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی اور کہنے لگے ”اس وقت الصلوٰۃ امر نسیت؟“ یعنی کیا تم نے نماز کی چوری کی ہے یا بھول گئے ہو؟ چنانچہ اس کے بعد جب بھی وہ نماز پڑھتے تھے حمد کے بعد سورت میں بسم اللہ کو ضرور پڑھا کرتے۔ [۳]

لیکن اس کے باوجود بھی اب تک بعض علمائے اہلسنت نماز میں حتیٰ کہ سورہ حمد میں یا تو بسم اللہ الرحمن الرحیم بالکل نہیں پڑھتے اور اگر پڑھتے بھی ہیں تو آہستہ سے!!

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں اس حقیقت پر سولہ دلائل پیش کیے ہیں کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم سورہ حمد کی جزو ہے جن میں سے اکثر دلائل رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث پر مشتمل ہیں۔

ہر چند کہ مشہور مفسر آلوسی نے اپنی تفسیر روح البیان میں ان دلائل پر انگشت نمائی کی ہے لیکن اس کے باوجود وہ یہ صراحت ضرور

[۱] تفسیر درمنثور، جلد ۱، ص ۸۔

[۲] تفسیر درمنثور، جلد ۱، ص ۸۔

[۳] اس روایت کو حاکم نے اپنی کتاب مستدرک جلد ۱، ص ۲۳۳ میں نقل کیا ہے اور اس کی سند کو بھی معتبر تسلیم کیا ہے اور یہی مضمون تھوڑے سے تفاوت کے ساتھ تفسیر درمنثور، جلد ۱، ص ۱۸ اور تفسیر روح المعانی، جلد ۱، ص ۹۳ میں بھی مذکور ہے۔

کرتے ہیں کہ بسم اللہ قرآن کی ایک مستقل آیت ضرور ہے لیکن سورہ حمد کی جزو نہیں ہے۔<sup>[۱]</sup>  
اس لحاظ سے انہوں نے درحقیقت اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ بسم اللہ..... قرآن کی جزو ہے لیکن یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ کس بناء پر انہیں مستقل آیت اور سورت حمد کی جزو نہ ہونے پر اصرار ہے؟

بہر صورت اس سے بڑھ کر کوئی واضح دلیل نہیں ہو سکتی کہ تاریخ اسلام کے طویل ترین دور میں چھپنے والے تمام قرآنوں میں ہر سورت کے آغاز میں (سوائے سورت برات کے) بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھی جاتی آرہی ہے اور یہ یقیناً پندرہویں صدی کے حکم کے مطابق ہوا ہے کیونکہ یہ بات قطعاً ناقابل قبول ہے کہ پیغمبر قرآن مجید میں ایسی چیزوں کے درج ہونے کا حکم دیں جو اس کا جزو نہیں ہیں پس اسی لیے ہم کسی بھی بہانہ سے بسم اللہ الرحمن الرحیم! کو سورتوں کا جزو ہونے سے جدا نہیں کر سکتے کیونکہ یہ قرآن میں ایک طرح کی تحریف ہوگی۔  
یہی وجہ ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام ایسے لوگوں کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

**سر قوا ا کر م ا یة فی کتاب اللہ بسم الرحمن الرحیم**

”انہوں نے قرآن مجید سے نہایت ہی مکرم و قیمتی آیت یعنی بسم اللہ الرحمن الرحیم کو چُرا لیا ہے۔“<sup>[۲]</sup>

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

**”مالہم قاتلہم اللہ عمدوا الی اعظم ا یة فی کتاب اللہ فزعموا انہا**

**بدعة اذا اظہر وھا وہی بسم اللہ الرحمن الرحیم“**

”خدا انہیں غارت کرے انہیں کیا ہوگا ہے کہ وہ قرآن کی سب سے بڑی آیت کے خلاف کمر بستہ ہو گئے ہیں اور

گمان کر لیا ہے کہ اگر اسے بلند آواز سے ظاہر کریں تو بد بخت ہے یعنی بسم اللہ الرحمن الرحیم۔“<sup>[۳]</sup>

اسی لیے تو آئمہ اہل بیت علیہم السلام کا اصرار رہا ہے کہ شب و روز کی تمام نمازوں میں بسم اللہ کو خاص طور پر بلند آواز سے پڑھا کریں تاکہ یہ ناپسندیدہ بدعت ختم ہو۔

قصہ مختصر، تمام قرآن میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کی اہمیت روز روشن کی طرح واضح اور عیان راہچہ بیان کے مصداق کسی بحث کی محتاج نہیں، اسی لیے اسے بہت اہمیت دینی چاہیے بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض سلیقہ افرا اپنے خطوط اور تحریروں میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کے لکھنے سے اجتناب کرتے ہیں یا اس کی جگہ چند نلفظے لگا دیتے ہیں مبادا ان کی تحریر بے وضو لوگوں کے ہاتھ آجائے یا پاؤں تلے روندی جائے یا

[۱] تفسیر روح المعانی، جلد ۱، ص ۷۳۔

[۲] تفسیر برہان، جلد ۱، ص ۴۲، حدیث ۱۵۔

[۳] تفسیر برہان، جلد ۱، ص ۴۲، حدیث ۶۲۔

کوچہ و بازار میں اس کی توہین اور بے حرمتی ہو لیکن انہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اگر اسی بناء پر بسم اللہ کو نہ لکھا جاتے تو بسم اللہ حذف کرنا اور نام خدا کا سینسر CENSOR اس سے بڑھ کر قابل اعتراض جرم ہے۔

ہمارا فرض بنتا ہے کہ لکھیں اور اس کی حفاظت اور احترام کریں لیکن اگر دوسرے لوگ اس کا احترام نہ کریں تو ہم اس کے ذمہ دار نہیں ہیں اور بہانے سے بسم اللہ کو لکھنا چھوڑ دیں کہ اس کا نقصان زیادہ ہے۔

کیونکہ تاریخوں میں مذکور ہے کہ اسلام میں سب سے پہلے عبدالملک بن مروان کے دور حکومت میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے حکم سے عمومی اور مستقل صورت میں سکہ دھالا گیا جس کے ایک طرف ”لا الہ الا اللہ“ اور دوسری طرف ”محمد رسول اللہ“ لکھا گیا تھا اور ظاہر ہے سکہ یہ کہہ کافروں سمیت ہر شخص کے ہاتھ میں آتا تھا اور اس بات کی کبھی پرواہ نہیں کی گئی تھی کہ مبادا ان مقدس ناموں کی ہتک ہو یا کوئی شخص بغیر وضو کے انہیں ہاتھ لگائے۔ لہذا ایسا سکہ نہیں ڈھالنا چاہیے اسلامی شعرا کی عبارت تحریر نہیں کرنی چاہیے اور نہ ہی ایسا ہونا چاہیے۔ [۱]

سورہ برائت کے آغاز میں بسم اللہ کیوں نہیں؟

اس سوال کا واضح جواب حضرت امیر علیہ السلام کی ایک حدیث میں منقول ہے:

”لم تنزل بسم اللہ الرحمن الرحیم علی رأس سورۃ برائۃ لان بسم اللہ

للأمان والرحمة ونزلت برائۃ لرفع الأمان والسیف فیہ ”بسم اللہ

الرحمن الرحیم“

سورہ برائت (توبہ) کے اوّل میں بسم اللہ نازل نہیں ہوئی کیونکہ بسم اللہ امان اور رحمت کے لیے اور سورہ برائت

(عہد توڑنے والے کفار کے لیے) رفع امان کے واسطے ہے اور اس میں تلوار چھپی ہوئی ہے۔ [۲]

کچھ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ یہ سورہ انفال کا حصہ ہے کیونکہ سورہ انفال میں عہد و پیمان کا تذکرہ ہے اور اس سورہ میں

عہد شکنی اور عہد شکنوں کا ذکر ہے۔ لہذا ان دونوں کے درمیان ”بسم اللہ“ مذکور نہیں ہوئی۔

یہی چیز حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ایک روایت میں بھی ہے کہ:

[۱] کتاب تاریخ تمدن اسلامی از جرجی زیدان، جلد ۱، ص ۱۴۳، (عربی متن)۔

[۲] تفسیر مجمع البیان، جلد ۵، ص ۲-۱۔ اسی حدیث کو فخر الدین رازی نے ابن عباس سے، انہوں نے حضرت علی علیہ السلام سے تھوڑے سے فرق کے ساتھ نقل کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ”لان بسم اللہ الرحمن امان وھذا السورۃ نزلت بالسیف ونبذ العہود ولیس فیہا امان“ (جلد ۱۵ ص ۲۱۶)

## «الانفال والبراءة واحدة»

سورہ انفال اور برائت ایک ہیں۔ [۱]

یہ احتمال بھی ہے کہ خداوند عالم نے خاص طور پر اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کہ بسم اللہ تمام قرآنی سورتوں کا جزو ہے سورہ برائت کے آغاز میں اسے نازل نہیں فرمایا۔

ان تینوں فلسفوں کا آپس میں جمع کرنا مکمل طور پر ممکن ہے۔

بسم اللہ کے بارے میں خاص طور پر حیوانات کے ذبح کرنے کے وقت قرآن مجید میں متعدد آیات موجود ہیں انشاء اللہ کسی اور مقام پر اس بارے میں گفتگو ہوگی۔

خدا کے نام کو غیر خدا کے ناموں کے ساتھ نہ ملاؤ۔

چونکہ قادر مطلق حقیقی رحمن اور واقعی رحیم صرف اسی خدا کی ذات پاک ہے اور یہ کائنات اسی کے احسان کا دسترخوان ہے اور جو شخص جو کچھ بھی اپنے پاس رکھتا ہے اسی کی مہربانی کی بدولت لہذا صرف اسی ہی سے مدد طلب کی جانی چاہیے اور اسی ہی کے نام سے ہر کام کا آغاز کرنا چاہیے بسم اللہ سے متعلق آیات اور اس بارے میں وارد ہونے والی تمام روایات بھی اسی بات پر زور دیتی ہیں۔

بنابریں جو لوگ غیر خدا کے ناموں کو اس کے نام کے ساتھ ساتھ ذکر کرتے ہیں درحقیقت وہ ایک قسم کے شرک میں مبتلا ہوتے ہیں جیسے وہ طاغوت پرست افراد جو جبار اور آمر بادشاہوں کے نام کو اس کے نام کے ساتھ ملا کر خدا اور بادشاہوں کے نام سے پروگراموں کا آغاز کرتے ہیں یا وہ لوگ جو عوام کے نام نہاد ہمدرد بنتے ہیں اور خدا اور عوام کے نام سے اپنے پروگراموں کا اعلان کرتے ہیں بلکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام کو بھی اس بارے میں خدا کے نام کے ساتھ نہیں ملا یا جاسکتا اور یہ نہیں کہا جاسکتا اللہ اور اس کے رسول کے نام کے ساتھ شروع کرتا ہوں۔

تفسیر امام حسن عسکری علیہ السلام میں ایک روایت ہے کہ:

ایک دن حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ یہ جملہ آپ کے کانوں تک پہنچ گیا، کوئی کہہ رہا تھا ”ما شاء اللہ و ما شاء اللہ“ (جو خدا چاہے اور محمد چاہیں) اور ایک دوسرا شخص یہ کہہ رہا تھا۔ ”ما شاء اللہ و ما شاء علی“ (جو خدا چاہیے اور علی چاہیں) آنحضرت نے یہ سن کر فرمایا ”لا تقرنوا محمداً ولا علیاً باللہ عزوجل“ (محمد اور علی کے ناموں کو خداوند عزوجل کے نام کے ساتھ نہ ملاؤ)

پھر فرمایا (ہاں اگر کہنا بھی چاہتے ہو تو) یوں کہا کرو ”ما شاء اللہ ثم ما شاء محمد“ یا ”ما شاء اللہ

ثُمَّ شَاءَ عَلِيٌّ (جو خدا چاہے پھر محمدؐ یا علیؑ چاہیں)۔  
 تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ خدا کی مشیت اس قدر قاہر اور غالب ہے کہ کوئی چیز بھی اس کے برابر مشابہ  
 اور ہم پلہ نہیں ہو سکتی خدا کے دین میں محمدؐ کی اس قدرت کے سامنے ایک ایسے طائر کی مانند ہیں جو اس وسیع  
 و عریض کائنات میں پرواز کرتا ہے اسی طرح علیؑ ہیں۔<sup>[۱]</sup>

[۱] اثبات الہدایۃ، جلد ۷، ص ۸۲، حدیث نمبر ۷۹ (تھوڑی سی تلخیص کے ساتھ)۔

## معرفت (شناخت) کا مسئلہ

اشارہ

تمام علمی مباحث میں سب سے پہلا مسئلہ جو انسان کو درپیش ہوتا ہے وہ یہی معرفت (شناخت) کا مسئلہ ہے اور دوسرے تمام سوالوں میں سے سب سے پہلا سوال جو انسان کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ:

۱۔ آیا ہمارے اپنے وجود کے علاوہ کوئی اور جہان بھی ہے یا جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں وہ خواب کی جیسی کوئی چیز ہے جو نیند کی حالت میں ہماری آنکھوں کے سامنے مجسم ہو کر آچکی ہے اور باہر کی یہ دنیا محض خواب و خیال ہے؟

۲۔ اگر واقعاً کسی جہان کا وجود ہے تو کیا اس تک رسائی ہمارے بس میں ہے اور اس کی شناخت و معرفت ہمارے امکان میں ہے؟

۳۔ اگر مذکورہ دونوں سوالوں کا جواب اثبات میں ہے یعنی خارج میں بھی جہان موجود ہے اور اس کی معرفت بھی ہمارے امکان میں ہے تو پھر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس معرفت کے کیا کیمیا راستے ہیں؟

الف۔ عقلی دلائل۔ ب۔ تجربہ اور سانس۔ ج۔ وحی یا کوئی اور راستہ؟ اور پھر یہ کران میں سے کونسا راستہ زیادہ قابل اطمینان و اعتماد ہے؟

۴۔ ان سب چیزوں سے ہٹ کر اس جہان کی معرفت کے کون سے ذرائع ہیں؟

۵۔ پھر یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ مندرجہ باتوں کو قبول کر لینے کے بعد کون سے ایسے امور ہیں جو انسان کے اندر معرفت اور شناخت کی راہیں مکمل طور پر ہموار کر کے روح اور جان کو معرفت کے لیے آمادہ کریں، اور معرفت کے راستے میں کون سی ایسی رکاوٹیں ہیں جو انسان کو عالم ہستی (کائنات) کے حقائق کی معرفت سے باز رکھتی اور گمراہی کی طرف لے جاتی ہیں؟

آیا ہمارے ذہن سے باہر بھی کوئی جہان موجود ہے؟

اس بارے میں فلاسفہ دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ۱۔ واقع بین ریالیٹسٹ REALIST۔

۲۔ خیالی لوگ یا آئیڈیالیٹس IDEALISTS

دوسرا گروہ درحقیقت سفسطائیوں SOPHISTS کی ایک شاخ ہے جو تمام حقائق کا انکار کرتے ہیں۔ بلکہ بعض لوگ تو کہتے ہیں کہ سفسطائی وہی آئیڈیالیٹس ہی ہیں جو اپنے وجود اور ذہن کو تسلیم کرتے ہیں اور باقی چیزوں کو خواب و خیال سمجھتے ہیں۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی عقلمند انسان اپنے وجود سمیت تمام چیزوں کا انکار کرے مگر یہ کہ وہ ذہنی اور نفسیاتی مریض ہو۔ بہر حال اشیاء کے بیرونی اور خارجی وجود کے اثبات کے لیے بہترین راہ یہ ہے کہ اس امر کو ضمیر اور وجدان کے حوالہ کر دیں کیونکہ دنیا بھر کے تمام لوگوں، تمام عقلاء اور دانشوروں، بلکہ خود ان آئیڈیالیٹس حضرات (جو ہر شے کے منکر ہیں) کا وجدان اور ضمیر بذات خود اس مدعا کی بین دلیل اور شاہد ناطق ہے۔ کیونکہ تمام لوگ جب

پیاسے ہوتے ہیں تو پانی کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں، یعنی عملی طور پر پیاس، پانی اور پیاس بچھانے میں پانی کی تاثیر کو سب لوگ تسلیم کرتے ہیں، حتیٰ کہ چھوٹے چھوٹے بچے، بلکہ جانور تک اس چیز کو قبول کرتے ہیں اور عملی طور پر سفسطائی بھی دوسروں سے جدا نہیں ہیں۔

یا جب کوئی انسان پر ہجوم سڑک کو عبور کرنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے سڑک کے کنارے آکھڑا ہوتا ہے، پھر دائیں بائیں دیکھتا ہے، ٹریفک ایک دوسرے کے پیچھے آ جا رہی ہوتی ہے۔ جب بھی سڑک پر تھوڑی سی خلوت ہوتی ہے اور وہ عبور کرنے کے قابل ہوتی ہے تو انسان بڑی احتیاط سے سڑک پر تھوڑی سی خلوت ہوتی ہے اور وہ عبور کرنے کے قابل ہوتی ہے تو انسان بڑی احتیاط سے سڑک کو پار کرنے کی کوشش کرتا ہے، مبادا کسی گاڑی سے تصادم ہو جائے اور وہ اسے مجروح کر دے یا موت کے گھاٹ اتار دے۔

اس طرز عمل میں واقع بین (ریلسٹ) اور خیالی لوگ (آئیڈیالٹ) برابر کے شریک ہیں، یعنی مذکورہ دونوں قسم کے لوگ عملی طور پر سڑک اور گاڑیوں کے وجود کو بھی تسلیم کرتے ہیں اور تصادم کے خطرات اور اس قسم کے دوسرے مسائل کو قبول کرتے ہیں۔ اسی لیے تو خوب دیکھ بھال اور بڑی احتیاط کے ساتھ سڑک پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یا جب کوئی شخص بیمار ہوتا ہے اور اپنے اندر بیماری کے مختلف آثار دیکھتا ہے تو حکیم یا ڈاکٹر کی طرف رجوع کرتا ہے۔ ڈاکٹر اس کی دیکھ بھال CHECK UP کرتا ہے، اس کے لیے دوا اور غذا تجویز کرتا ہے اور خوب سوچ سمجھ کر ہر ایک چیز کے بارے میں اسے ہدایات دیتا ہے اور مریض بھی اپنی کھوئی ہوئی تندرستی کو حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو ان ہدایات پر عمل کرنے کا پابند بناتا ہے۔

ان تمام امور میں واقع بین اور خیالی افراد برابر ہیں اور وہ بھی وجدانی طریق سے اپنی بیماری کے بارے میں رد عمل کا اظہار کرتے ہیں اور اس قسم کے بیسیوں عینی حقائق کو تسلیم کرتے ہیں، بیماری کے آثار سے لے کر طب اور ڈاکٹر، اس کی دیکھ بھال، دوا اور غذا کے وجود تک ہر ایک چیز کا اقرار کرتے ہیں۔ اسی لیے تو ہم کہتے ہیں کہ ”آئیڈیالٹ، عمل میں ریالٹ ہیں“ اور آئیڈیالٹ جب میدان زندگی میں اترتے ہیں تو اپنی تمام باتوں کو فراموش کر دیتے ہیں اور اپنے آپ کو عینی حقائق کے سامنے پاتے ہیں اور ان کے مطابق اپنے رد عمل کا اظہار کرتے ہیں۔

قرآن مجید بھی اپنی آیات میں صریحی طور پر اس بات پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے اور قرآن مجید کی تمام آیات عینی اور خارجی حقائق، آسمان وزمین، انسان اور فرشتے اس مادی دنیا اور اس کے بعد کا ایک اور جہان، یعنی دنیا اور آخرت کی خبر دیتی ہیں۔ قرآنی آیات کی رو سے یہ بات اس قدر واضح اور آشکار ہے کہ ہم اس سلسلے میں مزید کسی بحث کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ لہذا اس مسئلہ کو یہیں پر ختم کرتے ہیں اور دوسرے مسئلہ یعنی معرفت (شناخت) کے امکان پر ایک تفصیلی اور تحقیقی نظر ڈالتے [۱] ہیں۔

[۱] یہاں پر ہم ایک بار پھر زور دے کر یہ بات دہراتے ہیں کہ اس کی تمام مباحث میں ہمارا مقصد فلسفی یا تاریخی یا اس قسم کی کسی اور بحث کو چھیڑنا نہیں ہے۔ بلکہ ہمارا اصل مقصد تفسیر موضوعی ہے، یعنی قرآنی نقطہ نظر سے مختلف موضوعات کو زیر بحث لانا اور قرآنی آیات کی روشنی میں ان مباحث کو جانچنا اور اگر کسی مقام پر فلسفی یا اس قسم کی کسی اور بحث کی ضرورت محسوس ہوئی تو گفتگو کے آخر ”توضیحات“ کے عنوان کے تحت علیحدہ گفتگو کریں گے۔



## قرآنی نقطہ نظر سے معرفت ضروری ہے (علم کی اہمیت کے بارے میں چالیس قرآنی نکات)

اشارہ!

قرآن مجید جہانِ خارج یعنی بیرونی دنیا کی معرفت کو انسان کے لیے فقط ممکن ہی نہیں سمجھتا بلکہ اسے دوسرے تمام واجبات سے اہم بھی بتلاتا ہے۔

قرآن مجید مختلف بیانات کے ذریعہ اپنے پیروکاروں کو حصولِ علم کے ذریعہ کائنات کے رازوں کی شناخت اور معرفت کی دعوت دیتا ہے صریحی اور واضح طور پر بھی اور اشاروں کتابوں میں بھی۔

اس بارے میں قرآنی تعبیرات پر تحقیق ہمارے سامنے ایک نئی افق کی راہیں کھول دیتی ہے اور شناخت و معرفت کے مسئلہ کو ایک قطعی فریضہ کی صورت میں نہایت ہی اعلیٰ سطح پر پیش کرتی ہے۔

پھر لطف کی بات یہ ہے کہ یہ دعوت ایسے زمانے اور ایسے علاقے میں انجام پائی ہے جب جہالت اور لاعلمی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے ہر طرف چھائے ہوئے تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ان تعبیرات کی گہرائی اور گیرائی سب سے پہلے مرحلہ پر قرآن کی عظمت اور صاحبِ قرآن (نبی اکرمؐ) کی حقانیت کی دلیل ہے۔

اب ہم اسی نکتہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس سلسلے میں قرآن مجید کی مختلف تعبیرات کو بیان کرتے ہیں۔  
یہ صورت حال پوری طرح جدید انداز میں بیان ہوگی کہ جس کے چالیس نمونے تو ہم نے قرآن پاک کی مختلف آیات سے جمع کیے ہیں جن میں سے ہر ایک نمونہ کو خصوصی زاویہ فکر سے زیر بحث لایا گیا ہے۔

ساتھ ہی یہ بھی بتاتے چلیں کہ ان آیات کی مناسبت سے نہایت ہی انمول روایات کو ان کے حاشیہ میں تحریر کیا گیا ہے جو اس بارے میں کتاب و سنت کی مکمل ہم آہنگی پر روشن دلیل ہے۔

### ۱۔ حصولِ علم ضروری ہے

قرآن مجید کی ستائیں آیات میں ..... (جان لو) کہ کلمہ سے کام لیتے ہوئے حصولِ علم کی دعوت دی گئی ہے جس کے چند ایک نمونے مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۳۹﴾ یعنی جان لو کہ خداوندِ عالم ناقابلِ شکست اور صاحبِ حکمت

ہے۔ (سورہ بقرہ ۲۰۹)

۲۔ **وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ** ﴿۲۰﴾ یعنی جان لو کہ یقیناً خداوند عالم ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

(بقرہ ۲۳۱)

۳۔ **وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ** ﴿۲۱﴾ یعنی جن لو کہ یقیناً خداوند عالم ہر اس کام کو دیکھ رہا ہے جو تم انجام دیتے ہو۔ (بقرہ ۲۳۳)

۴۔ **إِعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا** ﴿۲۲﴾ یعنی جان لو کہ خداوند عالم زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے۔ (حدید ۱۷)

۵۔ **وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ** ﴿۲۳﴾ یعنی جان لو کہ یقیناً تم خدا کے پاس محشور ہو گے۔ (بقرہ ۲۰۳)

۶۔ **فَاعْلَمُوا أَنَّمَا عَلِيَ رَسُولِنَا بِالْبَلِغِ الْمُبِينِ** ﴿۲۴﴾ یعنی جان لو کہ ہمارے رسول پر تو صرف واضح طور پر پہنچا دینا ہی ہے۔ (سورہ مائدہ ۹۲)

۷۔ **وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ** ..... یعنی جان لو کہ جو نفع بھی تم حاصل کرو تو اس کا پانچواں حصہ خدا اور اس کے رسول ..... کے لیے ہے۔ (سورہ انفال ۴۱)

۸۔ **إِعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهُوَ** ..... یعنی جن لو کہ یہ دنیا تو بس کھیل تماشا ..... ہے۔ (سورہ حدید ۲۰)

پہلی، دوسری اور تیسری آیات خداوند عالم کی ذات اور اس کی ذاتی اور فعلی صفات کی طرف متوجہ کر رہی ہیں۔

چوتھی آیت تخلیق زندگی کی طرف توجہ دلا رہی ہے۔

پانچویں آیت میں قیامت اور حشر و نشر کی گفتگو ہے۔

چھٹی آیت میں نبوت اور پیغمبر اکرم کے فریضہ کی بات ہو رہی ہے۔

ساتویں آیت میں اسلام کے عملی احکام کا تذکرہ ہے۔

اور آٹھویں آیت زندگی کے حقیقی چہرے اور اس کے بے وقعت ہونے کو مجسم کر رہی ہے جو زہد و تقویٰ دنیا پرستی اور اس کی وجہ سے

حاصل ہونے والے گناہوں سے نجات کی دعوت کا ایک ذریعہ ہے۔

تو اس طرح سے عقائد اعمال اور معمولات زندگی سے تمام امور کی جانب ..... اعلیٰ کے ذریعہ توجہ مبذول کرائی گئی ہے اور اس

بارے میں علم و آگاہی کی زیادہ سے زیادہ دعوت دی گئی ہے [۱]۔

## ۲۔ غور و فکر سے کام نہ لینے پر سرزنش کی گئی ہے

چنانچہ کبھی تو فرماتا ہے ”افلا تتفكرون“ آیا غور و فکر نہیں کرتے ہو؟ (سورہ انعام ۵۰) اور کبھی تکوینی اور تشریحی آیات کو بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے ”لعلکم یتفكرون“ یہ صرف اس لیے ہے کہ شاید غور و فکر سے کام لیں۔ (سورہ بقرہ ۲۱۹)۔ سورہ اعراف ۱۷۶ میں لعلکم ہے۔

اور کبھی فرماتا ہے ”اولا یتفکروا“ کیا انہوں نے اپنی فکر سے کام نہیں لیا؟ (سورہ روم ۸) یہ سب باتیں علم و فکر کے لازم ہونے کی دعوت ہیں اور فکر و علم کا لزوم معرفت کے ممکن ہونے کی دلیل ہے [۲]۔

## ۳۔ تعلیم و تعلم کی تاکید

سورہ برائت (توبہ) میں ارشاد ہوتا ہے:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ﴿۱۲۷﴾

ہر گروہ سے ایک ایک ٹولہ کوچ کیوں نہیں کرتا کہ دین کے بارے میں آگاہی حاصل کرے اور اپنی قوم کی طرف واپس آ کر انہیں ڈرائے شاید کہ قوم کے لوگ فرمان الہی کی مخالفت سے بچ جائیں۔ (سورہ توبہ) یہ آیت صرف دین الہی کی تعلیم حاصل کرنے ہی کو واجب قرار نہیں دیتی بلکہ حصول علم کے بعد اسے دوسروں کو تعلیم دینے کو بھی واجب جانتی ہے۔

نفر ” کی تعبیر اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ کوچ کرنے سے مراد میدان جنگ کی طرف جانا ہے کیونکہ قرآن مجید کی مختلف آیات میں یہ

[۱] روایات میں اس بارے میں زبردست تاکید کی گئی ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور و معروف حدیث ”طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة“ اس کی روشن مثال ہے (ملاحظہ ہو بحار الانوار، جلد ۱، ص ۱۱۷) اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام بھی فرماتے ہیں ”طلب العلم فریضة علی کل حال“ (ہر حالت میں علم کا طلب کرنا واجب ہے۔ ملاحظہ ہو بحار الانوار، جلد ۲ ص ۱۷۲)

[۲] رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ہے ”اغدعالہا او متعلما او مستعبا او محبا ولا الخامس“ یعنی یا عالم بنویا طالب علم، یا پھر علماء کی باتیں سنا کرو، یا علم دوست بنو، لیکن پانچویں شخص نہ بنو کہ ہلاک ہو جاوے۔ (مجتبایا، جلد ۱، ص ۲۲)

تعبیر اسی معنی کے لیے استعمال ہوئی ہے اسی لیے تو مسلمانوں پر یہ بات فرض تھی کہ غیر ضروری صورت میں سب کو میدان جنگ کی طرف جانے کی ضرورت نہیں بلکہ کچھ لوگ تو دشمن کے ساتھ جہاد کرنے کے لیے میدان جنگ میں جائیں اور کچھ لوگ جہالت کے ساتھ جہاد کرنے کے لیے مدینہ ہی میں رہ جائیں اور احکام الہی کی تعلیم حاصل کریں اور دوسروں کو میدان جنگ سے واپسی کے بعد تعلیم دیں۔

اس آیت کی ایک اور تفسیر یہ ہے کہ مسلمان دو حصوں میں بٹ جائیں ایک تو مدینہ ہی رہ جائے تاکہ شہر کی حفاظت کر سکیں اور جو گروہ میدان جہاد میں جائے وہاں پر خدا کی عظمت کے آثار اس کی شبی امداد اور مسلمانوں کی معجزانہ کامیابیوں کے آثار اپنی آنکھوں سے دیکھے اور جب واپس آئے تو دوسروں کو تعلیم دے۔

اس آیت کی تفسیر میں ایک تیسرا احتمال بھی ملتا ہے اور وہ یہ کہ مدینہ کے گرد و نواح میں رہنے والے کچھ لوگوں پر ضروری تھا کہ وہ امن عامہ کے تحفظ کے لیے اپنے گھروں ہی میں رکے رہیں اور کچھ لوگ مدینہ میں آ کر آنحضرتؐ سے احکام الہی کی تعلیم حاصل کر کے واپس آ کر دوسروں کو یہ تعلیم دیں۔<sup>[۱]</sup>

ان میں سے ہر ایک تفسیر کی اپنی خصوصیت ہے جو دوسری میں نہیں پائی جات <sup>[۲]</sup> ای۔ لیکن ہم جس چیز کی تلاش میں ہیں اگر ان میں سے کسی کو بھی قبول کر لیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ جس طرح حصول علم واجب ہے اسی طرح دوسروں کو تعلیم دینا بھی واجب ہے اور ان دونوں واجبات پر تاکید مسئلہ معرفت و شناخت کے لازمی اور ممکن ہونے کی روشن دلیل ہے۔<sup>[۳]</sup>

## ۴۔ تخلیق کائنات کا مقصد ہی علم اور معرفت ہے

ارشاد باری ہے:

اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ ۖ يَتَنَزَّلُ الْأَمْرُ بَيْنَهُنَّ

[۱] تفسیر فخر الدین رازی، جلد ۱۶، ص ۲۲۵، تفسیر مجمع البیان، جلد ۵ ص ۸۳۔

[۲] پہلی تفسیر کی رو سے ضمیروں کا مرجع "لیتفقہوا" اور "لینذروا" میں محذوف اسم ہے جو تقدیری صورت میں یوں ہوگا "وتبقى طائفة"۔ لیکن یہ ظاہر کے خلاف ہے، جبکہ "نفر" جہاد کے معنی میں آیا ہے اور یہ اس کا ایک قوی نقطہ ہے۔ دوسری تفسیر میں بھی ضمیروں کا مرجع وہی مذکورہ کلمہ "طائفہ" ہے، لیکن اس تفسیر کی مشکل یہ ہے کہ میدان جہاد و احکام دین کی تعلیم حاصل کرنے کا مرکز نہیں ہوتا، مگر مذکورہ بالا تو جہہ کے ساتھ اور تیسری تفسیر میں بھی ایک مقدر محذوف ہے، لیکن بہت سی ان روایات سے ہم آہنگ ہے جن میں "نفر" کی "علم دین کے حصول کے لیے کوچ کرنا" سے تفسیر کی گئی ہے۔ (تفسیر نور الثقلین میں اس بارے میں نور روایات نقل کی گئی ہیں)۔

[۳] حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "لوددت ان اصحابی ضربت روسهم بالاسیاط حتی یتفقہوا" مجھے یہ بات پسند ہے کہ میرے دوستوں کو تازیانے مار کر علم و دانش کے حصول کے لیے روانہ کیا جائے۔ (کافی، جلد ۱، ص ۸)

لِتَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۖ وَأَنَّ اللَّهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿۱۲﴾  
 خدا تو وہ ہے جس نے سات آسمانوں کو پیدا کیا اور زمینوں کی بھی اسی طرح اس کا حکم ہمیشہ ان کے درمیان نازل  
 ہوتا رہتا ہے یہ سب کچھ صرف اسی لیے ہے تاکہ تم جان لو کہ خداوند عالم ہر چیز پر قادر ہے اور اس کا علم ہر چیز کو  
 اپنے احاطہ میں لے چکا ہے۔ (سورہ طلاق ۱۲)

سات آسمانوں اور سات زمینوں سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں ہم تفسیر نمونہ میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ لیکن  
 صورتف حال خواہ کچھ بھی ہو یہ آیت وضاحت کے ساتھ اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ تخلیق کائنات کے مقاصد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ  
 لوگوں کو خداوند عالم کے علم و قدرت اور اس کی ذات و صفات سے آگاہ کیا جائے اور یہ بات بڑی صراحت کے ساتھ وسیع پیمانے پر معرفت  
 کے ممکن ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ ﴿۱۲﴾

### ۵۔ بعثت انبیاء کا مقصد تعلیم و تربیت ہے

قرآن مجید نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں بارہا اس بات کی یاد دہانی کرائی ہے۔ منجملہ ان کے سورہ بقرہ میں  
 ہے:

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ  
 وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿۱۵۱﴾

جیسا کہ ہم نے ایک رسول تمہارے لیے تم ہی سے بھیجا ہے تاکہ وہ تم پر ہماری آیات کی تلاوت کرے تمہارا  
 تزکیہ کرے تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور جو تم نہیں جانتے وہ تمہیں سکھائے۔ (بقرہ ۱۵۱)  
 یہی چیز سورہ بقرہ ۱۲۹ سورہ آل عمران ۱۶۴ اور سورہ جمعہ ۲ میں بیان ہوئی ہے۔

اگر معرفت اور شناخت ناممکن ہوتی تو پھر یہ بات کیونکر ممکن تھی کہ اسے پیغمبر اسلام کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک مقصد کے طور پر

﴿۱﴾ سات آسمانوں کے متعلق تفسیر نمونہ جلد اول، طبع جدید میں سورہ بقرہ کی آیت ۲۹ کے ذیل میں اور سات زمینوں کے بارے میں تفسیر نمونہ،  
 جلد ۲۴، سورہ طلاق کی بارہویں آیت کے ذیل میں تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے، ادھر رجوع فرمائیں۔

﴿۲﴾ ایک روایت میں ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنے دوستوں سے فرمایا: "ایہا الناس ان الله جل ذكره ما خلق  
 العباد الا ليعرفوه، فاذا عرفوه عبده، فاذا عبده استغنوا بعبادته عن عبادة ماسوا،" یعنی اے لوگو! جان لو کہ  
 خداوند عالم نے اپنے بندوں کو پیدا نہیں کیا مگر یہ کہ وہ اس کی معرفت حاصل کریں۔ جب اس کی معرفت حاصل کر لیں گے تو اس کی عبادت کریں  
 گے۔ جب اس کی عبادت کریں گے تو اس کے غیر کی بندگی سے بے نیاز ہو جائیں گے۔ (بخاری، جلد ۵، ص ۳۱۲)

بیان کیا جاتے ہیں؟

## ۶۔ قرآن کے نازل ہونے کا مقصد غور و فکر ہے

ارشاد ہورہا ہے۔

كِتَبْنَا لَكَ الْكِتَابَ الْمُبَارَكَ لِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿۲۹﴾

یہ بابرکت کتاب ہے جسے ہم نے آپ پر نازل کیا ہے تاکہ لوگ اس کی آیات میں تدبر کریں اور صاحبانِ عقل یاد آوری کریں۔ (سورہ ص ۲۹)

أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا ﴿۳۰﴾

کیا وہ لوگ قرآن میں فکر و تدبر سے کام نہیں لیتے؟ یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں؟ (سورہ محمد ۲۴)

”یتدبروا“ دراصل ”دبر“ (بروزن شتر) کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہر چیز کی پشت ہے پھر یہ غور و فکر اور عاقبت اندیشی کے لیے استعمال ہونے لگا کیونکہ سوچ و بچار کے ساتھ کسی بات کا انجام نتیجہ اور پس و پیش سامنے آجاتا ہے۔

پہلی آیت نزول قرآن کا مقصد فکر و تدبر بیان کر رہی ہے تاکہ لوگ چند کلمات مقدسہ پر مشتمل آیات قرآنی کی تلاوت ہی پر اکتفا نہ کریں اور آخری مقصد کو فراموش نہ کر دیں۔

اور دوسری آیت میں تفکر و تدبر سے کام نہ لینے کا سبب دلوں پر تالے پڑ جانے اور تشخیص کی حس کے ناکارہ ہونے کو بتایا گیا ہے تو گویا تمام صورتوں میں یہ آیات غور و فکر کرنے کے لیے دعوت عام ہیں ایسی دعوت جو معرفت کے امکان کو واضح طور پر ثابت کرتی ہے۔ [۲]

[۱] امیر المؤمنین فرماتے ہیں ”کفی بالعلم شرفاً ان یدعیہ من لا یحسہ ویفرح اذا نسب الیہ و کفی بالجهل ذمماً یبرأ منه من هو فیہ“ علم کے شرف کے لیے اتنا کافی ہے کہ جو لوگ اس سے آگاہ نہیں ہیں وہ بھی اس کا دعویٰ کرتے ہیں اور اگر انہیں اس کی طرف نسبت دی جائے تو خوش ہوتے ہیں اور جہالت کی مذمت کے لیے اتنا کافی ہے کہ جہالت کے حامل افراد اس سے اظہار برائت کرتے ہیں۔ (بخاری الانوار جلد ۱، ص ۱۸۵)

[۲] حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ہشام بن حکم سے فرماتے ہیں ”ما بعث الله انبیاءه الا ليعبادہ الا ليعقلوا عن الله فاحسنهم استجابة احسنهم معرفة“ خداوند عالم نے انبیاء کو لوگوں کی طرف اس لیے بھیجا ہے کہ وہ خدا کی معرفت حاصل کریں۔ ان کی دعوت کو ان لوگوں نے احسن طریقہ سے قبول کیا جن کی معرفت زیادہ تھی۔ (اصول کافی جلد ۱ ص ۱۶)

## ۷۔ معراج پیغمبر کا مقصد ہی معرفت تھا۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلٰی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا  
الَّذِیْ بَرَكْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیْہٖ مِنْ اٰیٰتِنَا ۗ اِنَّہٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ①

پاک و منزه ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو راتوں رات سیر کرائی مسجد اقصیٰ تک کہ جس کے اطراف کو ہم نے بابرکت بنایا ہے تاکہ ہم اسے اپنی نشانیاں دکھائیں بے شک کہ وہ سننے اور دیکھنے والا ہے۔ (بنی اسرائیل 1)  
یہی چیز سورہ نجم میں بھی بالفاظ دیگر بیان ہوئی ہے:

وَلَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہٖ الْکُبْرٰی ⑧

اس نے اپنے پروردگار کی بہت بڑی نشانیوں کو ملاحظہ کیا۔ (سورہ نجم 18)

یہ آیات معراج پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت بڑے مقاصد میں سے کم از کم ایک مقصد حق تعالیٰ کی بڑی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ بتاتی ہیں جو کہ معرفت کے اہم ذرائع میں سے ایک ہے۔ ⑧

## ۸۔ دعوت اسلام کا آغاز علم کی دعوت سے ہوا

ارشاد ہوتا ہے:

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ① خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ② اِقْرَأْ وَرَبُّكَ  
الْاَكْرَمُ ③ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ④ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمُ ⑤

پڑھو اپنے اس پروردگار کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا پڑھو  
کہ تمہارا پروردگار سب سے زیادہ کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ تعلیم دی انسان کو وہ کچھ پڑھایا جو وہ نہیں جانتا  
تھا۔ (سورہ علق 5 تا 8)

یہ آیات جو جبل نور کی غار حرا میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاک و مطہر دل پر وحی کی پہلی جھلک تھیں معرفت کے مسئلہ سے  
شروع ہو کر معرفت ہی کے مسئلہ پر ختم ہوتی ہیں۔

ان کا آغاز "قرائت" سے ہوتا ہے جو کہ معرفت کا ایک ذریعہ ہے اور اختتام پر کائنات کے عظیم ترین معلم یعنی خداوند عالم کے

⑧ اس بارے میں مزید تفصیلات کے لیے تفسیر نمونہ جلد 12 کے ابتدائی صفحات کا مطالعہ کریں۔

بارے میں تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے انسان جس کے کتب کا ایک چھوٹا سا شاگرد ہے۔  
تو کیا یہ سب معرفت کے امکان اور اس کے لزوم کی روشن دلیل نہیں ہے؟

## ۹۔ علم نور اور روشنائی ہے

ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ۗ أَمْ هَلْ تُسْتَوَىٰ الظُّلُمَاتُ وَالنُّورُ ۗ  
کہہ دیجئے کہ کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہو سکتے ہیں؟ یا ظلمتیں اور نور برابر ہو سکتے ہیں؟ (سورہ رعد ۱۶)

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ﴿۱۹﴾ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ ﴿۲۰﴾ وَلَا الظُّلُّ وَلَا  
الْحُرُّ ﴿۲۱﴾

نہ تو نابینا اور بینا برابر ہو سکتے ہیں اور نہ ہی تاریکیاں اور روشنائی اور نہ ہی سکون عطا کرنے والا سایہ اور گرم و جھلسا  
دینے والی ہوائیں۔ (سورہ فاطر ۱۹ تا ۲۱)

ان آیات میں ظلمت کو نابینائی اور نور کو بصیرت اور بینائی کے ہم پلہ قرار دیا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ علم اور معرفت نور اور  
روشنی ہیں جبکہ جہالت اور بے علمی اندھے پن کے برابر ہیں۔ اور یہ شناخت و معرفت کی ترغیب کے لیے نہایت ہی حسین تعبیر ہے [۱]۔

## ۱۰۔ کائنات کے اسرار کا ادراک صرف عالم ہی کر سکتے ہیں

ارشاد ہوتا ہے:

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ ۗ إِنَّ  
فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعَالَمِينَ ﴿۲۲﴾

اس کی نشانیوں میں ہے آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف اس میں نشانیاں ہیں  
عالم لوگوں کے لیے۔ (سورہ روم ۲۲)

[۱] پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: "العلم نور يقذفه الله في قلب من يريد ان يهديه" علم ایک نور ہے، جسے خداوند  
عالم ہدایت کرنا چاہے اس کی دل میں ڈال دیتا ہے۔ (وانی جلد ۱ ص ۷)



اور ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

**وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعُلَمَاءُ ﴿٣٣﴾**

یہ وہ مثالیں ہیں جنہیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں اور علماء کے سوا ان کا کوئی اور ادراک نہیں کر سکتا۔  
(سورہ عنکبوت ۴۳)

پہلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ کتاب تکوین (عالم کون و مکان) کے اسرار کا علم صرف علماء سے ہی خاص ہے اور دوسری آیت میں کتاب تدوین (قرآن مجید) کے ادراک کی انہی سے خصوصیت سے نشاندہی کی گئی ہے۔  
اور یہ جہاں ایک طرف علم و معرفت کے لیے ایک قسم کی ترغیب و تشویق ہے وہاں معرفت کے مسئلہ کی دلیل بھی ہے۔

**۱۱۔ سب سے پہلا معلم خداوند عالم ہے**

ارشاد ہوتا ہے:

**وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا**

خداوند عالم نے سارے کے سارے علم اسماء (اسرارِ تخلیق) کی آدم کی تعلیم دی۔ (سورہ بقرہ ۳۱)  
دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

**الرَّحْمٰنُ ۙ عَلَّمَ الْقُرْآنَ ۖ خَلَقَ الْإِنْسَانَ ۙ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ﴿٣٠﴾**

خداوند رحمان نے قرآن کی تعلیم دی انسان کو پیدا کیا اور اسے بات کرنا سکھایا۔ (سورہ الرحمن ۳۰)  
ایک اور جگہ فرماتا ہے:

**عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝**

انسان جو کچھ نہیں جانتا تھا اسے سکھایا (تعلیم دی)۔ (علق ۵)  
نیز فرماتا ہے:

**الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝**

جس نے قلم کے ذریعہ تعلیم دی۔ (علق ۴)

کائنات کا یہ عظیم معلم کبھی تو حضرت آدم کو تمام علم اسماء کی تعلیم دیتا ہے اور کبھی بنی نوع انسان کو (تکوین اور تشریح کے ذریعہ) اس چیز کی تعلیم دیتا ہے جو وہ نہیں جانتے اور انہیں اس کی ضرورت ہے۔

کبھی انسان کے ہاتھ میں قلم پکڑا کر اسے لکھنا سکھاتا ہے اور کبھی ایک ایک دو دوحروف اس کی زبان پر لاکر اسے بولنا سکھاتا ہے اور بات کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی ذات کی عظیم ترین صفات میں سے ایک اہم صفت بندوں کو تعلیم دینا بھی ہے تعلیم بھی ایسی جو ان کی شناخت اور معرفت کا ذریعہ ہوتی ہے۔

## ۱۲۔ انسان دوسری مخلوقات پر علم ہی کے ذریعہ ممتاز ہوتا ہے

ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ يَا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ ۖ فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ ۙ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ  
لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۙ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنْتُمْ  
تَكْتُمُونَ ﴿۳۳﴾

خدا نے فرمایا، اے آدم! انہیں موجودات کے ناموں اور اسرار سے آگاہ کرو۔ جب آدم نے انہیں ان سے آگاہ کیا تو فرمایا میں نے نہیں کہا تھا کہ میں آسمان اور زمین کے غیب کو جانتا ہوں اور اس چیز سے بھی باخبر ہوں جسے تم (فرشتے) ظاہر کرتے یا چھپاتے ہو۔ (بقرہ ۳۳)

یہ بات اس وقت کہی گئی جب خداوند عالم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ جس وقت میں اپنے خلیفہ اور نمائندہ (آدم) کو خلق کر لوں تو تم سب اس کے سامنے سجدہ کرنا اور اپنی فروتنی کا اظہار کرنا۔ اسی طرح کی برتری کو ظاہر کرنا چنانچہ جب فرشتوں کو معلوم ہو گیا کہ علم و معرفت کے لیے آدم کی آمادگی اور استعداد اعلیٰ حدود پر ہے تو انہیں پتہ چلا کہ وہ کس لیے خدا کا خلیفہ اور کائنات کا گل سرسبد ہے اور اس سے پہلے وہ جو باتیں کر چکے تھے ان پر نادم اور پشیمان ہوئے ﴿۳۳﴾۔

## ۱۳۔ خدا کا قرب معرفت کے تناسب سے حاصل ہوتا ہے

ارشاد ہوتا ہے

.....يَرْفَعُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ ط  
(اگر تم احکام الہی پر عمل کرو تو) خداوند عالم تم میں سے ان لوگوں کو عظیم درجات کی بلندی پر لے جائے گا جو ایمان

﴿۱﴾ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: «اكثر الناس قيمة اكثرهم علما و اقل الناس قيمة اقلهم علما» لوگوں میں سے جس کا علم سب سے زیادہ ہے اس کی قدر و قیمت بھی سب سے زیادہ ہے اور جس کا علم سب سے کم ہے اس کی قیمت بھی سب سے کم ہے۔ (بخاری الانوار جلد ۱ ص ۱۶۳)

لے آئے اور جو لوگ علم کی نعمت سے مالا مال ہیں۔ (سورہ مجادلہ ۱۱)

اس آیت کی ابتداء میں آداب مجلس کے سلسلہ میں چند اخلاقی احکام کی بات ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی خدا کی بارگاہ میں نتیجہ اور پاداش کے طور پر ان علماء اور مومنین کے درجات کا تذکرہ ہے جو ان احکام پر عمل کرتے ہیں۔

”درجات“ ”درجہ“ کی جمع ہے جس کا معنی سیڑھی کے وہ پائے ہیں جو اوپر کی طرف جاتے ہیں اس کے مقابلے میں درجات ہے جو ”درکہ“ کی جمع ہے جس کا معنی سیڑھی کے وہ پائے جو نیچے کی طرف جاتے ہیں (جیسے تہ خانے کی سیڑھیوں کے پائے ہوتے ہیں)۔ درجات کو نگرہ کی صورت میں بیان کرنا ان کی عظمت کی طرف اشارہ ہے اور انہیں جمع کی صورت میں بیان کرنا شاید علماء کے درجات کے تفاوت کی طرف اشارہ ہے۔

صورت حال خواہ کچھ بھی ہو یہ بات ضرور مسلم ہے کہ درجات کی بلندی سے مراد ان کی مکان کے لحاظ سے بلندی مراد نہیں ہے بلکہ بارگاہ خداوندی میں قرب کی بلندی مراد ہے۔

تفسیر المیزان میں ہے کہ اس آیت سے یہ بات اچھی طرح سمجھی جاسکتی ہے کہ مومنین کی دو قسمیں ہیں ایک مومنین عالم اور دوسرے مومنین غیر عالم جن میں سے مومنین عالم برتر ہیں پھر اس بارے میں سورہ زمر کی نویں آیت ”قل هل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون“ سے استدلال کیا گیا ہے۔<sup>[۱]</sup>

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ آیت میں ایمان اور علم کے رابطے کو بیان کیا گیا ہے انشاء اللہ بعد میں ہم اس بات کی طرف تفصیل سے اشارہ کریں گے۔<sup>[۲]</sup>

## ۱۴۔ انبیاء زیادہ سے زیادہ علم کے خواہاں ہوتے ہیں

ارشاد ہوتا ہے:

وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا ﴿۱۴﴾

کہہ دیجئے کہ اے پروردگار! میرے علم کو زیادہ کر دے۔ (طہ ۱۱۴)

یہ آیت جس کے مخاطب حضور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اس بات کی نشاندہی کر رہی ہے کہ باوجودیکہ آنحضرتؐ علم کے

[۱] تفسیر المیزان، جلد ۱۹، ص ۲۱۶

[۲] حضرت امام جعفر صادقؑ کی ایک حدیث میں ہے کہ ”ان الثواب بقدر العقل“ ہر شخص کو اس کی عقل (دوانش) کے مطابق اجر ملتا ہے۔

عظیم مقام و مرتبہ پر فائز تھے پھر بھی آپؐ کو زیادہ سے زیادہ علم طلب کرنے کا حکم تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی بتا رہی ہے کہ انسان اپنی عمر کے کسی بھی مرحلے میں فارغ التحصیل نہیں ہوتا اور علم و دانش کا رشتہ کہیں پر ختم ہونے میں نہیں آتا۔  
ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

**قَالَ لَهُ مُوسَىٰ هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَنْ تُعَلِّمَني مِمَّا عَلَّمْتَ رُشْدًا ﴿٦٦﴾**

حضرت موسیٰ نے اس عالم ربانی (حضرت خضرؑ) سے کہا کیا میں آپ کی پیروی کروں تاکہ جو کچھ آپ کو تعلیم دی جا چکی ہے اور رُشد و ہدایت کا موجب ہے اس سے مجھے بھی سکھائیں؟ (سورہ کہف ۶۶)

معلوم ہوتا ہے باوجودیکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اولوالعزم نبی تھے ”رب اشرح لی صدری“ خدواندا! (میرا سینہ کشادہ کر دے) (طہ ۵) اور ”ولما بلغ اشدہ و استوی اتیناہ حکمًا وعلما“ (جب وہ طاقتور اور کامل بن گئے تو ہم نے انہیں حکمت و دانش عطا کی۔ قصص ۱۲) کے مصداق ایک بلند پایہ علمی مقام کے حامل تھے پھر بھی انہیں حکم ملا کہ وہ خضر علیہ السلام کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کریں اور ان سے علم حاصل کریں۔

بہر حال یہ آیات معرفت کے امکان اور اس کے ضروری ہونے نیز علم و معرفت کے حصول کے لیے مسلسل تلاش اور کسی وقفہ کے بغیر سعی و کوشش کی روشن دلیل ہیں۔ [۱]

## ۱۵۔ انسان کی نجات کی گنجی معرفت ہے

ارشاد ہوتا ہے:

**قُلْ إِنَّمَا أَعْظَمُكُمْ بِوَأِحْدِيَةٍ ۚ أَنْ تَقُومُوا لِلَّهِ مَشْئِيًّا وَفِرَادِيًّا ثُمَّ تَتَفَكَّرُونَ ﴿٢٦﴾**

کہ دیجئے میں تمہیں صرف ایک چیز کی نصیحت کرتا ہوں وہ یہ کہ دو دو ہو کر یا ایک ایک ہو کر اجتماعی یا انفرادی صورت میں خدا کے لیے کھڑے ہو جاؤ پھر سوچ و بچار اور غور و فکر کرو۔ (سورہ سبأ ۲۶)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ باتیں ہٹ دھرم اور ضدی مزاج دشمنوں سے کہیں جو کفر و شرک اور ہر قسم کی اخلاقی برائیوں کا شکار تھے لہذا خداوند عالم نے ان کی اس قسم کے خطرناک گردابوں سے نجات کی گنجی غور و فکر بتائی ہے جو کہ معرفت کا ایک راستہ ہے۔  
یہی تو وجہ ہے کہ انسانی معاشروں میں ہر قسم کے انقلاب اور ہر قسم کی بنیادی تبدیلی کی اصل اور بڑھکروری اور ثقافتی انقلاب ہی میں

[۱] حضرت امیر فرماتے ہیں ”العلم میراث الانبیاء و المال میراث الفراعنہ“ علم انبیا کی میراث اور مال فرعونوں کی میراث ہے۔

(بحار الانوار جلد ۱ ص ۱۸۵)

ملتی ہے۔

اگر معرفت ممکن نہ ہوتی تو پھر غور و فکر کس لیے؟ خصوصاً جب اسے انما کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جو ”حصر“ کے لیے ہوتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نجات کی اصل کنجی صرف اور صرف یہی ہے۔

لیکن یہ بات ضروری ہے کہ یہ غور و فکر خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی صحیح معنوں میں ہو اور خدا کے لیے اٹھ کھڑا ہونے کے ساتھ ساتھ ہو اور پھر یہ بات سب سے اہم ہے کہ خدا کے لیے ہوا سی لیے تو فرماتا ہے کہ ”ان تقوا مولدہ“ یعنی ہر قسم کے تعصب ہٹ دھرمی اور نفسانی خواہشات سے بالاتر ہو کہ جن کی تفصیل انشاء اللہ معرفت کی رکاوٹوں کے باب میں آئے گی۔

اللہ کے نبی جناب یوسف نے بھی اسی چیز پر زور دیا ہے اور جب حکومت مصر کی مسند اقتدار پر متمکن ہوئے تو فرمایا:

رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمَلِكِ وَعَلَّمْتَنِي مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ ۖ فَاطِرَ  
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ اَنْتَ وَلِيٌّ فِى الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۗ تُوَفِّيهِ مُسْلِمًا وَّالْحَقِيْبِي

بِالصَّلٰحِيْنَ ﴿۱۰۱﴾

پروردگارا! تُو نے مجھے حکومت کا (بہت بڑا) حصہ دیا ہے مجھے تعبیر خواب کے علم سے آگاہ فرمایا ہے تو ہی آسمانوں اور زمین کا پید کرنے والا ہے تو ہی دنیا و آخرت میں میرا سرپرست ہے مجھے مسلمان بنا کر موت دے اور مجھے صالحین سے ملتی فرمادے۔ (سورہ یوسف ۱۰۱)

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ علم تعبیر خواب کا شعاران علوم میں ہوتا ہے جن کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے لیکن اس کے باوصف قرآن مجید میں حضرت یوسف کی داستان اس بات کی اچھی طرح نشاندہی کرتی ہے کہ اس عظیم الشان نبی کا یہی علم اس بات کا باعث ہوا کہ ایک تو وہ خود عزیز مصر کے قید خانے سے رہا ہو کہ مسند حکومت پر متمکن ہوئے اور دوسرے اس وسیع و عریض مملکت کو خطرناک قحط سالی سے نجات دلائی کیونکہ جب جناب یوسف قید میں تھے تو بادشاہ مصر نے ایک عجیب خواب دیکھا تھا کہ جس کی تعبیر بتانے سے سب معرعا جز آگئے تھے ایک قیدی جو حضرت یوسی علیہ السلام کی تعبیر خواب کی وجہ سے قید خانے سے رہائی پا کر شاہی دربار تک رسائی پا چکا تھا نے کہا میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جو اچھی طرح خوابوں کی تعبیر بتا سکتا ہے اور جب حضرت یوسف نے اس خواب کی تعبیر بتائی جو مملکت کے آئندہ سات سالوں کے اقتصاد سے متعلق تھا تو خود بھی قید سے رہا ہو گئے اور ان کی حکومت کے مقدمات فراہم ہو گئے اور ساتھ ہی آنے والے سالوں کی منصوبہ بندی کی جو قحط سے دو چار ہونے والے تھے۔

مندرجہ بالا آیت جو حضرت یوسف علیہ السلام کے حکومت پر فائز ہو جانے کے بعد ان کی تعبیر خواب کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے ممکن ہے کہ ان دونوں کے باہمی رابطے کی طرف اشارہ ہو۔

لیکن صورت حال خواہ کچھ بھی ہو اس آیت سے بخوبی یہ بات سمجھی جاتی ہے کہ نجات کی کنجی علم و معرفت میں ہے حتیٰ کہ بسا اوقات سادہ

سے سادہ اور معمولی قسم کا علم بھی کسی مملکت کی نجات کا سبب بن سکتا ہے۔ [۱]

## ۱۶۔ علم ہر صوت میں قابل فخر ہے

ارشاد ہوتا ہے

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا ۖ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي فَضَّلَنَا عَلَى كَثِيرٍ

مِمَّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۵﴾ وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ وَقَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ عَلِمْنَا

مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَأَوْتِينَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۗ إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِينُ ﴿۱۶﴾

ہم نے داؤد اور سلیمان کو دافر علم عطا فرمایا اور انہوں نے کہا حمد ہے اس خدا کی جس نے ہمیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر برتری عطا کی اور سلیمان داؤد کے وارث ہوئے اور کہا اے لوگو! ہمیں پرندوں کی گفتگو بھی سمجھائی گئی ہے اور ہمیں ہر چیز سے عطا کیا گیا ہے یہ واضح فضیلت ہے۔ (سورہ نمل ۱۵، ۱۶)

باوجودیکہ جناب داؤد اور حضرت سلیمان کی حکومت اور جاہ و حشمت کی مثال اور نظیر نہیں ملتی بلکہ جس طرح سورہ ص کی ۵۳ و ۵۴ آیت ”ہب لی ملکاً لا یذبحی لاحد من بعدی“ سے احتمالی طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مستقبل میں بھی دنیا میں اس طرح کی وسیع و عریض مملکت معرض وجود میں نہیں آئے گی خاص کر جبکہ داؤد و سلیمان علیہما السلام کی انسانوں کے علاوہ جنات اور حیوانات بلکہ ہوا جیسے طبعی امور پر بھی حکمرانی تھی لیکن جب خداوند عالم نے ان دونوں باپ بیٹے پر اپنی نعمتوں کا تذکرہ فرمایا ہے تو سب سے پہلے علم و معرفت جیسی نعمتوں کا ذکر کیا ہے اور انہوں نے بھی اسی بناء پر خدا کی حمد بجالائی ہے کہ خدا نے انہیں اپنے بہت سے بندوں پر فضیلت اور برتری عنایت فرمائی ہے۔ (شاید یہ اس لیے ہو کہ جو لوگ ان دونوں کے زمانے میں زیادہ علم کے مالک ہوں ان پر انہیں برتری حاصل ہو) نیز یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ حضرت سلیمان اس قدر عظیم جاہ و حشمت کے باوجود سب سے پہلے ایک غیر اہم علم یعنی علم منطق الطیر پر فخر کرتے نظر آتے ہیں بعد میں اپنی عظیم سلطنت اور دوسری نعمتوں پر۔

اس قسم کی لطیف تعبیریں ہر جگہ پر علم کے مقام و منزلت اور اس کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہیں اور بذات خود علم و معرفت کے امکان اور اس کے لازم ہونے کی واضح دلیل ہیں۔ [۲]

[۱] حضرت علی علیہ السلام کمیل سے فرماتے ہیں: ”یا کمیل ما من مرکة الا وانت محتاج ینہا الی معرفتہ“ اے کمیل! کوئی حرکت ایسی نہیں ہے جس میں تم معرفت کے محتاج نہ ہو۔ (تحف العقول ص ۱۱۹)

[۲] حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان ہے ”العلم کل حال سنی و منتهی کل منزلة رفیعة“ علم ہر قیمتی حالت کا نام ہے اور ہر بلند مرتبے کی انتہا ہے۔ (مجموع البیضا، جلد ۱، ص ۶۸)

## ۱۔ قیادت کی اولین شرط معرفت ہے

جب جناب یوسف علیہ السلام کو حکومت مصر کے اعلیٰ عہدے کی پیش کش ہوتی تو انہوں نے بادشاہ سے فرمایا:

اجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ ۗ إِنِّي حَفِيظٌ عَلَيْمُ ﴿۵۵﴾

مجھے اس سرزمین کے تمام خزینوں کا سرپرست بنا دیجئے کیونکہ میں ایک صاحب علم محافظ ہوں۔ (یوسف ۵۵)

نیز بنی اسرائیل کی داستان میں ہم پڑھتے ہیں کہ جب جالوت نامی ظالم بادشاہ نے انہیں در بدر کر دیا تھا تو انہوں نے اپنے زمانے کے نبی کی سرکردگی میں اس ظالم بادشاہ سے مقابلے کے لیے اپنی آمادگی کا اظہار کیا اور خدا کے نبی سے درخواست کی کہ وہ ان کی قیادت کریں اور کمان سنبھالیں تاکہ وہ ان کے تابع فرمان ہو کر ظالم جالوت سے جنگ کریں تو خدا کے نبی نے ان سے یوں کہا:

إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۗ قَالُوا أَنَّى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا  
وَمَنْ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِنَ الْمَالِ ۗ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ  
عَلَيْكُمْ ۗ وَآذَنَّاكَ فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۗ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ  
وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۴﴾

خداوند عالم نے طالوت کو تمہاری حکمرانی کے لیے بھیجا ہے تو انہوں نے کہا وہ ہم پر کیسے حکومت کر سکتے ہیں ہم ان سے زیادہ اہلیت رکھتے ہیں اور ان کے پاس فراوان دولت اور ثروت بھی نہیں ہے؟ پیغمبر نے کہا! خدا نے انہیں تمہارے لیے منتخب کر لیا ہے اور ان کے علم اور جسمانی طاقت کو وسعت بخشی ہے اور خدا جسے چاہے (اور لائق سمجھے) اسے اپنا ملک عطا کرتا ہے خدا کے احسانات وسیع ہے (اور افراد کی لیاقت کو) اچھی طرح جانتا ہے۔ (سورہ بقرہ ۲۴)

قابل توجہ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ خدا نے جس طالوت کو ایک مقتدر اور جابر و ظالم بادشاہ سے لڑائی کے لیے منتخب کیا وہ ایک دیہاتی انسان تھا جو ایک دریا کے ساحل گاؤں میں پیدا ہوا اور گمنام زندگی بسر کرتا تھا اور اپنے والد کے چوپائے چرایا کرتا تھا کھیتی باڑی اس کا پیشہ تھا۔ لیکن اس کے سینے میں معرفت بھر روشن دل تھا اور جسمانی لحاظ سے تو مندر اور طاقتور انسان تھا عمیق اور پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں مہارت رکھتا تھا معرفت اور شناخت اس کے دل میں جاگزین تھی اسی لیے جب اشموئیل نبی کی نگاہ اس پر پڑی تو بنی اسرائیل کی فرمانروائی کے لیے اسے منتخب کر لیا بنی اسرائیل کے سردار جو جو انتخاب اور انتصاب کا معیار فزونی مال و دولت اور ماں باپ یا قوم قبیلے کی شہرت جیسے موہوم امور سمجھتے تھے انہوں نے اللہ کے نبی اشموئیل پر اعتراضات شروع کر دیئے کہ بنی اسرائیل میں ہمارے جیسے ژ و تمند اور مشہور معروف افراد کے



ہوتے ہوئے طاقت اس منصب کی اہلیت نہیں رکھتے لیکن خدا کے نبی نے ان کی ایک نہ سنی اور صاف صاف کہہ دیا کہ یہ ایک خدائی انتخاب ہے تمہیں اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑے گا۔

یہ دونوں آیات اس امر کی بخوبی رضاحت کر رہی ہیں کہ علم و دانش اور معرفت و شناخت قیادت رہبری زمامداری اور سربراہی کے اہم ترین اور بنیادی عناصر ہیں اور معرفت کے بارے میں اب تک جو کچھ ہم بتا چکے ہیں اس کی تاکید ہیں۔<sup>[۱]</sup>

## ۱۸۔ علم ہی سے ایمان کے سوتے پھوٹتے ہیں

ارشاد ہوتا ہے:

وَتَرَى الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ الَّذِينَ الَّذِينَ أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ هُوَ الْحَقُّ ۖ وَيَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ﴿۱۸﴾

جو لوگ علم رکھتے ہیں جو کچھ تمہارے پروردگار سے تم پر نازل ہوا ہے اسے وہ حق اور خداوند عزیز و حمید کی راہ کا ہادی سمجھتے ہیں۔ (سورہ سبأ) اور فرمایا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهِ إِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ يَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ سُجَّدًا ﴿۱۹﴾  
وَيَقُولُونَ سُبْحَانَ رَبِّنَا إِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُولًا ﴿۲۰﴾

جن لوگوں کو اس سے پہلے علم و دانش عطا ہوئی جب بھی ان کے سامنے قرآن کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ سجدے کے بل گر جاتے ہیں اور کہتے ہیں پاک ہے ہمارا رب جو جس کے وعدے یقیناً انجام پاتے ہیں۔ (سورہ بنی اسرائیل ۱۰۷ تا ۱۰۸) نیز فرماتا ہے:

فَالْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوا آمَنَّا بِرَبِّ هَارُونَ وَمُوسَىٰ ﴿۲۱﴾

(جب جادوگروں نے موسیٰ کے معجزہ کو دیکھا اور جادو کی وجہ سے انہیں علم تھا انہوں نے سمجھ لیا کہ موسیٰ جادوگر نہیں ہیں) لہذا وہ سجدے میں گر گئے اور کہا ہم موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لے آئے۔ (طہ ۷۰)

[۱] حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "الملوك حكام على الناس و العماء حكام على الملك" بادشاہ لوگوں پر حاکم ہوتے ہیں اور علماء بادشاہوں پر حکمران ہوتے ہیں۔ (بحار الانوار جلد ۱ ص ۱۸۳)



اور فرمایا ہے:

لِيَعْلَمَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَيُؤْمِنُوا بِهِ فَتُخْبِتَ لَهُ قُلُوبُهُمْ ط

تاکہ وہ لوگ اچھی طرح جان لیں جنہیں علم دیا گیا ہے کہ یہ قرآن تمہارے خدا کی طرف سے حق ہے اور اس پر ایمان لے آئیں اور ان کے دل اس کے لیے جھک جائیں۔ (سورہ حج ۵۴)

فرماتا ہے:

وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ ۗ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ۝

راسخون فی العلم کہتے ہیں ہم خدا کی تمام آیات پر ایمان لے آئے ہیں سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے اور صرف صاحبانِ عقل ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ (آل عمران ۷)

یہ آیت علم و ایمان کا باہمی رابطہ اور ان کا ٹوٹا رشتہ واضح کر رہی ہے اور بتا رہی ہے کہ جن کا علم جتنا زیادہ ہوتا ہے ان کا ایمان اور خضوع و خشوع بھی اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔ [۱]

ان تمام آیات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ معرفت و آگاہی ایمان کے اہم سرچشموں سے ہیں اور ان [تجسس کے ایمان کی بنیاد رکھی جائے گی وہ نہایت ہی عمیق اور مستحکم ہوگا جیسا کہ عصرِ فرعون کے جادوگروں کی داستان میں ہم پڑھتے ہیں کہ جب فرعون نے دیکھ لیا کہ جادوگروں نے اپنے فنِ جادوگری کی وجہ سے یہ بات بخوبی سمجھ لی کہ موسیٰ نے جو کام کیا ہے وہ جادو نہیں معجزہ ہے اور وہ ان پر ایمان لے آئے ہیں تو اس نے ان جادوگروں کو زبردست دھمکی دی اور کہا میری اجازت سے پہلے تم اس پر ایمان کیوں لائے ہو؟ (گویا طاغوت یہ سمجھتے ہیں کہ لوگوں کا قلبی ایمان جو بوجھ اور فہم بھی سوچ ان ہی کی اجازت کے بغیر نہیں ہونے چاہئیں) لہذا اس نے کہا اب جب تم نے ایسا کر لیا ہے تو میں تمہارے ہاتھوں اور پاؤں کو اٹھائے سیدھے طریقے سے کاٹا ہوں اور تمہیں کھجور کی شاخوں پر سولی لٹکاتا ہوں مگر وہ اس حد تک ثابت قدم رہے کہ اسے دو ٹوک جواب دے دیا تم جو چاہو کرو اس خدا کی قسم جس نے ہمیں پیدا کیا ہے ہم ان روشن دلائل پر تمہیں کبھی مقدم نہیں کریں گے جو ہم دیکھ چکے ہیں۔ (طہ ۷۲)

[۱] جو کچھ اوپر بیان ہوا وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو اس آیت سے معلوم ہوتی ہے خواہ ”والراسخون فی العلم“ کا معنون لفظ ”اللہ“ کو جانیں، خواہ بعد کے جملہ کی مبتداء سمجھیں، کیونکہ ”يقولون“ میں موجود ضمیر ”والراسخون فی العلم“ کی طرف لوٹ رہی ہے اور علم اور عمل کے باہمی رابطے کو بیان کر رہی ہے۔

آخر کار فرعون نے اپنی دھمکی کو سچ کر دکھایا اور انہیں ساحلِ شہادت سے ہمکنار کر دیا اور وہ بھی اس عاشقانہ راہ پر شاکت قدم رہے اور کشادہ قلبی کے ساتھ جامِ شہادت نوش کیا چنانچہ عظیم مفسر طبری ان کے بارے میں کہتے ہیں:

”کانوا اول النهار کفاراً سحرۃ و آخر النهار شہداً بررة“

وہ (جادوگر) دن کے اول حصہ میں کافر تھے اور آخری حصے میں نیک شہداء۔

تو اس طرح سے علم نہ صرف ایمان آفرین ہے بلکہ استقامت اور استقلال و جو انمردی بھی کسی کا ثمرہ ہے۔ [۱] و [۲]

## ۱۹۔ علم سے تقویٰ اور خوفِ خدا کے سوتے پھوٹتے ہیں

ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ ط

خدا کے بندوں میں سے صرف علماء ہی اس سے ڈرتے ہیں۔ (فاطر ۲۸)

راغب کے بقول خشیت ایسا خوف اور ڈر ہوتا ہے جس میں تعظیم پائی جاتی ہے اور عام طور پر یہ علم ہی سے حاصل ہوتا ہے۔

اور ارشاد ہوتا ہے:

وَأَتَّقُونَ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ

اے صاحبانِ عقل و فکر پر ہیزگاری اختیار کرو۔ (سورہ بقرہ ۱۹)

اگر علم اور تقویٰ کے رابطہ نہ ہوتا تو خداوند متعال اس حکم میں ”اولو الالباب“ کو مخاطب نہ کرتا یہ خطاب ہی اس مبارک رابطہ کی تین

دلیل ہے۔

اور فرماتا ہے:

[۱] بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ”علم“ اور ”ایمان“ ایک چیز ہیں۔ یعنی اگر ہمارا یقین ہے کہ اس کائنات میں خدائے عالم وقادر موجود ہے تو ہمارا یہ علم اور یقین ہمارا ایمان ہوگا۔ لیکن محققین کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ ممکن ہے کہ ایمان علم کا ثمرہ ہو (البتہ ہمیشہ کے لیے نہیں اور نہ ہی ہر جگہ) لیکن بہر حال عین علم نہیں ہوتا اور ایمان، دل سے قبول کرنے کا نام ہے، کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی چیز کو جانتا تو ہے لیکن اسے دل سے قبول نہیں کرتا، جیسا کہ قرآن مجید کچھ لوگوں کے بارے میں کہتا ہے ”و جحدوا بہا واستیقنتہا انفسہم ظلماً و علواً“ یعنی ان لوگوں (فرعونوں) نے ظلم اور سرکشی کی بنا پر انکار کر دیا حالانکہ دل سے انہیں یقین تھا۔ (سورہ نمل ۱۳)

[۲] پیغمبر اسلام فرماتے ہیں ”العلم حیاة الاسلام و عماد الایمان“ علم اسلام کی حیات اور ایمان کا ستون ہے۔ (ملاحظہ ہو

کنز العمال، جلد ۱۰، ص ۱۸۱)

**فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۱۰۰﴾**

اے صاحبانِ عقل پر ہیزگاری اختیار کرو تا کہ کامیاب ہو جاؤ۔ (سورہ مائدہ ۱۰۰)

اور ارشاد فرماتا ہے:

**كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿۱۸۷﴾**

خداوند عالم اپنی اس قسم کی آیات کو لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے تاکہ وہ پرہیزگار بن جائیں۔ (سورہ بقرہ ۱۸۷)

اس سے یہ بات بخوبی معلوم ہو جاتی ہے کہ آیات کا بیان کرنا مقدمہ ہوتا ہے علم کا اور علم مقدمہ ہوتا ہے تقویٰ کا۔

یقیناً جہاں پر علم ہوتا ہے ضروری نہیں کہ وہاں پر تقویٰ بھی ہو کیونکہ عالم بے عمل بھی مل جاتے ہیں لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ علم تقویٰ کا مقدمہ اور پیش خیمہ ضرور ہوتا ہے اور اس کا اصل سرچشمہ شمار کیا جاتا ہے علم عام طور پر تقویٰ کو اپنے ہمراہ لاتا ہے جو علم ایمان کا سرچشمہ ہوتا ہے وہ تقویٰ کا بھی سرچشمہ ہوتا ہے جبکہ اس کے برعکس جہالت عام طور پر بے تقوائی کا عامل ہوتی ہے۔ [۱]

**۲۰۔ علم زہد کا منبع ہوتا ہے**

ارشاد ہوتا ہے:

**وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَيَلَكُمْ ثَوَابُ اللَّهِ خَيْرٌ لِمَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۗ**

**وَلَا يُلْقِيهَا إِلَّا الصَّابِرُونَ ﴿۸۰﴾**

جن لوگوں کو علم عطا کیا گیا تھا انہوں نے کہا تم پر افسوس ہے خداوند عالم کا ثواب ان لوگوں کے لیے جو ایمان لے

آئے اور نیک اعمال انجام دیئے بہتر ہے لیکن صابر لوگوں کے علاوہ کسی اور کو نہیں ملے گا۔ (سورہ قصص ۸۰)

یہ آیت سورہ قصص کے آخر اور قارون کی داستان کے سلسلے میں آئی ہے جو علمائے بنی اسرائیل کی لوگوں کو نصیحت کے طور پر ہے ان

لوگوں نے جب متکبر قارون کی دولت اور ثروت کی نمائش کو دیکھا تو آرزو کرنے لگے اے کاش کہ وہ قارون کی جگہ ہوتے!

جب بنی اسرائیل کے سلجھے ہوئے علماء نے لوگوں کی یہ صورت حال دیکھی کہ یہ لوگ تو دنیا پرستی کے سخت دلدادہ ہیں تو علماء نے انہیں

سمجھنے کی کوشش کی اور با آواز بلند کہا افسوس ہے تم پر اے دنیا پرستو! تم قارون کے زرق و برق سے دھوکے کھا رہے ہو؟ اگر تمہارے پاس ایمان اور

عمل صالح ہو تو خداوند عالم کی جزا دونوں جہانوں میں ان سب چیزوں سے بہتر اور برتر ہے لیکن اس جزا تک پہنچنے کے لیے صبر و شکیبائی اور زور

[۱] امیر المؤمنین علیؑ فرماتے ہیں: «اعظم الناس علماً اشدھم خوفاً من الله» جن لوگوں کا علم زیادہ ہوتا ہے ان کا خدا سے خوف

بھی سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ (غرر الحکم، حکمت ۳۲۶)

وزر کے آگے سر تسلیم خم نہ کرنا ضروری ہے!

”اتوا العلم“ کا جملہ اس بات کی بخوبی وضاحت کر رہا ہے کہ زہد اور علم کے درمیان ایک مضبوط رابطہ ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جو لوگ دنیا کی ناپائیداری اور آخرت کے ثبات اور خدا کی جزاء کی عظمت کے مقابلے میں مادی سرمائے کی حقارت سے آگاہ ہوتے ہیں اس مادی دنیا کے زرق و برق کے فریب میں نہیں آتے اور کبھی قارون کی دولت کی آرزو نہیں کرتے۔ [۱]

## ۲۱۔ علم مادی ترقی کا سرچشمہ ہوتا ہے

قرآن میں ہے:

إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِنْدِي ۗ ط

(قارون) نے کہا یہ ثروت مجھے اس علم کی بدولت ملی ہے جو میرے پاس ہے۔ (نقص ۸۷)

بنی اسرائیل کے مغرور متکبر دولت مند قارون نے یہ بات اس وقت کہی جب موسیٰ کی قوم کے علمائے اُسے نصیحت کی اپنی اس دولت و ثروت کو معاشرے کی فلاح و بہبود پر خرچ کرو اور دنیا میں اپنے حصے کو فراموش نہ کرو خدا نے جس طرح تم پر احسان کیا ہے تم بھی لوگوں کے ساتھ اسی طرح بھلائی کرو اور اس دولت کو زمین میں فساد کا ذریعہ نہ بناؤ۔ (نقص ۷۷)

اس نے جواب دیا: میں نے یہ دولت اپنی علمی طاقت کی بدولت جمع کی ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن مجید نے اس کے دعوے کی نفی نہیں کی بلکہ اس کے ساتھ ہی یہ کہتا ہے کہ:

أَوَلَمْ يَعْلَم أَنَّ اللَّهَ قَدْ أَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهِ مِنَ الْقُرُونِ مَنْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً

وَآكَثَرُ جَمْعًا ۗ ط

کیا وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ خداوند عالم نے اس سے پہلے ایسے لوگوں کو ہلاک کر دیا جو طاقت میں بھی اس سے زیادہ تھے اور مال و دولت میں بھی۔ (نقص ۷۸)

یہ ضمنی تائید اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ قارون نے اپنے علم اور اپنی دانش کی دولت اس قدر عظیم دولت و ثروت کو اکٹھا کیا تھا (یہ علم خواہ کیمیا کا علم تھا جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے خواہ تجارتی اصولوں اور کسب و کار کے فنون کا علم تھا)۔

لیکن یہ بات یقینی ہے کہ قارون کا یہ دعویٰ اس بات سے مانع نہیں تھا کہ وہ اپنی دولت لوگوں کی فلاح و بہبود پر خرچ کرتا کیونکہ کوئی

[۱] حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: خداوند عالم نے جناب موسیٰ علیہ السلام سے جو باتیں کی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی:

”ان عبادی الصالحین نہدوا فیہا بقدر علمہم بی“ میرے نیک بندے اس دنیا میں اسی حد تک زاہد ہوتے ہیں جتنا ان کو میرے بارے میں علم ہوتا ہے۔ (بحار الانوار جلد ۱۸ ص ۲۳۹)

شخص خواہ کتنا ہی عالم ہو یا استعداد ہو پھر بھی وہ اکیلے اس قدر عظیم دولت اکٹھی نہیں کر سکتا بلکہ اسے دوسرے لوگوں کی طاقت سے استفادہ کرنا پڑتا ہے اسی لیے وہ معاشرے اور عوام الناس کے تعاون کا مرہون منت ہوتا ہے۔

بہر صورت اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ مادی علم اور مادی ترقی کے درمیان رابطہ ضرور ہوتا ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے دورِ حاضر میں بخوبی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کہ بہت سی قومیں علم و صنعت کی بدولت مادی تمدن میں دوسری اقوام سے آگے جا چکی ہیں۔<sup>[۱]</sup>

## ۲۲۔ علم، طاقت کا سرچشمہ ہوتا ہے

ارشادِ قدرت ہے:

قَالَ الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتَابِ إِنَّا آتَيْنَكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ يَرْتَدَّ إِلَيْكَ

طَرْفَكَ ۗ فَلَمَّا رَأَاهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهُ قَالَ هَذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي ۗ

جس کے پاس کتاب کا جو کچھ علم تھا اس نے کہا میں اس (ملکہ سبا بقیس) کا تخت آپ (سلیمان) کے پلک جھپکنے سے پہلے آپ کے پاس لے آؤں گا اور جب اس نے اسے اپنے پاس موجود پایا تو کہا یہ میرے پروردگار کے فضل سے ہے۔ (سورہ نمل ۴۰)

یہ آیت حضرت سلیمان اور ملکہ سبا کی داستان سے متعلق ہے جب جناب سلیمان نے چاہا کہ ملکہ سبا کا تخت اپنے پاس منگوائیں تو سب سے پہلے جنوں کے ایک طاقتور سردار نے پیش کش کی کہ آپ کے دربار کے برخاست ہونے سے پہلے اسے حاضر کر دوں گا لیکن (جناب سلیمان کے وزیر آصف بن برخیا) نے جس کے پاس کتاب کا کچھ علم تھا اور اسی کے بل بوتے پر وہ خارق العادہ کام کیا کرتے تھے کہا: میں وہ تخت آپ کے قلم جھپکنے سے پہلے آپ کے پاس حاضر کر دوں گا اور اس نے ایسا کر بھی دکھایا اور حضرت سلیمان نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ان کے اس طرح کے یار و مددگار بھی ہیں۔ اگرچہ یہ آیت خاص موقع کے لیے ہے لیکن علم اور قدرت کے باہمی رابطے کو بخوبی واضح کر رہی ہے اور زیادہ سے زیادہ حصولِ علم کی ترغیب اور تشویق دلا رہی ہے۔<sup>[۲]</sup>

[۱] امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "لا غنی اخصب من العقل ولا فترا حط من الحبق" عقل سے بڑھ کر کوئی تو نگری نہیں اور حماقت سے بڑھ کر کوئی ناداری نہیں۔ (اصول کافی، جلد ۱، ص ۲۹)

[۲] حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "العالم بزمانہ لا یمہجم علیہ اللوابس" جو شخص اپنے زمانہ سے باخبر ہوتا ہے اس پر پیچیدہ امور حملہ آور نہیں ہوتے۔ (کافی، جلد ۱، ص ۲۷)

## ۲۳۔ علم تزکیہ نفس کا سرچشمہ ہوتا ہے

ارشادِ قدرت ہے:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ  
وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۗ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۱۲۹﴾

پروردگارا! ان (میرے خاندان) میں ان ہی سے ایک رسول بھیج تاکہ وہ ان پر تیری آیات کی تلاوت کرے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ اور تربیت کرے کیونکہ تو طاقتور اور صاحب حکمت ہے۔ (بقرہ ۱۲۹)

خانہ کعبہ کی تعمیر کے بعد حضرت ابراہیم اور حضرت اسمعیل علیہما السلام کی دعاؤں میں سے ایک دعا ہے جو علم و حکمت اور تزکیہ و تربیت کے رابطہ کو آشکار کر رہی ہے یہاں پر تزکیہ کو علم پر مقدم کیا گیا ہے۔ لیکن قرآن مجید کی دو اور آیات میں تزکیہ کو علم پر مقدم بیان کیا گیا ہے اور وہ آیات حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پروگراموں سے متعلق ہیں ایک تو سورہ آل عمران میں ہے اور دوسری سورہ جمعہ میں چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا  
عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَإِنْ كَانُوا مِن قَبْلُ  
لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿۱۶۳﴾

خداوند عالم نے مومنین پر احسان کیا ہے (اور انہیں عظیم نعمت عطا کی ہے) جبکہ ان کے درمیان انہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا تاکہ وہ ان پر اس کی آیات پڑھے اور ان کا تزکیہ اور تربیت کرے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دے ہر چند کہ وہ اس سے پہلے واضح گمراہی میں تھے۔ (آل عمران ۱۶۳)

اسی سے ملتی جلتی ایک آیت سورہ جمعہ میں بھی ہے۔ (سورہ جمعہ ۲)

تعبیر کا یہ فرق کہ کبھی تو تعلیم کو تربیت پر مقدم بیان کیا گیا ہے اور کبھی تربیت کو تعلیم پر بظاہر اس لیے ہے کہ ان کا آپس میں گہرا تعلق ہے اور وہ ایک دوسرے کے مقابلے کا اثر رکھتے ہیں علم تربیت اور اخلاقی نشوونما کا سرچشمہ ہے اور رشد و تربیت بعض مراحل میں حصول علم کا سرچشمہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

اسی لیے وہ ایک مرحلہ پر پہنچ کر ایک دوسرے کے لیے راہ ہموار کرتے ہیں اور یہی معنی ہے ان کے باہمی مقابلے کے اثر کا انشاء اللہ

اس موضوع پر شناخت کی تفصیل کے موقع پر مفصل روشنی ڈالی جائے گی۔ [۱]

## ۲۴۔ علم صبر و شکیبائی کا سرچشمہ ہے

ارشاد ہوتا ہے:

وَ كَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا ۝۸

جس چیز کے متعلق تم جانتے نہیں ہو اس پر تم کیسے صبر کر سکو گے؟ (سورہ کہف ۶۸)

یہ الفاظ ایک مرد خدا (خضر علیہ السلام) کے ہیں جو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہے تھے جبکہ وہ حضرت خضر علیہ السلام کے پاس پہنچے تھے اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ انہیں اپنے علوم سے بھی سکھائیں تو جناب خضر نے فرمایا تم میرے ساتھ رہ کر صبر نہیں کر سکو گے کیونکہ تم میرے کاموں کے اسرار و رموز سے واقف نہیں ہو اور تمہاری یہ بے علمی تمہاری بے صبری کا ذریعہ بنے گی۔

اس سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ علم صبر کا سرچشمہ اور لاعلمی بے صبری کا سبب بنتی ہے۔

البتہ صبر و شکیبائی بھی اپنی حد تک علم و آگاہی کا سرچشمہ بنتی ہیں جتنا صبر زیادہ ہوگا اتنا ہی علم زیادہ ہوگا اس طرح اس ان دونوں کا آپس میں گہرا رشتہ ہے اور ان میں مقابلے کی تاثیر ہوتی ہے جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ

اس میں ہر صبر اور شکر کرنے والے کے لیے آیات اور نشانیاں ہیں۔ (سورہ ابراہیم ۵، سورہ لقمان ۳۱، سورہ

سبا ۱۹، سورہ شوریٰ ۳۳)

واضح سی بات ہے کہ علم و معرفت کے راستے نہایت ہی پیچیدہ اور نشیب و فراز پر مشتمل ہوتے ہیں اور صبر و استقامت پامردی اور حوصلہ کے بغیر کوئی شخص وہاں تک نہیں پہنچ سکتا عظیم دانشور مشہور موجد اور دریافت کرنے والے معروف افراد صبر و شکیبائی کے زیر سایہ ہی اپنی منزل مقصود تک پہنچے ہیں۔

## ۲۵۔ علم و معرفت خیر کثیر ہیں

ارشاد ہوتا ہے:

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ط

[۱] علم کے بارے میں حضرت امیر فرماتے ہیں: "ومن ثمراته التقوى واجتناب الهوى وهجاجة الذنوب" تقویٰ خواہشات نفسانی سے دوری اور گناہوں سے اجتناب، علم کے ثمرات میں سے ہے۔ (بحار الانوار جلد ۷۸ ص ۶)



خداوند عالم جسے چاہے (اور لائق سمجھے) علم و حکمت عطا فرماتا ہے اور جسے حکمت عطا کر دی گئی اسے فراوانی کے ساتھ خیر عطا ہوئی۔ (بقرہ ۲۶۹)

حکمت حکم (بروزن خشم) کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں اصلاح کی غرض سے کسی کو روکنا اسی لیے اونٹ کی مہار کو..... حکمہ (بروزن شجرہ) کہتے ہیں اور چونکہ علم انسان کو غلط کاموں سے روکتا ہے لہذا اسے حکمت کہتے ہیں جیسا کہ عقل اصل میں رکنے اور روکنے کو کہتے ہیں اسی لیے جو رسی اونٹ کے پاؤں میں باندھی جاتی ہے تاکہ وہ اسے چلنے سے روکے رکھے عقلا کہلاتی ہے اور خرد کو اسی لیے عقل کہتے ہیں کہ وہ انسان کو غلط کاموں سے روکتی ہے۔

قرآن مجید نے علم و حکمت کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے اس سے زیادہ اور کئی تعبیر مناسب نہیں ہو سکتی کیونکہ خدا نے اسے خیر کثیر کہا ہے یہ ایک ایسی تعبیر ہے جو خدا کی تمام نعمتوں کو شامل ہے خواہ وہ نعمتیں مادی ہوں یا معنوی۔

بچپن سے عنوانات کے تحت اب تک جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہوتی ہے کہ قرآن مجید مختلف عبارتوں اور لطیف بیانات کے ذریعہ انسان کو علم و معرفت کی طرف متوجہ کرتا ہے اور اس کے حصول کی تشویق و ترغیب دلاتا ہے اور علم و آگاہی کو خداوند متعال کا بہت بڑا عطیہ بہت عظیم اعزاز اور اہم ترین نعمت شمار کرتا ہے۔ دلالت التزامی کی رو سے یہ تصریحات اور کنائے اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ شناخت اور معرفت کی راہیں سب کے لیے کھلی ہوئی ہیں اور اس سے بڑھ کر کوئی چیز مفید بھی نہیں ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کی ہمیں تلاش ہے۔

﴿۱﴾

اب ہم چند اور عنوانات کے بارے میں گفتگو کریں گے جن کا محور جہالت ہے تاکہ جہالت کے منفی اور مہلک آثار کو پیش نظر رکھ کر ہم اپنے لیے علم و معرفت کے مثبت اور زندگی بخش آثار کی راہیں کھول سکیں۔

## ۲۶۔ جہنمی لوگ جاہل ہیں

ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۗ لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ  
بِهَا ۖ وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ أَذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا ۗ أُولَٰئِكَ  
كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۗ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ﴿۱۵﴾

ہم نے بہت سے جن و انس کو جہنم کے لیے پیدا کیا ہے ان کے دل (عقل) ہیں جن سے سوچتے نہیں سمجھتے نہیں آنکھیں ہیں دیکھتے نہیں اور کان ہیں سنتے نہیں وہ چوپایوں کی مانند بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں یہ وہی غافل

﴿۱﴾ حضرت علیؑ فرماتے ہیں: "لا کنز نفع من العلم" علم سے بڑھ کر کوئی خزانہ سود مند نہیں۔ (بخاری الانوار، جلد ۱، ص ۱۸۳)



## لوگ ہی تو ہیں۔ (سورہ اعراف ۱۷۹)

’ذراً‘، ’ذراً‘ (برزن زرع) کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے تخلیق ایجاد اور آفرینش لیکن جیسا کہ کتاب مقابیس اللغۃ سے ظاہر ہوتا ہے اس کا اصلی معنی بیج ڈالنا ہے شاید راغب نے مفردات میں اسی بنا پر اس کا معنی اظہار اور آشکار کرنا بتایا ہے اور التحقیق فی کلمات القرآن الکریم جیسی کتابوں میں اس کا معنی پھیلا نا بتایا گیا ہے۔

زیر بحث آیت میں اگر تخلیق و آفرینش مراد ہے تو اس کے معنی یوں ہونگے کہ اس قسم کے لوگ جو دل آنکھ اور کان جیسے معرفت و شناخت کے خداداد اسباب و وسائل سے کام نہیں لیتے ان کا انجام سوائے دوزخ کے اور کچھ نہیں گویا وہ اسی کے لیے خلق کیے گئے ہیں اگر پھیلنے کے معنی ہے تو بھی یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس قسم کے لوگ وسیع صورت میں جہنم میں پھیل جائیں گے۔ معنی خواہ کچھ بھی ہوں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جہالت کا انجام اور شناخت کے ذرائع و وسائل سے کام نہ لینے کا نتیجہ آتش جہنم کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے

وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ ﴿۱۰﴾ فَأَعْتَرَفُوا

بِذُنُوبِهِمْ ۗ فَسَحَقًا لِأَصْحَابِ السَّعِيرِ ﴿۱۱﴾

وہ کہیں گے کہ اگر ہمارے پاس سننے والے کان ہوتے یا ہم عقل سے کام لیتے تو جہنمیوں میں سے میں نہ ہوتے وہ اب اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہے ہیں پس رحمتِ خدا سے دوری ہے جہنمیوں کے لیے۔ (سورہ ملک ۱۰، ۱۱)

جی ہاں! ان کا بہت بڑا گناہ یہی ہے کہ انہوں نے اپنی عقل سے کام نہیں لیا اور حق بات پر کان نہیں دھرا اپنے اوپر علم و دانش کے دروازے بند کر دیئے اور جہنم کے دروازے کھول دیئے۔

اس دوسری آیت کا انداز اس بات کی دلیل ہے کہ جہنمیوں نے یہ راستہ اپنی مرضی اور اختیار سے اپنایا ہے کیونکہ آیت میں گناہوں کی نسبت جہنمیوں کی طرف دی گئی ہے اور وہ اعتراف کرتے نظر آتے ہیں کہ اگر انہوں نے اپنی عقلوں سے کام لیا ہوتا تو ان کا ٹھکانہ جہنم نہ ہوتا۔ ان کا یہ اعتراف ندامت اور پشیمانی کی حکایت کر رہا ہے اور یہی چیز ان کے اختیار کی دلیل ہے لہذا اگر فخر الدین رازی جیسے بعض لوگوں نے پہلی آیت کو جبر کی دلیل سمجھا ہے تو یہ دوسری آیت اس کی تفسیر واقع ہو سکتی ہے کیونکہ ”القرآن یفسر بعضہ بعضاً۔“

بہر حال قرآنی نقطہ نظر سے دوزخ اور جہالت کے درمیان رابطہ ایک مسلم چیز ہے اور آئندہ کی مباحث میں اس کو مزید واضح

کریں گے۔ [۱]

## ۲۷۔ جہالت انسان کی پستی کا سبب ہے

ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ﴿۲۴﴾

تمام چلنے والوں میں سے اللہ کے نزدیک بدترین وہ بہرے اور گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

(سورہ انفال ۲۲)

یہ آیت تو صریحی طور پر اور اس سے پہلی آیت اشاروں کنایوں میں اس بات کو بیان کر رہی ہے کہ جب کوئی شخص قدرت کے عطا کردہ شناخت و معرفت کے ذرائع اور اسباب سے استفادہ نہیں کرتا وہ پستی کی ایسی گھاٹی میں جا گرتا ہے کہ روئے زمین پر چلنے والے ہر ذی روح سے بھی بدتر ہو جاتا ہے آخر کیوں نہ ہو؟ جبکہ وہ اعزاز و افتخار کی بلند بالا چوٹی اعلیٰ عملین اور قرب حق کے پڑوس تک پرواز کر کے ایسے مقام تک پہنچ سکتا تھا جہاں خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ وہ ان سب امکانات کو ٹھوکر مار کر ایسی جگہ جا گرتا ہے جسے اسفل السفلین کہا جاتا ہے اور جہاں سے اس کا نکلنا محال ہو جاتا ہے۔

اور پھر یہ بھی ہے کہ جب انسان خیر و ہدایت کی راہوں پر چلنا چھوڑ دے تو خدا کی عظیم نعمتوں اور اس کی خداداد صلاحیتوں کو شر (اور برائی) کے راستوں میں استعمال کرنا شروع کر دیتا ہے ہولناک جرائم کا ارتکاب کرتا ہے اور ایسے وحشت ناک اوزار و اسباب ایجاد کرتا ہے کہ کوئی خطرناک درندہ بھی اس کی گرد پاؤں نہیں پہنچ سکتا جیسا کہ دور حاضر میں ہم اس قسم کے نمونے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ خدا اور خلق خدا سے بے خبر لوگ کیا کیا گل کھلا رہے ہیں؟ [۲]

## ۲۸۔ جہالت نابینائی ہے

[۱] پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ہے کہ خداوند عالم نے میری طرف یوں وحی فرمائی ہے ”انہ من مسلک مسلکاً یطلب فیہ العلم سہلت لہ طریقاً الی الجنة“ جو شخص علم و دانش کے حصول کے لئے راستے پر قدم رکھے تو میں اس کے لیے بہشت کی راہیں آسان کر دیتا ہوں۔

(بخاری الانوار جلد ۱ ص ۱۷۳)

[۲] حضرت امیر فرماتے ہیں: ”الجهل مطیة شمس من رکبها زل و من صحبها ضل“ جہالت ایک ایسی سرکش سواری ہے کہ جو اس پر سوار ہوتا ہے وہ زمین پر آگرتا ہے اور جو اس کے ساتھ چلتا ہے گمراہ ہو جاتا ہے۔ (غرر الحکم، جلد ۱، ص ۸۵)

ارشاد ہوتا ہے:

أَفَمَنْ يَعْلَمُ أَمَّا أَنْزَلَ إِلَيْكَ مِنَ رَبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ أَعْمَى ط اِمَّا يَتَذَكَّرُ  
أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿١٩﴾

آیا وہ شخص جو یہ جانتا ہے کہ جو کچھ آپ پر نازل ہوا ہے وہ حق ہے اس شخص کی مانند ہے جو نابینا ہے؟ یہ تو صرف صاحبانِ عقل ہی سمجھتے ہیں۔ (سورہ رعد ۱۹)

یہاں پر ایک طرف تو صاحبانِ علم و آگاہی کا ذکر ہے اور دوسری طرف اندھے اور نابیناؤں کا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہالت اور نابینائی میں کوئی فرق نہیں اور یہی چیز قرآن مجید کے ایک اور مقام پر دوسرے لفظوں میں ذکر ہوئی ہے:

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَى وَالْبَصِيرُ ﴿١٩﴾ وَلَا الظُّلُمُتُ وَلَا النُّورُ ﴿٢٠﴾ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا  
الْحُرُورُ ﴿٢١﴾ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ ط

اندھا اور آنکھوں والا ہرگز برابر نہیں ہیں اور نہ تاریکی اور روشنی اور نہ ہی سکون عطا کرنے والا سایہ جھلسا دینے والی گرم ہوا کے برابر ہوتے ہیں اور (جیسا کہ) مُردے اور زندے برابر نہیں ہو سکتے۔ (سورہ فاطر ۱۹ تا ۲۲) ﴿۱۹﴾

## ۲۹۔ جہالت کی زندگی ارذل العمر ہے

ارشاد ہوتا ہے:

وَمِنْكُمْ مَّنْ يُرَدِّدُ إِلَىٰ أَرْدَلِ الْعُمْرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا ط

اور بعض لوگ اس قدر زندہ رہتے ہیں کہ زندگی کے بدترین مرحلے اور بڑھاپے تک جا پہنچتے ہیں یہاں تک کہ انہیں اپنے علم سے کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ (سورہ حج ۵)

یہی چیز تھوڑے سے فرق کے ساتھ سورہ نحل کی آیت ۸۰ میں بھی مذکور ہے۔

”ارذل“، ”رذل“ کے مادہ سے ہے اور جیسا کہ مقام میں اللغۃ صحاح اللغۃ اور مفردات وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے اس کے معنی پست چیز ہیں یا بالفاظِ دیگر ایسی چیز جو قابلِ اعتنا نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کی کوئی قدر و قیمت ہوئی ہے۔ اور ”ازلا العمر“ سے مراد انسانی زندگی کے نہایت ہی بے قدر و قیمت ایام ہیں قرآن مجید نے انتہائی بڑھاپے کے ایام کو ارذل العمر میں شمار کیا ہے جن میں عام طور پر انسان فراموشی اور نسیان کا

﴿۱﴾ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ”من لم یصدبر علی ذل التعلم ساعة بقی فی ذل الجہل ابدًا“ جو شخص تحصیل علم کے لیے ایک گھنٹہ ذلت کو برداشت نہیں کر سکتا وہ جہالت کی ذلت میں ہمیشہ کے لیے باقی رہتا ہے۔ (بخاری الانوار، جلد ۱، ص ۱۷۷)

مریض بن جاتا ہے اور اپنے سابقہ علوم کو فراموش کر دیتا ہے اس لحاظ سے انسانی زندگی کے بہترین ایام اور بہترین گھڑیاں اس کے علم و آگاہی اور شناخت و معرفت کے ایام اور گھڑیاں ہوتی ہیں۔<sup>[۱]</sup>

### ۳۰۔ جہالت کفر کا سرچشمہ ہے

ارشاد ہوتا ہے:

وَجُوزْنَا بِبَنِي إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ فَأَتَوْا عَلَى قَوْمٍ يَعْكِفُونَ عَلَىٰ أَصْنَامٍ لَهُمْ ۗ

قَالُوا يَا مُوسَىٰ اجْعَلْ لَنَا إِلَهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ ۗ قَالَ إِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ ﴿۳۰﴾

ہم نے بنی اسرائیل کو (صحیح سالم) دریا سے پار کر دیا اور وہ اپنے راستے میں ایسی قوم کے پاس پہنچے جو اپنے بتوں کے گرد اکٹھا ہو کر ان کی خضوع و خشوع کے ساتھ عبادت کر رہی تھی ان (بنی اسرائیل) لوگوں نے موسیٰ سے کہا تو بھی ہمارے لیے ایسا معبود بنا جیسے ان کے معبود ہیں (موسیٰ نے) کہا تم جاہل لوگ ہو۔ (سورہ اعراف ۱۳۸)

تعب تو اس بات پر ہوتا ہے کہ جو لوگ فرعونوں کی غرقابی اور نیل کی موجوں سے اپنی نجات کے معجزات کو اپنی آنکھوں سے تازہ دیکھ چکے تھے اور عظمت الہی کو چشم خود ملاحظہ کر چکے تھے وہی موسیٰ کو بت سازی اور بت پرستی کی پیش کش کر رہے ہیں۔

لیکن موسیٰ نے انہیں جواب دیا کہ یہ تمہاری جہالت اور نادانی ہی ہے جو تمہیں بت پرستی کی دعوت دے رہی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ہمیشہ اور ہر دور میں جہالت ہی بت پرستی کا منبع رہی ہے وگرنہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ انسان اپنی ہی مصنوعات کی پرستش کرے اور لکڑی یا دھات کے بے جان ٹکڑے جیسی چیزوں سے اپنی عظیم مشکلات حل کرنے کی درخواست کرے؟ بت پرستی کی تاریخ بھی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ برائی خرافات اور موہومات کے زیر سایہ پروان چڑھی ہے اور جوں جوں اقوام و ملل کے علم و دانش نے ترقی کی ہے بت پرستی اور شرک نے اسی قدر عقب نشینی کی ہے اور انوار توحید کو وسعت ملتی رہی ہے۔

جب قوم عاد نے اللہ کے عظیم پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام سے بت پرستی کے اصرار پر مبنی عذاب الہی کا تقاضا کیا تو انہوں نے بھی ان لوگوں سے یہی بات کہی:

إِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللَّهِ ۗ وَأُبَلِّغُكُمْ مَّا أُرْسِلْتُ بِهِ وَلَكِنِّي أَرَاكُمْ قَوْمًا

تَجْهَلُونَ ﴿۳۱﴾

[۱] حضرت علیؑ فرماتے ہیں: «الجهل في الانسان اضر من الالكة في الابدان» کوڑھ انسان کے بدن کے لیے اتنا مضر ہے جتنی جہالت اس کے لیے نقصان دہ ہے۔ (غرر الحکم)

علم تو بس خدا ہی کو ہے (وہی جانتا ہے کہ کب اور کن حالات میں مشرکوں اور گناہ گاروں کو عذاب کرتا ہے) میرا فریضہ تو یہی ہے کہ میں جس چیز کے ساتھ معبود کیا گیا ہوں وہی تم تک پہنچاؤں لیکن میں تمہیں ایسے لوگ سمجھتا ہوں جو ہمیشہ جہالت کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ (سورہ احقاف ۲۳)

”تجھلون“ کا جملہ جو کہ فعل مضارع کی صورت میں ہے اور فعل مضارع عام طور پر استمرار پر دلالت کرتا ہے اس بات کی دلیل ہے کہ مسلسل جہالت ہی شرک اور بت پرستی کا سرچشمہ چلی آرہی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ تین طرح کے جہالتیں مل کر ہی ان کو معرض وجود میں لاتی ہے۔ ۱۔ خدا کی ذات سے جہالت اور اس بات سے جہالت کہ اس کا کوئی شریک او مانند ہمتا نہیں ہو سکتا۔ ۲۔ انسان کی اپنی ذات اور مقام و مرتبہ سے جہالت وہ انسان جو اشرف المخلوقات اور گلستانِ تخلیق کا گل سرسبد ہے۔ ۳۔ عالم طبیعت کے بارے میں جہالت اور انسان جیسی مخلوق کے مقابلے میں جمادات کے بے قدر و قیمت ہونے سے لاعلمی۔ سچ مچ یہ بات کیونکر قرین عقل ہو سکتی ہے کہ انسان پہاڑ سے پتھر کا ایک ٹکڑا جدا کر کے اس کے ایک حصے تو گھر کی سیڑھیاں بنائے اور اسے ہمیشہ روندتا رہے اور دوسرے حصے کو تراش کر اس سے بُت تیار کرے پھر اس کے سامنے سجدہ ریزی کرے اور اپنی عظیم مشکلات کو اس سے حل کرنے کی درخواست کرے یہ جہالت نہیں تو اور کیا ہے؟ [۱]

### ۳۔ جہالت ہی شکست کا اصل سبب بنتی ہے

ارشاد ہوتا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ ۗ إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عِشْرُونَ  
صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتِينَ ۚ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِنَ الَّذِينَ  
كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ ﴿۶۵﴾

اے پیغمبر! مومنین کو کفار کے ساتھ جنگ کے لیے آمادہ کریں اگر تم میں سے بیس با استقامت افراد ہوں تو وہ دوسو پر غالب آجائیں اور سو افراد ہوں تو ہزار ایسے لوگوں پر غالب آجائیں جو کافر ہو چکے ہیں کیونکہ وہ تو جاہل اور بے سمجھ لوگ ہیں۔ (انفال ۶۵)

یہ آیت جو بظاہر جنگ بدر کے موقع پر نازل ہوئی اور مشرکین مکہ کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد کے برابر نہ ہونے کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور اسلامی دستور کے مطابق حکم دے رہی ہے اگر دشمن کی تعداد کے مقابلے میں سپاہ اسلام کی تعداد دسواں حصہ بھی ہو تو وہ میدان

[۱] حضرت امیر علیہ السلام فرماتے ہیں: ”الجاہل لایر تدع وبالہوا اعظ لاینتفع“ جاہل جس راستے پر چلتا ہے اس سے وہ واپس نہیں پلٹ سکتا اور وعظ و نصیحت سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ (غرر الحکم جلد ۱، ص ۶۸) امام جعفر صادق فرماتے ہیں ”لیس بین الایمان والکفر الاقلۃ العقل“ ایمان اور کفر کے درمیان صرف جہالت اور کم عقلی کا فاصلہ ہوتا ہے۔ (اصول کافی جلد ۱ ص ۲۸)

جنگ کی میں پیچھے نہ ہٹے لیکن جو چیز اس ظاہری نابرابری کی تلافی کرتی ہے وہ..... اس آیت کی صراحت کے مطابق..... دو چیزیں ہیں: ایک تو خود مومنین کے اندر صبر و استقامت اور پامردی ہے اور دوسری دشمن میں جہالت، نادانی اور بے خبری کا وجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صبر و استقامت کا میابی اور فتح کا سبب اور جہالت اور نادانی شکست کا موجب ہوتی ہے۔

اپنے وجود میں خداداد صلاحیتوں اور توانائیوں سے جہالت۔

پروردگار عالم کی قدرت و طاقت سے جہالت۔

جنگلی اصول و فنون سے جہالت..... اور اس قسم کی کئی دوسری جہالتیں۔<sup>[۱]</sup>

## ۳۲۔ جہالت کی بدولت اخلاقی برائیاں پھیلتی ہیں

ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُونِ النِّسَاءِ ۗ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ

تَجْهَلُونَ ﴿۵۵﴾

آیا تم شہوت کے لحاظ سے عورتوں کی بجائے مردوں کے پاس جاتے ہو؟ بلکہ تم تو ایسے لوگ ہو جو ہمیشہ جہالت کا اظہار کرتے رہتے ہو۔ (سورہ نمل ۵۵)

خداوند عالم مقصد تخلیق اور اس کے قوانین خلقت سے جہالت اس شرمناک گناہ ہم (جنس بازی) کے برے اثرات سے جہالت۔ یہ الفاظ خدا کے عظیم پیغمبر حضرت لوطؑ کے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ اس منحرف اور گمراہ قوم کا ہم جنس بازی جیسے شرمناک فعل کی طرف رجحان ان کی جہالت اور بے خبری کی بدولت تھا۔

خدا کے ایک اور عظیم پیغمبر یعنی حضرت یوسف علیہ السلام بھی اسی چیز کو دوسرے لفظوں میں بیان فرماتے ہیں:

قَالَ رَبِّ السِّجْنِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ ۗ وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ

أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُن مِّنَ الْجَاهِلِينَ ﴿۳۳﴾

یوسف نے کہا: پروردگار! میرے نزدیک قید خانہ اس سے کہیں زیادہ عزیز ہے جس کی طرف مجھے یہ عورتیں بلاتی ہیں اگر تو نے مجھ سے ان کے مکرو فریب کو نہ پلٹایا تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور جاہلوں میں میرا شمار

[۱] پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: "من عمل علی غیر علم کان ما یفسد اکثر مما یصلح" جو شخص بغیر علم کے کوئی

عمل کرے گا وہ بنانے سے زیادہ بگاڑ دے گا۔ (مشکوٰۃ الانوار، ص ۱۳۵)

## ہوگا۔ (سورہ یوسف ۳۳)

اس آیت میں جو تعبیر بیان ہوئی ہے یعنی عورتوں کو جمع کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ صرف عزیز مصر کی بیوی (زلیخا) ہی یوسف علیہ السلام کو گناہ کی دعوت نہیں دے رہی تھی بلکہ مصر کی عورتیں بھی انہیں عفت و پاکدامنی کے راستے سے ہٹانے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن یوسف علیہ السلام نے کھلے دل سے قید خانے کو قبول کر لیا لیکن اپنی روح اور جان کو زنانہ مصر کی ہوس کے قید خانہ میں مقید کرنا گوارا نہ کیا۔

مندرجہ بالا آیت کا آخری جملہ بتا رہا ہے کہ گناہ آلود عشق اور جنسی گمراہی (کم از کم بہت سے مقامات پر) جہالت اور لاعلمی اور نادانی کی بدولت معرض وجد میں آتی ہے انسان کے وجودی اقدار سے جہالت عفت و پاکدامنی کے انمول آثار سے جہالت گناہوں کے انجام سے جہالت اور خدا کے اوامر اور نواہی سے جہالت۔

اور پھر حضرت یوسف علیہ السلام کی اسی داستان میں ہم واضح طور پر یہ بھی دیکھتے ہیں کہ یوسف کے بھائیوں کے جرائم کا اصل سبب یہی جہالت اور نادانی ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

**قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنْتُمْ جَاهِلُونَ ﴿۸۹﴾**

(جب حضرت یوسف کے بادشاہ بن کر سریر حکومت پر جلوہ افروز ہو چکے اور ان کے بھائی گندم خریدنے کے

لیے کنعان سے مصر آئے تو یوسف نے ان جان بن کر اپنے بھائیوں سے) کہا: آیا جانتے ہو کہ تم نے یوسف اور

اس کے بھائی (بن یامین) کے ساتھ کیا سلوک کیا جبکہ تم جاہل تھے؟ (سورہ یوسف ۸۹)

جی ہاں! تم ہی تھے جنہوں نے جہالت کی بنا پر پہلے اپنے بھائی پر تشدد کیا پھر اسے کنوئیں میں پھینک دیا! تم ہی تھے جنہوں نے اپنے بوڑھے باپ سے جھوٹ بولا۔ اس کے دل کو اپنے فرزند ارجمند کے فراق سے داغدار کیا اور انجام کار اپنے بھائی کو چند کھوٹے سگوں کے بدلے بیچ ڈالا۔

اپنے دوسرے بھائی (بنیامین) کے ساتھ بھی تم نے بے وفائی کی، اسے چوری کے الزام سے متہم کیا، اسے اکیلا چھوڑ دیا اور اس کی حفاظت و نگہبانی کے سلسلے میں اپنے والد سے جو عہد و پیمان کیے تھے سب فراموش کر دیئے۔ تمہاری ان سب کارستانیوں کا سرچشمہ تمہاری جہالت اور نادانی تھا۔ [۱]

[۱] پیغمبر اکرم کی ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں "فقیہ واحد اشد علی ابلیس من الف عابد" شیطان کے لیے ایک فقیہ، ہزار

عابد سے زیادہ دشوار ہوتا ہے۔ (بحار الانوار جلد ۱ ص ۱۷۷)



## ۳۳۔ جہالت تعصب اور ہٹ دھرمی کا موجب ہوتی ہے

ارشاد ہوتا ہے:

إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ الْحَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةَ فَأَنْزَلَ اللَّهُ  
سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ

اس وقت کو یاد کرو جب کافروں نے اپنے دلوں میں جاہلیت کے تعصب اور غصے کو پرورش دی تو اس وقت  
خداوند عالم نے اپنی طرف سے پیغمبر اور مومنین پر آرام و سکون نازل فرمایا (تاکہ وہ ان کے مقابلے میں اپنے  
سکون و وقار کا مظاہرہ کریں)۔ (سورہ فتح ۲۶)

”حمیة“ ”حمی“ (بروزن حمد) کے مادہ سے ہے جیسا کہ راغب مفردات میں لکھتے ہیں دراصل اس کا معنی وہ حرارت ہے جو آگ  
سورج اور جسم کی اندرونی توانائیوں جیسی چیزوں سے معرض وجود میں آتی ہے (اشیاء کے اندرون کی ذاتی حرارت) اسی لیے تو بخار کو  
حمی (بروزن کبریٰ) کہتے ہیں اور چونکہ تعصب اور غصہ انسان کے اندر جلادینے والی حرارت پیدا کر دیتے ہیں اسی لیے انہیں حمیت کہتے ہیں۔  
کتاب التحقیق فی کلمات القرآن الکریم میں بھی آیات ہے کہ حمیت کا معنی حرارت کی شدت اپنے آپ سے دفاع کے لیے تعصب اور  
اپنی ذات تعلق اور کبر و غرور ہے (ہی شدة الحرارة والعلاقة والتعصب في الدفاع عن نفسه والتعنف والترفع ”مادہ حمی)  
یہ آیت ان آیات میں سے ہے جو صلح حدیبیہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں تفصیل اس کی یہ ہے کہ ہجرت کے چھٹے سال جب پیغمبر  
اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عمرہ کی غرض سے عازم بت اللہ ہوئے تو مشرکین مکہ کہ آحضرت اور دوسرے مسلمانوں کے مانع ہوئے تعصب اور  
جاہلیت نے انہیں اس بات کی اجازت نہ دی کہ وہ ان مسلم تو انہیں کا احترام کرتے جو سب لوگوں کے لیے خانہ خدا کی آزادانہ زیارت کے  
بارے میں تھے۔ اس طرح کا اقدام کر کے انہوں نے خانہ خدا اور حرم امن کے احترام کو پس پشت ڈال دیا اور اپنے اصول و قوانین کو پامال کر  
کے اپنے اور حقائق کے درمیان ایک ضخیم پردہ حائل کر دیا۔

حمیت کی جاہلیت کی طرف اضافت سبب کی مسبب کی طرف اضافت ہے کیونکہ ہمیشہ تعصبات ہٹ دھرمیاں اور آتشیں غضب  
جہالت کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اس لیے کہ جہالت انسان کو اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ کسی کام کے انجام پر نظر کرے اور نہ ہی اس  
بات کی اجازت دیتی ہے کہ وہ اس بات کو قبول کرے کہ شاید اس نے اپنی تشخیص میں غلطی کی ہو اور کوئی اور علم بھی اس کے علم سے بالاتر ہو اسی لیے  
ہمیشہ تعصب اور ہٹ دھرمی کی شدت جاہل اور بے علم اقوام میں دوسروں سے زیادہ ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب پیغمبر ان خدا آسمانی کتابیں اور مشعل انوار ہدایت لے کر ایسی جاہل اور بے علم اقوام کے پاس آئے تو انہوں نے  
ان کی خوب ڈٹ کر مخالفت کی اور ان پر طرح طرح کی الزام تراشیاں کیں اس کا نمونہ قرآن مجید کی سورہ ”ص“؟ میں موجود ہے:



انہوں نے عجب کیا کہ ڈرانے والا پیغمبران میں سے کیوں بھیجا گیا اور کافروں نے کہا یہ جھوٹا جادوگر ہے اس نے ان تمام خداؤں کے بجائے ایک خدا قرار دیا ہے؟ سچ مچ یہ کتنی عجیب بات ہے ان کے سرداروں نے کہا جاؤ اور اپنے خداؤں کو محکم پکڑو کیونکہ یہ شخص چاہتا ہے کہ ہمیں بدبختی سے دوچار کر دے ہم نے اس قسم کی کوئی بات اپنے باپ داداؤں سے نہیں سنی یہ تو ایک بہت ہی بڑا جھوٹ ہے۔ (ص ۸ تا ۴)

اس تمام گفتگو میں ہٹ دھرمی کے آثار ملتے ہیں جو جہالت اور غرور سے پیدا ہوتی ہے۔ [۱]

### ۳۴۔ جہالت بہانہ جوئی کا سبب ہوتی ہے

ارشاد ہوتا ہے:

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللَّهُ أَوْ تَأْتِينَا آيَةٌ كَذَلِكَ قَالَ  
الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۖ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ ۖ قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ  
لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿۱۸﴾

جاہل اور بے سمجھ لوگوں نے کہا: خدا ہمارے ساتھ بات کیوں نہیں کرتا؟ ان سے پہلے لوگوں نے بھی ایسی باتیں کہی تھیں۔ ان کے دل (اور افکار) ایک جیسے ہیں لیکن ہم نے (کافی حد تک) اپنی آیات اور نشانیوں کو اہل یقین کے لیے واضح طور پر بیان کر دیا ہے۔ (سورہ بقرہ ۱۱۸)

تاریخ انبیاء میں ہمیں یہ نکتہ بار بار دکھائی دیتا ہے کہ جاہل اور بے سمجھ لوگ مختلف حیلوں بہانوں کے ذریعہ ایمان لانے سے پہلو تہی کرتے رہے اور روشن دلائل آسمانی کتابوں اور صریح معجزات کے سامنے مختلف قسم کے بہانے تراشتے رہے کبھی تو وہ اپنے پیغمبر سے کہتے کہ تم انسان کیوں ہو تمہاری جگہ پر فرشتہ کیوں نہیں آیا؟ کبھی کہتے کہ خدا کی طرف سے ہمارے پاس کوئی خط کیوں نہیں آیا؟ کبھی کہتے کہ جب تک تم خدا اور فرشتے ہمارے سامنے واضح طور پر نہ آؤ ہم ایمان نہیں لائیں گے! اور کبھی کہتے کہ جب تک تم بے آب و گیاہ سرزمین کو ایسے ایک باغ میں تبدیل نہ کرو جس میں پانی کی نہریں جاری ہوں اس میں انواع و اقسام کے درخت پھول اور میوے ہوں تب تک ہم تم پر ایمان نہیں لائیں گے (اس کا واضح نمونہ سورہ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۹۰ تا ۹۳ میں

[۱] امیر المؤمنین علی فرماتے ہیں: «العلم اصل کل خیر... والجهل اصل کل شر» علم ہر اچھائی کی بنیاد اور جہالت ہر برائی کی

جڑ ہے۔

(غرر الحکم، ص ۲۰، ج ۱۲)

موجود ہے اس کے علاوہ اور بھی قرآنی آیات میں اس قسم کے معتد ذمہ منے ملتے ہیں (درحقیقت صاحبان علم و معرفت کسی حقیقت تک پہنچنے کے لیے کسی ایک منطقی دلیل ہی کو کافی سمجھ لیتے ہیں اور اگر متعدد دلائل مل جائیں تو ان کا ایمان مزید راسخ ہو جاتا ہے لیکن چونکہ ہٹ دھرم متعصب اور جاہل افراد اس بات کے لیے حاضر نہیں ہوتے کہ خرافات پر مبنی اپنے عقائد سے دست بردار ہو جائیں لہذا حقیقت سے پہلو تہی کرنے اور اپنی جان چھڑانے کے لیے مختلف حیلوں بہانوں سے کام لیتے رہتے ہیں حتیٰ کہ اگر ان کے بہانوں کو عملی شکل بھی دے دی جاتی پھر بھی اسے چھوڑ کر کسی اور اور بہانے کا آسرا لیتے کیونکہ ان کا مقصد حقیقت کی تلاش نہیں بلکہ اس سے پہلو تہی کرنا ہوتا تھا۔<sup>[۱]</sup>

### ۳۵۔ جہالت اندھی تقلید کا سبب ہوتی ہے

ارشاد ہوتا ہے:

إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا هَذِهِ السَّمَائِيلُ الَّتِي أَنْتُمْ لَهَا عِكْفُونَ ﴿۵۲﴾ قَالُوا  
وَجَدْنَا آبَاءَنَا لَهَا عِبَادِينَ ﴿۵۳﴾ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ فِي ضَلَالٍ

مُّبِينٍ ﴿۵۴﴾

اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے منہ بولے باپ (چچا آذر) اور قوم سے کہا: یہ بے روح مجسمے کیا ہیں جن کی تم عبادت کرتے ہو؟ انہوں نے کہا: ہم نے اپنے باپ داداؤں کو دیکھا ہے کہ وہ ان کی عبادت کیا کرتے تھے فرمایا: یقیناً تم اور تمہارے باپ دادا اگلی گمراہی میں ہو۔ (سورہ انبیاء ۵۲ تا ۵۴)

تماثیل تمثال کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ایسی چیز جس کی صورت ہو اور جسمہ اور نقاشی یعنی پورٹریٹ تصویر کو تمثال کہتے ہیں۔

”عاکفون“، ”عکوف“ کے مادہ سے ہے جس کے معنی میں ایسی مسلسل توجہ جس میں تعظیم بھی پائی جائے اور اعتکاف کا لفظ بھی اسی سے مشتق ہے جو مسجد میں مخصوص عبادت انجام دینے کے معنی میں ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ کے بت پرستوں کے پاس اپنے اس فتیح فعل کی کوئی منطقی دلیل نہیں تھی اور وہ غالباً اپنے بزرگان ماسلف کی اندھی تقلید پر ہی قناعت کرتے تھے اسی لیے جناب ابراہیم علیہ السلام نے انہیں کھلم کھلا اور آشکار گمراہی اور ضلالت پر قائم رہنے والے کہا۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بابل کے بت پرستوں سے تاریخی مناظرہ کرتے ہوئے وہ باتیں کہیں جنہیں قرآنی

[۱] امیر المومنین فرماتے ہیں، ”الجاهل صغیر وان کان شیخاً والعالم کبیر وان کان حدیثاً“ جاہل، بچہ ہوتا ہے خواہ وہ بوڑھا ہو اور عالم بزرگ ہوتا ہے خواہ وہ کمسن ہو۔ (بخاری الانوار، جلد 1، ص 1۸۳)

آیات نے یوں بیان کیا ہے: آیا تم خدا کے علاوہ ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہو جو نہ تو تمہیں ذرہ برابر فائدہ پہنچا سکتی ہیں اور نہ ہی رتی بھر نقصان؟ پھر فرماتے ہیں:

**أَفِ لَكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۶۷﴾**

تم پر بھی افسوس اور خدا کے علاوہ ان چیزوں پر بھی جن کی تم عبادت کرتے ہو آیا تم عقل سے سوچتے نہیں؟

(انبیاء ۶۷)

یعنی اس قسم کی اندھی تقلید تمہارے عقل اور غرور و فکر سے کام نہ لینے کی بدولت معرض وجود میں آتی ہے اور جہالت کی پیداوار ہوتی ہے اس کی دلیل واضح ہے کیونکہ اہل علم افراد فکری استقلال کے حامل ہوتے ہیں اور فکری استقلال انہیں اندھی تقلید کی اجازت نہیں دیتا یہ تو جاہلوں کا کام ہوتا ہے جو کبھی اس کے پیچھے لگ گئے اور کبھی اسکے اور اندھا دھند ہر پروگرام کو اپنالیا۔

### ۳۶۔ جہالت اختلاف و انتشار کا سبب ہوتی ہے

ارشاد ہوتا ہے:

**لَا يُفَاتِلُونَكُمْ جَمِيعًا إِلَّا فِي قَرْيٍ مُحْصَنَةٍ أَوْ مِنْ وَرَاءِ جُدُرٍ بِأَسْهُمٍ بَيْنَهُمْ**

**شَدِيدٍ ۝ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّى ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْقِلُونَ ﴿۱۴﴾**

وہ تمہارے ساتھ کبھی اجتماعی صورت میں نہیں لڑیں گے مگر یا تو محکم قلعوں میں یا دیواروں کے پیچھے سے ان کے اپنے درمیان سخت لڑائی ٹھنی ہوئی ہے (لیکن تمہارے مقابلے میں وہ عاجز و ناتواں ہیں) تم انہیں متحد سمجھتے ہو حالانکہ ان کے دل منتشر ہیں یہ اس لیے ہے وہ ایسے جاہل لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ (سورہ حشر ۱۴)

’قری‘، ’قریۃ‘ کی جمع ہے جس کے معنی آبادی ہیں خواہ وہ شہر ہو یا دیہات اور کبھی اس انسانی گروہ کو بھی قریہ کہا جاتا ہے جو ایک جگہ اکٹھا ہوتا ہے اور ’قری محصنہ‘ ان آبادیوں کو کہا جاتا ہے کہ جو برجوں قلعوں یا خندقوں کے ذریعہ دشمن کے حملوں سے محفوظ ہوتی ہیں۔ یہ آیت طائفہ بنی نضیر (یہود مدینہ کے تین گروہوں میں سے ایک) کے حالات بیان کر رہی ہے اور ان کے اندرونی اختلافات اور خوف و وحشت سے پردہ اٹھا رہی ہے گویا کہہ رہی ہے کہ ان کے بظاہر اتحادی پراپیگنڈے کو مت دیکھو درحقیقت یہ اپنی جہالت اور بے علمی کی وجہ سے متفرق اور منتشر ہیں۔

ہمیشہ اختلافات جہالت اور اتفاق و اتحاد علم کی بدولت معرض وجود میں آتے ہیں جاہل لوگ صرف اختلاف و انتشار کے عظیم خطرات ہی کو نہیں دیکھتے اور اتحاد و اتفاق کی برکت ہی سے بے خبر نہیں ہوتے بلکہ جیواور جینے دو کے سنہری اصول ایک دوسرے سے تعاون اور باہمی اور مشترکہ جدوجہد کے اصولوں سے بھی واقف نہیں ہوتے یہی چیز انہیں انتشار کا شکار بنا دیتی ہے۔

متعصب ہٹ دھرم مغرور متکبر خود پسند اور کینہ پرور لوگ اتفاق و اتحاد کی نعمت سے کبھی بہرہ ور نہیں ہو سکتے کیونکہ ان میں سے ہر چیز وحدت کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ جہالت کی پیداوار ہے۔<sup>[۱]</sup>

## ۷۔۳۔ جہالت سے بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں

ارشاد ہوتا ہے:

ثُمَّ أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِ الْغَمِّ أَمْنًا نُعَاسًا يَغْشَىٰ طَائِفَةً مِّنْكُمْ ۖ

وَطَائِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنفُسُهُمْ يَظُنُّونَ بِاللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۗ

پھر اس غم و اندوہ کے بعد اس نے تم پر اپنا سکون نازل فرمایا جو مختصر سی نیند کی صورت میں تھا تم میں سے کچھ لوگوں

کو تو نیند آگئی اور کچھ لوگ اپنی جان کی فکر میں تھے (انہیں نیند نہیں آئی) وہ خدا کے بارے میں زمانہ جاہلیت

جیسے غلط گمان کرنے لگے۔ (آل عمران ۱۵۴)

یہ آیت جنگ اُحد کے بعد کی رات کے ماجرے کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو نہایت ہی دردناک اور پُر اضطراب رات تھی کیونکہ دشمن کے زبردست حملے کو سہنے کے بعد کچھ مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ خیالات جنم لینے لگے کہ قریش کا فاتح لشکر ایک بار پھر مدینہ کو لوٹ آئے اور مسلمانوں کی رہی سہی قوت بھی ختم کر دے۔

اس دوران خداوند عالم نے اُن پر پُر سکون نیند طاری کر دی جس سے ان کا اضطراب کم پڑ گیا لیکن ضعیف ایمان لوگ ساری رات ڈھیروں غم و اندوہ اور خوفناک تصورات کے درمیان کھوئے رہے کبھی تو بڑا بڑا تے اور کبھی سوچتے کہ آیا پیغمبرؐ نے جو وعدے و وعید کیے تھے وہ سچے تھے؟ آیا خدا میں ہمارے ساتھ درپیش آنے والے دلخراش سانحے کے باوجود بھی انجام کار ہم کا میاب ہوں گے؟ آیا اس ہلاکت ناک ماجرے کے باوجود بھی زندہ بچ جائیں گے؟ یا یہ سب کچھ جھوٹ اور فریب ہے؟ یہ اور اس قسم کے دوسرے شیطانی وسوسے اور زمانہ جاہلیت کی سی بدگمانیاں!

لیکن آئندہ کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ وہ زبردست غلط فہمی میں مبتلا تھے اور خدا کے سارے وعدے سچے تھے لیکن چونکہ ان کے تعلقات ابھی تک زمانہ جاہلیت سے منقطع نہیں ہوئے تھے لہذا وہ خدا اور رسولؐ کے بارے میں بدگمانیاں کر رہے تھے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بدگمانی کا ایک اہم عامل جہالت بے علمی اور واقعات کے صحیح تجزیہ و تحلیل کی عدم توانائی ہے کیونکہ اگر انسان میں واقعات کے تجزیہ

[۱] حضرت علیؑ فرماتے ہیں: "لو سکت الجاہل ما اختلف الناس" اگر جاہل خاموشی اختیار کر لیں تو لوگوں کے درمیان اختلاف ہی

و تحلیل کی صحیح معنوں میں قدرت ہو تو اس قسم کی بدگمانیوں میں مبتلا نہیں ہوتا۔

## ۳۸۔ جہالت بے ادبی کا سبب ہے

ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِنَ الْجُبُرَاتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿۳۸﴾

جو لوگ حجروں کے پیچھے سے آپ کو بلاتے ہیں ان میں سے اکثر سمجھ دار نہیں ہیں۔ (سورہ حجرات ۴)

اعراب کے کچھ گروہ تھے جو وقت و بے وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کے پیچھے سے آ کر بلند آواز میں کہتے تھے: ”یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم! یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم! یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم! یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم!“ اے محمد! اے محمد! (باہر آؤ تمہارے ساتھ ایک کام ہے) سرکار رسالت آج گوان کی اس قسم کی بے ادبی اور بے جا مداخلت سے تخت کوفت ہوتی تھی لیکن ذاتی شرافت کی بنا پر خاموش ہو جاتے تھے یہ سلسلہ سورہ حجرات کے نزول تک جاری رہا جب یہ سورہ نازل ہوئی تو اس پر آنحضرتؐ کے ساتھ گفتگو کے آداب اور آپؐ کو مخاطب کرنے کے طور طریقے بتادیئے گئے۔

”اكثرهم لا يعقلون“ (ان میں سے اکثر سمجھ دار نہیں ہیں) کی تعبیر اس بات کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ بے ادب اور گستاخ افراد کی بے ادبی عام طور پر ان کی جہالت کی وجہ سے رونما ہوتی ہے خلاصہ کلام جہاں علم ہوگا وہاں اس کے ساتھ ادب بھی ہوگا اور جہاں پر جہالت ہوگی وہاں پر بے ادبی اور گستاخی بھی ہوگی۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً ۗ قَالُوا أَتَتَّخِذُنَا

هُزُؤًا ۗ قَالُوا عَوْذٌ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ﴿۶۷﴾

اور (اس وقت کو یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا خداوند تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم گائے کو ذبح کرو تو انہوں نے کہا کہ آپ ہمارے ساتھ مذاق کر رہے ہیں؟ تو موسیٰ نے کہا میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔ (سورہ بقرہ ۶۷)

اس آیت کا تعلق اس قتل سے جو بنی اسرائیل میں ہو گیا تھا اور چونکہ قاتل کا سراغ نہیں مل رہا تھا لہذا امکان پیدا ہو گیا تھا کہ اس سے بنی اسرائیل کے مختلف قبائل کے درمیان خونریز جنگ چھڑ جائے اسی لیے خداوند تعالیٰ کی طرف سے حکم نازل ہوا کہ وہ ایک گائے کو ذبح کریں اور اس کے بدن کے ایک حصہ کو لے کر مقتول کو ماریں جس سے وہ زندہ ہو کر اپنے قاتل کی نشاندہی کرے گا۔

چونکہ یہ بات بہت ہی عجیب اور اعجاز آمیز تھی لہذا پہلے پہل بنی اسرائیل نے بڑے تعجب سے موسیٰ علیہ السلام کو کہا کیا آپ ہمارے ساتھ مذاق کر رہے ہیں؟

جناب موسیٰ نے جواب میں کہا میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں سے ہو جاؤں گویا مذاق کرنا جاہلوں کا نشان بے علمی کی علامت اور غرور و تکبر کی دلیل ہے اس قسم کے لوگ دوسروں کو حقیر کرنے کے لیے ان سے مذاق کرتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ تکبر اور غرور بھی جہالت سے ہی پیدا ہوتے ہیں حتیٰ کہ بعض اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ بہت سے جاہل لوگ داناؤں اور خرد مندوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔<sup>[۱]</sup>

### ۳۹۔ جہالت اجتماعی مصائب اور پشیمانوں کا سبب ہوتی ہے

ارشاد ہوتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا  
بِجَهَالَةٍ فَتُصِيبُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نُدْمِينَ ﴿٦﴾

اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے آئے تو اس کے بارے میں تحقیق کرو مبادا جہالت کی وجہ سے کسی قوم کو مصیبت میں ڈال دو اور اپنے کیے پر پشیمان ہو جاؤ۔ (حجرات ۶)

یہ آیت ایک بنیادی اصول کے عنوان سے مسلمانوں کو حکم دے رہی ہے کہ خبروں کو ماننے کے لیے راوی کے ثقہ ہونے کو پیش نظر رکھو اور اگر کوئی خبر کسی فاسق اور ناقابل اعتماد شخص سے تمہیں ملے تو اس کے بارے میں خوب چھان بین کرو اور تحقیق کرنے سے پہلے کوئی قدم مت اٹھاؤ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس سے مصائب کا طوفان کھڑا ہو جائے اور تمہیں ندامت کا سامنا کرنا پڑے۔

ظاہری بات ہے کہ جاہل انسان مختلف حوادث کے بارے میں صحیح موقف نہیں اپنا سکتا اور اس کی یہ بے علمی کئی مصیبتوں اور نقصانات کا سرچشمہ بن سکتی ہے جس کا نتیجہ ندامت اور پشیمانی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔

### ۴۰۔ جہالت اقدار کو بدل دیتی ہے

ارشاد ہوتا ہے:

كُنْتُمْ عَلَيَّكُمْ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ  
لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا  
تَعْلَمُونَ ﴿٣١﴾

[۱] امیر المؤمنین فرماتے ہیں: «العلماء غرباء لكثرة الجهال بينهم» جاہلوں کی کثرت کی وجہ سے علما ان کے درمیان پر دیسی ہیں۔

راہ خدا میں جہاد تم پر فرض کیا گیا ہے جبکہ تم اسے ناپسند کرتے ہو ہو سکتا ہے کہ کسی چیز کو تم ناپسند کرو جبکہ اس میں تمہاری بھلائی ہو اور کسی چیز کو پسند کرو جبکہ اس میں تمہارے لیے برائی ہو اور خدا سب کچھ جانتا ہے تم کچھ نہیں جانتے۔ (بقرہ ۲۱۶)

ہمیشہ انسان کی حرکت ان اقدار کی جانب ہوتی ہے جو اس کے پیش نظر ہوتی ہیں اور اقدار کی تشخیص اس حرکت کی سمت کو متعین کرنے میں بہت بڑا کردار ادا کرتی ہے اور اس سے لاعلمی اس بات کا باعث بن جاتی ہے کہ انسان اقدار کو خلاف اقدار کے پہچاننے میں غلطی کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے لہذا جو چیز اس کی ترقی و پیش رفت اور خیر و برکت کا موجب ہوتی ہے اسے شر یا خلاف اقدار سمجھ لیتا ہے اور اس کے برخلاف جو اس کی بدبختی اور تباہی کا موجب ہوتی ہے اور خوش بختی اور نجات سمجھ لیتا ہے۔

مندرجہ بالا آیت بتا رہی ہے کہ راہ خدا میں جہاد اقدار انسانی میں سے ایک ہے (عزت و آبرو اور افتخار و اعزاز کا موجب اور کامیابی کا سبب ہے) لیکن تم اپنی جہالت کی وجہ سے اسے ناپسند کرتے ہو کیونکہ اس کے آثار اور برکات سے بے خبر ہو اور اسکے برخلاف سکوت و خاموشی اور ترک جہاد کو اپنے لیے سعادت و سلامتی اور ایک اعلیٰ قدر تصور کرتے ہو حالانکہ یہ تمہاری بدبختی کا موجب ہے۔ اس طرح سے اقدار کی تشخیص میں غلطی کا سرچشمہ جہالت ہوتی ہے اور وہ بھی بجائے خود مختلف مسائل کے بارے میں غلط اور غیر صحیح موقف اور زندگی کے گونا گوں حوادث کے سلسلے میں نادرست موقف اور افراط و تفریط کا عامل ہوتی ہے۔<sup>[۱]</sup>

## ۱۔ آیات کی جمع بندی اور نتیجہ

علم و معرفت اور شناخت کے بارے میں چالیس عنوانات کے تحت قرآنی آیات کے مباحث سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اور قرآن نے اس بارے میں کس حد تک اہتمام کیا ہے۔ (ہم اس بات کا ہرگز دعویٰ نہیں کرتے کہ یہ بات انہی چالیس عنوانات میں منحصر ہے) معرفت خواہ خدا کی ذات ہو یا اس کی صفات کی عالم آفرینش کی شناخت ہو یا زمین و آسمان اور باقی کائنات کی زمین و آسمان میں موجود چیزوں کے اسرار سے آگاہی ہو یا طبعی اور ماوراء الطبیعت سے اپنی ذات کی پہچان ہو یا مختلف علوم کا احاطہ سب اسی زمرے میں آتے ہیں۔ ان تمام آیات کی تحقیق سے مندرجہ ذیل امور بخوبی واضح ہوتے ہیں۔

۱۔ معرفت کی راہیں سب لوگوں کے لیے کھلی ہوئی ہیں اور ہر شخص اپنی استعداد و لیاقت کے مطابق تلاش و کوشش کر کے ان راہوں کو طے کر سکتا ہے وگرنہ اس قدر تاکید و اہمیت کے ساتھ اس کی دعوت کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

[۱] امیر المؤمنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں: "لا تری الجاہل الامفرطاً و المفرطاً" جاہل کو تو دو حال سے خالی نہیں پائے گا، یا وہ افراط میں ہوگا یا تفریط میں۔

(نسخ البلاغ، کلمات قصار، جملہ ۷۰)



۲۔ انسانی اقدار کا خدا کی معرفت کائنات کی شناخت اور اپنی پہچان سے مستقیم رابطہ ہے اور جتنا اس کی معرفت زیادہ ہوگی اتنا ہی ان اقدار کا رابطہ گہرا ہوگا۔

۳۔ انسان کی جسمانی کمزوریوں کے باوجود اس کے لیے سب سے بڑا اعزاز اس کا زیادہ سے زیادہ معرفت کے لیے آمادہ ہونا ہے۔  
۴۔ فتح و کامرانی تک پہنچنے ہر طرح کی مشکلات پر قابو پانے اور تزکیہ نفس اور خود سازی کی راہیں علم و معرفت کی راہیں ہیں۔  
۵۔ مختلف قسم کی تباہ کاریوں بد بختیوں اور ناکامیوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے سب سے پہلے حصول معرفت ضروری ہے۔  
ہم ایک بار پھر اس بات کو دہراتے ہیں کہ یہ قرآنی مباحث ایسے وقت اور ایسے ماحول میں نازل ہوئیں جب جہالت اور تاریکی کے بادل اس علاقہ پر ہی نہیں بلکہ پوری دنیا پر چھائے ہوئے تھے علم و دانش کا سورج غروب ہو چکا تھا اور لوگ جہالت کی موجوں میں غوطہ ور تھے۔  
اور یہ واقعاً عجیب بات ہے کہ اس قسم کے ماحول سے اس طرح کی تعلیمات کا آغاز ہو جو قرآن مجید کی حقانیت کی واضح اور زندہ دلیل ہے جو درس نہ پڑھے ہوئے انسان کے ذریعہ اس قسم کے مکتب کا پیام برہے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ بعض محققین جنہوں نے علم و معرفت اور اس کے منابع کے سلسلہ میں تحقیق کی ہے اس بارے میں سات سو سے زیادہ آیات کا پتہ لگایا ہے جبکہ وہ احکام پر قرآن پر مشتمل پانچ سو آیات کی نشاندہی کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے احکام دین کی نسبت علم و معرفت کو زیادہ اہمیت دی ہے۔

## چند وضاحتیں

۱۔ آیا فلسفہ کی رو سے شناخت ممکن ہے؟ جیسا کہ ہم آغاز بحث میں بتا چکے ہیں کہ ہمارے فکر و ادراک کے دائرہ کار سے باہر کسی جہان کا وجود ایسا موضوع نہیں ہے جس پر بحث اور گفتگو کی جائے حتیٰ کہ سفسطائی یا آئیڈیالیسٹ (خیالی لوگ) جو ظاہری اور بیرونی حقائق کے منکر ہیں وہ بھی عملی طور پر اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان حقائق کی شناخت و معرفت کا کوئی راستہ ہے یا نہیں؟ اگر جواب مثبت ہے تو پھر اس کے کیا ذرائع اور طریقے ہیں؟ اور اگر ذرائع اور طریقے ہیں تو پھر کن حالات کے تحت ان تک رسائی ممکن ہے؟

بالفاظ دیگر ہم خارج میں پائی جانے والی اور آنکھ سے دیکھی جانے والی واقعات (واقعی چیزوں) کو حقیقت میں تبدیل کر سکتے ہیں یا نہیں؟ خارجی واقعات کو ذہن میں منعکس کر سکتے ہیں یا نہیں؟ شناخت و فروخت کی تمام تعریفوں اور اس مسئلہ پر تمام نزاع کی بازگشت بھی اسی موضوع کی طرف ہے۔ [۱]

اور اس کے ساتھ ہی تمام انسانی علوم و دانش کی اصل بنیاد اسی سوال کے جواب میں مضمر ہے۔

[۱] بنا بریں شناخت کی تعریف یوں ہوگی: خارجی واقعات کو ذہنی حقیقتوں میں تبدیل کرنا اور انہیں جیسا کہ وہ ہیں۔ آئینہ فکر میں منعکس کرنا۔



اگرچہ اکثر و بیشتر فلاسفہ، خواہ وہ خدا پرست ہوں یا مادہ پرست، عینی واقعیت کی شناخت کے طرفدار ہیں لیکن پھر بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس بات کے منکر ہیں اور ان کے اس بارے میں مندرجہ ذیل چار اہم اور قابل ذکر دلائل ہیں:

۱۔ ہماری شناخت کے اہم ترین ذرائع ہمارے حواس ہیں اور ان تمام حواس میں حس بینائی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ کس قدر خطائیں ہیں جو آنکھ سے سرزد نہیں ہوتیں؟ مثلاً:

شعلہ اور شہابیہ، جو ہماری نگاہوں میں آگ کی ایک لمبی لکیر کی مانند آسمانوں میں منعکس ہوتا ہے، واقع میں ایک نورانی نقطہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔

اگر ہم ایک لمبی اور مستقیم سڑک کے درمیان کھڑے ہو جائیں، جس کے دونوں اطراف درخت ہوں اور اس کے آخر تک نگاہ کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ درخت جتنا بھی ہم سے دور ہوں گے اتنا ہی ایک دوسرے کے نزدیک ہوتے نظر آئیں گے۔ انتہائی دور نقطہ پر ہم ان دو متوازی خطوط کو ایک دوسرے سے بالکل متصل دیکھیں گے جن سے ہم تصور کریں گے کہ ان سے ایک زاویہ بن چکا ہے، حالانکہ واقعیت اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے کیونکہ سڑک کے دونوں اطراف کا باہمی فاصلہ ہر جگہ بالکل یکساں ہوتا ہے۔

اگر ہمارا ایک ہاتھ گرم اور دوسرا ٹھنڈا ہو اور ہم دونوں کو ایک ہی آن میں نیم گرم پانی میں ڈالیں، تو جو ہاتھ گرم تھا اس سے ٹھنڈک کا اور جو ٹھنڈا تھا اس سے گرمی کا احساس کریں گے۔ گویا ایک ہی شے سے ایک ہی آن میں مکمل طور پر دو متضاد احساسات ہمارے ذہن میں ایجاد ہوں گے۔

اس قسم کی بہت سی مثالیں ہیں جو حس بینائی اور دیگر حواس مثلاً حس لامسہ وغیرہ کے بارے میں ہیں۔ اس صورت میں حواس پر کیا بھروسہ کیا جاسکتا ہے؟ اور شاید کہ یہ خارجی دنیا خواب و خیال کے سوا کچھ بھی نہ ہو، تو کیا جو چیز ہم خواب میں دیکھتے ہیں اور اسی لمحے اس کی حقیقت کے قائل بھی ہو جائیں تو کیا یہ واقعیت ہوگی؟

۲۔ دنیا کے متفکرین دانشوروں اور فلاسفہ میں سے دو شخص بھی ایسے نہیں ملیں گے جو تمام مسائل میں باہم متفق ہوں ان کے درمیان اس قدر تضاد اور اختلاف اس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ حقائق کی شناخت کیلئے ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں اور جس چیز کو میں حقیقت و واقعیت سمجھتا ہوں ممکن ہے وہ کسی دوسرے کے نزدیک خواب و خیال سے زیادہ نہ ہو اور جس کو دوسرے لوگ واقعیت سمجھتے ہیں وہ میرے نزدیک ایک خواب و خیال ہو! حتیٰ کہ ممکن ہے کہ ایک انسان مختلف حالات کے مطابق مختلف نظریات و عقائد رکھتا ہو اور یہی چیز مسئلہ شناخت کی بنیادوں پر ایک کاری ضرب ہے۔

۳۔ ہم جانتے ہیں کہ کائنات کی ساری چیزیں حرکت کر رہی ہیں اور یہ عمومی حرکت ایسی ہے جس میں ہر شے دگرگون ہوتی رہتی ہے حتیٰ کہ ہمارے افکار علوم معارف اور دانش بھی۔

تو پھر اس حالات میں کیونکر یہ بات قبول کی جاسکتی ہے کہ ہم کائنات کی موجودات اور ان کے باہمی روابط کے بارے میں صحیح

معلومات اور شناخت حاصل کر سکتے ہیں؟ جبکہ شناخت کے لیے ضروری ہے کہ ہم ایک ثابت موضوع کو پیش نظر رکھیں۔  
۴۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ عالم ہستی ایک باہم پیوستہ اکائی ہے اسی لیے جزو کی شناخت کل کی شناخت سے جدا نہیں ہو سکتی بنا بریں اگر ہم اس سلسلے کی ایک بھی کڑی کو شناخت نہ کر پائیں تو اس کی کسی بھی کڑی کی شناخت نہیں کر پائیں گے۔  
ادھر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بہت سی ایسی واقعات ہیں جن کا ادراک نوع بشر کے لیے ناممکن ہے اور انسانی معلومات کی تعداد ابھی تک اس کی کم از کم مجہولات کی تعداد سے بھی قابل موازنہ نہیں ہے۔  
تو پھر ایسی صورت میں ہم کائنات کو کیونکر ممکن سمجھتے ہیں؟ اسی لیے ماننا پڑے گا جو کچھ بھی ہمارے تصورات میں آتا ہے وہ صرف علم کی حد تک محدود ہے نہ کہ واقعات کی بناء پر!

## جواب

ان دلائل کے تین طریقوں سے جواب دیئے جاسکتے ہیں۔  
۱۔ جو لوگ بھی عدم شناخت کی بات کرتے ہیں اسی حالت میں بھی جبکہ وہ اپنے مخالفین کو دلائل دینے کے یا ان دلائل کو اپنی کتابوں میں درج کرنے کے لیے قلم بدست ہیں سینکڑوں خارجی واقعات کی شناخت کر چکے ہیں اور اسی شناخت کے ساتھ اور ان ہی چیزوں کی شناخت کی بدولت ہی مسئلہ شناخت سے جنگ کرنے میدان میں نکل آئے ہیں قلم کاغذ خطوط کلمات جملات چھاپہ خانہ کتاب کی اشاعت لائبریری کتب خانہ فریق مخالف صوتی لہریں حروف کے نخرج نور اور روشنی دوسروں کے افکار پر اثر اندازی غرض ان سب عینی واقعات کو قبول کرتے ہیں۔  
ان سب چیزوں کی شناخت کے ساتھ ہی شناخت کے ساتھ جنگ کے لیے میدان میں اترتے ہیں اور ان معارف کی امداد و تعاون ہی سے معرفت کی نفی کے درپے ہیں ہے نا یہ عجیب غلطی؟ (غور کیجئے گا)  
۲۔ ان کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ انسانی علم و شناخت کے محدود ہونے کو شناخت کے اصل مسئلہ کے ساتھ ملا دیا ہے ان کے دلائل امکان شناخت کی ہرگز نفی نہیں کرتے بلکہ آخر میں وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ انسانی معارف محدود یا بسا اوقات کچھ غلطیوں سے آلودہ ہوتے ہیں۔

وہ شہا بے ”کے وجود خارجی کا انکار تو نہیں کر سکتے بلکہ کہتے ہیں کہ وہ صرف ایک نورانی (چمکدار) نقطہ ہے جو قوتِ باصرہ کی غلطی کی بدولت ہمیں آگ کی ایک لمبی یکسر دکھائی دیتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شہا بے کے اصل وجود میں غلطی نہیں بلکہ غلطی اس آگ کی لمبی لکیر میں ہے۔

اسی طرح سڑک اور اس کی دونوں جانب درختوں کے اصل وجود میں غلطی نہیں ہے بلکہ غلطی اس بات میں ہے کہ وہ درخت ہم سے جس قدر دور ہوتے جاتے ہیں ہمیں آپس میں نزدیک ہوتے دکھائی دیتے ہیں اسی طرح نیم گرم پانی کے بارے میں ہے کہ پانی کے

اصل وجود اور ایک مقررہ حد تک درجہ حرارت کے اصل وجود کے بارے میں ہم غلطی کے مرتکب نہیں ہوئے بلکہ غلطی تو اس حرارت کی مقررہ حد کی تشخیص میں ہوئی ہے۔

لیکن جس طرح ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ہمیں یہ دعویٰ ہرگز نہیں ہے کہ ہم اس جہان کے تمام حقائق کا ادراک رکھتے ہیں اور جن حقائق کا ادراک ہے ان میں غلطی واقع نہیں ہوتی بلکہ ہمارا مقصد جزئیہ کی صورت میں شناخت و معرفت کے امکان کو ثابت کرنا ہے جبکہ ان کی تمام تر غلط فہمی اسی موقع پر ہے۔

پھر مزے کی بات یہ ہے کہ عدم امکان شناخت کے طرفدار اپنے مدعا پر جو دلائل پیش کرتے ہیں اچھی طرح خود ان کے اپنے خلاف واقع ہوتے ہیں کیونکہ جب وہ حواس کی غلطی کے مسئلہ کو درمیان میں لے آتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم نے واقعیت کو اپنے دوسرے حواس یا عقلی ذرائع سے دریافت کیا ہے جس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہماری حس نے فلاح مقام پر غلطی کی ہے اس بات کا اعتراف ہی شناخت کی ٹھیک ایک قسم ہے۔

مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ آسمان میں شہابے کے بظاہر ہونے کے موقع پر جو آگ کی ایک لمبی لکیر دیکھتے ہیں یہ غلطی ہے تو ہم نے کئی اور رستوں سے اس واقعیت کو سمجھ لیا ہے کہ شہابیہ پتھر کا ایک ٹکڑا ہے جب وہ زمینی فضاؤں میں داخل ہوتا ہے تو اپنی تند ترین تیز رفتاری کی وجہ سے ہواؤں کے پردوں سے جا ٹکراتا ہے جس سے وہ گرم ہو کر شعلہ ور ہو جاتا ہے اور ایک چمکدار نقطہ دکھائی دینے لگتا ہے اور چونکہ یہ چمکدار نقطہ اس قدر تیز حرکت کرتا ہے کہ ہماری آنکھ غلطی میں پڑ جاتی ہے اور اسے خطِ مستقیم یا خطِ منحنی کی صورت میں دیکھتی ہے۔

اسی بنا پر ایک غلطی کے پہلو میں کئی معروف واقعات موجود ہوتی ہیں کہ جن سے ہم آگاہ ہوتے ہیں اور ان ہی کے ذریعہ ہم اپنی خطاؤں کی اصلاح کرتے ہیں۔

اسی طرح آنکھ کی غلطی کا مسئلہ ہے جو دو متوازی خطوط کو ایک زاویہ کی صورت میں دیکھتی ہے ہم نے پہلے نزدیک سے سڑک کے دونوں کناروں اور ان کناروں پر موجود درختوں کو دو متوازی خطوط کی صورت میں دیکھا اور ان کا اندازہ لگا لیا لہذا جب دور سے اسے دو متقاطع خطوط کی صورت میں دیکھتے ہیں تو ان معلومات کی روشنی میں جو نزدیک سے دیکھ چکے ہیں ان کا آپس میں تقابل کیا تو اس غلطی کا احساس کیا۔

اس صورت میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ کسی غلطی کے وجود کا حکم بہت سی واقعات کی شناخت کی دلیل ہوتا ہے (وقت کیجئے گا)۔  
۳۔ ان لوگوں نے بدیہی ”و نظری“ اور ”امور مطلقہ“ و ”امور نسبیہ اور معرفت اجمالی و معرفت تفصیلی کی تفصیل کو نہیں سمجھا اور ان تین موضوعات کو صحیح معنی میں نہ سمجھنے کی وجہ سے دوسری راہیں اختیار کی ہیں۔

## اور اب وضاحت:

کچھ حقائق ایسے ہیں جن کے بارے میں سفسطانیوں کے سوا جو ہماری بحث سے خارج ہیں کسی کو انکار نہیں (جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں سفسطانی حضرات بھی اگرچہ زبان سے انکار کرتے ہیں لیکن دل سے انہیں ضرور مانتے ہیں) کچھ حقائق ایسے ہوتے ہیں جن میں غور و فکر کی

ضرورت نہیں ہوتی مثلاً ہر شخص جانتا ہے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں پر شخص کو معلوم ہے کہ یہ بات قطعاً ناممکن ہے کہ ایک ہی وقت اور ایک ہی جگہ پر رات بھی ہو اور دن بھی سردی بھی ہوتی ہے اور گرمی بھی یا ایک ہی شخص ایک ہی آن میں مکہ میں بی ہو اور مدینہ میں بھی حتیٰ کہ جو لوگ اجتماع ضدین (دو ضدوں کے اجتماع کو ممکن سمجھتے ہیں وہ ان الفاظ کے مفہوم میں تصرف کرتے ہیں اور ان کی گفتگو زیادہ تر الفاظ بازی پر مبنی ہوتی ہے وگرنہ اصل مطلب کو وہ بھی جانتے ہیں مثلاً وہ اجتماع ضدین کے بارے میں کہتے ہیں کہ ایک لمحے میں بارش آجائے اور فوراً بعد ایک آن میں بادل چھٹ جائیں پس اجتماع ضدین ممکن ہو گیا لیکن اگر ان سے پوچھا جائے کہ ایک مقررہ وقت اور مقررہ جگہ پر یہ دونوں چیزیں جمع ہو سکتی ہیں؟ تو کہتے ہیں کہ نہیں!

ان بدیہی معلومات کے مقابلے میں کچھ نظری معلومات ہوتی ہیں کہ جن میں غلطی اور شبہے میں پڑنے کا امکان ہوتا ہے اور شناخت کے ناممکن ہونے کے بارے میں یہ حضرات جو کچھ بھی کہتے ہیں ان سب کا تعلق انسان کی انہی نظری معلومات سے ہے۔

اسی طرح ہم کچھ ایسی واقعات کو جانتے ہیں جو مطلق ہوتی ہیں اور ان میں کسی قسم کی نسبت اور تناسب کا رابطہ نہیں ہوتا جس طرح اوپر کی مثال جو ہم نے بیان کی ہے۔ (اعداد کے درمیان ریاضی رابطہ و ضدوں یا دو فیوض کا ایک جگہ جمع نہ ہونا)

لیکن اس بات سے بھی انکار قطعاً ناممکن ہے کہ کچھ مفہوم ہوتے ہیں جن کا تعلق نسبت یا تناسب سے ہوتا ہے جو شرائط کے مختلف ہونے سے مختلف ہو جاتے ہیں جیسے سردی اور گرمی ہے جو ایک معنی کے لحاظ سے نسبی چیز ہوتی ہے جس چیز کی حرارت انسان کی جسمانی حرارت سے زیادہ ہوتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ گرم ہے اور جس چیز کی حرارت ہمارے جسم سے کم ہوتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ سرد ہے بنا بریں اگر ہمارے بدن کا درجہ حرارت دگرگون ہو جائے تو ہمارے لیے سردی اور گرمی کا مفہوم بھی دگرگون ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب ایک کمرے میں دو آدمی بیٹھے ہوں تو ان میں سے ایک گرمی کا احساس کرتے ہوئے کہتا ہے کہ دروازے اور کھڑکیاں کھول دو جبکہ دوسرا سردی کا احساس کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہیٹر لے آؤ۔

البتہ ان تمام صورتوں میں ایک واقعیت ضرور ہوتی ہے اور وہ ہے کمرے کا درجہ حرارت اور ایک دوسری واقعیت خود ہمارے جسم کا درجہ حرارت ہوتا ہے البتہ سردی اور گرمی کی برداشت دگرگون ہونے والی چیز ہے جو دونوں کے باہمی تقابل سے حاصل ہوتی ہے اور ان کے بارے میں فیصلہ مختلف ہوتا ہے:

اسی طرح اس دنیا میں کچھ واقعات ثابت ہوتی ہیں اور کچھ واقعات متغیر جو مثالیں ہم اوپر بیان کر آئے ہیں وہ اس قسم کی دوسری مثالیں ثابت واقعات کا حصہ ہیں حتیٰ کہ مارکسٹ حضرات marxists جو کہ ہر چیز کو متغیر جانتے ہیں وہ بھی تغیر اور تبدل کو استثنائی طور پر ایک ثابت اصول کی صورت میں تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کائنات کی ساری چیزیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں سوائے تغیر اور تبدل کے قانون کے جو ہمیشہ ثابت رہتا ہے اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی رونما نہیں ہوتی (البتہ اس اصول کے ساتھ ساتھ کچھ اور اصول بھی ہیں جنہیں وہ ثابت جانتے ہیں) اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے اور وہ یہ کہ معرفت کی دو قسمیں ہیں ایک معرفت اجمالی اور دوسری معرفت تفصیلی چنانچہ کچھ ایسی واقعات ہیں جن کے بارے میں ہم صرف معرفت اجمالی رکھتے ہیں لیکن ان کی خصوصیات اور دنیا کی دوسری اشیاء کے ساتھ ان کے ارتباط سے

ہم بے خبر ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے چونکہ ہم تفصیلی معرفت سے بے خبر ہیں لہذا اجمالی معرفت سے بھی نا بلد ہیں۔ ہماری آنکھ ہمارے بدن کا ایک حصہ ہے اور یہ بات بھی مسلم ہے کہ جب تک ہم تمام بدن کو اچھی طرح نہ جان لیں آنکھ کی شناخت اور اس کے دوسرے اعضاء کے ساتھ روابط کی شناخت ناممکن ہے لیکن اس تفصیلی شناخت سے لاعلمی اس بات سے ہرگز مانع نہیں ہے کہ ہم اس بات کو سمجھتے ہوں کہ آنکھیں سر میں ہوتے ہیں پیشانی کے نیچے ہوتی ہیں ان کے سات طبقے ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک طبقہ کا مقررہ فریضہ ہے ان کا فائدہ یہ ہے کہ ہم ان میں سے مختلف مناظر اور واقعات کا نظارہ کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا توضیح کے بعد یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ شناخت و معرفت کے منکرین کے دلائل درحقیقت ان کے اس تقسیم کے بارے میں اچھی طرح غور و فکر نہ کرنے کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں مثلاً جب وہ کہتے ہیں کہ یہ کائنات ایک اکائی سے زیادہ کچھ نہیں اگر ہم نے اس کی کسی ایک کڑی کو نہ پہچانا تو کچھ بھی نہ پہچانا درحقیقت انہوں نے معرفت اجمالی اور معرفت تفصیلی کو آپس میں ملا دیا ہے کیونکہ اگر ہم اس عالم کے کسی ایک جز کو اس کے دوسرے اجزاء کے ساتھ روابط سمیت مکمل طور پر پہچانا چاہیں تو ہمیں مکمل جہان کی معرفت حاصل کرنا پڑے گی لیکن معرفت اجمالی کے لیے ایسی کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی یہی صورت زمین و آسمان افراد بشر اور اپنے اطراف میں موجود اشیاء کے بارے میں ہماری معرفت کی ہے۔ [۱]

اس سلسلے میں مزید وضاحت انشاء اللہ اگلی فصل میں آرہی ہے۔

[۱] کبھی کہا جاتا ہے کہ معرفت کے منکرین اس کی مکمل طور پر نفی نہیں کرتے بنا بریں معرفت کے طرفداروں کے ساتھ ان کا لفظی نزاع ہے، جو ”عنب“، ”انگور“ اور ”ازوم“ کی داستان کا مصداق ہے (انگور کو عربی میں عنب، فارسی میں انگور اور ترکی میں ازوم کہتے ہیں)۔

## ۲۔ محدود انسانی علم

۱۔ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ ط قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ﴿۸۵﴾ (سورہ بنی اسرائیل ۸۵)

۲۔ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ط وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ط إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿۳۳﴾ (سورہ لقمان ۳۳)

۳۔ وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ ط  
(سورہ بنی اسرائیل ۴۴)

۴۔ وَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ ء وَعَسَى أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَكُمْ ط وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۳۱﴾ (سورہ بقرہ ۱۲۱)

۵۔ لَخَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ أَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۵۴﴾ (سورہ مومن ۵۴)

۶۔ لَا تَدْرِي لَعَلَّ اللَّهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذَلِكَ أَمْرًا ﴿۱﴾ (سورہ طلاق ۱)

۷۔ قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ط وَلَوْ كُنْتَ أَعْلَمُ الْغَيْبِ لَا سِتْكُنْتُمْ مِنَ الْخَيْرِ ؕ وَمَا مَسْنِيَ السُّوْءُ ؕ (سورہ اعراف ۱۸۸)

۸۔ أَبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ط (سورہ نساء ۱۱)

۹۔ وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ ط إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۴﴾ (سورہ لقمان ۲۴)

ترجمہ

۱۔ آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں تو کہہ دیجئے کہ روح میرے پروردگار کے امر سے ہے

- اور تمہیں علم سے تھوڑی سی چیز کے علاوہ کچھ نہیں دیا گیا۔
- ۲۔ کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا؟ اور کوئی بھی نہیں جانتا کہ وہ کس سر زمین میں مرے گا؟
- ۳۔ ہر موجود اس کی تسبیح اور حمد کرتا ہے لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔
- ۴۔ ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو لیکن تمہاری خیر اسی میں ہو اور کسی چیز کو پسند کرو لیکن تمہارا شر اسی میں ہو اور خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔
- ۵۔ آسمانوں اور زمین کی آفرینش انسانوں کی آفرینش سے زیادہ اہم ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔
- ۶۔ تم نہیں جانتے کہ شاید اس کے بعد خداوند عالم (مطلقہ عورتوں کے بارے میں) کوئی تازہ صورت حال پیدا کر دے۔
- ۷۔ کہہ دو کہ میں اپنے نفع و نقصان کا مالک نہیں ہوں مگر وہ جو خدا چاہے (اور غیب و مخفی اسرار سے بھی باخبر نہیں ہوں مگر جو خدا چاہے) اور اگر میں غیب سے باخبر ہوتا تو اپنے لیے بہت زیادہ منافع فراہم کرتا اور مجھے کوئی نقصان نہ پہنچتا۔
- ۸۔ تم نہیں جانتے کہ تمہارے ماں باپ اور تمہاری اولاد میں سے کون تمہارے لیے زیادہ مفید ہے؟
- ۹۔ اگر تمام وہ درخت جو روئے زمین پر ہیں قلم بن جائیں اور سمندر سیاہی بن جائیں اور سات سمندر ان میں اضافہ کر دیئے جائیں پھر بھی یہ سب ختم ہو جائیں لیکن کلمات خدا ختم نہ ہو پائیں خداوند عالم عزیز اور حکیم ہے۔

## الفاظ کے معنی

روح ”جیسا کہ کتاب مقابیس اللغۃ میں آیا ہے دراصل روح کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہوا ہے اور سانس لینے اور پھونک مارنے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے چونکہ سانس لینے اور انسانی بقا اور جان کے درمیان قریبی رابطہ ہے اسی لیے روح جان اور حیات کے معنی میں پھر اس مجرد حقیقت کے معنی میں بولا جانے لگا جس پر حیات کی بقاء کا انحصار ہے۔

روح (بروزن لوح) کے معنی ہیں نسیم خنک اسی طرح مہربانی اور رحمت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور راحۃ کا معنی براہِ مرواح کا معنی پنکھا سب اسی اصل کی فرعیں ہیں۔

”تفقہون“ ”فقہ“ کے مادہ سے ہے جیسا کہ لسان العرب میں آیا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز سے آگاہی اور اسے سمجھنا ہے لیکن اگر خاص طور پر علم دین یا (علم احکام) پر اس کا اطلاق ہوتا ہے تو یہ اسکی عظمت اور اہمیت کی وجہ سے ہے راغب مفردات میں کہتے ہیں کہ فقہ کا معنی ہے ظاہر اور آشکار امر کے ذریعہ مخفی چیزوں سے آگاہی بنا بریں اس کا مفہوم علم کے مفہوم سے خاص ہے کیونکہ علم کا مفہوم عام ہوتا ہے۔



غیب جیسا کہ ابن منظور نے لسان العرب میں لکھا ہے کہ اس کا اصل معنی شک ہے اور جو چیز بھی انسان سے مخفی چیزوں کے بارے میں زیادہ شک کیا جاتا ہے اور راغب "یومنون بالغیب" کی تفسیر میں لکھتے ہیں غیب وہ چیز ہوتی ہے جو حسن کے دائرہ سے باہر اور ابتدائی عقل کی دسترس سے بھی خارج ہو اور یہ انبیاء کے خبر دینے کی وجہ سے ہی پہچانی جاتی ہے۔

"نفدت"، "نفد" (بروزن حسد) اور نفاد کے مادہ سے ہے اور جیسا کہ لسان العرب اور مفردات سے معلوم ہوتا ہے اس کے معنی فنا اور نابودی ہیں اور..... منافذ..... اس شخص کو کہا جاتا ہے جو استدلال قائم کرنے میں زبردست مہارت رکھتا ہو اس طرح کہ مخالف کو مکمل طور پر ناکام کر دے اور انفاذ کنوں کا پانی خشک ہونا کے معنی میں بھی آیا ہے۔

## تفسیر اور آیات کی جمع بندی

کچھ مشرکین یا اہل کتاب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بار بار روح کے بارے میں سوال کیا کرتے تھے پہلی آیت کے مطابق آنحضرتؐ کو حکم ہوتا ہے کہ آپؐ انہیں کہہ دیں کہ روح میرے پروردگار کے امر سے ہے پھر کہا گیا ہے کہ علم سے تمہیں بہت کم حصہ ملا ہے، لہذا تم حقیقتِ روح کے ادراک کی طاقت نہیں رکھتے۔<sup>[۱]</sup>

یہ چیز علمِ انسانی کی محدودیت پر واضح دلیل ہے کیونکہ روح انسان سے دوسری تمام چیزوں کی نسبت زیادہ قریب ہے (اگر مندرجہ بالا آیت میں روح سے مراد انسانی روح ہے) یعنی جب انسان اپنی روح کے جوہر ہی کو نہیں پہچان سکتا اور اس بارے میں اس کی معلومات سطحی اور اجمالی ہیں تو کائنات کی دوسری واقعات اور حقائق کے بارے میں اس سے کیا توقع رکھی جاسکتی ہے؟

دوسری آیت جو سورہ لقمان کی آخری آیت ہے ان علوم کی نشاندہی کر رہی ہے جو خدا کی ذات سے ہی مخصوص ہیں اور اس میں پانچ علوم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے قیامت کا قیام بارش کا نزول وہ بچے جو ماؤں کے شکم میں ہوتے ہیں انسانی اعمال سے متعلق آئندہ کے واقعات اور ہر شخص کی موت کی سرزمین جنہیں اسلامی روایات میں مفاہج خمسہ غیب سے یاد کیا گیا ہے جنہیں خدا کے سوا کوئی اور نہیں جانتا۔<sup>[۲]</sup>

ہو سکتا ہے کہ قرآن کے ان اعتبار سے کچھ لوگ ان امور کے بارے میں کچھ کلیات کو جان لیں لیکن ان پانچ امور کی جزئیات کو کوئی شخص بھی نہیں جان سکتا مثلاً کوئی شخص یہ نہیں جانتا کہ جو بچہ شکمِ مادر میں ہے وہ کن جسمانی استعداد کا مالک ہے؟ اس کی روح کی کیا کیفیت ہے؟ خوبصورت ہے یا بدصورت؟ صحیح و سالم ہوگا یا ناقص و مریض اگر بیمار ہوگا تو کس قسم کے مرض کا شکار ہوگا؟ حتیٰ کہ کوئی شخص اس کی جنس (مذکر اور

[۱] "وما اوتیتہم من العلم" کے جملہ کی اکثر مفسرین نے "قلیلا من العلم" کے معنی میں تفسیر کی ہے۔ جبکہ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد "قلیلا منکم" ہے۔ لیکن یہ تفسیر ظاہری آیت کے ساتھ سازگار نہیں ہے کیونکہ اس میں مسئلہ روح کے بارے میں سوال کرنے والے ہی مخاطب ہیں۔ (دقت کیجئے گا)۔

[۲] تفسیر مجمع البیان، جلد ۸، سورہ لقمان کی ۳۴ ویں آیت کے ذیل میں۔



مؤنث ہونے) کی بھی بہت سے مراحل میں نہیں جانتا۔

قرآن کہتا ہے اے انسان! تو تو اپنے کل سے بھی بے خبر ہے اور اس سر زمین کو بھی نہیں جانتا جہاں تیری عمر کا خاتمہ ہونا ہے! تو پھر کائنات سے کیونکر آگاہ ہو سکتا ہے؟ اسی لیے تیرا علم محدود ہے۔

تیسری آیت میں موجودات عالم کی عمومی حمد اور تسبیح کا بیان ہے جو سب کی سب زبان حال اور اس عجیب و غریب نظم کے تحت جو ان پر حکم فرما ہے حق تعالیٰ کی حمد و ثنا میں مصروف اور اس کے ہر قسم کے عیب و نقص سے پاک ہونے کی گواہی میں رطب اللسان ہے اپنی زبان بے زبانی کے ساتھ کائنات کو اپنی تسبیح کے غلغلہ سے بھر رکھا ہے یا پھر یہ کہ زبان حال کے علاوہ ان کی زبان قال بھی ہے اور کسی استثناء کے بغیر اس موجودات عالم کا ایک ایک ذرہ اپنی اپنی حد تک عقل و عرفان اور شعور کی نعمت سے مالا مال ہے اور مکمل آگاہی اور علم کے ساتھ خدا کی حمد و تسبیح میں مصروف ہے ان دونوں نظریات کی تشریح ہم تفسیر نمونہ بیان کر چکے ہیں۔<sup>[۱]</sup>

لیکن بہر حال نہ تو ہم میں یہ قدرت ہے کہ ہم ان کی زبان حال کو سمجھیں کیونکہ نہ تو ہم موجودات عالم پر حکم فرمانظاموں اور کائنات کے اسرار سے باخبر ہیں اور نہ ہی ان کی زبان قال سے واقف ہیں کہ جس کا حال واضح ہے۔

اس طرح سے یہ کائنات شور و نو اور غلغلہ سے بھر پور ہے لیکن ہم اس سے بے خبر ہیں اور یہ بذات خود ہمارے علم و دانش کے محدود ہونے کی ایک واضح اور روشن دلیل ہے۔

چوتھی آیت میں جہاد کی بات ہو رہی ہے جو لوگ جہاد کو ناپسند کرتے تھے انہیں بتایا جا رہا ہے کہ تم تو اپنے خیر و شر سے بھی بخوبی واقف نہیں ہو اور اس کا چھی طرح ادراک نہیں رکھتے تو اس طرح سے کبھی تو تم اپنے منافع اور مفادات سے برسر پیکار ہوتے ہو اور کبھی اپنے نقصانات کی طرف بڑے شوق سے جاتے ہو جو تمہارے علم کے محدود ہونے کی واضح اور روشن دلیل ہے کہ تم تو اپنے سودزیاں کو بھی نہیں سمجھ سکتے مگر خداوند بزرگ اس سے بخوبی آگاہ ہے اور وحی کے ذریعہ سے جو معرفت کا ایک اہم ترین ذریعہ ہے تمہیں تمہارے تمام نفع و نقصان سے باخبر کر دیا ہے۔

پانچویں آیت میں آسمانوں میں اور زمینوں کی آفرینش کی عظمت کا بیان ہے اور اس واقعیت کا بھی کہ ان چیزوں کی تخلیق و آفرینش انسان کی تخلیق و آفرینش سے بڑھ کر باعظمت اور با اہمیت ہے اس کے ساتھ ہی اس بات سے اکثر لوگوں کی بے خبری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور یہ اس دوریات کی بات ہے جب آسمانوں کی تخلیق کے بارے میں لوگوں کی معلومات عام طور پر اور جزیرۃ العرب کے باسیوں کی خاص طور پر محدود تھیں اور شاید وہ ستاروں کو آسمان کی چھت پر چاندی کی میخیں سمجھتے تھے اور آج جب کہ معلومات انسانی کا دائرہ وسیع ہو چکا ہے پھر بھی اس بارے میں ہماری معلومات محدود ہیں۔

چھٹی آیت میں طلاق اور عدت رجبی میں مطلقہ عورتوں کے اپنے شہروں کے گھروں میں موجود رہنے کے مسئلہ کو بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے تم نہیں جانتے کہ شاید خداوند عالم اس کے بعد ان کے لیے کئی نئی صورت حال پیدا کر دے اور عدت کا دورانیہ خاص کر جب

[۱] تفسیر نمونہ، جلد ۱۲، ص ۱۳۳، سورۃ اسراء (بنی اسرائیل) کی آیت ۴۴ کے ذیل میں رجوع ہو۔

سابق شوہروں کے ساتھ نظر ثانی اور صلح صفائی کا سبب بن جائے جس سے زنا شوئی کی کوئی خاص صورت حال نکل آئے اور یہ دلیل ہے انسانی علم کے میں محدود ہونے پر کہ انسان تو اپنی کل کی زندگی سے متعلق مسائل تک سے بے خبر ہے اور ان کے بارے میں کسی قسم کی پیشگوئی نہیں کر سکتا۔

ساتویں آیت میں پیغمبرؐ سے کہا جا رہا ہے کہ وہ لوگوں کو بتادیں: میں اپنے سودو زیاں کا خود مالک نہیں ہوں اور اس بات کا اعتراف کریں کہ میں (سوائے اس کے جو خدا نے مجھے بتایا ہے) غیب کو نہیں جانتا کیونکہ اگر میں غیب جانتا تو زندگی میں مجھے کوئی مشکل درپیش نہ آتی آپ نے یہ بات اس وقت کی جب اہل مکہ نے کہا: اگر آپ کا خدا سے رابطہ ہے تو آئندہ کے بارے میں اجناس کی گرانی اور ارزانی سے باخبر کیوں نہیں ہیں یا مختلف علاقوں کی خشک سالی اور پڑ آبی کو کیوں نہیں جانتے تاکہ اس طرح سے آپ کو بہت بڑا منافع حاصل ہوتا؟ تو آپ نے جواب میں فرمایا: عالم الغیب تو بس خدا ہی ہے کہ جس کا علم بے انتہا اور ذاتی ہے۔

جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خداوند عالم جن کے علم کی عظمت کے بارے میں فرماتا ہے "وعلمک مالہم تکن تعلم" (سورہ نساء ۱۱۳) اس بات کا اعتراف کریں اور کہیں کہ (خداوند عالم نے جو کچھ مجھے بتایا ہے اس کے علاوہ) میں اور غیب نہیں جانتا (جو میرے دائرہ حس سے باہر ہے) تو دوسرے لوگوں کا حال صاف ظاہر ہے

آٹھویں آیت میں مختلف حالات و شرائط کے تحت اولاد اور والدین کی وراثت کے بارے میں احکام صادر کرنے کے بعد فرماتا ہے حتیٰ کہ تم یہ بھی نہیں جانتے کہ تمہارے ماں باپ اور تمہاری اولاد میں سے کون تمہارے لیے زیادہ مفید ہے اور تمہارے اموال کا کون زیادہ مستحق ہے تاکہ اس کے لیے زیادہ حصہ مقرر کر دیا؟

جی ہاں تم تو یہ جانتے کہ تمہاری اپنی بہتری کس بات میں ہے؟ اسی لیے تو میراث وغیرہ میں تم اپنے لیے صحیح طور پر اور شائستہ صورت میں قانون سازی نہیں کر سکتے تمہارا قانون ساز خدا ہی کو ہونا چاہیے جو تمہاری ہستی کے تمام اسرار سے آگاہ ہے جی ہاں! انسان کا علم تو اس حد تک محدود ہے کہ وہ اپنے لیے ایسے قوانین بھی صحیح معنوں میں نہیں بتا سکتا جو اس کے اپنے مفادات کی حفاظت کر سکیں اسی لیے تو انسانی قوانین بوجہ انسانی علم کے ناقص ہونے کے جو اس کے عمل سے ظاہر ہوتا ہے ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں جب اپنی سرنوشت کے بارے میں انسان کے علم کی یہ حالت ہے تو موجودات عالم کے بارے میں اس کی حالت صاف ظاہر ہے!

اور آخر میں نویں اور آخری آیت جو خدا کے بے انتہا اور غیر متناہی علم کی نشاندہی کر رہی ہے اور اس علم کے بے انتہا ہونے کو کہ جس کا تصور بڑے بڑے دانشوروں کے لیے بھی مشکل ہے اس قدر نہایت شیریں اور زیبا صورت میں ہے کہ جسے کم علم ہی نہیں بے علم بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لیں یوں بیان کر رہی ہے اگر روئے زمین کے تمام درخت یعنی تمام باغات اور جنگلات کے تمام درخت کہ جن کی تعداد کھربوں سے بھی بڑھ جاتی ہے قلم بن جائیں (جبکہ ہر درخت سے لاکھوں بلکہ کروڑوں قلم تیار کیے جاسکتے ہیں) اور تمام دریا اور سمندر لکھنے کے لیے سیاہی بن جائیں (جبکہ ایک چھوٹے سے حوض سے لاکھوں دواتیں بھری جاسکتی ہیں) اور پھر فرشتے اور جن وانس سمیت تمام کائنات لکھنے والے بن جائیں اور ان قلموں اور دواتوں سے خدا کے علوم و کلمات لکھنا شروع کر دیں پھر بھی اس بات پر قادر نہیں ہوں گے یہ سب قلم فرسودہ ہو کر ختم ہو جائیں گے سیاہیاں ختم ہو جائیں گی لیکن ابھی ان کلمات کا آغاز نہیں کر پائیں گے۔

یہ تو رہا ایک طرف دوسری طرف ہم جانتے ہیں کہ کلماتِ خداوندی سے مراد عالم ہستی کی یہ کل موجودات ہیں تو اس لحاظ سے مندرجہ بالا آیت اس کائنات کی بے انتہا وسعت اور اس کے مقابلے میں انسانی علم و دانش کی محدودیت پر روشن دلیل ہے۔

## اس ساری بحث کا نتیجہ

مندرجہ بالا تمام آیات سے یہ نتیجہ بخوبی نکالا جاسکتا ہے کہ انسان کی معرفت اور شناخت اس کی اپنی ذات کی حد تک کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو اور انسان کی دانش اور اس کا علم روز بروز کتنا ہی کیوں نہ بڑھتا رہے ساری دنیا مدارس جامعات اور تحقیقاتی مراکز سے بھر کیوں نہ جائے پھر بھی اس کی معلومات کا حجم اس کی مہولات کی نسبت ایسے ہے جیسے سمندر کے مقابلے میں قطرہ؟ جب انسان اپنے خیر و شر کو نہیں جانتا اپنے سود و زیاں سے بے خبر ہے اپنے روح کے جوہر کو نہیں پہچانتا جو اس کے سب سے زیادہ قریب ہے اپنے کل کے حوادث اور اپنی موت کے لمحہ سے بے خبر ہے تو اس سے یہ انتظار کیونکر کی جاسکتی ہے کہ وہ در دراز کے رستوں کی کہکشاؤں اور اس وسیع اور بے انتہا کائنات میں گزرنے والے حالات و واقعات سے آگاہ ہوگا!

اس میں شک نہیں کہ یہ سب کچھ اس لیے نہیں ہے کہ انسان شناخت و معرفت سے عاجز ہے بلکہ اس لیے ہے کہ عالم ہستی بہت وسیع ہے بعض لوگ جو شناخت و معرفت کا انکار کرتے ہیں شاید اس لیے ہے کہ علم بشر محدود اور اس کے بعض علوم غلطیوں سے آلودہ ہیں جس کی وجہ سے وہ خود شناخت کے مسئلہ کے بارے میں اشتباہ میں مبتلا ہو کر غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔

بہر حال قرآن مجید نے جس طرح معرفت کی راہیں سب لوگوں کے لیے بنا رکھی ہیں اور بڑی تاکید کے ساتھ انہیں اس کی دعوت دی ہے، اسی طرح انسانی علم کو محدود بھی بتایا ہے ایسی محدودیت جو انہیں اس جہان اور اس کے خالق کی عظمت اور انبیاء اور صاحبانِ وحی کی ضرورت کے اقرار و اعتراف پر آمادہ کرے۔

اب ہم اپنی اس گفتگو کو حضرت امام حسین علیہ السلام کی دعائے عرفہ کے اس مطالب بھرے جملہ پر ختم کرتے ہیں جو آپ نے بارگاہ رب العزت میں عرض کرتے ہوئے فرمایا:

”الہی انا الفقیر فی غنای  
فکیف لا اکون فقیرا فی فقیری  
الہی انا الجاہل فی علمی  
فکیف لا اکون جھولا فی جھلی“

خداوند! جب میں بے نیاز ہوتا ہوں تو پھر بھی میں سر تاپا فقر و احتیاج ہوتا ہوں تو پھر میں فقر کی حالت میں فقیر کیوں نہیں ہوں گا؟ خداوند! میں عین علم و دانش کے ہوتے ہوئے بھی لاعلم ہوں تو پھر لاعلمی کی حالت میں میں لاعلم کیوں نہیں ہوں گا؟

## ۳۔ انسانی علم کے محدود ہونے پر فلاسفہ اور دانشوروں کی گواہی

انسانی علم کے محدود ہونے پر دلیل اس قدر واضح ہے کہ زیادہ بحث کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی لیکن نکات ذیل کی طرف توجہ کرنے سے یہ اور زیادہ روشن ہو جائے گی۔

۱۔ انسانی حواس کی قدرت محدود ہے، آنکھ جو کہ امور محسوسہ کی معرفت کا اہم ترین ذریعہ ہے اس میں دیکھنے کی محدود طاقت ہوتی ہے بسا اوقات زیادہ تیز بھی ہو تو چند کلومیٹر سے زیادہ فاصلے کو نہیں دیکھ پاتی۔ اسی طرح جن رنگوں کا انسان مشاہدہ کرتا ہے وہ بھی بہت محدود ہیں کیونکہ بنفشی رنگ سے اوپر اور سُرخ رنگ سے نیچے بھی بہت سے رنگ ہوتے ہیں لیکن انسانی آنکھ انہیں دیکھنے پر قادر نہیں ہے۔

اسی طرح انسانی کان ہر آواز کو نہیں سن پاتا صرف چند لہریں waves ہیں جو اس کے لیے قابلِ درک ہیں لیکن وہ ارتعاش of sound vibration جس کی مقدار حد سے زیادہ یا حد سے کم قطعاً قابلِ سماعت نہیں ہوتا اسی طرح دوسرے حواس کی صورت حال ہے۔

ہم کرہ زمین میں عام حالت میں اس آنکھ سے آسمان پر صرف چند ہزار ستارے دیکھ سکتے ہیں جبکہ ہم جانتے ہیں کہ آسمان پر کئی رب ستارے موجود ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ علمی ذرائع نے انسانی حواس کی قدرت میں اضافہ کر دیا ہے لیکن ان ذرائع کی قدرت دید اور قدرت ادراک بھی محدود ہے۔

۲۔ ہمارے فکر و ادراک کی قدرت بھی محدود ہے اس کے ماوراء جو کچھ بھی ہے ہمارے وہم و گمان کی نگاہوں سے مطلقاً پوشیدہ ہے حتیٰ کہ نہایت گہری سوچ رکھنے والے لوگ بھی اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔

۳۔ ادھر عالم ہستی (یہ کائنات) اس قدر وسیع ہے کہ اس کی وسعتیں ہمارے فکر و خیال میں نہیں سما سکتیں ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ انسانی علم و دانش کا دامن جس قدر پھیلتا جائے گا اس کی نگاہوں میں کائنات کی عظمت بڑھتی جائے گی۔

اس عالم کی عظمت کا اندازہ لگانے کے لیے (جہاں تک کہ ہمارے فکر کی رسائی ہے) اس قدر کافی ہے کہ یہ جان لیں کہ ہمارا نظام شمسی اور وہ تمام ستارے جو ہمیں آسمان میں دکھائی دیتے ہیں ایک کہکشاں کا جزوی حصہ ہیں (کہکشاں یا ستاروں کے شہر ستاروں کا ایک عظیم مجموعہ ہیں جو اپنے ایک علیحدہ عالم تشکیل دیتے ہوئے ہیں) دانشوروں کے مطابق اس کہکشاں میں ایک سو بلین (سوارب) سے زیادہ ستارے موجود ہیں ہمارا یہ سورج اپنی تمام عظمتوں اور وسعتوں سمیت اس کہکشاں کا ایک متوسط ستارہ ہے!!

اور انہی دانشوروں کے بقول کہ اب تک وہ مختلف ٹیلی سکوپوں اور کمپیوٹروں کے ذریعہ اندازہ لگا کر جو نتیجہ اخذ کر سکے ہیں وہ یہ ہے کہ

اس عالم میں کم از کم ایک ارب کہکشاں موجود ہیں۔<sup>[۱]</sup>

جی ہاں! ان اعداد کو زبان سے کہہ دینا کس قدر آسان لیکن ان کا تصور کس قدر مشکل ہے؟ لیکن یہ بات بھی فراموش نہ کریں کہ یہ سب عظیم کہکشاں اور یہ بے شمار ستارے جو ہماری معلومات میں آئے ہیں ان سب کا محور عموماً ہمارا یہ کرہ زمین ہے اور پھر یہ کہ ہم ان سب کو بھی اچھی طرح نہیں پہچان سکے۔

۴۔ چوتھی چیز ہم جس عالم میں رہ رہے ہیں اس کا ماضی بھی ہے اور مستقبل بھی لیکن اب تک کسی کو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کے کتنے ارب سال گزر چکے ہیں اور نہ ہی اس کے مستقبل کے بارے میں کسی کو علم ہے کہ کتنے ارب سال اس پر اور گزریں گے؟ اس کی مثال ایک زنجیر جیسی ہے کہ جو ازل سے موجود چلی آرہی ہے اور اب تک چلی جائے گی اور ہماری معلومات صرف اس کی ایک کڑی تک محدود ہیں جس میں ہم خود رہ رہے ہیں اور اس کے ماضی اور مستقبل کے بارے میں ایک موہوم سائے سے زیادہ ہماری معلومات نہیں ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ انسان نے فطرت کی آواز اپنے اندرونی عوامل کی بنا پر جس دن سے خود کو پہچانا ہے اپنی جہد مسلسل اور سعی پیہم کے تحت اپنی اور اس جہان کی معرفت کی زیادہ سے زیادہ تلاش میں لگا ہوا ہے اور ہزاروں سال کی مسلسل کوششوں سے جو معلومات حاصل کی ہیں وہ اس وقت دنیا بھر کی چھوٹی بڑی لائبریریوں میں محفوظ ہیں اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ ان لائبریریوں میں سے کچھ اس قدر عظیم ہیں کہ ان کی الماریوں کی مجموعی لمبائی ایک سو کلو میٹر تک جا پہنچتی ہے جیسے برطانوی عجائب گھر کی لائبریری british museum library اور بعض لائبریریوں میں موجود کتابوں کی تعداد ساٹھ لاکھ ہے (جیسے پیرس کی نیشنل لائبریری) اور بعض کی تعداد اڑھائی کروڑ ہے (جیسے مشہور امریکن لائبریری) جبکہ بعض اس قدر وسیع ہیں کہ صرف ان کی کتابوں کی فہرست سے ایک بہت بڑی لائبریری بن چکی ہے اور بذات خود لائبریری ایک بڑے شہر کی صورت اختیار کر چکی ہے جس کے مختلف شعبوں تک پہنچنے کے لیے ٹرانسپورٹ کی ضرورت پیش آتی ہے۔

پھر بھی کائنات اور اس کے تخلیقی اسرار و رموز کے بارے میں انسانی معرفت اور معلومات ایسی ہیں جیسے ایک قطرہ کو بحر اوقیانوس سے نسبت ہوتی ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر کچھ دانشوروں کی گواہی کو بطور نمونہ پیش کیا جائے تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ اس بارے میں کیا کہتے ہیں بطور مشن نمونہ از خروارے۔

۱۔ مشہور ڈاکٹر اور ماہر نفسیات کورسی مورسین ’اپنی کتاب راز آفریش انسان میں لکھتے ہیں:

’جب ہم غیر متناہی فضا کے بارے میں سوچتے ہیں اور زمانے کے بارے میں غور و فکر کرتے ہیں جن کی نہ ابتداء

[۱] ’آیا؟ چگونہ؟ چرا؟‘ نامی کتاب میں ہے، ’عصر حاضر کے ستارہ شناسوں ASTROLOGERS کا کہنا ہے کہ ہماری کہکشاں کے علاوہ اور بھی کئی چھوٹی بڑی کہکشاں موجود ہیں۔ طاقتور ٹیلیکوپوں اور کمپیوٹروں کی مدد سے ایسے ستارے موجود دکھائی دیتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عالم میں تقریباً ایک ارب کہکشاں ہیں۔‘

کا پتہ ہے اور نہ انتہا کا علم ہے یا ایٹم atom کے اندر نہفتہ طاقت energy کے بارے میں غور و فکر سے کام لیتے ہیں یا بے حد و حساب ثوابت و سیار سے مزین کہکشائوں کے متعلق غور و فکر سے کام لیتے ہیں یا سیارات شعاعوں کی قدرت پر ذہن سے کام لیتے ہیں یا زمین کی کشش کے بارے میں سوچتے ہیں یا نظام عالم سے وابستہ دوسرے قوانین کے متعلق غور و فکر کرتے ہیں تو اپنے وجود کی حقارت اور اپنے علم کی کوتاہی کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔<sup>[۱]</sup>

۲۔ ڈاکٹر الکسیس کارل اپنی کتاب انسان موجودنا شناختہ میں لکھے ہیں:

”یہ بات اچھی طرح واضح ہے کہ جن جن علوم نے بھی انسان کے بارے میں مطالعہ کیا ہے اب تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے اور ابھی تک ہماری اپنی ذات کے بارے میں معرفت بھی بہت سے نقائص کی حامل ہے۔“<sup>[۲]</sup>

یہ بات قابل توجہ ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب کا نام انسان موجودنا شناختہ بھی اسی لیے رکھا ہے جب انسان کی اپنی ذات کے بارے میں شناخت و معرفت اس حد تک محدود ہو تو دوسری کائنات کے بارے میں اس کی معرفت کا حال ظاہر ہے!

۳۔ معروف دانشور ولیم جیمز کہتے ہیں:

”ہمارا علم ایک قطرہ کی مانند ہے اور ہماری جہالت ایک عظیم سمندر کی مانند۔“

۴۔ مشہور ماہر فلکیات فلے مارٹین لکھتے ہیں:

”میں تم سے دس سال تک جہولات کے بارے میں سوال کرتا رہوں لیکن تم میرے کسی ایک بھی سوال کا جواب نہ دے سکو۔“<sup>[۳]</sup>

۵۔ وہ ایک اور مقام پر کہتے ہیں:

”ہم سوچتے اور غور و فکر کرتے ہیں یہ فکر کیا چیز ہے؟ ہم چلتے ہیں تو عضلات (پٹھوں) کا یہ عمل کیسا ہے اسے کوئی بھی نہیں جانتا میں اپنے ارادے کو ایک غیر مادی طاقت سمجھتا ہوں لیکن جب میں ارادہ کرتا ہوں تو اپنے ہاتھ کو اوپر اٹھاتا ہوں دیکھتا ہوں کہ میرا غیر مادی ارادہ میرے مادی ہاتھ کو حرکت دیتا ہے تو یہ صورت حال کیسے وجود میں آتی ہے؟ میری عقلی طاقتوں کے درمیان وہ کون واسطہ ہے جو مادی نتیجہ دیتا ہے؟ آج تک کوئی بھی ایسا نہیں

[۱] راز آفرینش انسان ص ۸۷

[۲] انسان موجودنا شناختہ، ص ۵

[۳] کتاب ”علی اطلال المذہب المادی“ ص ۱۳۸

جو اس سوال کا جواب دے سکے۔“ [۱]

جب روزمرہ کے مسائل کے بارے میں ہماری معلومات اس حد تک ہوں تو پیچیدہ یا زمان و مکان کے لحاظ سے دور ترین مسائل کے بارے میں ان کا حال صاف ظاہر ہے۔

۶۔ نسبت اور بعد چہارم کے نظریہ کے موجد مشہور و معروف ریاضی دان آئن سٹائن اپنی کتاب میں کہتے ہیں:

”اب تک ہم نے جو کچھ کتابِ طبیعت میں پڑھا ہے اس سے بہت کچھ سیکھا ہے اور ہم زبانِ طبیعت کیا اصولوں سے آشنا ہوئے ہیں..... لیکن اس کے باوجود بھی ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ جو کتابیں پڑھی اور سمجھی جا چکی ہیں ابھی تک اسرارِ طبیعت کے مکمل طور پر حل کرنے سے کافی دور ہیں۔“ [۲]

ان تمام شہادتوں پر ایک اور جملہ کا اضافہ کرنا چاہیے اور وہ یہ کہ:

”عجیب بات تو یہ ہے کہ جس قدر تازہ انکشافات ہوتے جاتے ہیں انسانی مہولات کے حجم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے بالفاظِ دیگر مختلف موضوعات میں دانشوروں کے نئے انکشافات تازہ لائبریریوں یا روئے زمین کے مختلف نقاط میں گراں قیمت دقینوں کی دریافت کی مانند ہیں۔“

ظاہری بات ہے کہ اگر ہم نے کسی شہر میں کوئی لائبریری دریافت کر لی یا کسی جنگل میں کسی دفینہ کو دریافت کر لیا تو ایک مہول کو تو دریافت کر لیا لیکن اس کے ہزاروں مہولات اور اکٹھا ہو گئے مثلاً کتابوں کی تعداد ان کے مطالب ان کے قلم کار اور دیگر بہت سی تفصیلات اور یہی حال دفینے کا ہے۔

زیادہ دور نہ جائیں جب میکروسکوپ کے ذریعہ دیکھی جانے والی چیزوں (جراثیم بیکٹریا اور وائرس) کے جہان کی دریافت نہیں ہوتی تھی تو یہ سب چیزیں انسان کے لیے مکمل طور پر مجہول تھیں لیکن جونہی لوئی پاستور Luis Pasteur نے اس سلسلے میں آگے قدم بڑھایا تو ہزاروں مہولات کا ایک عظیم عالم اس کے آگے اکھڑا ہوا۔

منظومہ شمسی یورینس پنچون اور پلوٹون اور تازہ کہکشانوں کی دریافت سب اسی قسم سے ہیں اس مقام پر پہنچ کر ہمیں نہایت ہی عاجزی سے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ تمام انسانی علوم و دانش ایک شمع کی روشنی کی مانند ہیں اور اس کائنات کے حقائق نورِ آفتاب کی مثل بلکہ اس سے بھی عظیم!

یہیں پر ہمیں مجبوراً کہنا پڑتا ہے ”سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا“

اس گفتگو کو ہم کائنات کے ایک عظیم قادر الکلام یعنی امیر المومنین علی بن ابی طالبؑ کے خطبہ اشباح کے ان الفاظ کے ساتھ ختم

[۱] کتاب ”علی اطلال المذہب المادی“ ص ۱۳۸

[۲] خلاصہ فلسفہ نسبیت



کرتے ہیں۔

”واعلم ان الراسخين في العلم هم الذين اغناهم عن اقتحام السدد  
المضروبة دون الغيوب، الاقرار بجملة ما جهلوا تفسيرا من الغيب  
المحجوب، فمدح الله تعالى اعترافهم بالعجز عن تناول ما لم يحيطوا به  
علما، وسمى تركهم التعقب فيما لم يكلفهم البحث عن كنهه رسوخا  
فاقتصر على ذلك ولا تقدر عظمة الله سبحانه على قدر عقلك فتكون  
من الهالكين“

آگاہ رہو! راسخون فی العلم وہ لوگ ہیں جنہیں خداوند عالم نے ان سے چیزیں پوشیدہ ہیں ان کے اجمالی  
اقرار کے ساتھ مخفی اسرار میں دخل دینے سے بے نیاز کر دیا ہے اور خدا نے ان کی اس بات پر تعریف کی ہے کہ جس  
چیز کی تفسیر سے بے خبر ہیں اس کے بارے میں اپنے عجز اور ناتوانی کا اعتراف کرتے ہیں اور جو چیز ان کے ذمہ  
نہیں لگائی اس کے بارے میں غور و فکر اور بحث مباحث میں نہ پڑنے کا نام رسوخ کی لاعلم رکھا ہے (اور انہیں  
راسخون فی العلم کہا ہے) تو بھی اسی چیز پر اکتفا کر اور عظمتِ خداوندِ تعالیٰ کو اپنی عقل کے پیمانے پر جانچنے کی  
کوشش نہ کرو ورنہ ہلاک ہو جائے گا۔ □

## چند ضروری باتیں

انسان کا اپنے علم کی محدودیت کی طرف متوجہ ہونا مندرجہ ذیل مثبت آثار اور تعمیری نتائج کا حامل ہوتا ہے:

## ۱۔ علمی غرور کا سد باب:

ہم سب کو معلوم ہے کہ بنی نوع انسان نے علمی غرور کی بدولت بڑے بڑے نقصانات اٹھائے ہیں جس کا ایک نمونہ اٹھارویں صدی  
عیسوی میں یورپ میں ظاہر ہوا، جب وہاں پر سائنسی علوم کی ایسی لہر دوڑی کہ جس سے بعض دانشور اس قدر علمی غرور کا شکار ہو گئے کہ انہوں نے یہ  
سمجھ لیا کہ کائنات کے تمام اسرار و رموز کو حل کر چکے ہیں اسی بناء پر انہوں نے اپنی معلومات کے علاوہ باقی تمام چیزوں کا انکار کر دیا بلکہ بعض  
واقعات تو وہ ان کا مذاق بھی اڑایا کرتے تھے حتیٰ کہ بعض لوگوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ جب تک ہم روح کو آپریشن تھیٹر میں لا کر اس کا نشتر کے



ذریعہ آپریشن نہ کر لیں اسے نہیں مانیں گے اور یہ بھی کہا چونکہ خدا ہمارے حواس کے ذریعہ قابل ادراک نہیں ہے لہذا اس کا وجود ہی نہیں ہے۔ اس علمی غرور سے بہت سی مشکلات اور پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں جن کے دور کرنے کا واحد علاج یہی ہے کہ انسان اپنی مجہولات کے مقابلے میں اپنی معلومات کو حقیر اور ناچیز سمجھے جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں۔

یہ اسی واقعیت کی جانب توجہ کا نتیجہ ہے کہ ایک عظیم دانشور اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوتا نظر آتا ہے کہ میرا علم اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ میں جان گیا ہوں کہ کچھ بھی نہیں جانتا وہ اپنی معلومات کو صفر Zero اور مجہولات کو لامتناہی سمجھتا ہے۔

## ۲۔ تیز تر علمی حرکت:

اس حقیقت کی توجہ انسان کو عالم ہستی کے راز کھولنے کے لیے زیادہ سے زیادہ تلاش و کوشش اور مخلصانہ جدوجہد اختیار کرنے پر آمادہ کرتی ہے اس کی تلاش و کوشش میں اس وقت اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے جب وہ اپنے سامنے شناخت و معرفت کی راہیں کھلی دیکھتا ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ معلومات کے حصول میں کبھی مایوس نہیں ہوتا۔

ظاہری بات ہے کہ جب تک انسان اپنے نقص کا احساس نہ کرے کمال کی جانب قدم نہیں اٹھا سکتا؟ جب تک درد کا احساس نہ کرے دوا کی تلاش میں نہیں نکلتا اسی لیے تو کہتے ہیں کہ درد کا احساس خدا کی ایک عظیم نعمت ہے اور بدترین بیماری وہ ہے جس کے ساتھ درد نہ ہو کیونکہ انسان اس سے اس وقت باخبر ہوتا ہے جب وہ اس کا خاتمہ کر چکی ہوتی ہے۔

انسانی معلومات کے ناچیز ہونے کی طرف توجہ کا انسان کے لیے یہ مثبت رد عمل ہوتا ہے کہ وہ اسے زیادہ سے زیادہ تحقیقات پر آمادہ کرتی ہے اور قرآن نے انسانی علم کے ناقص ہونے کی بار بار جو تاکید کی ہے شاید اس کا ایک مقصد بھی یہی ہے۔

۳۔ بالاترین مبداء کی طرف توجہ: علمی نقص اور انسانی معلومات کی محدودیت کا احساس ہر انسان میں ایک اور مثبت اثر پیدا کرتا ہے کہ وہ چارونچا خود کو بالاترین مبداء کا محتاج سمجھتا ہے ایسا مبداء تمام کائنات کے اسرار و رموز جس کے سامنے واضح اور روشن ہیں اور یہی چیز اسے انبیاء کی دعوت قبول کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور فوق انسانی ذرائع کی طرف توجہ کی راہیں اس کے لیے کھولتی ہے۔

بہر حال علم انسانی کی محدودیت کی طرف توجہ اس بات سے قطع نظر کہ وہ ایک حقیقت اور واقعیت ہے مثبت تربیتی آثار کی حامل بھی ہے۔

## ۲۔ معرفت کے منابع اور ذرائع

(معرفت کے چھ راستے)

احساس اور تجربہ  
عقل و منطقی تجزیہ و تحلیل  
مرتب اور غیر مرتب تاریخ  
فطرت اور ضمیر  
وحی اور خدائی پیام  
کشف اور شہود

## اشارہ

اب جبکہ شناخت اور معرفت تک رسائی کے امکانات اجمالی طور پر ثابت ہو چکے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ اب شناخت کے طریقوں یا بالفاظ دیگر ان منابع کو تلاش کریں جو ہمیں اس کائنات کی واقعت سے باخبر کریں اور واقعت کو حقیقت میں تبدیل کرنے کے لیے ان معلمین سے مکمل طور پر استفادہ کریں کیونکہ معرفت کے ان منابع اور ذرائع میں سے ہر ایک ایسے معلم کی حیثیت رکھتا ہے جو کائنات کے رازوں پر پڑے ہوئے پردے اٹھاتا ہے

سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اس بارے میں قرآن پاک کیا کہتا ہے؟ کیونکہ ہماری بحث کا اصل محور وہی تفسیر موضوعی اور قرآنی تعلیمات کے بارے میں تحقیق کرنا ہے۔

قرآن مجید کی مختلف آیات جو سب کی سب اس آسانی کتاب کے اندر مختلف مقامات پر موجود ہیں کے بارے میں ہم مکمل تحقیق سے اس واقعت پر پہنچتے ہیں کہ قرآنی نقطہ نظر سے معرفت کے منابع اور ذرائع چھ ہیں۔

۱۔ احساس اور تجربہ (یا طبیعت)۔

۲۔ عقل اور منطقی تجزیہ اور تحلیل۔

۳۔ مرتب اور غیر مرتب تاریخ

۴۔ فطرت اور ضمیر۔

۵۔ وحی اور خدائی پیغام۔

۶۔ کشف اور شہود۔

## احساس اور تجربہ

سب سے پہلے مندرجہ ذیل آیات کو سنتے ہیں۔

۱۔ أَفَلَمْ يَنْظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا وَمَا لَهَا مِنْ

فُرُوجٍ ۝۶ (سورہ لقمان ۶)

۲۔ أَوَلَمْ يَنْظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ ۝۷

(سورہ اعراف ۱۸۵)

۳۔ أَفَلَا يَنْظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۝۱۶ وَآلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۝۱۸

وَالِی الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ<sup>١٩</sup> وَالِی الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ<sup>٢٠</sup>

(سورہ فاشیہ ۷ تا ۲۰)

۳۔ فَانظُرْ إِلَىٰ آثَرِ رَحْمَتِ اللَّهِ كَيْفَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا<sup>ط</sup>

(سورہ روم ۵۰)

۵۔ فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ<sup>٥</sup> خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ<sup>٦</sup> (سورہ طارق ۶، ۵)

۶۔ فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ<sup>٣٣</sup> أَتَا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا<sup>٣٥</sup> ثُمَّ شَقَقْنَا

الْأَرْضَ شَقًّا<sup>٣٦</sup> فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا<sup>٣٧</sup> وَعَبَبْنَا وَقَضَبًّا<sup>٣٨</sup> (عبس ۲۳ تا ۲۸)

۷۔ أَوْلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ الْأَرْضِ كَمْ أَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ<sup>٤</sup>

(سورہ شعراء ۷)

۸۔ أَوْلَمْ يَرَوْا أَتَا نَسُوقَ الْمَاءِ إِلَىٰ الْأَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا تَأْكُلُ مِنْهُ

أَنْعَامُهُمْ وَانْفُسُهُمْ<sup>ط</sup> أَفَلَا يُبْصِرُونَ<sup>٢٥</sup> (سورہ الم سجدہ)

۹۔ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْأَفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ<sup>١</sup>

(الحم سجدہ ۵۳)

۱۰۔ أَوْلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَفْتٍ وَيَقْبِضْنَ<sup>١</sup> مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا

الرَّحْمَنُ<sup>ط</sup> إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيرٌ<sup>١٩</sup> (سورہ ملک ۱۹)

۱۱۔ وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُوقِنِينَ<sup>٣٠</sup> وَفِي أَنْفُسِكُمْ<sup>ط</sup> أَفَلَا تَبْصِرُونَ<sup>٣١</sup>

(سورہ ذاریات ۲۰ تا ۲۱)

۱۲۔ وَاللَّهُ أَخْرَجَكُمْ مِنْ بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا<sup>١</sup> وَجَعَلَ لَكُمُ

السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ<sup>١</sup> لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ<sup>٤٨</sup> (سورہ نحل ۷۸)

البتہ اس بارے میں قرآن مجید کی آیات فراواں ہیں اور مذکورہ بالا آیات اس سلسلہ کے مختلف واضح نمونے ہیں۔ [۱]

ترجمہ

۱۔ کیا ان لوگوں نے اپنے اوپر آسمان کی طرف نظر نہیں کیا کہ ہم نے اسے کیونکر بنایا اور ستاروں کے ذریعہ اسے کیسی زینت دی؟ اور اس میں کہیں بھی شگاف اور ناموزونیت نہیں۔

۲۔ کیا ان لوگوں نے آسمانوں اور زمین کے ملکوت کے بارہ میں اور جو کچھ کہ خدا نے پیدا کیا (غور و عبرت) کی نظر ڈالی؟

۳۔ آیا وہ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کیسے پیدا کیا گیا؟ آسمان کی طرف نگاہ نہیں کرتے کہ کیسے بلند کیا گیا؟ اور پہاڑ کیسے گاڑے گئے؟ اور زمین کیسے بچھائی گئی؟

۴۔ رحمتِ خداوندی کے آثار کو دیکھو کہ زمین کو اس کے مرنے کے بعد کیونکر زندہ کرتا ہے؟

۵۔ انسان کو چاہیے کہ یہ دیکھے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے؟ ایک ٹپکنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔

۶۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی غذا کی طرف نگاہ کرے ہم نے بہت سا پانی آسمان سے نیچے ڈالا پھر زمین کو شگافتہ کیا اور اس میں بہت سے دانے اُگائے اور انکو اور بہت سی سبزی کو۔

۷۔ کیا انہوں نے زمین کی طرف نہیں دیکھا، ہم نے اس میں کس حد تک نباتات کی قسمیں اگائیں؟

۸۔ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم خشک زمینوں کی طرف پانی کو چلاتے ہیں اور اس کے ذریعہ سے کھیتیاں اُگاتے ہیں جس سے ان کے چوپائے بھی کھاتے ہیں اور وہ خود بھی خوراک حاصل کرتے ہیں آیا وہ نہیں دیکھتے؟

۹۔ ہم بہت جلد اپنی نشانیاں انہیں کائنات کے اطراف میں بھی اور ان کی اپنی جانوں میں بھی دکھائیں گے تاکہ ان کے لیے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کہ وہ حق ہے۔

۱۰۔ آیا انہوں نے ان پرندوں کو نہیں دیکھا جو ان کے سروں کے اور پر اپنے پر کھولے ہوئے ہیں اور کبھی سمیٹ لیتے ہیں خداوندِ رحمان کے سوا کوئی اور انہیں آسمان کی بلندیوں میں نہیں روکتا کیونکہ وہ ہر چیز کو دیکھتا ہے۔

۱۱۔ اور زمین میں یقین کے طلبگاروں کے لیے نشانیاں ہیں اور خود تمہارے اپنے اندر (بھی نشانیاں ہیں) کیا تم نہیں دیکھتے؟

[۱] اس بارے میں مندرجہ آیات کی طرف رجوع فرمائیں: سورہ اعراف ۱۸۵، یوسف ۱۰۹، روم ۹، غافر ۶، نحل ۹، شعراء ۷، احقاف

۳۳، ملک ۱۹، یسین ۷۷، انعام ۶، نحل ۸، مومنون ۸، ق ۳، احقاف ۲۶، ہود ۲۴، غافر ۲۱، محمد ۱۰۔

۱۲۔ اور خداوند عالم نے تمہیں ماؤں کے شکم سے باہر نکالا ہے جبکہ تم کچھ نہیں جانتے تھے لیکن تمہارے لیے کان، آنکھ اور عقل بنائے ہیں تاکہ تم اس کی نعمتوں کا شکر بجالاؤ۔

## الفاظ کی تشریح

ملکوت کے بارے میں ”راغب“ مفردات میں کہتے ہیں کہ یہ ملک کا مصدر ہے جس کے ساتھ ”ت“ کا اضافہ کیا گیا ہے اور صرف خدا کی مالکیت کے بارے میں ہی استعمال کیا گیا ہے اور مجمع الجریں اور لسان العرب ملکوت کے معنی عزت اور سلطنت ہیں بعض ارباب لغت یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کی اصل ”ملک“ (بروزن حکم) ہے جس کے معنی حکومت اور مالکیت ہیں اور ”واؤ“ اور ”تا“ کا اضافہ تاکید اور مبالغہ کے لیے ہے۔

”قضب“ (بروزن جذب) کے بارے میں لسان العرب کا کہنا ہے کہ یہ دراصل قطع کے معنی میں ہے اور جیسا کہ بہت سے مفرین کہتے ہیں اس کے معنی وہ سبزیاں ہیں جنہیں مختلف باریوں میں چٹنا جاتا ہے۔<sup>[۱]</sup>

”جرز“ (بروزن شتر) کے معنی بے آب و گیاہ زمین کے وہیں یا وہ زمین جہاں پر گھاس نہیں اُگتی اور ”جرز“ (بروزن مرض) کے معنی کاٹنا ہے اور لسان العرب میں بعض ارباب لغت سے منقول ہے کہ..... زمین اس زمین کو کہتے ہیں جس سے گھاس کاٹ لی گئی ہو یا جہاں بارشوں کا سلسلہ منقطع ہو جائے۔

”افئدہ“ جمع ہے فواد۔ کی اور راغب کے بقول اس کے معنی قلب ہیں البتہ فواد اور قلب میں یہ فرق ہے کہ فواد ایسے دل کو کہتے ہیں جس میں روشنی اور چمک کی حالت پائی جاتی ہو اور یہ بات قابل توجہ ہے کہ خداوند عالم نے ایسے دل کو اپنی نعمت میں شمار کیا ہے جو خود بھی روشن ہو اور دوسرے دلوں کو بھی روشن کرے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ لسان العرب نے اس کلمہ کو فواد، (بروزن عد) سے لیا ہے جس سے معنی بھن کر پختہ ہو جانا ہے اسی لیے فواد..... ان عقول کی طرف اشارہ ہے جن کے افکار پختہ ہوتے ہیں۔

## تفسیر اور جمع بندی

پہلی آیت میں لوگوں کی توجہ آسمان، اس کی زیبائشوں اور آسمانی کروں کی بناوٹ کی طرف دلائی گئی ہے خصوصاً ان چیزوں میں ناموزونیت کی طرف ان کو توجہ دلائی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ زیبا ہیں محکم ہیں منظم ہیں اور ہر قسم کے نقص و عیب سے خالی ہیں۔

[۱] تفسیر المیزان، جلد ۲۰، ص ۱۶ اور مجمع البیان جلد ۱۰، ص ۴۰ اور ابن عباس سے منقول ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں ”قضب“ سے مراد وہ تازہ کھجوریں ہیں جنہیں درخت سے چٹنا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ بعد کی آیت میں اس کا ذکر علیحدہ صورت میں کیا گیا ہے اس لئے یہ تفسیر بعید معلوم ہوتی ہے۔ بعض مفسرین کا احتمال ہے کہ ”قضب“ سے مراد بیل بوٹوں اور پودوں پر لگنے والے پھل ہیں جیسے کھیرا، مکڑی، تربوز اور خر بوزہ وغیرہ یا نباتاتی ریشے ہیں، جیسے گجر اور گوبھی وغیرہ۔

دوسری آیت میں دلوں کو بیدار کرنے اور توحید و خدا شناسی کی راہ پر چلنے کے لیے تمام انسانوں کو زمین و آسمان کے نظام اور مخلوق خدا کے مشاہدہ کی دعوت دی گئی ہے اور تیسری آیت میں آسمان سے زمین کی طرف متوجہ کیا گیا ہے اور انسانوں کو دو چیزوں کی طرف توجہ کرنے کی دعوت دی گئی ہے ایک تو اونٹ اور اس کے بہت سے عجائبات کی طرف (خاص کر ان لوگوں کو جنہوں نے قرآن کے ماحول میں رہ رہے تھے) اور دوسرے کرہ زمین کی سطح (ہموار) ہونے کی طرف کہ جو انسانی زندگی کے قابل ہے اور مشاہدہ کو تمام مراحل میں معرفت کے ایک مؤثر منبع کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا ہے۔

چوتھی آیت میں پیغمبر اکرمؐ کو مخاطب کرتے ہوئے انہیں بارش کے نزول اور مردہ زمینوں کے زندہ ہونے کی طرف متوجہ کراتے ہوئے فرماتا ہے رحمت خداوندی کے آثار کو دیکھو کہ کس طرح مردہ زمین کو زندہ کرتا ہے!

پانچویں آیت میں انسان کا ذکر ہے اور خصوصی طور پر اس کے مبداء آفرینش کی نشاندہی کراتے ہوئے فرماتا ہے ہر انسان کو چاہیے کہ یہ دیکھے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے؟ اس ٹپکنے والے ناچیز پانی سے! اور یہاں پر بھی حس اور مشاہدہ کو معرفت کا ذریعہ بنایا ہے۔

چھٹی آیت میں انسان کو حکم دیا جا رہا ہے کہ ذرا آنکھوں کو کھول اور اپنی خوراک پر نظر ڈال کہ اس کی کیونکر پرورش کی گئی؟ اس پرورش کے لیے بارش کو نازل کیا گیا اور زمین کو شگافتہ کیا گیا ہے نباتات اور غلہ کے پودوں نے وہاں سے سر اٹھایا میوے نکلے اور کھانے کی سبزی نمودار ہوئی اگر تو اس کے ہر پتے کو غور سے دیکھے تو تجھے اس میں معرفت پروردگار کی ایک بہت بڑی کتاب نظر آئے۔

مندرجہ بالا چھ آیات نظر کو دعوت دے رہی ہیں جبکہ ان کے بعد کی پانچ آیات رؤیت کو اگرچہ یہ دونوں الفاظ بہت مقامات پر ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں لیکن جیسا کہ لغت کی بعض معروف کتابوں سے معلوم ہوتا ہے نظر کے معنی کسی چیز کے مشاہدہ کے لیے آنکھ کو گردش دینا اور اس کے بارے میں غور و فکر کرنا ہے۔

جبکہ خود مشاہدہ کو رؤیت کہا جاتا ہے۔ [۱] البتہ کبھی ان دونوں الفاظ میں سے ہر ایک کو حسّی مشاہدہ کے معنی میں استعمال کیا ہے اور کبھی ذہنی اور فکری مشاہدہ کے معنی میں لیکن اس بات کو ضرور پیش نظر رکھا جائے کہ اس کے اصل معنی وہی حسّی مشاہدہ ہے۔

بہر حال ساتویں آیت میں کفار کو نباتات کی مختلف انواع کے مشاہدہ کی دعوت دی جا رہی ہے جو روئے زمین کے کونے کونے پر جوڑے جوڑے کی صورت میں اُگتی ہیں۔

آٹھویں آیت میں ان (کفار) کو بادل کے ذرات میں دریاؤں کے پانی کی حرکت کی کیفیت اور اس کے خشک اور ویران زمین پر برسنے کی نوعیت کے مشاہدہ کی دعوت دی جا رہی ہے کہ اس پانی سے کس طرح مردہ زمینیں زندہ ہوتی ہیں اور سبزہ و نباتات اُگتی ہیں جن سے انسان بھی استفادہ کرتے ہیں اور چوپائے بھی۔

نویں آیت میں آفاق اور انفس کی آیات یعنی خدا کی وہ نشانیاں جو عالم اکبر یعنی کائنات میں اور عالم اصغر یعنی خود انسان کے وجود میں

[۱] ”مفردات راغب“ اور ”لسان العرب“ مادہ ”نظر“ کی طرف رجوع کیا جائے۔

پائی جاتی ہیں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ہم یہ آیات مستقل طور پر اور مسلسل صورت میں انسانوں کو دکھاتے رہتے ہیں تاکہ وہ خدا کے وجود کو تسلیم کر لیں اور حق ان پر آشکار ہو جائے۔

دسویں آیت میں پرندوں کے مشاہدہ کی بات ہو رہی ہے کہ کس طرح وہ ہمارے روں پر پرواز کرتے رہتے ہیں کبھی تو وہ اپنے پروں کو کھول لیتے ہیں اور کبھی بند کر دیتے ہیں اور آسمان کی بلندیوں میں ان اپنے پروں کو کھولنا اور بند کرنا ہی انہیں اڑاتا رہتا ہے اور کوشش ثقل کے قانون کے برعکس وہ خود کو آسانی کے ساتھ زمین و آسمان کے درمیان محفوظ رکھے ہوئے ہیں کبھی تو پروں کو کھول کر تیزی کے ساتھ پرواز کرتے ہیں گویا کوئی مخفی طاقت انہیں آگے بڑھا رہی ہے اور کبھی پروں کو بند کر کے تیز پروازی میں مصروف ہوتے ہیں اور پھر یہ ہر ایک کی اپنی راہ و رسم ہے بناوٹ اور مخصوص شکل و صورت ہے اور ہر ایک کے اپنے وسائل زندگی اور طور و طریقے ہیں۔

گیارہویں آیت میں ایک بار پھر زمین کی آفرینش اور پھر خود انسانی وجود کی تخلیق کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے کہ خود انسان کا اپنا وجود کتنا چھوٹا ہے لیکن اپنے اندر ایک عظیم اور چہل پہل سے لبریز دنیا لیے ہوئے ہے "افلا تبصرون" کے جملہ سے ان لوگوں کو سرزنش کی جا رہی ہے جو آنکھیں تو رکھتے ہیں اور آنکھیں کھلی ہوئی بھی ہوتی ہیں لیکن وہ ان آنکھوں سے واقعات کو نہیں دیکھتے۔

(توجہ رہے کہ بصیرت کا مادہ بصر ہے جس کے معنی ہیں آنکھ یا آنکھ کی نگاہ باوجودیکہ وہ نظر اور رؤیت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن اس سے مختلف ہے کیونکہ اس کا زیادہ تر دار و مدار بینائی کے عضو اور اس کی طاقت پر ہوتا ہے اور ان دونوں الفاظ (نظر اور رؤیت) کی مانند کبھی اندرونی مشاہدہ اور غور و فکر کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے)۔

اور آخر کا اس سلسلے کی آخری آیت کان آنکھ اور دل کی طرف توجہ دلا رہی ہے کہ شناخت و معرفت کے تین اصل عوامل ہیں اور یہ شناخت و معرفت کے لیے ایک اصل منبع کی حیثیت سے حسن اور مشاہدہ کی روشن دلیل ہیں۔

## نتیجہ

مندرجہ بالا آیات میں جو زیادہ تر توحید اور خدا شناسی کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں اس راہ کو طے کرنے اور منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے ان انسانوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ وہ ٹھیک طریقوں سے اپنی آنکھیں کھولیں اور کائنات کی ایک ایک چیز کی پیشانی پر اللہ کا نام غور سے دیکھیں ان کے عجائبات کا مطالعہ کریں ان پر حکم فرما صحیح نظاموں کا غور سے مشاہدہ کریں اور برہان نظم کے بعد صرف ذاتِ خدا ہی نہیں بلکہ اس کی توحید تہذیب قدرت اور اس کے لامتناہی علم کا ادراک بھی کریں۔

چونکہ اسلام میں سب سے اہم مسئلہ توحید اور خدا شناسی کا مسئلہ ہے اور قرآن مجید میں اس کی اہم ترین دلیل برہان نظم ہے کا اہم ترین ماخذ و منبع یہ کائنات اور اس کی آفرینش ہے اسی لیے قرآنی نقطہ نظر سے حسن مشاہدہ اور تجربہ کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

نہ صرف خدا شناسی کے مسئلے بلکہ معاد کا مسئلہ بھی قرآن مجید کے حسی مشاہدات سے کافی حد تک استفادہ کرتا ہے جو خدا شناسی کے بعد دوسرا اہم مسئلہ ہے اور معاد کے مناظر کو قرآن مجید کی بہت سی آیات میں اس جہان طبیعت میں لوگوں کی آنکھوں کے سامنے مجسم کر کے پیش کرتا



ہے بطور نمونہ سورہ ق کی آیت میں ۱۱ تا ۱۹ میں ہم پڑھتے ہیں:

وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُّبَارَكًا فَأَنْبَتْنَا بِهِ جِبْتًا وَحَبَّ الْحَصِيدِ ۝ وَالنَّخْلَ  
بِسِقِّ لَهَا طَلْعٌ نَضِيدٌ ۝ رِزْقًا لِلْعِبَادِ ۝ وَأَحْيَيْنَا بِهِ بَلْدَةً مَّيْتًا ۝ كَذَلِكَ  
الْخُرُوجُ ۝

ہم نے آسمان سے برکت والا پانی برسایا تو اس سے باغات اور اناج اور لمبی لمبی کھجوروں کو اگایا جن کا بُور باہم گتھا ہوا ہوتا ہے (یہ سب کچھ) بندوں کو روزی دینے کے لیے (پیدا کیا) اور پانی سے ہی مردہ زمینوں کو زندہ کیا بروز قیامت مُردوں کا زندہ ہونا بھی اسی طرح ہے۔

اسی طرح ظلم و ستم اور بدکاروں کے انجام و عاقبت کو واضح کرنے کے لیے لوگوں کو ظالموں کے باقی ماندہ آثار اور تباہ شدہ شہروں کے کھنڈرات کے مشاہدہ کی دعوت دیتا ہے۔

یہ سب کچھ قرآن مجید کی طرف سے شناخت اور معرفت کے لیے حس و مشاہدہ سے استفادہ کرنے کی بہت بڑی تاکید ہے۔ (غور

کیجئے گا)

## چند توضیحات

### فلاسفہ اور حسن کا منبع:

بیرونی دنیا سے ہمارا آگاہ ہونا کن مراحل کو طے کرتا ہے اور کن راستوں سے ہمارے اندر داخل ہوتا ہے اس بارے میں فلاسفہ کے درمیان بہت اختلاف ہے لیکن دنیا کے اکثر فلاسفہ حسن اور حسنی تجربہ کو شناخت اور معرفت کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ سمجھتے ہیں ہر چند کہ ان کے مقابلے میں فلاسفہ کے دو اور گروہ بھی ہیں جو کہ افراد اور تفریط کی صورت میں ظاہر ہوئے ہیں۔

۱۔ ایک گروہ جسے حسیون کہتے ہیں صرف حس ہی کو شناخت کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور عقل و خرد کے دوسرے منابع کا انکار کرتے ہیں۔

یہ لوگ سترھویں صدی عیسوی کے بعد منصفہ شہود پر آئے ہیں اور قیاس عقلی کے برہان کا مکمل طور پر انکار کرتے ہیں اور تجرباتی طریقہ کار ہی کو صحیح اور قابل اعتماد طریقہ کار سمجھتے ہیں اس گروہ کے نظریہ کے مطابق جو نظری اور عقلی تجربہ علم (سائنس) سے جدا ہو اس کی نہ تو کوئی بنیاد ہوتی ہے اور نہ ہی اساس اور علم حواس ہی سے حاصل ہوتا ہے اور حواس کا تعلق صرف ظاہر اور عوارض سے ہوتا ہے لہذا فلاسفہ کے ابتدائی مسائل جو صرف نظری اور عقلی ہوتے ہیں اور ان کا تعلق غیر محسوس امور سے ہوتا ہے بے اعتبار اور بے بنیاد ہوتے ہیں اور انسان کے لیے اس قسم کے مسائل

نفسی اور اثبات کے لحاظ سے ناقابل ادراک ہوتے ہیں۔<sup>[۱]</sup>

مادہ پرست materialists اور بڑی حد تک کارل مارکس کی منطق کے پیروکار dialaictics بھی اس نظریے کے یکے طرفدار ہیں وہ کہتے ہیں:

”اگر خارجی اشیاء کی تاثیر کے تمام راستے channels ہمارے حواس سے منقطع ہو جائیں یعنی ان میں سے کوئی بھی کام نہ کرے تو ہمیں کسی بھی قسم کی معلومات حاصل نہ ہوں اور مغز انسانی ہر طرح کی گرمی سے عاجز آ جائے لہذا خارجی واقعات کی شناخت ناممکن ہے اس بناء پر ہر چیز کے معاملے میں ہماری شناخت اور فیصلے کی بنیاد احساس بنا بریں یہ کہنا چاہیے کہ احساس ہی شناخت کا سرچشمہ اور تہا سرچشمہ ہے۔“<sup>[۲]</sup>

۲۔ ان کے مقابلہ میں ایک دوسرا گروہ ہے جو حس اور تجربہ کا مکمل انکار کرتا ہے اور معرفت کے بارے میں اسے ذرہ بھر بھی اہمیت نہیں دیتا۔

”ڈکارٹ کہتے ہیں کہ جو مفاد ہم پہنچا نہ حواس کے ذریعہ خارج سے ہمارے ذہن میں داخل ہوتے ہیں ان کے بارے میں ہمیں کوئی اطمینان نہیں ہے کہ خارج میں ان کا کوئی مصداق بھی ہے اور اگر ہو بھی تو یہ یقین نہیں کہ ذہن میں موجود صورت خارجی امر کے مطابق بھی ہے۔“<sup>[۳]</sup>

سیر حکمت دراروپا کے مصنف یہاں پر اس بات کا اضافہ کرتے ہیں کہ:

”ڈکارٹ کا یہ نظریہ تھا کہ انسانی محسوسات واقع کے مطابق نہیں ہیں وہ تو صرف عالم جسمانی کے ساتھ بدن کے رابطے کا ذریعہ ہیں اور ہمارے لیے عالم کی ایک ایسی تصویر بناتے ہیں جس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی..... اس کا نظریہ تھا کہ فقط نظری مفاد ہم ہی علم واقعی کی بنیاد ہیں۔“<sup>[۴]</sup>

خلاصہ کلام اس گروہ کا یہ عقیدہ ہے کہ صرف معقولات ہی یقینی اور معرفت کی قدر و قیمت کے حامل ہیں اور تہا محسوسات کی نہ تو کوئی عملی حیثیت ہے اور نہ ہی یقینی۔<sup>[۵]</sup>

پہلا گروہ عقل نظری کی غلطیوں اور مسائل عقلی کے بارے میں دانشوروں کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کا سہارا لیتا ہے جبکہ دوسرا گروہ حواس کی غلطیوں کا اور اس بارے میں انہوں نے صرف حسن باصرہ (حس بینائی) کی بے شمار غلطیاں گنوا ڈالی ہیں جو ایک اہم

[۱] اصول فلسفہ و روش انا لیسیم، جلد ۱، ص ۶ (تھوڑی سی تلخیص کے ساتھ)

[۲] ماترہ بسیم و دیالتیک (از نیک آئین) (تھوڑی سی تلخیص کے ساتھ)

[۳] سیر حکمت دراروپا، جلد ۱، ص ۱۷۲ (تھوڑی سی تلخیص کے ساتھ)

[۴] سیر حکمت دراروپا، جلد ۱، ص ۱۷۲ (تھوڑی سی تلخیص کے ساتھ)

[۵] اصول فلسفہ، جلد چہارم (ارزش معلومات)

ترین اور وسیع ترین انسانی حس ہے۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ دونوں فریق ہی غلط فہمی کا شکار ہیں اور ان کی غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے یوں کہا جاسکتا ہے۔  
 رہا حسیوں کے بارے میں تو ان کا اہم ترین اشکال (غلط فہمی) چند نکات ہیں:

۱۔ موجودات خارجی کے بارے میں ہمیں چند مسلسل جزئی حوادث کا سامنا ہے جس نے استدلال کے لیے کسی بھی صورت میں استفادہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ استدلال کے لیے کئی قضیہ کو لیا جاتا ہے نہ کہ کسی جزئی واقعہ کو۔  
 اب یہیں پر ہمیں مجبوراً عقل کی ضرورت ہوتی ہے جو کئی جزئیات کو ملا کر ایک کلی قاعدہ بناتی ہے مثلاً ہم مختلف صورتوں میں دیکھتے ہیں کہ پتھر عام قسم کے شیشے کو توڑ ڈالتا ہے یہ اور اس قسم کے دوسرے جزئی حوادث جو حس کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں عقل میں منتقل ہو جاتے ہیں اور وہیں پر ایک کلی قاعدہ تیار ہوتا ہے۔

یا مثلاً مختلف حالات اور مختلف زمان اور مکان کے تحت حاصل ہونے والے مختلف تجربات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ روشنی خط مستقیم کے ساتھ منتشر ہوتی ہے ہماری عقل ان جزئی حوادث سے ایک ایسا کلیہ قاعدہ بناتی ہے جو خارج میں بالکل موجود نہیں ہوتا اور جو کچھ ہوتا ہے وہ اس کے مصداق ہوتے ہیں۔

بنابریں ہماری حسی معلومات ایسے خام مواد کی مانند ہوتی ہیں جو عقل کی آزمائش گاہوں laboratories میں جا کر یا تو تجزیہ ہوتے ہیں اور یا مرکب بنتے ہیں اور ان کے تجزیہ اور ترکیب سے کچھ عقلی کلی مفاد حاصل ہوتے ہیں جن سے منطقی اور استدلال کے لیے استفادہ کیا جاتا ہے۔

۲۔ اس میں شک نہیں کہ حس میں بہت سی غلطیاں ہوتی ہیں جن کی اصلاح کے لیے عقل سے استفادہ کرنا چاہیے مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ سڑک کے دونوں طرف کے درختوں کو ہماری حس متقاطع صورت میں دیکھتی ہے جو کہ دور جا کر آپس میں ملے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تو یہ ایک غلط فہمی اور خطا ہے اور اس خطا کو دور کرنے کا معیار عقل ہے یعنی جب اسے عقل کے معیار پر جانچیں گے تو یہ غلط فہمی دور ہو جائے گا۔  
 یہ ٹھیک ہے کہ اس خطا کی تشخیص کے لیے ہم اپنی حس پر بھی بھروسہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے بارہا اس سڑک کو طے کیا ہے اور ہر مقام پر نزدیک سے درختوں کے باہمی فاصلے کو ایک جیسا دیکھا ہے لیکن یہ استدلال اس وقت زیادہ جان پیدا کر لیتا ہے جب ہم اجتماع نقیضین کو محال سمجھیں اور کہیں کہ یہ بات قطعاً ناممکن ہے کہ یہ درخت باہم متوازی بھی ہوں اور غیر متوازی بھی اور اگر ہم ان درختوں کو نزدیک سے متوازی دیکھتے ہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اگر انہیں دور سے متقاطع دیکھتے ہیں تو غلط فہمی اور خطا ہے۔

اصولی طور پر اجتماع نقیضین کے محال ہونے کا مسئلہ جو صرف عقل و خرد ہی کے ذریعہ قابل فہم و ادراک ہے تمام استدلال کی بنیاد ہے اسی لیے کوئی حسی دلیل عقل کے بغیر قابل قبول نہیں ہے۔

۳۔ ان سب سے ہٹ کر ہماری حس صرف اشیاء کی سطح کا ادراک کر سکتی ہے اور ہم ایک جسم سے صرف اس کی سطحوں کو دیکھتے ہیں اسی لیے اگر عقلی ادراکات کا یہاں پر عمل دخل نہ ہو تو حقیقت جسم کے متعلق بھی کوئی نتیجہ نکالنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

ممکن ہے یہاں پر یہ بات کہی جائے کہ یہ ٹھیک ہے کہ تنہا حواس ہی مفید نہیں ہوتے اور تجرباتی علوم (سائنس وغیرہ) میں عقل کے حتی ادراکات کے تعاون اور امداد کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ تمام عقلی ادراکات حسن ہی کے ذریعہ وجود میں آتے ہیں اور مشہور برطانوی فیلسوف جان لاک کے بقول عقل میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے جو اس سے پہلے حسن میں موجود نہ ہو۔

یہ اس کا ایک یادگار جملہ ہے جو ضرب المثل کی صورت اختیار کر چکا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذہن ابتداء میں ایک بے نقش اور سفید لوح کی مانند ہوتا ہے جو حواس کے ذریعہ نقوش کو قبول کرتا ہے اور عقل کا کام صرف ان چیزوں کی تجرید یا تعمیم یا تجزیہ و ترکیب کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا جو اس کے ذریعہ اس تک جا پہنچتی ہیں۔

جواباً عرض ہے کہ ایسا کہنا بہت بڑی غلطی ہے کیونکہ ہمارے اپنے وجود کا علم (جو ایک علم حضوری ہے) حواس کے ذریعہ قطعاً حاصل نہیں ہوا۔ اس طرح حواس اور فطری مسائل کے بارے میں بھی ہمارے علم حسن کے ذریعہ حاصل نہیں ہوا جیسے اجتماع نقیضین کے محال ہونے کا مسئلہ ہے اگر ہم کوئی بھی حسن نہ رکھتے پھر بھی ہم سمجھ سکتے تھے کہ یہ بات قطعاً ناممکن ہے کہ ہم موجود بھی ہیں اور موجود نہ بھی ہوں۔ اسی طرح بہت سے دوسرے مسائل ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم حسن سے بے نیاز ہیں۔

اس بارے میں اور بھی بہت سی مباحث ہیں جن پر جانے سے ہم اس کتاب کے اصل مقصد سے دُور ہو جائیں گے اور ہمارا مقصد یہ تھا کہ حیاتوں اور عقلمیوں کا نظریہ واضح ہو جائے جو ادراک کے منبع کو صرف ایک ہی پہلو تک محدود رکھتے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی نظریہ قابل قبول نہیں ہے بلکہ حسن اور عقل جدا گانہ طور پر ادراک کا ایک ایک منبع ہیں اور یہی چیز قرآن مجید میں بخوبی واضح ہے۔

## معرفت کا دوسرا منبع عقل و خرد ہے

### اشارہ

اس منبع کے بارے میں قرآن مجید کی بہت سی تعبیرات ملتی ہیں اور فرقانِ حمید کی بہت سی آیات تمام انسانوں کو شناخت اور معرفت کے لیے غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں معرفت کے اس اہم منبع کے لیے قرآن مجید میں جو تعبیرات ذکر کی گئی ہیں بہت زیادہ ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

- ۱- عقل - ۲- لُب (جس کی جمع الباب ہے) - ۳- فواد - ۴- قلب - ۵- نُحْی (بروزن ہما) - ۶- صدر - ۷- روح - ۸- نفس -
- اس کے علاوہ عقل سے متعلق کاموں کے بارے میں کچھ اور تعبیرات بھی قرآن مجید میں موجود ہیں مثلاً
- ۹- ذکر - ۱۰- فکر - ۱۱- فقہ - ۱۲- شعور - ۱۳- بصیرت - ۱۴- درایت -
- اب ہم مندرجہ بالا عنوانات میں سے ہر ایک کو آیات قرآنی کی روشنی میں زیر بحث لاتے ہیں۔<sup>[۱]</sup>
- سب سے پہلے مندرجہ ذیل آیات کو سنئے:

۱- كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۳۳﴾ (سورہ بقرہ ۵، ۲۴۲)

۲- اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الْاَيِّلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ (سورہ آل عمران، ۱۹۰)

۳- وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا ۗ وَجَعَلَ لَكُمْ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ ۗ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۴۸﴾ (سورہ نحل، ۴۸)

[۱] اس کے علاوہ قرآن مجید میں ادراک کے مراتب کے لیے کئی اور الفاظ بھی بیان ہوئے ہیں، مثلاً ظن، زعم، حساب، یقین، علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین۔ علم و ادراک کے معمولی مرحلہ سے شروع ہو کر یقین کے آخر مرحلہ تک کے مراتب کو بیان کیا گیا ہے کہ حق الیقین کے بعد کوئی اور مرحلہ نہیں ہے۔

۴۔ وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنْ قَرْنٍ هُمْ أَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوا فِي الْبِلَادِ ۖ هَلْ مِنْ مَّخِيصٍ ﴿۳۶﴾ (سورہ ق، ۳۶ تا ۳۷)

۵۔ كُلُوا وَارْعَوْا أَنْعَامَكُمْ ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّأُولِي النُّهْيِ ﴿۵۴﴾ (سورہ طہ ۵۴)  
۶۔ بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ ۗ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا الظَّالِمُونَ ﴿۳۹﴾ (سورہ عنکبوت، ۳۹)

۷۔ فَإِذَا سَوَّيْتَهُ وَنَفَخْتَ فِيهِ مِنْ رُوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ ۝

(سورہ حجر ۲۹، ص ۷۲)

۸۔ وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّيْتَهَا ۚ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۗ ﴿۸﴾ (سورہ شمس ۷ تا ۸)

۹۔ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۳۱﴾ (سورہ بقرہ ۲۲۱)

۱۰۔ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ۗ أَفَلَا تَتَفَكَّرُونَ ﴿۵۰﴾ (سورہ انعام ۵۰)

۱۱۔ اُنْظُرْ كَيْفَ نَصَرِفُ الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ ﴿۶۵﴾ (سورہ انعام ۶۵)

۱۲۔ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۗ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ ﴿۱۵۳﴾ (سورہ بقرہ ۱۵۳)

۱۳۔ إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَٰئِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُونَ ﴿۳۱﴾ (سورہ اعراف ۲۰۱)

۱۴۔ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۗ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ۗ (سورہ لقمان ۳۴)

ترجمہ

۱۔ اسی طرح خداوند عالم اپنی آیات کو تمہارے لیے بیان کرتا ہے تاکہ تم اپنی عقلوں سے کام لو اور سوچ بچار کرو۔

۲۔ یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات و دن کے آنے جانے میں (خداوند عالم کی عظمت کی بہت بڑی) نشانیاں ہیں، صاحبانِ عقل کے لیے۔

۳۔ خداوند عالم نے تمہیں ماؤں کے شکموں سے باہر نکالا جبکہ تم کچھ نہیں جانتے تھے، اور تمہارے لیے کان، آنکھ، اور عقل بنائی (تا کہ تم علم و آگاہی حاصل کر سکو) ہو سکتا ہے کہ اس کی نعمتوں کا شکر بجالاؤ۔

۴۔ کتنی قومیں ہیں جنہیں ہم نے ان سے پہلے ہلاک کر دیا وہ ایسی قومیں تھیں جو ان سے طاقت میں زیادہ تھیں اور اور شہروں (اور ملکوں) کو فتح کیا، آیا کوئی راہ فراتھی؟ اس میں اُس کے لیے یاد دہانی ہے جس کی عقل ہے، یادہ کان دیتا ہے اور موجود ہوتا ہے۔

۵۔ ان میوہ جات اور نباتات سے تم خود بھی کھاؤ جو خدا نے بارش نازل کر کے زمین سے پیدا کیے ہیں اور اپنے جانوروں کو بھی ان سے کھلاؤ، اس میں عقلمند لوگوں کے لیے (اس کی عظمت کی) نشانیاں ہیں۔

۶۔ (یہ قرآن انسانی سوچ کی پیداوار نہیں) بلکہ روشن آیات ہیں جو صاحبانِ علم کے سینوں میں (محفوظ) ہیں۔

۷۔ جب میں نے آدم کی تخلیق کو موزوں بنا لیا اور اپنی روح اس میں پھونک دی تو تم اس کے لیے سجدہ میں گرجاؤ۔

۸۔ انسان کی روح اور جان کی قسم، اور اس کی قسم جس نے اسے موزوں بنایا، اور پھر اسے اس کے گناہ اور تقویٰ (خیر و شر) کی راہیں اسے سمجھادیں۔

۹۔ خداوندِ عالم اپنی آیات کو لوگوں کے لیے بیان فرماتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں (غور و فکر کریں اور سیدھی راہ پر آجائیں)

۱۰۔ کہہ دیجئے کہ کیا اندھا اور آنکھوں والا (نادان اور دانا) یکساں ہیں؟ آیا تم سوچتے نہیں؟

۱۱۔ دیکھئے تو ہم اپنی آیات کو مختلف تعبیروں کے ساتھ ان کے لیے کیونکر بیان کرتے ہیں، شاید کہ وہ سمجھ جائیں۔

۱۲۔ اور جو لوگ راہِ خدا میں مارے جاتے ہیں انہیں مُردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں اور تم نہیں سمجھتے۔

۱۳۔ متقی لوگ جب شیطانی وسوسوں میں پھنس جاتے ہیں (تو خدا کی) یاد میں پڑ جاتے ہیں اور پینا ہو جاتے ہیں۔

۱۴۔ اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ کل کیا کرے گا؟ اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ کس زمین میں مرے گا؟ (صرف خداوندِ عالم، عالم اور آگاہ ہے)

## الفاظ کے معانی

مفردات میں راغب کے بقول عقل دراصل عقلا سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں وہ رسی جس سے اونٹ کے پاؤں کو باندھا جاتا ہے تاکہ وہ چل پھرنہ سکے چونکہ خرد کی طاقت انسان کو ناروا اور ناپسندیدہ کاموں سے روکتی ہے اسی لیے اس پر عقل کا اطلاق ہوتا ہے صحاح اور دوسری لغوی کتابوں میں عقل کی حجر اور منع سے تفسیر کی گئی ہے اور قاموس جیسی دوسری کتابوں میں اس کا یوں معنی کیا گیا ہے کہ اشیاء کے حُسن و قبح اور کمال اور نقصان جیسی صفات کا علم عقل کہلاتا ہے اور مجمع البحرین میں عاقل کی یوں تفسیر کی گئی ہے عاقل وہ شخص ہوتا ہے جو اپنے نفس کو کنٹرول کرے اور ہوا و ہوس سے باز رکھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اصل بنیاد وہی روکنا اور باز رکھنا ہے لہذا جب کسی کی زبان بند ہو جاتی ہے تو عرب کہتے ہیں "اعتقل لسانہ" اور دیت کو بھی عقل کہتے ہیں کیونکہ وہ مزید خونریزی سے روکتی ہے اور عقیلہ اس عورت کو کہتے ہیں جو عفت حجاب اور پاکدامنی کی حامل ہو۔ کتاب العین میں خلیل بن احمد بقول عقل قلعہ کو بھی کہتے ہیں جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں منع اور باز رکھنے کا مفہوم ان تمام معانی میں پایا جاتا ہے لہذا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اصل بنیاد وہی منع کرنا ہی ہے۔

"لُب" اور "لباب" کے بارے میں بہت سے ارباب لغت کہتے ہیں کہ اس کے معنی ہیں ہر چیز کا خالص اور برگزیدہ ہونا اسی لیے عقل و خرد کے بلند ترین مرحلہ کو بھی لُب کہتے ہیں اسی لیے ہر لُب عقل ہے لیکن ہر عقل لُب نہیں ہے کیونکہ عقل کا لُب اس کے عالی ترین اور خالص ترین مرحلہ پر ہوتا ہے اسی لیے قرآن مجید میں کچھ مسائل کو اولوالالباب کی طرف نسبت دی گئی ہے جن کو عالی ترین مرحلہ کی عقول ہی درک کر سکتی ہیں اور بہت سے میوہ جات کے مغز کو بھی لُب کہتے ہیں کیونکہ وہ چھلکے سے خالص ہوتے ہیں۔ [1]

"فؤاد" جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں "فؤاد" (بروزن وعد) کے مادہ سے ہے جو دراصل روٹی کو گرم کر کے یا رکھ کر رکھنے کے معنی میں ہے تاکہ روٹی خوب پک جائے اسی طرح گوشت کے پکانے اور بھوننے کو بھی فؤاد کہتے ہیں۔ [2] اسی لیے جب عقل پختگی کے مراحل کو پہنچ جاتی ہے تو اسے فؤاد کہتے ہیں جس کی جمع "افئدہ" ہے۔

"راغب" مفردات میں کہتے ہیں کہ "فؤاد" بمعنی دل ہے اس اضافہ کے ساتھ کہ اس میں چمک اور دمک کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ "قلب" جیسا کہ "قاموس" مفردات "العین" اور "لسان العرب" میں آیا ہے دراصل کسی چیز کو دیگر گول کرنے کے معنی میں ہے اور عام طور پر دو معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے ایک تو اس عضو کو کہتے ہیں جو تمام بدن میں خون پہنچانے کا ذریعہ ہے اور دوسرے روح، عقل،

[1] لسان العرب، مفردات اور مجمع البحرین

[2] لسان العرب، تاج العروس اور مفردات راغب



علم، فہم، اور شعور پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اور یہ اس لیے ہے کہ قلب خواہ جسمانی ہو یا روحانی ہمیشہ دگرگونی، تبدیلی اور حرکت کی حالت میں رہتا ہے جیسا کہ کسی صاحب لغت نے کہا ہے:

ماسمی القلب الامن تقلبہ  
والرأی یصرف بالانسان اطوارا

قلب کو قلب اس لیے کہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ تبدیل ہوتا رہتا ہے اور انسان کی رائے اور عقیدہ کو مختلف اشکال میں تبدیل کرتا رہتا ہے۔

ضمنی طور پر ہم یہ بھی بتاتے چلیں کہ ہر چیز کے مرکز اور مغز کو بھی قلب کہتے ہیں مثلاً قلب لشکر، کیونکہ انسان کا قلب اس کے جسم و جان کا مرکز ہوتا ہے۔ اور کتاب ”قاموس“ میں بھی آیا ہے کہ ہر چیز کے خالص کو اس کا قلب کہا جاتا ہے۔

”نہی“ (بروزن ہما) بمعنی ”عقل“ کے ہے اور ”نہی“ (بروزن سعی) کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز سے روکنا اور باز رکھنا اور بہت سے ارباب لغت (جیسے مفردات راغب، مجمع البحرین لسان العرب اور شرح قاموس) نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ نھی کو اس سے نھی کہتے ہیں کہ وہ انسان کی عقل کو بڑی اور ناپسندیدہ چیزوں سے روکتی اور باز رکھتی ہے۔

”صدر“ دراصل سینہ کے معنی میں ہے پھر اس کا اطلاق ہر چیز کے اگلے اور بالائی حصے پر ہونے لگا ہے جیسے صدر مجلس، مجلس کے بالائی حصے کو، صدر کلام، گفتگو کے آغاز کو، اور صدر نہار، دن کے اول حصے کو کہتے ہیں ملاحظہ ہو قاموس، (مفردات اور لسان العرب)۔

لیکن بعض لغات سے یہ بات سمجھی جاتی ہے کہ اس کا اصل معنی وہی ہر چیز کا اگلا حصہ اور آغاز ہے۔

لیکن چونکہ انسانی عقل اس کے وجود کے اہم اور اعلیٰ حصے پر مشتمل ہے لہذا اسے صدر کہتے ہیں خاص کر جبکہ جسمانی بلب سینہ کے درمیان میں واقع ہوتا ہے اور ہم بعد میں بتائیں گے کہ بہت سی عقلی اور روحی تبدیلیوں کا تعلق اسی جسمانی قلب کے ساتھ ہوتا ہے۔

”روح“ کا اصل معنی تو تنفس یعنی سانس لینا ہے۔ لیکن چونکہ سانس لینے اور حیات کی بقا کے درمیان قریبی رابطہ ہوتا ہے لہذا اس (روح) کا اطلاق انسان کی جان اور اس کے عقل و فہم کے مرکز پر بھی ہوتا ہے۔

بعض حضرات نے یہ تصریح کی ہے کہ ”روح“ اور ”روح“ یعنی ہوا، دونوں ایک معنی سے مشتق ہیں اور اگر انسانی روح، جو کہ ایک مستقل اور مجرد گوہر ہے کو ”روح“ کہا جاتا ہے تو اس لیے کہ وہ بھی ہوا کی مانند متحرک ہے زندگی کی موجد ہے اور دکھائی نہیں دیتی۔

”نفس“ مفردات ”لسان العرب“ قاموس العین اور دوسری کتابوں کے بقول ”روح“ کے معنی میں ہے جو انسانی ادراکات کا مرکز ہوتی ہے۔ البتہ قرآن مجید میں نفس کے کئی مراحل ذکر کیے گئے ہیں مثلاً نفس امارہ یعنی وہ سرکش روح جو انسان کو برائیوں اور گناہوں کی ترغیب دلاتی ہے نفس لوامہ یعنی جو روح گناہوں سے آلودہ ہونے کے بعد پشیمان ہو جاتی ہے اور اپنی ملامت اور سرزنش پر اتر آتی ہے، اور فارسی میں جسے ”وجدان“ (اور اردو میں ”ضمیر“) کہتے ہیں اور نفس مطمئنہ وہ روح ہوتی ہے جو مکمل طور پر اپنی خواہشات اور شہوات پر مسلط ہوتی ہے اور

سکون و اطمینان کے مرحلہ پر پہنچ چکی ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا تمام گفتگو سے مجموعی طور پر جو چیز بخوبی سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں عقل و خرد کے بارے میں گونا گوں تغیرات موجود ہیں جو اس نفسانی گوہر کے اپنے اپنے مخصوص پہلوؤں اور طریقہ کار کی نشاندہی کرتی ہیں۔ بالفاظ دیگر ان میں سے ہر ایک کلمہ انسان کی عقل و خرد کے کسی نہ کسی مخصوص پہلو سے مربوط ہے۔

کیونکہ خدا کی مخفی اور موزن طاقت انسان کو برائیوں سے باز رکھتی ہے لہذا سے ”عقل“ اور ”عُی“ کہتے ہیں۔

کیونکہ وہ ہمیشہ تبدیلی کی حالت میں رہتی ہے لہذا سے ”قلب“ کہتے ہیں۔

کیونکہ وہ انسانی جسم کے بالائی حصہ میں ہوتی ہے لہذا سے ”صدر“ کہتے ہیں۔

کیونکہ حیات و زندگی سے اس کا قریبی تعلق ہوتا ہے لہذا سے ”روح“ اور ”نفس“ کہتے ہیں۔

اور جب وہ خلوص کے مرحلہ کو پہنچ جاتی ہے، اس وقت اسے ”لُب“ کہتے ہیں۔

انجام کار جب وہ پختہ ہو جاتی ہے تو اس پر فواد کا اطلاق ہوتا ہے۔

اس بیان سے بخوبی یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ان مختلف اور گونا گوں الفاظ کے انداز اور طریقہ کار کسی حساب کتاب کے بغیر نہیں ہوتے ہیں لہذا ہر اس مطلب کے ہم آہنگ ہوتے ہیں جو کسی آیت میں بیان کیا گیا ہے اور یہ قرآن مجید کے عجائبات میں سے ایک ہے جس سے انسان تفسیر موضوعی کی تحقیقات کے ضمن میں باخبر ہوتا ہے۔

## عقل کے افعال

”ذکر“ جس کا نقطہ مقابل ”نسیان“ ہے اور ”مفردات“ میں ”راغب“ کے بقول ایسی حالت کا نام ہے جو انسان کو یہ امکان دیتی ہے کہ جن معارف کو اس نے دریافت کیا ہے انہیں محفوظ رکھے اور بوقت ضرورت انہیں ذہن میں حاضر کرے اور یہ معنی کبھی تو ”قلب“ کے ذریعہ اور کبھی ”زبان“ کے ذریعہ انجام پاتے ہیں۔

”فکر“ کا معنی سوچنا اور عقل کا سرگرم رہنا ہے اور ”راغب“ کے بقول ایسی طاقت ہے جو علم کو معلوم کی طرف لے جاتی ہے اور بعض فلاسفہ کے بقول غور و فکر دو حرکتوں سے مرکب ہے ایک حرکت تو ہر مطلب کے مقدمات کی طرف لے جاتی ہے اور دوسری حرکت ان مقدمات سے نتائج کی طرف لے جاتی ہے اور یہ دونوں حرکتیں جو اشیاء کی شناخت اور معرفت کا سبب بنتی ہیں ”فکر“ کہلاتی ہیں۔

”فقہ“ یا تو اس کا معنی مطلقاً ”فہم“ ہے جیسا کہ ”لسان العرب“ میں آیا ہے لیکن ”مفردات“ کے بقول ”فقہ“ نام ہے حاضر اور موجود مطالب کی معاونت سے مخفی اور پنهان مطالب سے آگاہی کا تو اس لحاظ سے فقہ وہ علم ہے جو دلائل کے ذریعہ حاصل ہو۔ (البتہ اصطلاحی معنی میں فقہ اسلامی احکام کے علم کا نام ہے)

شعور جیسا کہ صاحب، قاموس ”لسان العرب“ اور مقامیں الغز وغیرہ نے کہا ہے کہ اس کے معنی علم اور آگاہی ہیں لیکن ”راغب“ نے

”مفردات“ میں اس کے معنی ”احساس“ ذکر کیے ہیں لہذا اگر اس کے معنی اندرونی احساس ہیں تو اس کا دوسرے ارباب لغت سے چنداں تفاوت نہیں ہوگا۔ اور قرآن مجید کی بہت سی آیات میں بھی اس معنی (علم) میں استعمال ہوا ہے، ہر چند کہ بعض دوسری آیات میں بیرونی معنی بھی احساس کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

بصیرت ”بصرہ“ سے لیا گیا ہے جو بقول راغب تین معانی کے لیے آتا ہے خود ”چشم“، ”چشم کی طاقت“ اور ادراک و علم کی قوت۔ بعض دوسرے ارباب لغت نے کہا ہے کہ اس کے اصل معنی علم ہیں خواہ مشاہدہ حسی سے حاصل ہو خواہ علم و عقل کے ذرائع سے۔<sup>[۱]</sup> بصیرت کا لفظ خصوصی طور پر قلبی ادراک اور علم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی لیے لسان العرب میں آیا ہے کہ، بصیرت کے معنی قلبی عقیدہ، ہیں اور بعض نے ہوش اور ذکاوت کے معنی میں تفسیر کی ہے۔

قرآنی آیات میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے جیسے: ”قل هذا سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرة“ یعنی کہہ دیجئے یہ میرا راستہ ہے کہ میں خدا کی طرف پوری آگاہی کے ساتھ دعوت دیتا ہوں۔ (سورہ یوسف ۱۰۸)<sup>[۲]</sup>

درایت، معنی مطلقاً علم و آگاہی ہے یا بمعنی مخفی اور پنہاں مسائل میں علم آگاہی ہے اور ہوشیاری کے معنی میں بھی آیا ہے مقابلیں اللغۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اصل معنی کسی چیز کی طرف توجہ ہیں بعد میں کسی چیز سے آگاہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے قرآن مجید میں بھی کئی مقامات پر علم کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اس بارے میں جو کچھ ہم بتا چکے ہیں اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ جو الفاظ عقل و خرد کے کام کے لیے استعمال ہوئے ہیں اور، علم و ادراک کے معنی دیتے ہیں گونا گون اور کئی اقسام پر مشتمل ہیں جن میں سے ہر ایک علم کے کسی نہ کسی مخصوص پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے اور ہر مناسب موقع پر استعمال ہوا ہے۔

جہاں پر علمی مویشکافیوں کی بات مقصود ہوتی ہے وہاں پر درایت جہاں پر تجزیہ و تحلیل کی بات پیش نظر ہوتی ہے وہاں پر فکر اور جہاں پر ایک محسوس امر کے ذریعے کسی مخفی امر کی آگاہی منظور ہوتی ہے وہ پر فرقہ“ کا لفظ استعمال ہوا ہے اور جہاں پر حفظ اور یاد آوری کے ساتھ علم و آگاہی مقصود ہوتی ہے وہاں پر ذکر کا کلمہ استعمال ہوا ہے اسی طرح:

ہر سخ موقعی و ہر نقطہ مقامی دارد

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید میں عقل کے کام کے بارے میں جو تعبیرات بیان ہوئی ہیں ان کے بھی مراتب ہیں اور مرحلہ وار ذکر ہوئی ہیں جو شعور، یعنی عام سے ادراک کے معنی سے شروع ہو کر، فقہ پر ختم ہوتی ہیں جو آشکار مسائل کے ذریعے مخفی مسائل کے ادراک کا نام

[۱] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم مادہ ”بصر“

[۲] منجملہ اس کے اور آیات بھی ہیں جن میں یہ معنی مراد لیے گئے ہیں، مثلاً سورہ قیامت ۱۴، سورہ انعام ۱۰۴، سورہ اعراف ۲۰۳، سورہ اسراء

ہے اس کے بعد فکر کا مرحلہ جو حقائق کے تجزیہ و تحلیل کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد، ذکر یعنی حفظ اور یاد آوری کا مرحلہ ہے، اس سے بالاتر نہیں، یعنی عمیق حقائق کے ادراک کا مرحلہ ہے اس سے بالاتر بصیرت یعنی عمیق دانش و بینش کا مرحلہ ہے اور اسے کہتے ہیں فصاحت اور بلاغت۔

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### عقل کا قرآنی معیار:

زیر بحث سے پہلی آیت یہ بتا رہی ہے کہ آیات الہی کے نزول کا اصل مقصد یہ ہے کہ لوگ عقل و فکر سے کام لیں، اس قسم کے مقامات پر عقل کا ذکر جو ہدف کو بیان کرنے کے لیے ہے، اس حقیقت کا آشکار کر رہا ہے۔

کچھ دوسری قرآنی آیات اس مطلب کو کچھ اور آگے لے جاتی ہیں اور تہدید آمیز لہجہ میں ان لوگوں کا مواخذہ کر رہی ہیں جو عقل و فکر سے کام نہیں لیتے اور کہتی ہیں: ﴿افلا تعقلون﴾ [۱]

کچھ اور آیات میں اسی چیز کو جملہ شرطیہ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿قد بینا لکم الایات ان کنتم تعقلون﴾ (اور ہم نے تمہارے لیے آیات کو واضح طور پر بیان کر دیا ہے اگر تم عقل سے کام لو)۔ (آل عمران ۱۱۸)

یہ تین مختلف تعبیریں (لعلکم تعقلون۔ افلا تعقلون اور ان کنتم تعقلون) اس حقیقت کی بخوبی نشاندہی کر رہی ہیں کہ خداوند عالم نے عقل سے کام لینے کی طاقت کو انسان کے اختیار میں دے دیا ہے تاکہ وہ واقعیت کو درک کرنے کے لیے اس سے استفادہ کرے۔ اگر استفادہ نہیں کرے گا تو وہ ڈانٹ ڈپٹ اور جھڑکیوں کا مستحق ہوگا۔

دوسری آیت میں زمین و آسمان کی تخلیق اور رات دن کے آنے جانے میں خدا کی نشانیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ ان آیات کا ادراک ﴿اولو الالباب﴾ کے لیے میسر ہے۔

جب کہ ہم الفاظ کی تشریح میں بتا چکے ہیں کہ ﴿اولو الالباب﴾ ایسے دانشور لوگ ہوتے ہیں جن کے افکار و عقول خلوص کے مرحلہ تک پہنچ چکے ہیں اور ہر قسم کے شائبوں اور اوہام سے پاک ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ ہی نظام آفرینش کی باریکیوں سے آگاہ ہوتے ہیں اور ان کے ماروا میں خدا کے جمال دل آرا کی زیارت کرتے ہیں اور یہ چیز بذات خود حق کی معرفت کے ذرائع کے لیے عقل و خرد کی اہمیت کو واضح کرتی ہے۔

تیسری آیت میں انسان کے شکم مادر سے باہر آنے کی طرف اشارہ کرنے کے بعد شناخت و معرفت کے اوزار و وسائل کی تشریح کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ جب انسان شکم مادر سے باہر آیا تھا تو اس وقت کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ سب سے پہلے، سمع (سننے کی طاقت) ہے جس

[۱] آل عمران ۶۵، انعام ۳۶، اعراف ۱۶۹، یونس ۱۶، ہود ۵۱، یوسف ۱۰۹، انبیاء ۱۰، ۶۷، قصص ۶۰، صافات ۱۳۸

کے ذریعہ وہ علوم نقلی اور دوسروں کے تجربوں کو سنتا ہے۔ پھر بینائی کی طاقت ہے جس کے ذریعہ وہ حسی امور اور مشاہدہ کے قابل اشیاء کو مادرِ گیتی میں دیکھتا ہے پرافندہ (دل اور عقل و خرد) ہے جس کے ذریعہ وہ ماوراءِ احس تھاقد و واقعات کا ادراک کرتا ہے اور جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ نواذ پختہ عقل کو کہتے ہیں جو، عقل، کے مفہوم سے ایک درجہ بلند تر ہے۔

چوتھی آیت میں پہلے تو ان اقوام کی سرگزشت بیان کی گئی ہے جو ان لوگوں سے پہلے کرہ ارض پر رہتی تھیں اور طغیان، سرکشی اور فتنہ و فساد کی وجہ سے نابود ہو گئیں اور ان کے لیے کوئی راہ فرار باقی نہیں رہ گئی تھی۔ پھر فرماتا ہے، ان کی سرگزشت اور انجام بیداری اور یاد آوری کا سبب ہے، ان لوگوں کے لیے جو قلب (عقل) اور سننے والے کان رکھتے ہیں۔

پانچویں آیت میں بنجر اور مردہ زمینوں کے زندہ ہونے کا تذکرہ ہے اور نباتات کے اُگنے کا جو انسانوں اور چوپایوں کی غذا ہے جو انسان کے اختیار میں ہیں۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ ان سب چیزوں میں ان لوگوں کے لیے خدا کی نشانیاں ہیں جو صاحبانِ نوحیٰ ہیں جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں نبی (بروزن شا) عقل کو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ انسان کو برائیوں اور غلط کاموں سے روکتی ہے۔

چھٹی آیت میں قرآن مجید کی باعظمت اور واضح آیات کے اشارہ کے بعد ارشاد فرماتا ہے یہ ان لوگوں کے سینہ میں ہیں جنہیں علم و دانش عطا کی گئی ہے..... جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں صدر، (سینہ) ہر چیز کے اگلے اور بالائی حصے کو کہتے ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عقل کا گوہر، شناخت و معرفت کے اہم ترین منابع میں سے ہے اور انسانی وجود کے بالاترین حصے پر مشتمل ہے۔

ساتویں آیت میں حضرت آدمؑ کے مٹی سے پیدا کرنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے جب اس کی خلقت موزوں ہو گئی اور میں نے اس میں اپنی روح پھونک دی تو اے فرشتو! تم اس کی عظمت کے لیے سجدہ ریز ہو جاؤ۔

یہ الہی روح وہی گوہر عقل ہے جو اپنی اہمیت کے پیش نظر کی طرف منسوب ہے اور جسے اس کی طرف اضافت دی گئی ہے (اس اضافت کو اضافت تشریحی کہتے ہیں) وگرنہ نہ تو خدا کی روح ہے اور نہ ہی اس کا جسم ہے۔ اور یہ روح الہی ہی تھی جس کی خاطر تمام ملائکہ مقررین اور بارگاہِ حق کے باعظمت فرشتوں کو آدمؑ کو سجدہ کرنے حکم ملا، وگرنہ مٹی اور گارا اس اہمیت کا حامل نہیں تھا کہ اسے ایسے ایسے باعظمت فرشتے سجدہ کریں، اور یہ عقل و خرد کی اہمیت کے لیے ایک اہم تاکید ہے۔

آٹھویں آیت میں انسانی نفس (روح اور عقل) اور نفس کے خالق کی قسم اٹھائی گئی ہے اور پھر ارشاد ہوتا ہے، جب خداوندِ عالم نے اس روح کو پیدا کر دیا اور موزوں بنا دیا تو فوراً اور تقویٰ کے (ٹیڑے اور سیدھے) راستے سے (نفس کو) الہام کر دیئے، جو بذاتِ خود انسان کے فطری ادراکات کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ روزِ اوّل ہی سے الہی تعلیمات کے طریقہ سے اس کی جان کے اندر رکھ دیئے گئے ہیں۔

یہ تھا جوہر عقل و خرد کے بارے میں آٹھ مختلف عنوانات کا مجموعہ جسے قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے۔ اور شناخت کے اس منبع کی اہمیت کو اس کے مختلف پہلوؤں سے واضح کرتا ہے۔

جو کچھ اوپر بیان ہوا ہے اور قرآنی آیات کے چند نمونے ذکر ہوئے ہیں خود جوہر عقل کے بارے میں تھیں۔ لیکن اس کی فعالیت اور طریقہ کار کے بارے میں بھی قرآن مجید میں متعدد تعبیرات بیان ہوئی ہیں جن میں سے ہر ایک اس کے کسی نہ کسی پہلو اور زاویے کو روشن کرتی

ہیں اور ان کی ترتیب کچھ اس طرح سے ہے۔

زیر بحث آیت میں سے نویں آیت میں ”تذکر“ کی گفتگو ہو رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ خداوند عالم اپنی آیات کو لوگوں کے لیے اس لیے بیان کرتا ہے کہ وہ یاد آوری کریں، تذکرہ کے معنی حفظ اور یاد آوری ہیں جو عقل کے اہم ترین کاموں میں سے ایک ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو انسان اپنے علوم سے کچھ بھی حاصل نہ کر سکتا۔

یہاں پر ہم ایک بار پھر قرآن مجید میں مختلف تعبیرات دیکھتے ہیں۔ کہیں پر تو ہر مطلب کو مذکورہ بالا آیت کی مانند لعل کے جملہ سے بیان کرتا ہے جو اس قسم کے مقامات پر مقصد کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور کہیں پر سرزنش اور جھڑکی کی صورت میں ارشاد فرماتا ہے ”افلا تتذکرون“ [۱]

اور کہیں پر ان لوگوں کو سرزنش کی جا رہی ہے جو اپنی عقلوں کو کام میں نہیں لاتے اور حقائق کی یاد آوری نہیں کرتے ”قلیلا ماتذکرون“ [۲]

دسویں آیت میں تفکر کی بات ہو رہی ہے۔ پہلے ایک استفہام انکاری کے ساتھ پوچھتا ہے کہ آیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہو سکتے ہیں؟ پھر جھڑکی بھرے لہجے میں فرماتا ہے آیا تم فکر نہیں کرتے؟ اور جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں مختلف مسائل کی گہرائیوں تک پہنچنے کے لیے ان کے تجزیہ و تحلیل کو فکر کہتے ہیں اور یہ بہتر و بیشتر فہم کا ایک عمدہ راستہ ہے۔

اور یہاں پر بھی گونا گوں تعبیرات ہیں۔ کہیں فرماتا ہے ”لعلکم تتفکرون“ یعنی شاید تم فکر سے کام لو (سورہ بقرہ ۲۱۹) ”لقوم یتفکرون“ یعنی ایسی قوم کے لیے جو فکر سے کام لیتی ہے (یونس ۲۴، رعد ۳-نحل ۱۱) اور کہیں فرماتا ہے ”اولم یتفکروا فی انفسہم“ یعنی انہوں نے اپنے دل میں غور و فکر نہیں کیا؟ (روم ۸)

گیارہویں آیت میں فقہ، بمعنی فہم اور عمیق ادراک کی گفتگو ہو رہی ہے ارشاد ہوتا ہے دیکھو تو! ہم اپنی آیات کو کس طرح مختلف بیانات کے ذریعہ ذکر کرتے ہیں شاید کہ وہ سمجھ جائیں اور درک کر لیں یہاں پر بھی (مندرجہ بالا آیت کی مانند) کبھی تو ”لعلہم یتفقہون“ آیا ہے اور کہیں پر ”لقوم یتفقہون“ یعنی ان لوگوں کے لیے جو سمجھتے ہیں، (انعام ۹۸ آیا ہے) اور ایک مقام پر ”لوکانوا یتفقہون“ یعنی اگر وہ سمجھتے (توبہ ۸۱) ہیں۔ ایک دوسرے مقام پر ”بل کانوا لا یتفقہون الا قلیلا“ (اگر وہ کم ہی سمجھتے ہیں) (فتح ۱۵) یہ آیت تفقہ اور عقلی ادراکات جیسے مسئلہ کی حد سے زیادہ اہمیت کو بیان کر رہی ہیں۔

جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں فقہ کے معنی ہیں آشکار مسائل کے مشاہدہ کے ذریعہ مخفی مسائل کو سمجھنا جو بذات خود عقلی ادراک کا ایک اہم پہلو ہے۔

[۱] انعام ۸۰، نحل ۹۰، مومنون ۸۵، صافات ۱۵۵

[۲] نمل ۶۲



بارہویں آیت میں، شعور کی بحث ہے۔ مومنین کو اس سے روکنے کے بعد کہ شہیدانِ راہِ خدا کو مردہ نہ کہو ارشاد فرماتا ہے وہ تو زندہ ہیں لیکن تم ان کی زندگی کو درک نہیں کر سکتے۔

البتہ شعور کبھی تو ظاہری احساس کے معنی میں آتا ہے اور کبھی اندرونی احساس کے معنی میں اور یہی عقلی ادراک ہے، اور قرآن مجید میں دونوں معانی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

جو لوگ اپنے شعور سے کام نہیں لیتے قرآن مجید نے بہت سی آیات میں ایسے لوگوں کی مذمت کی ہے۔<sup>[۱]</sup> تیرھویں آیت میں بصیرت کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے تقویٰ کے آثار میں سے ایک اثر کی طرف اشارہ کرنے کے بعد فرماتا ہے متقی لوگ جب شیطانی وسوسوں میں گرفتار ہو جاتے ہیں تو اچانک خدا کی یاد میں لگ جاتے ہیں، بصیرت حاصل کرتے اور حقیقت کا ادراک کر لیتے ہیں اور شیطانی وسوسوں کے جال سے بچ جاتے ہیں۔

بصیرت اور ابصار کہ جن کے معنی بینائی ہیں کبھی تو ظاہری آنکھ پر بولے جاتے ہیں اور حسّی پہلو کے حامل ہوتے ہیں اور کبھی اندرونی آنکھ اور عقل و خرد کے لیے بولے جاتے ہیں جن کے معنی عقلی ادراکات ہوتے ہیں اور زیر بحث آیت ان آیات میں سے ہے جن میں یہ الفاظ دوسرے معنی کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔

قرآن مجید کبھی تو کہتا ہے کہ انسان اپنی نسبت اور اپنے بارے میں اچھی طرح بصیرت اور آگاہی رکھتا ہے "بل الانسان علی نفسه بصیرۃ" (قیامت / ۱۴) اور کبھی خدا پیغمبرؐ سے فرماتا ہے کہ لوگوں کو کہیں کہ یہ میرا راستہ ہے، میں اور میرے پیروکار سب لوگوں کو خدا کی طرف بلا تے ہیں "وقل ہذا سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی" (سورہ یوسف / ۱۰۸)

مسلم ہے کہ ان تمام مقامات پر بصیرت اس علم و آگاہی کے معنی میں ہے جو عقل و خرد کے ذریعہ انسان کو حاصل ہوتی ہے۔ اور انجام کار چودھویں اور آخری آیت میں دلالت کی بات ہو رہی ہے جس کے معنی ہیں غیر محسوس اور مخفی مسائل سے ہوشیاری اور آگاہی، ارشاد ہوتا ہے کوئی شخص یہ نہیں جانتا کہ کل کیا کرے گا اور نہ ہی کوئی شخص یہ جانتا ہے کہ کوئی سر زمین مرے گا؟ یہ بات بھی قابل توجہ کے قرآن مجید درایت کا مادہ ہمیشہ منفی صوت میں استعمال ہوا ہے۔

یعنی جہاں ہر انسان کے عدم درایت کی بات ہوتی ہے وہاں پر یہ مادہ ہمیشہ استعمال ہوتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ درایت درک و فہم کا ایسا عمیق (گہرا) مفہوم ہے جو ہر شخص کو حاصل نہیں ہو سکتا۔

مذکورہ بالا چودہ آیات سے درج ذیل نتائج حاصل ہوتے ہیں۔

۱۔ قرآن مجید انسان کی عقل و خرد، کو معرفت کے اصل منابع میں سے ایک اہم منبع کی حیثیت دیتا ہے اور اس کی زبردست اہمیت کا

قاتل ہے۔

[۱] شعراء ۱۳۳، حجرات ۲، بقرہ ۹، آل عمران ۶۹، انعام ۲۶ و ۱۲۳، مومنون ۵۶۔

۲۔ قرآن مجید ہر ایک کو تمام مسائل پر زیادہ سے زیادہ عقل و فکر سے کام لینے کی دعوت دیتا ہے۔  
 ۳۔ قرآن مجید نے انسانی روح کے گونا گوں پہلوؤں کی طرف خاص توجہ فرمائی ہے اور ان میں سے ہر ایک پر خاص طور پر تاکید کی ہے۔  
 ۴۔ قرآن مجید نے واقعات کے ادراک کے لیے روح کی سرگرمیوں کو مختلف تعبیرات کے ساتھ ذکر کیا ہے اور ہر ایک پر اپنے اپنے مقام کے لحاظ سے تاکید کی ہے۔  
 لیکن اس کے باوجود قرآن مجید نے عقل کے صحیح ادراک کے متعدد موانع کا بھی ذکر کیا ہے جو انشاء اللہ معرفت کے موانع کی بحث میں بیان ہوں گے۔

## مزید وضاحتیں

### ۱۔ فلسفی نقطہ نگاہ سے عقلی ادراکات

اکثر فلاسفہ کے نقطہ نظر سے عقلی ادراکات کو معرفت کے ایک اہم منبع کی حیثیت سے پہچانا گیا ہے۔ اور جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں حسی فلاسفہ نے اس امر کی مخالفت پر کمر باندھ رکھی ہے اور وہ عقلی ادراکات کو مکمل طور پر درجہ اعتبار سے ساقط سمجھتے ہیں اور واقعیت کی شناخت کو صرف حسی تجربات میں منحصر سمجھتے ہیں۔  
 ان کا اس بارے میں بہانہ چند چیزیں ہیں۔  
 ۱۔ عقلی مسائل کے بارے میں فلاسفہ کے درمیان اختلاف ہے اور ہر ایک نے اپنے اپنے نقطہ نظر سے ظاہر منطقی دلائل بھی ذکر کیے ہیں۔  
 ۲۔ بہت سے دانشوروں کے عقائد میں اس حد تک غلطیاں واقع ہوئی ہیں کہ بذات خود انہوں نے کئی مقامات پر اس کا برملا اعتراف بھی کیا ہو ہے اور ان کی اصلاح بھی کی ہے۔

۳۔ مذکورہ بالا دونوں وجوہات پر اس موضوع کا اضافہ بھی کرنا چاہیے کہ ان آخری چند صدیوں میں سائنس اور علوم طبعی نے تیزی سے جو ترقی کی ہے اور حسی تجربات کے ذریعہ عالم طبیعت کے چہرہ سے جو نقاب کشائی کی ہے، اس سے اس سوچ کو مزید تقویت ملتی ہے کہ صرف اور صرف حسی کے منبع پر ہی بھروسہ کیا جائے اور اس کے علاوہ دیگر تمام منابع پر خطہ تنسیخ کھینچا جائے۔

تاریخ فلسفہ میں ہم پڑھتے ہیں کہ اس طرح کے موضوعات اس بات کا موجب بن گئے کہ قدیم یونان میں سفسٹائی افکار نے ہر قسم کے حسی اور غیر حسی واقعات کا انکار کیا، کیونکہ ایک طرف تو انہوں نے فلاسفہ کے اختلاف کو دیکھا اور دوسری طرف بہت سے تنازعات اور جھگڑوں کو دیکھا جو عدالتوں میں پیش کیے جاتے تھے اور زبردست اور ماہر وکلاء اپنے موکلین کا بھرپور دفاع کرتے تھے اور عامۃ الناس ان وکلاء کے دلائل کو سنتے تھے کہ ہر وکیل اپنے موکل کو سچا ثابت کرنے کے لیے یوں دلائل کی بوچھاڑ کرتا تھا کہ سننے والے ہر دو فریق کو برحق سمجھنے



لگتے تھے، حالانکہ دونوں فریق ایک دوسرے کے مخالف ہوا کرتے تھے۔ اس صورت حال سے اس فکر کو تقویت ملی کہ ممکن ہے کہ اس دنیا میں کوئی واقعیت سرے سے موجود ہی نہ ہو۔

لیکن ان تمام شکوک و شبہات اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے عقلی ادراکات پر زیادہ سے زیادہ تحقیقات ہونی چاہیے اور سب سے پہلے بدیہی ادراکات، کو نظری ادراکات سے جدا کرنا چاہیے کیونکہ بدیہی ادراکات کے سلسلے میں کسی قسم کی غلطی واقع نہیں ہو سکتی، کیونکہ کوئی بھی شخص دو اور دو کے چار ہونے میں شک نہیں کرتا، اور نہ ہی اسے اس بات میں شک ہوتا ہے کہ ایک چیز ایک ہی آن اور ایک ہی مکان میں موجود بھی ہو اور معدوم بھی۔ اور اگر کچھ لوگ اس قسم کے موقع پر شک و تردید کا اظہار کرتے ہیں، یا اس کے برخلاف نظریہ رکھتے ہیں، درحقیقت وہ الفاظ کے ساتھ کھیل رہے ہوتے ہیں، مثلاً وہ صدیقین (دو ضدوں) اور نقیضین (دو نقیضوں) کی اور طرح سے تفسیر و تشریح کرتے ہیں، وگرنہ اصل مطلب میں کسی کو اختلاف نہیں ہوتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ استدلالی امور میں بھی اگر صحیح میزان و قواعد سے کام لیا جائے تو غلطی واقع نہیں ہو سکتی۔ غلطی اس وقت سرزد ہوتی ہے جب میزان و قواعد سے صحیح معنوں میں کام نہیں لیا جاتا۔ یا خود قواعد و میزان دقیق نہیں ہوتے یہی وجہ ہے چونکہ ریاضی کے مسائل میں صحیح صحیح قواعد و میزان موجود ہیں لہذا ریاضی دان حضرات کے درمیان کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے اور ان کے نتائج قطعی اور یقینی ہوتے ہیں، کیونکہ صحیح اور باطل کی پہچان کے لیے روشن اور واضح معیار موجود ہوتا ہے۔ لہذا ہر سوال کا نتیجہ صحیح حاصل ہوتا ہے۔

تیسرے یہ کہ جو ہم کہتے ہیں کہ عقلی ادراکات میں غلطی واقع ہوتی ہے یہ چیز بذات خود عقلی ادراکات کے قبول کرنے پر خود ایک واضح دلیل ہے نہ کہ ان کی نفی پر، کیونکہ جب ہم غلطی کی بات کرتے ہیں تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ ہم نے واقعات کو قبول کر لیا ہے۔ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ فلاں نظریہ غلط ہے۔ مثلاً یہ جو ہم کہتے ہیں کہ فلاسفہ کے درمیان اختلاف ہے، تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ غلطی پر ہیں، تو یہ اس لیے ہے کہ ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ دونوں متضاد نظریات کا بیک صورت صحیح ہونا محال ہے یہ خود ایک بدیہی ادراک عقلی ہے۔ اسی لیے اسی طرح کہ نکتہ کو ہم نے ان کے بارے میں کہا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ چونکہ حسن خطا کرتی ہے لہذا درجہ اعتبار سے ساقط ہے اور ہم بتا چکے ہیں کہ بینائی کی حسن خطا اور غلطی کا شکار ہوتی ہے کیونکہ مثلاً ایک نورانی نقطہ اگر تیزی سے حرکت کرے تو آنکھ اسے ایک لمبی لکیر کی صورت میں دیکھتی ہے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے نورانی نقطہ اور اس کی حرکت کو واقعیت کے طور پر درک کر لیا ہے اور چونکہ نقطہ اور لکیر دو متضاد چیزیں ہیں لہذا جس چیز کو ہم ایک لمبی لکیر کی صورت میں دیکھتے ہیں یہ غلطی ہے۔ گویا یہ سب کچھ واقعات اور ادراک کے وجود کا ضمنی اعتراف ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ جو لوگ بھی عقلی ادراکات کی مخالفت پر کمر بستہ ہو چکے ہیں درحقیقت وہ خود انہی عقلی ادراکات کی مدد سے ہی اپنے مدعا کو ثابت کرنا چاہتے ہیں گویا وہ عملی طور پر اپنے دعویٰ کی نفی کر رہے ہوتے ہیں اور عقلی ادراکات ہی کے ذریعہ عقلی ادراکات کے ساتھ نہرو آزا ہوا رہے ہوتے ہیں۔

## ۲۔ اسلامی روایات میں عقل کا مقام

اسلامی روایات میں عقل و خرد کے جوہر کو اس حد تک بلند و بالا درجہ عطا کیا گیا ہے جو انسانی تصور سے باہر ہے۔ اسے دین کی اساس بزرگ ترین تو نگری، سب سب سے بڑھ کر سرمایا، تیز ترین راہوار، بہترین دوست، غرض خدا کے تقرب اور جزا کے حصول کے لیے میزان و معیار کے عنوان سے متعارف کرایا گیا ہے۔

اس بارے میں وارد ہونے والی بیسیوں بلکہ سینکڑوں روایات جو پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ اطہار علیہم السلام کی زبانی بیان ہوئی ہیں، میں صرف بارہ روایات پر اکتفا کی جاتی ہے۔

۱۔ پیغمبر اکرم صلی علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

”قوام البرء عقله، ولادین لمن لا عقل له“

انسانی وجود کی بنیاد اس کی عقل ہے، جس کی عقل نہیں اس کا دین نہیں ہے۔<sup>[۱]</sup>

۲۔ امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام فرماتے ہیں:

”لا غنی کالعقل ولا فقر کالجہل“

عقل سے بڑھ کر کوئی تو نگری اور جہالت سے بھڑھ کر کوئی ناداری نہیں۔<sup>[۲]</sup>

۳۔ امیر المؤمنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

”ان الله تبارك و تعالیٰ يحاسب الناس علی قدر ما اتاهم من العقول فی

دار الدنيا“

خداوند عالم لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق ہی ان کا محاسبہ کرے گا جو انہیں دنیا میں دی تھی۔<sup>[۳]</sup>

۴۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث ہے:

”ان الثواب علی قدر العقل“

عمل کا ثواب اور پاداش عقل کے مطابق ہی ہوگا۔<sup>[۴]</sup>

[۱] بحار الانوار، جلد ۱، ص ۹۴، حدیث ۱۹

[۲] نہج البلاغہ، کلمات قصار، جملہ ۵۴

[۳] بحار، جلد ۱، ص ۱۰۶، حدیث ۲

[۴] اصول کافی، جلد ۱، ص ۱۲ حدیث ۸ (کتاب العقل والجہل)

۵۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

”ما قسم الله للعباد شيئاً افضل من العقل وما ادى العبد فرائض الله

حتى عقل عنه وما بلغ جميع العابدين في فضل عبادتهم ما بلغ العاقل“

خداوند عالم نے اپنے بندوں کے درمیان عقل سے بڑھ کر کوئی اور نعمت تقسیم نہیں کی، اور بندے خدائی فریضوں کو اس وقت تک بجا نہیں لا سکتے جب تک کہ انہیں اپنی عقول سے دریافت نہ کر لیں، اور تمام عابدین اپنی عبادت کی فضیلت میں عاقل کے پایہ کو نہیں پہنچ سکتے۔ [۱]

۶۔ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے ہشام بن حکم سے فرمایا:

”يا هشام ما بعث الله انبياءه ورسوله الى عبادة الا ليعقلوا عن الله

فاحسنهم استجابة احسنهم معرفة، واعلمهم بامر الله احسنهم

عقلا، واكلهم عقلا ارفعهم درجة“

خداوند عالم نے اپنے انبیاء اور رسولوں کو لوگوں کی طرف نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ وہ خدا کے بارے میں عقل سے زیادہ سے زیادہ کام لیں۔ اسی لیے خدا کے بہترین بندے جنہوں نے ان کی دعوت کو قبول کیا وہ لوگ ہیں جن کی معرفت بہتر تھی، اور جو لوگ امر الہی سے زیادہ آگاہ ہوتے ہیں وہی سب سے زیادہ عقلمند ہوتے ہیں اور جن کی عقلیں زیادہ کامل ہیں دنیا اور آخرت میں ان کا مقام و مرتبہ بھی بلند و بالا تر ہوتا ہے۔ [۲]

۷۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک اور حدیث ہے:

”لكل شئ الع وعدة والة المؤمن وعداته العقل، ولكل شئ مطية

ومطية البرء العقل، ولكل شئ غاية وغاية العبادة العقل“

ہر چیز کے آلات و وسائل و تے ہیں اور مومن کے آلات و وسائل اس کی عقل ہے ہر چیز کی سوری ہوتی ہے اور انسان کی سواری عقل ہے اور ہر چیز کی کوئی نہ کوئی غرض و غایت ہوتی ہے اور عبادت کی غرض و غایت عقل ہے۔ [۳]

[۱] اصول کافی، جلد ۱، ص ۱۲، حدیث ۱۱

[۲] کافی، جلد ۱، ص ۱۶

[۳] بحار الانوار، جلد ۱، ص ۹۵، حدیث ۳۴

۸۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

”اذا اراد الله ان يزيل من عبد نعمة كان اول ما يغير منه عقله“

جب خداوند عالم اپنے کسی بندے سے (ناشکری کی وجہ سے) اس سے نعمت سلب کرنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے اس کی عقل کو زائل کر دیتا ہے۔ [۱]

۹۔ امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام ہی فرماتے ہیں:

”العقل صاحب جيش الرحمن والهوى صاحب جيش الشيطان،

والنفس متجاذبة بينهما، فايهما غلب كان في حيزه“

عقل خداوند رحمن کے لشکر کی سربراہ ہے اور خواہشاتِ نفسانی شیطانی لشکر کی فرمانروا، جبکہ نفسِ انسانی ان دونوں کی کشمکش کا شکار ہے۔ ان میں سے جو اس پر غالب آجائے انسان اس کی قلمرو میں داخل ہو جاتا ہے۔ [۲]

۱۰۔ حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام ہی فرماتے ہیں:

”العقول ائمة الافكار، والا فكار ائمة القلوب، والقلوب ائمة الحواس،

والحواس ائمة الاعضاء“

عقول افکار کی پیشوا، افکار قلوب کے راہنما، قلوب حواس کے رہبر اور حواس اعضاء کے پیشوا ہیں۔ [۳]

(اسی طرح انسانی اعضاء کا اس کے حواس پر جو اس کا قلوب پر، قلوب کا افکار پر اور افکار کا عقول پر تکیہ ہوتا ہے۔)

۱۱۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں آیا ہے کہ:

”ان الرجل ليكون من اهل الجهاد، ومن اهل الصلوة والصيام، ومن

يامر بالمعروف وينهى عن المنكر، ولا يجزى يوم القيامة الا على قدر

عقله“

ممکن ہے کہ انسان اہل جہاد، اہل نماز، اہل روزہ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والا ہو، لیکن بروز

[۱] بحار الانوار، جلد ۱، ص ۹۴، حدیث ۲۰

[۲] عزز الحکم

[۳] بحار الانوار، جلد ۱، ص ۹۴، حدیث ۴۰

قیامت اسے صرف اس کی عقل کے مطابق ہی سزا اور جزا ملے گی۔ [۱]

۱۲۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد ہوتا ہے:

”لا مصیبة لعدم العقل“

بے عقلی جیسی کوئی مصیبت نہیں۔ [۲]

### ۳۔ حاکمیت عقل کے مخالفین

عقل کے بارے میں اس قدر تعریف و توصیف اور آیات و روایات میں اس گراں قیمت جوہر کی عظمت و رفعت کے باوجود نہایت ہی تعجب سے کہنا پڑتا ہے کہ دنیا کے کونے کھدرے میں کچھ ایسے افراد بھی موجود ہیں جو عقل کی مذمت میں زبان کھولے ہوئے ہیں اور اپنے عقلمند ہونے سے نالاں ہیں۔ اور اس سے بڑھ کر جو عجیب بات ہے وہ یہ کہ اپنے اس دعوے کے لیے دلائل یا صحیح لفظوں میں بہانے بھی پیش کرتے ہیں۔

کبھی تو وہ کہتے ہیں کہ عقل انسان کی محدود کردیتی ہے اور نیک و بد، حلال و حرام اور غلط و صحیح کو انسان کے رستے میں ڈال دیتی ہے، اور انسانی آزادی کو بہت بڑی حد تک سلب کر لیتی ہے، کیا ہی اچھا تھا کہ یہ عقل نہ ہوتی اور ہم ہر لحاظ سے، آزادی آزاد ہوتے..... کبھی کہتے ہیں کہ عقل درد آفرین ہے، ہوشیار اور حساس انسان کے لیے سکھ کا سانس لینا دشوار ہے، جبکہ کم عقل یا بے عقل آدمی خوش و خرم اور شاد و بے نیاز زندگی بسر کرتا ہے۔ اسی بارے میں شاعر نے کہا:

دشمن جان من است، عقل من و ہوش من  
کاش گشادہ نبود چشم من و گوش من

یعنی میری عقل و ہوش ہی میری جان کے دشمن ہیں۔ اے کاش کہ میری آنکھ اور کان نہ کھلے ہوتے۔

یا ایک اور شاعر کا قول:

عقل مباش تاغم دیوانگان خوری  
دیو انباش تاغم تو عاقلان خورد

یعنی عاقل مت بنو تا کہ تمہیں دیوانوں کا غم نہ کھانا پڑے، دیوانے بن جاؤ تا کہ عقل مندوں کو تمہارا غم کھانا پڑے۔

یا بقول شاعر:

[۱] مجمع البیان، جلد ۱۰، ص ۳۲۲

[۲] بحار الانوار، جلد ۸، ص ۱۶۵

خوش عالمی است عالم دیوانگی اگر  
موی دماغ مانشود شخص عاقلی

یعنی عالم دیوانگی کیسا بہترین عالم ہے بشرطیکہ کوئی عقلمند شخص اس بارے میں مانع نہ ہو۔

لیکن صاف ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظریہ یا توسفط ہے، یا مزاح، یا کسی قسم کے اور مفہوم کی طرف اشارہ و کنایہ اور بہت بعید معلوم ہوتا ہے کہ ان اشعار کے کہنے والوں کا مقصد عقل کی مذمت ہو، بلکہ کنایہ کے طور پر وہ یہ حقیقت بنانا چاہتے ہیں کہ اپنے اطراف میں وہ ایسے دردناک مسائل دیکھتے ہیں کہ لوگ جن سے مکمل طور پر غافل ہیں۔

یاد یوانگی سے ان کی مراد ایک قسم کا عرفانی مفہوم ہے یعنی حق کا بے قرار عاشق ہونا اور دنیا کی ہر مادی چیز کو اس کے قدموں پر قربان کرنا۔

بہر حال یہ ٹھیک ہے کہ عقل انسان کو محدود کر دیتی ہے۔ لیکن یہ محدودیت انسان کے لیے سرمایہ افتخار اور موجب ارتقاء ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ علم طلب سے آگاہی انسان کو غذا کی نوع اور زندگی کے دوسرے مسائل کے انتخاب میں بڑی حد تک محدود کر دیتی ہے، تو کیا یہ محدودیت عیب کی بات ہے یا نہ بلکہ انسان کی سلامتی اور بیماریوں اور مسمومیت سے نجات کا سبب؟

رہی یہ بات کہ عقل ہمیشہ انسان کے دل پر غم کا بوجھ ڈال دیتی ہے، تو یہ غم بھی انسان کے لیے موجب افتخار اور باعث کمال ہے۔ کیا انسان کو مشہور مثل کے مطابق ستر اطلی ہونا چاہیے کہ کمزور اور ناتواں ہو یا سو رکی طرح ہونا چاہیے کہ موٹا تازہ اور مسٹنڈا ہو؟

ہاں یہ اور بات ہے کہ اگر ہم انسان کے مسئلہ ارتقاء کو مکمل طور پر نظر انداز کر کے اصل کو چند روزہ مادی زندگی پر ترجیح دیں جیسا کہ لذت کو اصل مقصد زندگی سمجھنے والے کچھ مادی لوگ سمجھتے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ ان کی کوئی بات ٹھیک ہو، لیکن ایک موخہ انسان کی نگاہ میں یہ سب باتیں مذاق کے سوا اور کچھ نہیں جو انسان کے لیے حرکت، ادائے فرض، ہدف اور ارتقاء و تکامل کا قائل ہے۔

اور پھر دلچسپ بات ہے کہ لذت کو ہی سب کچھ سمجھنے والے مادی لوگ بھی مجبور ہیں کہ اپنی اسی لذت کو محفوظ رکھنے کے لیے اجتماعی قوانین کے ذریعہ بڑی حد تک محدودیت کو قبول کریں اور اس راستے سے ہر قسم کے غم و اندوہ کو اپنے لیے ہموار کریں۔ یہیں سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اگر انسان وحی کے سرچشمہ اور انبیاء کرام کی تعلیمات سے دور ہو جائے تو کس حد تک پستی کے گڑھوں میں جا گرتا ہے؟

شناخت کے دوسرے منبع یعنی عقل و خرد سے متعلق مسائل کو ہم یہاں ختم کرتے ہیں اور تیسرے منبع کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں، اگرچہ اس مقام پر اور بھی کئی باتیں قابل ذکر ہیں۔

## معرفت کا تیسرا منبع تاریخ اور تاریخی آثار

اشارہ

قرآن مجید میں تاریخی مسائل کو دو طرح سے بیان کیا گیا ہے۔

### ۱۔ مرتب صورت میں:

یعنی قرآن مجید مسلمانوں کے لیے گزشتہ اقوام کی تاریخ کے بہت سے حصے کو ظریف و دقیق الفاظ اور عبارات کے ساتھ بیان فرماتا ہے اور ان اقوام کی زندگی کے باریک اور روشن نقاط کو ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے انجام کی بھی بیان فرماتا ہے تاکہ مختلف مسائل کے بارے میں مسلمانوں کو آگاہی، بیداری اور معرفت حاصل ہو اور انسان اپنی زندگی کے حقائق کو گزشتہ اقوام کی تاریخ کے آئینہ میں دیکھ سکیں۔

### ۲۔ تکوینی صورت میں:

یعنی گزشتہ اقوام کے چھوڑے ہوئے تاریخی آثار ایسے آثار جو بظاہر تو خاموش ہیں۔ لیکن اپنے اندر شور و غوغا کی ایک کائنات لیے ہوتے ہیں، ایسے آثار جو گزشتہ تاریخ کو واضح طور پر پیش کر رہے ہیں درحقیقت یہ ایسے آثار ہیں جو انسان کے سامنے آئینہ کی حیثیت رکھتے ہیں جس میں وہ اپنی زندگی اور اپنے مستقبل کے چہرہ کو بخوبی ملاحظہ کر سکتا ہے۔  
سب سے پہلے ہم ان دونوں قسم کے نمونوں کو آیات کی روشنی میں پیش کرتے ہیں۔

آیات

۱۔ لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةً لِأُولِي الْأَلْبَابِ ط (سورہ یوسف ۱۱۱)

۲۔ فَأَقْصِصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ۞ (سورہ اعراف ۱۶۶)

۳۔ ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْقُرْاٰنِ نَقُصُّهُ عَلَيْكَ مِنْهَا قَائِمٌ وَّحَصِيْدٌ ۝ (سورہ ہود ۱۰۰)

۳۔ مَحْنٌ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَذَا الْقُرْآنَ ۖ وَإِنْ

كُنْتَ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الْغَافِلِينَ ﴿۳﴾ (سورہ یوسف ۳)

۵۔ فَأَخَذَهُ اللَّهُ نَكَالَ الْآخِرَةِ وَالْأُولَىٰ ﴿۳۵﴾ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَن يَخْشَىٰ ﴿۳۶﴾

(سورہ نازعات ۲۶، ۲۵)

۶۔ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُون لَهُمْ قُلُوبٌ يَّعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ

يَسْمَعُونَ بِهَا ۗ (سورہ حج ۳۶)

۷۔ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ

قَبْلِهِمْ ۗ دَمَّرَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۖ وَلِلْكَافِرِينَ أَمْثَالُهَا ﴿۱۰﴾ (سورہ محمد ۱۰)

۸۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۖ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ

عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ﴿۱۳﴾ (سورہ آل عمران ۱۳)

۹۔ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللَّهُ يُنشِئُ النَّشْأَةَ

الْآخِرَةَ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۲۰﴾ (عنكبوت ۲۰)

۱۰۔ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ حَاجَّ أَبْرَاهِمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ ۗ

(سورہ بقرہ ۲۵۸)

۱۱۔ أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ﴿۶﴾ إِرْمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ﴿۷﴾ (سورہ فجر ۶-۷)

۱۲۔ أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ ﴿۱﴾ (سورہ فیل ۱)

ترجمہ

۱۔ ان کی سرگزشت میں عقلمند لوگوں کے لیے عبرت ہے۔

۲۔ ان قصوں کو (ان کے لیے) بیان کرو شاید کہ وہ سوچیں (اور بیدار ہوں)

۳۔ یہ شہروں اور بستیوں کی خبروں میں سے ہیں جو ہم آپ کو بیان کرتے ہیں کہ جن میں سے بعض تو ابھی تک اپنی



جگہ پر قائم ہیں اور بعض جاچکے ہیں۔

۴۔ ہم اس قرآن کو وحی کرنے کے طریقے سے بہترین قصے تمہارے لیے بیان کرتے ہیں، ہر چند کہ تم اس سے پہلے غافل لوگوں میں سے تھے۔

۵۔ خداوند عالم نے اسے آخرت اور دنیا کے عذاب میں مبتلا کیا اور اس میں ان لوگوں کے لیے عبرت ہے جو (خدا سے) ڈرتے ہیں۔

۶۔ آیا وہ زمین میں نہیں چلے پھرے تاکہ ان کے لیے ایسے دل ہوں جن کے ذریعہ وہ حقیقت کو درک کریں یا ایسے سننے والے کان ہوں جن کے ذریعہ وہ حق کی آواز کو سنیں۔

۷۔ آیا زمین میں نہیں چلے پھرے تاکہ وہ دیکھیں کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جو ان سے پہلے تھے؟ خداوند عالم نے انہیں ہلاک کیا۔ اور کفار کے لیے اس جیسی سزائیں ہیں۔

۸۔ تم سے پہلے کچھ طریقہ کار موجود تھے اور (ہر قوم اپنے اعمال و صفات کے مطابق کسی نہ کسی انجام کو ضرور پہنچی) لہذا تم روئے زمین پر چلو پھرو اور دیکھو کہ (آیاتِ خدا) کو جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا؟

۹۔ کہہ دو کہ تم زمین میں سیر کرو اور دیکھو کہ خدا نے تخلیق کا آغاز کیونکر کیا؟ (پھر اسی طریقہ پر) خداوند عالم، عالمِ آخرت کو ایجاد کرے گا، خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

۱۰۔ آیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم علیہ السلام سے اس کے رب کے بارے میں احتجاجی گفتگو کی۔

۱۱۔ آیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے عاد، اس طاقتور شہر کے ساتھ کیا کیا؟

۱۲۔ آیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے اصحابِ فیل (ابرہہ کے لشکر) کے ساتھ کیا کیا؟

## الفاظ کی شرح

۱۔ قصص، (بروزن نفس) کے معنی چیزوں کے آثار کے بارے میں جستجو کرنا ہے [۱] اور قصہ کو اس لیے قصہ کہتے ہیں کیونکہ اس میں مختلف قسم کے حوادث اور خبروں کا تعاقب کیا جاتا ہے۔ بنا بریں قصہ کا معنی صرف داستان اور کہانی نہیں بلکہ لغوی معنی کی رو سے اشیاء کے آثار کی جستجو ہے۔

[۱] یہ بات پیش نظر رہے کہ ”قصص“ کے ایک تو مصدری معنی ہیں اور دوسرے وہ قصہ کی جمع ہے۔ سورہ یوسف کی ۳۱ اور ۱۱ آیت میں جمع کے معنی میں ہے۔

ہر وہ چیز جو ایک دوسرے کے بعد قرار پائے۔، قصص کہلاتی ہے۔ اور قینچی کو اس لیے مقصص کہتے ہیں کیونکہ وہ بالوں کو پے در پے کاٹتی ہے۔ اور قصہ (بروزن غصہ) بالوں کے اُس مجموعہ کو کہتے ہیں جو سر کے اگلے حصہ میں ہوتا ہے۔ [۱]

۲۔ عبرت دراصل عبور اور عبر (بروزن ابر) کے مادہ سے ہے جس کے معنی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونا ہے۔ اور عبور دراصل لغت عرب میں پانی سے گزرنے کے معنی میں ہے، خواہ تیر کر، یا کشتی کے ذریعہ یا پُل وغیرہ کے ذریعہ ہو۔ لیکن بعد میں وسیع تر معنی میں استعمال ہونے لگا، اور ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہونے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ بات کو اس لیے عبارت کہتے ہیں کہ وہ گزرنے والی ہوتی ہے اور بولنے والے کی زبان سے گزر کر سننے والے کے کانوں تک جا پہنچتی ہے۔

لیکن عبرت اس قابل مشاہدہ کیفیت کے معنی میں ہے جس کے ذریعہ انسان اس چیز تک جا پہنچتا ہے جو قابل مشاہدہ نہیں ہوتی۔ [۲] کچھ لوگ کہتے ہیں کہ عبرت اس راہنمائی کو کہتے ہیں جو انسان کو منزل مقصود تک پہنچاتی ہے اور عبرت کے معنی تعجب بھی ہیں اور (یہ شاید اس لیے ہے کہ بہت سے تعجب خیز حوادث کو انسان اہم اور آشکارا حوادث کے ذریعہ سے دریافت کرتا اور تعجب کرتا ہے)۔

سیر کا معنی زمین پر چلنا ہے۔ اور جب ”سیر فی الارض“ کہا جاتا ہے تو اس میں تاکید معنی پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ راغب مفردات میں کہتے ہیں کہ علماء نے ”سیر فی الارض“ کے دو معنی ذکر کیے ہیں، ایک تو روئے زمین پر جسمانی حرکت (اور مختلف آثار و موجودات کا مشاہدہ) اور دوسرے موجودات عالم کے بارے میں مطالعہ اور فکری حرکت۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ سیر کا معنی کسی ایک جہت میں لگا تار عبور ہے۔ [۳]

سیرت روش یا افراد کی تاریخ زندگی کا معنی بھی اسی سے لیا گیا ہے۔

۳۔ رویت کے بارے میں لغت نے دو معنی بتائے ہیں۔ ایک تو آنکھ سے مشاہدہ دوسرے باطنی علم و آگاہی اور مشاہدہ۔ [۴] اور کلام مجید میں بہت سے مقامات پر دوسرے معنی یعنی علم و آگاہی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اور رائے بھی قلبی عقیدے اور نظریے کے معنی میں ہے خواہ یہ عقیدہ قطعی اور یقینی ہو خواہ ظنی اور گمان کے لیے ہو۔ اور، رویہ اور تروی کا معنی ایک نظریہ کو حاصل کرنے کے لیے غور و فکر یا تلاش اور جستجو کرنا ہے۔

۵۔ نظر دراصل آنکھ کی گردش کرنے کے معنی میں ہے، یا کسی چیز کی حقیقت کو معلوم کرنے کے لیے فکر کو جولانی دینے کے معنی میں ہے

[۱] لسان العرب، مفردات راغب اور مجمع البحرین۔

[۲] مفردات راغب

[۳] مجمع البیان، جلد ۵، ص ۲۶۸

[۴] پہلا ایک مفعول کی طرف متعدی ہے اور دوسرا مفعولوں کی طرف (لسان العرب اور مفردات)

اور کبھی تجسس اور جستجو کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی ایسی معرفت کے معنی میں ہوتا ہے جو جستجو کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ [۱]

مجمع البحرین میں نظر کے تین معنی ذکر کیے گئے ہیں: ۱: کسی چیز کا مشاہدہ کرنا۔ ۲: آنکھ کے ساتھ کسی چیز کو غور سے دیکھنا۔ ۳: علم یا گمان کو حاصل کرنے کے لیے غور و فکر سے کام لینا۔

لسان العرب نے پہلے تو، نظر کے معنی احساسِ چشم کیا ہے اور پھر اسے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک آنکھ کیساتھ دیکھنا اور دوسرے قلب کے ساتھ دیکھنا اور لائق توجہ یہ ہے کہ یہ تفسیر بیان کرنے کے بعد اس نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث کو ذکر کیا ہے۔

«النظر الی وجه علی عبادۃ» اور اس حدیث کی تفسیر میں ابن اثیر کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس حدیث کے یہ معنی ہیں کہ جب لوگوں کی نگاہ علی علیہ السلام پر پڑتی تھی تو وہ کہہ اٹھتے تھے:

«لا اله الا الله ما اشرف هذا الفتی! لا اله الا الله ما اعلم هذا الفتی!»

«لا اله الا الله یہ جوان کس قدر شریف ہے! لا اله الا الله یہ جوان کس قدر عالم ہے؟»

تو اس طرح سے ان کا علی کی طرف دیکھنا عبادتِ الہی اور کلمہ توحید کی دعوت دیتا تھا۔ [۲]

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

سب سے پہلی آیت میں گزشتہ اقوام میں سے کچھ قوموں کے دردناک انجام کی طرف اشارہ کرنے کے بعد فرماتا ہے: ان کے آثار کی تحقیقات اور ان اقوام میں سرگزشت اور ان کا انجام صاحبانِ عقل و فکر کے لیے موجبِ عبرت ہے اور وہ اس طریقہ سے بدبختی اور خوش بختی کے عوامل کو سمجھ سکتے ہیں اور نجات و ہلاکت کی راہ کو ایک دوسرے سے جدا کر سکتے ہیں۔

دوسری آیت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے: ان کی سوچ اور افکار کو زندہ کرنے اور انہیں غور و فکر پر آمادہ کرنے کے لیے ان کے سامنے گزشتہ اقوام کی سرگزشت اور داستانیں بیان کیجئے، کیونکہ گزشتہ لوگوں کی تاریخ کا صحیح بیان ان کے افکار کی بیداری کا موجب اور معرفت کا منبع ہے۔

تیسری آیت میں قومِ نوح، قومِ شعیب، قومِ فرعون اور قومِ لوط عا د اور شمود جیسی گزشتہ اقوام کی سرگزشت بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے: یہ ان شہروں اور آبادیوں کی خبروں میں سے ہے جو ہم آپ سے بیان کرتے ہیں، جن سے کچھ تو اپنی جگہ پر قائم ہیں اور کچھ کو سرکوب کر دیا گیا ہے اور وہ نیست و نابود ہو چکے ہیں ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ اور آخر میں اضافہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: اس بارے میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو آخرت کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔

[۱] مفردات راغب، مادہ نظر

[۲] لسان العرب، جلد ۵، مادہ نظر

چوتھی آیت میں، جو کہ سورہ یوسف کے آغاز میں ہے، سامعین کو آمادہ کرنے کے لیے فرماتا ہے: ہم اس آسمانی وحی یعنی قرآن میں آپ کے لیے ایسی بہترین داستانیں اور سرگزشتوں کو بیان کرتے ہیں اور حقائق سے مطلع کرتے ہیں جن سے آپ پہلے آگاہ نہیں تھے۔ اس طرح آپ کی معرفت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ان چار آیات میں قصہ یا قصص پر تکیہ کیا گیا ہے جو تحقیق، جستجو اور گزشتہ حوادث و اخبار کی تحلیل کے معنی میں ہے اور معرفت کا ایک وسیلہ ہیں۔

پانچویں آیت میں فرعون کے دردناک عذاب کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے: خدا نے اسے آخرت اور دنیا کے عذاب سے معذب کیا اور اس ماجرے میں ان لوگوں کے لیے عبرت ہے جو خدا ترس ہیں۔

اس آیت میں عبرت پر تکیہ کیا گیا ہے جس کا معنی ایک قابل مشاہدہ حالت سے منتقل ہو کر اور عبور کر کے ایسے حقائق کے مشاہدہ تک پہنچنا ہے جو قابل مشاہدہ نہیں ہیں۔

چھٹی، ساتویں، آٹھویں اور نویں آیت میں ”سیر فی الارض“ پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ ایک جگہ پر کہا گیا ہے کہ اگر وہ روئے زمین پر چلتے پھرتے اور گزشتہ لوگوں کے باقی ماندہ آثار کو دیکھتے تو ان کے دل و دماغ بیدار ہو جاتے اور وہ حق کے ادراک کے لیے سننے والے کانوں کے مالک ہوتے۔

دوسری جگہ پر کفار کو سرزنش کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ آخر وہ زمین پر چلتے پھرتے کیوں نہیں، تاکہ وہ ان اقوام کے انجام کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ وہ عذاب الہی میں گرفتار ہوئے، اور انہیں معلوم ہوتا کہ اس قسم کے عذاب ان کے انتظار میں بھی ہیں۔

ایک اور مقام پر تمام لوگوں کو، یا تمام مسلمانوں کو، خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے: تم سے پہلے کچھ طریقہ کار موجود تھے اور کچھ تو میں اپنے مختلف اعمال و کردار کی وجہ سے برسرِ اقتدار آئیں۔ تمہیں چاہیے کہ تم کمر باندھ لو اور دنیا کے مختلف حصوں میں ان کے آثار کو دیکھو تاکہ تمہیں اس بات کا علم ہو جائے کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جنہوں نے انبیاء علیہم السلام کی دعوت کو جھٹلایا۔

ایک اور جگہ پر لوگوں کو ”سیر فی الارض“ کی دعوت بھی دی گئی ہے تاکہ اس طرح وہ آغازِ آفرینش کی جستجو کر کے معاد کے مسئلہ کی حقیقت کو سمجھ سکیں۔

دسویں، گیارھویں اور بارھویں آیات میں مشاہدہ اور روایت کے مسئلہ پر زور دیا گیا ہے لیکن ظاہر آنکھ سے نہیں بلکہ باطنی اور دل کی آنکھ سے۔

مذکورہ تینوں آیات میں روئے سخن بظاہر تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی کی طرف ہے لیکن اس سے مراد تمام مومنین بلکہ تمام انسان ہیں، استفہام (سوالیہ انداز) کی صورت میں آنحضرتؐ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: آیا آپ نے اس شخص کی تاریخ کو نہیں دیکھا جس نے اپنی سلطنت کے غرور میں آ کر ابراہیم علیہ السلام سے خدا کے بارے میں مناظرانہ گفتگو کی، اس کا انجام کیا ہوا؟ یعنی سرکش و متکبر اور مغرور و زمرود کا کبھی کہتا ہے کہ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خداوند عالم نے قوم عاد اور اس کے آباد و شاد شہروں کے ساتھ کیا کیا؟

آیا آپ نے نہیں دیکھا کہ ہاتھی والوں کا کیا انجام ہوا؟ وہی جو خانہ کعبہ کو مہندم کرنے کے لیے سرزمین یمن سے ایک کثیر لشکر لے کر

آئے اور خدا نے اس قدر عظیم اور طاقتور لشکر کو ضعیف و ناتواں پرندوں کے ذریعہ کنکریاں برساکر سرکوب کر دیا؟  
یقینی بات ہے کہ نہ تو پیغمبر اکرمؐ نے ابراہیم علیہ السلام اور نمرود اور ان کی مناظرانہ گفتگو کو آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا تھا اور نہ ہی مسلمانوں نے۔ یہی حال قوم عاد اور ان کے شہروں کی کیفیت کا ہے۔ مشہور روایات کی بنا پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی سال متولد ہوئے جس سال ہاتھی والوں کا ماجرا رونما ہوا۔ طبعی طور پر آنحضرتؐ نے اس ماجرہ کو نہیں دیکھا اور نہ ہی مسلمانوں کی اکثریت نے۔ اسی لیے یہاں پر روایت سے مراد ان کی تاریخ اور سرگزشت کے بارے میں غور و فکر کرنا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ پہلی پانچ آیات میں مدون و مرتب تاریخ پر زور دیا گیا ہے یعنی ان واقعات پر جو تاریخ کتب کے صفحات میں درج ہیں۔ اور بعد کی چار آیات میں زندہ تکوینی تاریخ پر زور دیا گیا ہے، یعنی گزشتہ اقوام کے وہ آثار جو دنیا کے مختلف نقاط میں موجود ہیں۔

تین آخری آیات میں شاید تاریخ مدون یا خارجی زندہ تاریخ یا دونوں کی طرف اشارہ ہے۔ ان مجموعی آیات اور قرآن میں (ان جیسی دوسری آیات) سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید تاریخ کی دونوں قسموں کو معرفت و آگاہی کے منبع کی حیثیت سے متعارف کراتا ہے۔ ایک اور مقام پر قرآن مجید لوگوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ بدست خود جا کر فرعونی محلات، عاد و ثمود کے تباہ شدہ کھنڈرات، نمرود یوں کے بلند و بالا قصور اور قوم لوط کی تہ و بالا شدہ سرزمین کو دیکھیں اور معرفت حاصل کریں۔

قرآن مجید ایک اور مقام پر بدست خود ان واقعات اور سرگزشتوں کی دقیق صورت میں مویشگانی کرتے ہوئے تشریح کرتا ہے اور ان کے عبرت آموز نکات کو ایک ایک کر کے بیان فرماتا ہے اور ان تاریخی مباحث میں ملذبین کافرین ظالمین اور ہوس کاروں کے انجام کو واضح کرتا ہے۔

حقیقت میں کبھی تو لوگوں کو مصر لے جاتا ہے اور انہیں وہاں کے تاریخی آثار دکھاتا ہے اور منوں مٹی تلے سوائے ہوئے لوگوں کو ان کے سامنے مجسم کر دیتا ہے، ان کے تاریخ شدہ بخت و تخت کو ان کی آنکھوں کے سامنے لے آتا ہے۔ اور کبھی تخت سے گرے بختوں کا دیدار کراتا ہے۔

غرض گزشتہ تاریخ کو مستقبل کے سینوں میں محفوظ رکھ کر لوگوں کو ان کا دیدار کراتا ہے۔<sup>[۱]</sup>  
 اور کبھی ان کا ہاتھ پکڑ کر قوم لوٹ کے رہائشی مرکز سدوم کی طرف لے جاتا ہے۔ وہاں سے شدا کی بہشت، پھر سرزمین بابل کی طرف جو کہ نمرود کی فرمانروائی کا مرکز تھا اور وہاں سے کئی دوسرے مقامات کی جانب۔  
 مدائن کے ایوان کو آئینہ عبرت بنا کر پیش کرتا ہے اور ہر محل کے ایک ایک کنگرے سے نئی نصیحتیں پیش کرتا ہے۔  
 غرض قرآن مجید تعلیم و تربیت اور معرفت و آگاہی کے سلسلے میں تاریخ پر بھی انحصار کرتا ہے اور اوراق کتاب اور صفحہ زمین میں موجود گزشتہ اقوام کی سرگزشت پر بھی۔ اور یہی چیز بذات خود ایک غور و فکر کی صورت ہے۔

## توضیحات

[۱] مذکورہ بالا تعبیرات ”سرد“ کے مشہور اشعار کی طرف اشارہ رہیں۔ سرد کہتے ہیں:

بمصر رفتم و آثار باستان دیدم	بہ چشم آنچه شنیدم ز داستان دیدم
بے چین و چناں خواندہ بودم از تاریخ	چنین فادہ نصیبم کہ آنچه ان چنان دیدم
گزشتہ در دل آئندہ ہرچہ پنہاں داشت	بہ بصر از توچہ پنہاں کہ برعیان دیدم
تو تخت دیدی و من بخت واژگون از تخت	تو نقش ظاہر و من نقش ناتوان دیدم
تو تاج دیدی و من تخت رفتہ تاراج	تو عاج دیدی و من مشت آستخوان دیدم
تو چشم دیدی و من دیدہ حریصان باز	ہنوز در طبع ملک جاوداں دیدم

یعنی میں مصر گیا اور وہاں پر آثار قدیمہ کے بارے میں جو کچھ میں نے قصے کہانیوں کے ذریعہ سن رکھا تھا اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

میں نے تاریخ میں تو بہت کچھ پڑھا ہوا تھا، لیکن نصیب کی بات کہ میں نے وہاں پر بعینہ وہی کچھ دیکھا۔

ماضی نے مستقبل کے بارے میں اپنے دل میں جو کچھ چھپا رکھا تھا اسے میں نے واضح طور پر دیکھا۔

تم نے تو صرف تخت کو دیکھا لیکن میں نے تخت کے اجڑے بخت کو دیکھا۔ تم نے ظاہری نقش و نقوش کو ملاحظہ کیا لیکن میں

نے باریک و ناتوان نقوش کا مطالعہ کیا۔ تم نے تو صرف تاج کو دیکھا مگر میں نے تاراج ہونے والے تخت کو دیکھا، تم نے

ہاتھی دانت دیکھے مگر میں نے ایک مشت آستخوان کو دیکھا۔ تم نے صرف آنکھوں کو دیکھا، لیکن میں نے ملک جاودان کے

لاٹچ میں ابھی تک حریصوں کی کھلی ہوئی آنکھوں کو دیکھا۔

## ۱۔ تاریخ کا آئینہ جہان نما:

انسانی عمر کا اہم ترین حاصل اور نتیجہ اس کے تجربات ہیں۔ اور تجربات بھی ایسے کہ انسان جن سے اپنی زندگی کو بہتر بنا سکے، زیادہ سے زیادہ جہاد کر سکے اور روز افزاوں ارتقاء کی جانب گامزن ہو سکے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک انسان اپنی مختصر سی زندگی میں کتنی مدت تجربات کرے گا؟ بیس سال؟ پچاس سال؟ اسی سال؟ اور وہ بھی اس صورت میں کہ شدید ترین بحرانوں سے دوچار ہو جو کہ تجربہ کا میدان ہیں، اور اس کی زندگی یکساں صورت میں نہ گزرے۔

اب ذرا سوچئے کہ اگر ہم ایک ہی دور میں رہنے والے تمام لوگوں کے تجربات کو اکٹھا کر سکیں بلکہ اس سے بڑھ کر گزشتہ تمام ادوار کے انسانوں کے تجربات کو یکجا کر سکیں، تو آپ ہی بتائیے کہ ان تجربات کا حجم کسی حد تک ہو جائے گا؟ اور یقینی بات ہے کہ یہی تجربات معرفت و آگاہی کا ایک عظیم مبداء ہوں گے۔

تاریخ گزشتہ تمام ادوار کے تمام لوگوں کے تجربات کا ایک مجموعہ ہے بشرطیکہ صحیح اور مکمل صورت میں اسے مرتب و منظم کیا جائے، حتیٰ کہ اگر ناقص صورت میں بھی مرتب کی جائے پھر بھی اسی لحاظ سے گزشتہ ادوار کے تجارب کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

تاریخ کی اہمیت اس لحاظ سے بھی زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ ہمیں اس بات کا علم ہو جائے کہ موجودہ دور میں کوئی بھی چھوٹے سے چھوٹا واقعہ ایسا نہیں ہے جس کا ایک یا کئی نمونے ماضی میں واقع نہ ہو چکے ہوں اسی لیے تو کہا جاتا کہ تاریخ ہمیشہ اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے۔ اور یہ ہے بھی حقیقت البتہ ممکن ہے کہ چند استثنائی واقعات ایسے ہوں جن کی مثال نہ ملتی ہو لیکن واقعات کو قطعی اکثریت اسی زمرے میں آ جاتی ہے۔

حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام اپنے فرمانِ ذیشان میں اسی چیز کی طرف اشارہ کر کے فرماتا ہیں:

”عباد اللہ ان الدھر یجری بالباقین کجریہ بالماضین“

خدا کے بندو! حالات موجودہ لوگوں میں بھی اسی طرح چل رہے ہیں جس طرح گزشتہ لوگوں میں جاری و

ساری تھے۔ [۱]

ایک مشہور معروف حدیث میں آیا کہ اس امت میں جو کچھ واقع ہو رہا ہے اس کا نمونہ بنی اسرائیل میں واقع ہو چکا ہے:

یہیں سے معرفت و آگاہی کے بارے میں تاریخ کا مقام و مرتبہ اس کی اہمیت مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے۔

تاریخ بشریت کا بغور مطالعہ کرنے سے مندرجہ ذیل امور روز روشن کی طرح واضح ہو جاتے ہیں۔

شکست و ناکامی۔

فتح و کامیابی کے اسباب،

تمدن کی نشوونما کے اسباب،  
حکومتوں کے سقوط و انقراض کے اسباب،  
ظلم و استبداد کا انجام،  
عدل و انصاف کا انجام  
اتحاد و تحریک اور تلاش و کوشش کے آثار،  
علم و آگاہی کے نقوش،

اور جہالت سستی اور کاہلی کا انجام، غرض سب کچھ تاریخ کے آئینہ جہاں نما میں منعکس ہوتا ہے۔  
اگر کسی دانشور شاعر نے خدا سے دوبارہ زندگی کی درخواست کی ہے تو کہا ہے:

مرد	خرد	مند	پسندیدہ	را
عمر	دو بالیت	در	این	روزگار
تابہ	یکی	تجربہ	اندوختن	
با	گری	تجربہ	بستن	بکار

یعنی ایک اچھے اور عقلمند انسان کے لیے دنیا میں دو عمریں ضروری ہیں

تاکہ ایک عمر کے ذریعہ وہ تجربہ حاصل کرے اور دوسری کے ذریعہ اس تجربہ پر عمل کرے۔

اسے کہنا چاہیے کہ اگر تم تاریخ کا بغور مطالعہ کرو تو دوبارہ کی عمر تو آسان بات ہے سو بار بلکہ ہزار بار کی عمر بھی تمہیں مل سکتی ہے۔

کیا خوب فرمایا ہے امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے اپنے فرزند گرامی اما حسن مجتہبی علیہ السلام سے:

”ای بنی! انی وان لم اکن عمرت عمر من کان قبلی، فقد نظرت فی

اعمالهم، ونکرت فی اخبارهم، وسرت فی آثارهم، حتی عدت کا

حدهم، بل کانی بما انتھی الی من امورهم قد عمرت مع اولهم الی

آخرهم۔“

فرزند دلہند! اگرچہ مجھے گزشتہ افراد کی عمر نہیں ملی لیکن میں نے ان کے اعمال پر نظر ڈالی ہے اور ان کی خبروں کے بارے میں سوچ و فکر سے کام لیا ہے ان کے آثار کی سیر کی ہے اور وہ بھی اس حد تک گویا میں بھی ان میں سے کا



ایک شمار ہونے لگا ہوں: نہیں بلکہ جو کچھ مجھے ان کی تاریخِ زندگی سے حاصل ہوا ہے گویا ان کے اول سے لے کر آخری فرد کے ساتھ آغاز سے انجام تک زندہ رہا ہوں۔<sup>[۱]</sup>

مذکورہ معروضات پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اس نکتہ سنج شاعر کا نظہار افسوس جو یہ کہتا ہے:

افسوس کہ سودای من سوختہ خام است

تا سوختہ شود خامی من عمر تمام است

(ہائے افسوس کہ میرا علم و عقل اور تجربہ ابھی تک خام اور نامکمل ہے اور جب میری یہ خامی دور ہوگی تو زندگی ختم ہو جائے گی)

یا ایک اور شاعر کا جو یہ کہتا ہے:

تا تو انستم ندانستم چه سود

چونکہ دانستم تو انستم بنود

(جب میں جان سکتا تھا تو تمہیں جانا۔ اس کیا کیا فائدہ۔ جب جان لیا تو میری طاقت سے باہر تھا)

کوئی معقول معلوم نہیں ہوتا کیونکہ تاریخِ بشریت اس قسم کی بہت سی مشکلات کو حل کر سکتی ہے اور اس طرح کی کئی قسم کی کمی کو پورا کر سکتی ہے۔

البتہ ہم موجودہ تاریخ تو کمزوری اور ناتوانی کا انکار نہیں کرتے۔ لیکن تاریخ اپنے تمام اشکالات کے باوجود (جس کی طرف ہم عنقریب اشارہ کریں گے) آگاہی اور معرفت کا ایک مؤثر اور مفید منبع ہے۔

## ۲۔ تاریخ کے پرکشش نکات

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ تاریخ سے سبق حاصل کیا جاسکتا ہے، اور کیونکر؟ تو اس سوال کا جواب چنداں مشکل نہیں ہے، کیونکہ تاریخ کو ایک بہت بڑی تجربہ گاہ یا لیبارٹری سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جس میں انسانی زندگی کے مختلف مسائل پر تحقیقات کی جاتی ہے۔

اسی لیے جس طرح تجرباتی علوم نے اپنی حدود کے اندر بہت سے مسائل کو حل کر دیا ہے اور تحقیقات کے ذریعہ بہت سی واقعات کو ثابت کر دکھایا ہے، اسی طرح تاریخ بھی جو ایک عظیم تجربہ گاہ ہے مختلف مسائل کو آزمائش کے مراحل سے گزار کر خالص اور ناخالص کو جدا کر دیتی ہے اور تخیلات کی بجائے حقائق اور واقعات کو پیش کرتی ہے۔

اگر فزیکل اور کیمیکل لیبارٹریوں میں اجسام کے ظاہر یا ان کی ترکیب پر تحقیق ہوتی ہے تو تاریخ کی لیبارٹری میں بھی اقوام کی فتح و شکست کے اسباب، تمدنوں کی پیش رفت اور سقوط کے عوامل، مختلف اقوام و افراد کے صفات و اوصاف کے رد عمل اور ان کے رفتار و کردار کے طریقہ کار کو آزمائش کی کسوٹی پر رکھا جاتا ہے اور وہ بھی نہایت ہی شیریں اور پُرکشش انداز ہیں۔

اس طرح سے تاریخ انسان کی خوش قسمتی اور بدبختی کے عوامل و اسباب کو پرکھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید گزشتہ لوگوں کی تاریخ پر بہت زور دیتا ہے اور قرآن مجید کی سورتوں میں تاریخی مباحث کو بیان کیا گیا ہے، حتیٰ کہ بعض سورتوں کی تقریباً تمام آیات مشتمل ہی گزشتہ لوگوں کی تاریخ پر ہیں، تو اس کا سبب بھی یہی ہے۔

ممکن ہے کہ ہٹ دھرم اور ضدی مزاج کے لوگ بہت سے ہے نظری مسائل کا انکار کر دیں لیکن تاریخ کی مسلم اور قطعی واقعات کا تو انکار نہیں کر سکتے، خصوصاً جب قرآن مجید لوگوں کا ہاتھ پکڑ کر گزشتہ اقوام کے باقی ماندہ آثار قدیمہ کی طرف لے جاتا ہے اور ان کی قبروں پر شہروں کے کھنڈرات پر کھڑے ہو کر بیان کرنے کی باتیں ان سے بیان کرتا ہے۔

درحقیقت تاریخ تجرباتی مسائل کی ایک شاخ ہے اور ایک لحاظ سے اسے معرفت کے ایک اور منبع یعنی حس اور تجربہ سے ادغام کیا جا سکتا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ حس اور تجربہ کا تعلق حال سے ہوتا ہے جبکہ تاریخ کا تعلق ماضی سے ممکن ہے کہ حس اور تجربہ کا صرف تعلق ہو جبکہ تاریخ کا تعلق تمام لوگوں سے ہوتا ہے۔

لیکن تاریخ جو کہ تجربہ کی ایک شاخ ہے، اپنی زبردست اہمیت کے پیش نظر اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اس پر معرفت کے مستقل منبع کی حیثیت سے غور و فکر کیا جائے۔

### ۳۔ تاریخ کے ناخالص پہلو

باوجودیکہ تاریخ بہت سی واقعات کو بیان کرنے کے لیے ایک عمدہ اور عظیم آئینے کی حیثیت رکھتی ہے لیکن بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ صاف و شفاف آئینے کے چہرے کو بگاڑنے کے لیے ہمیشہ کئی آلودہ ہاتھ سرگرم عمل رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے اندر کئی ناخالص مواد موجود ہیں بسا اوقات سچ کو جھوٹ سے اور کھرے کو کھوٹے سے جدا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اس کی وجہ بھی صاف ظاہر ہے، کیونکہ ایک طرف تو تمام مؤرخین ہمیشہ غیر جانبدار نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ اپنی ذاتی پسند یا گروہی مصلحتوں کے پیش نظر اپنی حسب منشا تاریخ نگاری کرتے تھے اور دوسری طرف ظالم و جابر طاقتیں ہر دور اور ہر مکان پر تاریخ نویسوں کو اپنے زیر اثر رکھ کر اپنی مرضی کے مطابق تاریخ لکھواتی رہیں اور وہ بھی ان کے حکم کے مطابق لکھتے رہے۔

اگرچہ ان جبار حکمرانوں میں سے ہر ایک کی حکومت کے خاتمہ اور آزاد ماحول میسر آ جانے کے بعد کوشش ہوا کرتی تھی کہ ان غلطیوں کا ازالہ کیا جائے اور خرابیوں کی ترمیم کی جائے لیکن پھر بھی اس میں یا تو مکمل طور پر کامیابی نہیں ہو پاتی تھی اور اگر ہو بھی جاتی تو اصلاح اور ترمیم ناکافی ہوا کرتی تھی۔

پھر لطف کی بات یہ ہے کہ کئی خود سر حکومتوں کے عروج و زوال کے ساتھ تاریخی مسائل بھی مختلف صورتوں میں تبدیل کر دیئے جاتے جو ایک دوسرے کے بالکل برعکس ہوتے تھے، مثال کے طور پر بنی امیہ نے تاریخ اسلام میں اپنی مرضی کے مطابق تحریف کی تو بنی عباس نے دوسری شکل میں اسے بدل ڈالا، لیکن جب بنی عباس کے جانشین آئے تو انہوں نے اسے ان دونوں سے مختلف شکل دے دی۔

سوویت یونین کا امراء اسٹالن، کیونسٹ انقلاب کی تاریخ کو اسی صورت میں تحریر کرنا ہے جیسا اس کا جی چاہتا ہے، حتیٰ کہ پورے ملک کے مدارس میں اس تاریخ کو داخل نصاب کیا جاتا ہے۔ لیکن جب اس کے جانشین آتے ہیں تو اس کا ایک خون آشام جلاد کے عنوان سے تعارف کراتے ہیں اور اس کی تحریر کردہ تاریخی کتابوں کو سمیٹنے کا حکم دے کر تاریخ انقلاب کو نئے انداز میں تحریر کیا۔ اسی طرح جو ٹولا بھی برسر اقتدار آتا رہا اپنے منشا و مذہب کے مطابق تاریخ میں رد و بدل کرتا رہا۔

یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ تاریخ سے اس قدر بدظن ہو گئے کہ اس معروف جملے کو مبالغہ کی حد تک اپنا لیا کہ تاریخ ایسے واقعات اور سرگزشتوں کا مجموعہ ہے جو معرض وجود میں نہیں آئے اور ایسی قوموں کے بارے میں ہے جن کا قطعاً وجود ہی نہیں تھا، لیکن جہاں تک انصاف کا تعلق ہے۔ ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ اپنے ان تمام نقائص کے باوجود تاریخ معرفت و شناخت کے منبع کی حیثیت سے قابل قبول ہے، کیونکہ تاریخ بھی دوسری تمام روایتوں کی مانند متواتر موثق ضعیف اور مجہول روایات کی حامل ہے۔

کچھ امور کے بارے میں تاریخی متواترات کا انکار نہیں کیا جاسکتا، جیسے منگولوں کے لشکروں کے حملے، ہٹلر کی بربریت، اندلس کے دردناک حوادث اور اس قسم کے سینکڑوں دوسرے واقعات ہیں۔ البتہ جس چیز کی نفی یا اثبات، یا جس پر اعتراض اور اشکال کیا جاسکتا ہے، وہ تاریخی جزئیات ہیں کہ اگر موثق ذرائع سے ثابت ہو جائیں تو قابل قبول ہیں۔ البتہ ان کے ضعیف پہلو بھی کم نہیں ہیں۔ تاریخ کے بارے میں یہ ایک منصفانہ فیصلہ ہے لہذا نہ تو اس کی تمام چیزوں کو آنکھ اور کان بند کر کے تسلیم کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی تمام تاریخی کتابوں کو یکسر مسترد کیا جاسکتا ہے۔

اس سے قطع نظر تاریخ کے دو حصے ایسے ہیں جو ہر طرح کی دستبرویا تحریف سے پوری طرح محفوظ ہیں۔ ایک تو وہ آثار جو خارجی اور نکتوینی صورت میں اس دنیا میں باقی ہیں کہ آسانی کے ساتھ ان میں تحریف نہیں کی جاسکتی اور قرآن مجید نے بھی تاریخ کے اسی حصہ پر زیادہ زور دیا ہے اور سیر فی الارض کی آیات بھی گزشتہ لوگوں کے بارے میں آگاہی حاصل کرنے کے لیے اسی چیز کو بیان کرتی ہیں۔

اور اس سے بڑھ کر وہ تواریخ ہیں جو وحی کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی ہیں، جیسے قرآن مجید میں موجود تاریخوں کے واقعات جو ہر لحاظ سے خالص اور اصل ہیں۔ اصولی طور پر جس طرح بہترین قانون ساز خداوند عالم ہے اسی طرح بہترین مؤرخ بھی وہ خود ہی ہے، کیونکہ اسے تمام حقائق کی جزئیات کا علم ہے اور شخصی یا گروہی پسند اور ناپسند کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی بنا پر وہ خود ہی دوسروں کی نسبت تاریخ کو بہتر طور پر بیان کر سکتا ہے۔

پھر مزے کی بات یہ ہے کہ قرآن مجید کسی ایک تاریخی داستان کا اس حد تک تکرار کرتا ہے کہ بعض لوگ تعجب کرنے لگ جاتے ہیں۔ مثلاً حضرت نوحؑ یا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی داستانوں کو اور ان انبیاء کی متکبرین کے ساتھ محاذ آرائی کو اس حد تک کیوں بار بار دہرایا

گیا ہے؟ لیکن انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ ان میں سے ہر ایک آیت کا اپنا مخصوص تاریخی پہلو ہوتا ہے کیونکہ بسا اوقات ایک تاریخی واقعہ کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔

مثلاً بنی اسرائیل کی تاریخ کے سلسلے میں کبھی تو طاعون وقت کے ساتھ محاذ آرائی اور مقابلہ کا پہلو اجاگر کیا جاتا ہے اور کبھی اس ہٹ دھرم قوم کی ہٹ دھرمی کو زیر بحث لایا جاتا ہے، کبھی ان کے باہمی اختلافات پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور کبھی نعمتوں کی ناشکری کے پہلو کو نمایاں کیا جاتا ہے۔

الغرض بہت سے تاریخی حقائق ایسے آئینہ کی مانند ہیں جس کے کئی پہلو ہیں اور ہر ایک پہلو ایک علیحدہ حقیقت کو نمایاں کرتا ہے، انشاء اللہ (اس کی مزید تفصیل آپ تاریخ قرآن کی فصل میں پڑھیں گے)

## ۴۔ فلسفہ تاریخ

تاریخ میں جس چیز کو زبردست اہمیت حاصل ہے وہ یہ ہے کہ اس بات کو دیکھا جائے کہ تاریخی واقعات کی بنیاد کیا ہے اور اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

مثال کے طور پر اگر دنیا کے کسی خطے میں کوئی انقلاب رونما ہوتا ہے تو سب سے پہلے ان مسائل کا منظر غائر جائزہ لیا جائے جس کی وجہ سے یہ انقلاب برپا ہوا ہے اور ساتھ ہی ان تمام گزشتہ حوادث و واقعات کا جائزہ لینا چاہیے جن کے ساتھ ان انقلاب کا تعلق ہے۔

پھر اس انقلاب کے ثمرات اور نتائج کا جائزہ لیا جائے گا۔ اور جو چیز تاریخ کو ہدف عطا کرتی ہے اور اسے ایک قسم کی سرگرم رکھنے والی حکایات اور قصوں کہانیوں سے نکال کر شناخت و معرفت کے ایک اہم اور قابل غور منبع میں تبدیل کر دیتی ہے وہ یہی ہے۔

لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ تاریخ نگاروں نے صرف تاریخی واقعات کے ذکر کرنے پر ہی اکتفا کی ہے اور وہ بھی اس وقت جب وہ رونما ہو چکے تھے۔ ان واقعات کے اسباب و نتائج کی طرف بہت کم توجہ دی ہے اور مسائل کے تجزیہ و تحلیل کرنے میں کوئی خاص توجہ نہیں کی۔

لیکن جو چیز قابل توجہ ہے وہ یہ کہ قرآن مجید نے تاریخی واقعات کو بھی بیان کیا ہے؟ ان کے اسباب اور بنیادوں کو بھی ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کا نتیجہ بھی بیان کیا ہے۔ کہیں پر تو گزشتہ لوگوں کی تاریخ کا کچھ حصہ بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے "فانظروا کیف کان

عاقبة المکذبین" دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا؟ (سورہ آل عمران ۷۷)

کبھی کہتا ہے "وانظروا کیف کان عاقبة المفسدین" دیکھو فساد یوں اور تباہ کاروں کا انجام کیا ہوا؟ (اعراف ۸۶)

کبھی فرماتا ہے "فانظروا کیف کان عاقبة المجرمین" دیکھو تو سہی کہ مجرموں کا کیا انجام ہوا؟ (سورہ نمل ۶۹)

اور کبھی فرماتا ہے "ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا واما بانفسہم" خداوند عالم کسی قوم کی حالت اس وقت تک تبدیل

نہیں کرتا جب تک وہ لوگ اپنی حالت خود تبدیل نہ کریں۔ (رعد ۱۱)

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ تاریخ کہ بہت سے شعبے ہیں جن میں زیادہ اہم شعبے یہ ہیں، انسان اور انسانی معاشروں کی تاریخ، مختلف

تمدنوں کی تاریخ اور انسانی علوم و فنون کی تاریخ یہ ایسی تاریخیں ہیں جن کا اصل محور انسان ہے اور انسان ہی اس گاڑی کو چلانے والا ہے۔ اور عجیب کم فہم و رسادہ لوح ہیں وہ لوگ جو تاریخ کو اپنے تمام لوازمات سمیت اقتصاد کے جبری مسائل کا نتیجہ سمجھتے ہیں بلکہ اسے صنعتی ہتھیار سمجھتے ہیں۔ یعنی وہ انسانی تاریخ کو چند صنعتی مشینوں اور صنعتی ہتھیاروں کی مخلوق اور بے ارادہ غلام سمجھتے ہیں جنہیں خود انسان نے تیار کیا ہے۔

اس قسم کے لوگوں نے اپنے اس گمانِ باطل کی وجہ سے نہ تو انسان کو پہچانا ہے اور نہ ہی تاریخ کو۔

## ۵۔ نقلی اور علمی تاریخ اور فلسفہ تاریخ

ایک معاصر دانشور نے تاریخ کو ایک لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ نقلی تاریخ: جو چند ایسے جزئی اور خصوصی حوادث اور واقعات کا مجموعہ ہے جو ماضی میں رونما ہو چکے ہیں، اور حقیقت میں ایسی فلم FILM کے مشابہ ہے جو کسی ایک واقعہ یا چند واقعات سے تیار کی جاتی ہے، اسی لیے یہ تاریخ ہمیشہ جزئی ہوتی ہے نہ کہ کلی، ماضی سے اس کا تعلق ہوتا ہے نہ کہ حال سے: اور نقلی ہوتی ہے نہ کہ عقلی۔

تاریخ کا یہ حصہ فیصلہ جات کے ذریعہ مفید اور سبق آموز ہوتا ہے مثلاً انسان کا اپنے ہم نشین پر اثر ہوتا ہے اور اپنے زمانے کے لوگوں سے عبرت حاصل کرتا ہے جیسا کہ قرآن مجید نے مختلف لوگوں کے اُسوے بیان کیے ہیں تاکہ لوگوں کو ان سے نصیحت حاصل ہو۔

۲۔ علمی تاریخ: انسانی زندگی پر حاکم قوانین اور طریقوں کو بیان کرتی ہے۔ ایسے قوانین اور طریقہ کار جو گزشتہ حوادث کے تجزیہ و تحلیل کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کے اس حصے کے لیے نقلی تاریخ خام مال کا کام دیتی ہے۔ ان قواعد کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں عام ہونے، علمی ہونے اور شناخت و معرفت کا ایک منبع ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے، اور انسان کو مستقبل پر مسلط کرنے کی قابلیت بھی دیتی ہے۔

اس کے باوجود پھر بھی تاریخ کی اس قسم میں یہ بتایا جاتا ہے کہ واقعات کیا ہیں اور یہ نہیں بتایا جاتا کہ کیسے ہوئے ہیں ہر چند کہ یہ قسم کلی بھی ہے اور عقلی بھی۔

۳۔ فلسفہ تاریخ: مختلف ادوار اور معاشروں میں رونما ہونے والے مرحلہ وار تغیر و تبدل کو بیان کرتا ہے یا دوسرے لفظوں میں یہ بتاتا ہے کہ یہ واقعات کیونکر رونما ہوئے ہیں۔

اسی چیز کو ہم ایک مثال سے واضح کرتے ہیں:

حیات شناسی EXISTENTIALISM زندہ موجودات کی زندگی پر حکم فرما کلی قاعدوں اور قوانین کے بارے میں بحث کرتی ہے۔ جبکہ ارتقاء انواع کا نظریہ (اس نظریہ کے قائل ہونے کی صورت میں) زندہ موجودات کی ایک نوع سے دوسری نوع میں تبدیلی کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ درحقیقت یہاں پر موضوع بحث تاریخ کی حرکت اور ارتقاء کی کیفیت ہوتی ہے اور تاریخ کی یہ قسم ایک کلی حیثیت کی حامل ہے

اور عقلی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی ماضی پر بھی نگاہ ہے اور مستقبل پر بھی۔

”تاریخ کی اس قسم کا فائدہ بھی کسی پر مخفی نہیں ہے۔“ [۱]

لیکن یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ مندرجہ بالا تحقیق اور تاریخ کو تین حصوں میں تقسیم کرنے کے سلسلے میں جو کچھ بیان ہوا ہے صحیح ہے لیکن علم اور فلسفہ کی جو اصطلاحیں بیان ہوئی ہیں وہ نئی ہیں جنہیں متکلم نے اپنا مقصود بیان کرنے کے لیے ادا کیا ہے وگرنہ عام حالات ان اصطلاحوں سے سازگار نہیں ہیں۔

اس کے علاوہ دوسری اور تیسری قسم کو بھی ایک دوسرے میں ادغام کیا جاسکتا ہے، کیونکہ تاریخ پر حکم فرما کئی قوانین جو تاریخ نقلی سے حاصل ہوتے ہیں کبھی تو معاشروں کی موجودہ کیفیتوں کو بیان کرتے ہیں اور کبھی معاشروں میں پیدا ہونیوالی تبدیلیوں اور ارتقاء کو بیان کرتے ہیں۔

یہاں پر جو بات زیادہ اہمیت کی حامل ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے صرف تاریخی واقعات کے ذکر پر ہی اکتفاء نہیں بلکہ معاشرے اور اجتماع پر حکم فرما کئی قوانین کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے، ایسے کئی قوانین جو کیوں اور کیسے کی وضاحت کرتے ہیں اور تاریخ میں رونما ہونے والے تغیر و تبدل اور ترقی و پستی کے اسرار سے نقاب کشائی کرتے ہیں۔

مگر قرآن مجید نے ایک جگہ فرمایا ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا  
بِاَنْفُسِهِمْ ۗ

اس کی وجہ یہ ہے کہ خداوند عالم جب کسی قوم کو نعمت سے نوازے تو اس وقت تک اس نعمت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود کو تبدیل نہ کر دے۔ (انفال - ۵۳)

یاد رہے کہ قرآن مجید نے اس کلی اصول کو قوم فرعون کی داستان اور گناہوں کی وجہ سے ہر عذاب نازل ہونے کے واقعہ کے بعد ارشاد فرمایا ہے۔

ایک اور جگہ پر ان طاقتور اور زور آور اقوام کی تاریخ کو بیان فرمایا ہے جو اپنے انبیاء کے جھٹلانے اور شرک و گناہ اور ظلم کے ارتکاب کی وجہ سے نیست و نابود ہو گئیں:

فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاُوْا بَاْسَنَا ۗ سُنَّتِ اللّٰهُ الَّتٰى قَدْ خَلَتْ فِيْ  
عِبَادِهٖ ۗ

[۱] استاد مرحوم شہید مطہری کی کتاب ”فلسفہ تاریخ“ کا خلاصہ

انہوں نے جب ہمارے شدید عذاب کو دیکھ لیا تو ایمان کا اظہار کر دیا لیکن انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچا یہی وہ خدائی طریقہ کار ہے جو اس کے گزشتہ بندوں کے بارے میں جاری ہو چکا ہے۔ (مومن / ۸۵)

جی ہاں! یہ ایک کلمیہ قاعدہ اور قانون کلی ہے کہ حادثات کا علاج رونما ہونے سے پہلے کیا جانا چاہیے اور جب انجام انسان کے دامنگیر ہو جائے تو پھر سب کچھ بیکار ہو جاتا ہے۔ چڑیوں کے کھیت چگ جانے سے ہوت کا بچھتا واریکار ہو جاتا ہے اور تلافی ناممکن۔

## ایک سوال کا اور اس کا جواب

ممکن ہے یہاں پر سوال کیا جائے کہ تاریخ بشریت میں قواعد کلمیہ کے وجود کو قبول کر لینے سے حیرت تاریخ کا مفہوم آنکھوں کے سامنے آسکتا ہے جو انسان کی آزادی اور ارادہ سے سازگار نہیں ہے۔

لیکن اگر ایک نکتہ پر اچھی طرح غور کیا جائے تو اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کئی قواعد اور طریقہ کار سے مراد انسان اور انسانی معاشرے کے وہ اعمال ہیں جو ان سے تو آزاد نہ طور پر سرزد ہوتے ہیں لیکن ان کا رد عمل یقینی ہوتا ہے، مثلاً باشعور، دلیر اور جفاکش قومیں کامیاب ہوتی ہیں اور منتشر، سست اور بے شعور قومیں شکست اور ناکامی سے دوچار ہوتی ہیں۔

یہ ایک اہل تاریخ فیصلہ ہے اور کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان مجبور اور تاریخی حوادث کے چنگل میں جکڑا ہوا ہے، یا انسان کے انجام میں اس کا ارادہ مؤثر اور اہم کردار ادا کرتا ہے؟

بعینہ اس کی مثال یوں دہ جاسکتی ہے کہ ہم کہتے ہیں مثلاً اگر کوئی شخص زہریلا کھانا کھالے تو وہ یا تو بیمار ہو جائے گا اور یا موت کے منہ میں چلا جائے گا اور یہ ایک کلمیہ قاعدہ ہے۔ لازمی طور پر اس کا ایک ضروری اثر بھی ہوتا ہے جو انسان کے ارادہ و اختیار کی اصل سے ہرگز کوئی منافات نہیں ہے۔

## ۲۔ نبج البلاغہ اور اسلامی روایات میں تاریخ کا بیان

چونکہ نبج البلاغہ ایک عظیم کتاب ہے جس کا تربیتی مواد نہایت ہی کثیر، قوی اور بے نیاز کرنے والا ہے، لیکن تربیت معرفت کے بغیر اور معرفت و مسائل اور منابع کے بغیر ناممکن ہے۔ اسی لیے نبج البلاغہ میں تاریخی مسائل پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔

نجم البلاغہ میں امیر المؤمنین علی علیہ السلام کا کلام مبارک تاریخی حوادث کی اس انداز میں تشریح فرماتا ہے گویا انسان کا ہاتھ پکڑ کر اسے دوردراز کے ادوار کی طرف لے جاتا ہے اور حالات و واقعات کو صاف صاف اس کے سامنے مجسم کر دیتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انسان فرعون کے لشکر کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہے جو مستضعفین بنی اسرائیل کی گرفتاری کے لیے آگے ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ نیل کی موجوں کی نذر ہو رہا ہے

قوم عاد و ثمود اور قوم لوط کو سرکش آندھیوں کے جھکڑوں، بجلیوں، زلزلوں اور پتھروں کی بارشوں کے حملوں کا شکار ہوتا دیکھ رہا ہے۔



پلک جھپکتے ہی یہ سرکش، ظالم، ستمگار اور ہوس باز اور رب کی باغی تو میں اور ان کے قصور و مجلات، غرض کہ زندگی کا سب کچھ آن کی آن میں تباہ و برباد ہو رہا ہے اور سوائے خاموش کھنڈرات اور بے جان دھڑوں کے اور کچھ باقی نہیں رہا اور اب وہاں پر موت کی خاموشی کا سکہ چل رہا ہے۔ پھر ہر مسافر کو معرفت و آگاہی کے توشہ کے ساتھ وہاں سے واپس لے آتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تاریخی واقعات کی نشاندہی میں نبی البلاغہ کو جو عجیب قدرت حاصل ہے اس کا کوئی ثانی نہیں ہے، اسی طرح فلسفہ تاریخ کے بیان کرنے میں۔

ہم پہلے تفصیل کے ساتھ امیر المؤمنین کا کلام انسان کی انفرادی عمر کے بارے میں بتا چکے ہیں جو آپؐ نے اپنے فرزند گرامی امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام سے فرمایا تھا اور بتایا تھا کہ تجربہ اور معرفت کے لحاظ سے تاریخ انسان کی عمر کو تمام دوسرے انسانوں کی عمر کے برابر بنا دیتی ہے۔ تاریخ کے کئی قواعد کے بارے میں بھی آپؐ کے کلام میں نہایت ہی قابل توجہ تعبیرات ملتی ہیں چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

”عباد اللہ! ان الدهر یجری بالباقین کجریہ بالماضین، لا یعود ما قد ولی

منہ، ولا یبقی سرمداً مافیہ، آخر فعالہ کا ولہ، متشابهة امورہ،

متظاہرة اعلامہ“

اے بندگانِ خدا! اس دنیا میں باقی رہنے والوں پر بھی وہی کچھ گزرے گا جو گزشتہ لوگوں پر گزر چکا ہے، جو گزر گیا اس نے لوٹ کر نہیں آنا، اور جو کچھ موجود ہے وہ ہمیشہ نہیں رہے گا، اس دنیا کے آخری کام اس کے ابتدائی کاموں جیسے ہیں، اور اس کے اعمال اور رفتار و روش سب ایک دوسرے جیسے ہیں اور اس کی علامتیں اور نشانات واضح اور آشکار ہیں۔ [۱]

امیر المؤمنین علیہ السلام ایمان کی تفسیر میں چار ستونوں (صبر، یقین، عدل اور جہاد) کے قائل ہیں، اور اس کے بعد فرماتے ہیں:

”والتقین منها علی اربع شعب: علی تبصرة الفطنة، وتاول الحکمة

والموعظة العبرة وسنة الاولین“

اور یقین کے چار شعبے ہیں (چار ستونوں پر استوار ہے) روشن نگاہی، حقیقت رسی، عبرت اندوزی اور اگلے لوگوں کا طور طریقہ۔ [۲]

ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں:

”واعلموا عباد اللہ انکم و ما انتم فیہ من ہذا الدنیا علی سبیل من

[۱] نبی البلاغہ، خطبہ ۱۵۷

[۲] نبی البلاغہ، کلمات قصار، جملہ نمبر ۳۱



قد مضى قبلكم، من كان لطول منكم اعمارا، واعمر ديارا، وابعث آثارا،  
اصبحت اصواتهم هامدة، ورياحهم راكدة، واجسارهم بالية،  
وديارهم خالية، وآثارهم عافية فاستبدلوا بار لقصو المشيدة،  
والنمارق المبهدة، الصخور والاحجار المسندة والقبور اللاطئة  
الملحدة، التي قد بنى على الخراب فناءها وشيد بالتراب بناءها»

اے خدا کے بندو! اس بات کو جانے رہو کہ تمہیں اور اس دنیا کی ان چیزوں کو کہ جن میں تم ہوا نہیں لوگوں کی راہ پر  
گزرنا ہے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں جو تم سے زیادہ لمبی عمروں والے، تم سے زیادہ آباد گھروں والے اور تم سے  
زیادہ پائیدار نشانیوں والے تھے۔ ان کی آوازیں خاموش ہو گئیں، بندھی ہوئیں اُکھڑ گئیں، بدن گل سڑ گئے،  
گھر سنسان ہو گئے اور نام و نشان تک مٹ گئے۔ انہوں نے مضبوط محلوں اور بچھی ہوئی مسندوں کو پتھروں اور  
چینی ہوئی سلوں اور پیوند زمین ہونے والی (لحد) احد والی قبروں سے بدل لیا کہ جن کے صحفوں کی بنیاد تباہی  
وویرانی پر ہے اور مٹی ہی سے ان کی عمارتیں مضبوط کی گئی ہیں۔<sup>[۱]</sup>  
ایک اور خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

«فاعتبروا بما اصاب الامم المستكبرين من قبلكم، من باس الله و  
صولاته، ووقائعه ومثلاته، واتغطوا بمشاوى خدودهم ومصارع  
جنوبهم»

تمہیں لازم ہے کہ تم سے قبل سرکش امتوں پر جو قہر و عذاب اور عتاب و عقاب نازل ہوا ہے اس سے عبرت لو اور  
ان کے رخساروں کے بل لیٹنے اور پہلوؤں کے بل گرنے کے مقامات سے نصیحت حاصل کرو۔<sup>[۲]</sup>  
اسی خطبے ہی میں فرماتے ہیں:

«فانظروا كيف كانوا، حيث كانت الاملاء مجتمعة والا هواء متلفة،

[۱] نہج البلاغہ، خطبہ ۲۲۶

[۲] نہج البلاغہ، خطبہ قاصعہ نمبر ۱۹۲

والقلوب معتدلة، والا يدي مترادفة والسيوف متناصرة، والبصائر نافذة، والعزائم واحدة، الم يكونوا اربابا في اقطار الارضين؟ وملوكا على رقاب العالمين؟ فانظروا الى ما صاروا اليه في اخر امورهم، حين وقعت الفرقة، وتشتت الالفة، واختلفت الكلمة، والافعة، وتشعبوا مختلفين، وتفرقوا متحاربين، قد خلع الله غلهم لباس كرامته، وسلبهم غضارة نعمته، وبقي قصص اخبارهم فيكم عبرة للمعتبرين!

غور کرو کہ جب ان کی جمعیتیں یکجا، خیالات یکسو اور دل یکساں تھے، اور ان کے ہاتھ ایک دوسرے کو سہارا دیتے اور تلواریں ایک دوسرے کی معین و مددگار تھیں، اور ان کی بصیرتیں تیز اور ارادے متحد تھے، تو اس وقت ان کا عالم کیا تھا؟ کیا وہ اطراف زمین میں فرمانروا اور دنیا والوں کی گردنوں پر حکمران نہیں تھے؟ اور تصویر کا یہ رُخ بھی دیکھو کہ جب ان میں پھوٹ پڑ گئی، کینہتی درہم برہم ہو گئی، ان کی باتوں اور دلوں میں اختلافات کے شاخسانے پھوٹ نکلے، اور وہ مختلف ٹولیوں میں بٹ گئے اور الگ جھتے بن کر ایک دوسرے سے لڑنے بھڑنے لگے تو ان کی نوبت یہ ہو گئی کہ اللہ نے ان سے عزت و بزرگی کا پیرا ہن اتار لیا اور نعمتوں کی آسائشیں ان سے چھین لیں اور تمہارے درمیان ان کے واقعات کی حکایتیں عبرت بن کر رہ گئیں۔<sup>[۱]</sup>

ایک اور خطبہ میں فرماتے ہیں:

”وان لكم في القرون السالفة لعبرة، اين العبالقة وابناء العبالقة، اين الفراعنة وابناء الفراعنة؟ اين اصحاب مدائن الرس الذين قتلوا النبيين، واطفعا سنن المرسلين، واحيوا سنن الجبارين؟ الذين ساروا بالجيش وهزموا بالابوف، وعسكرو العساكر، ومدنوا المدائن؟“

تمہارے لیے گزشتہ دوروں (کے ہر دور) میں عبرتیں (ہی عبرتیں) ہیں (ذرا سوچو تو) کہ کہاں ہیں عمالقہ<sup>[۱]</sup> اور ان کے بیٹے، اور کہاں ہیں فوعون اور ان کی اولادیں؟ کہاں ہیں اصحاب الرس<sup>[۲]</sup> کے شہروں کے باشندے جنہوں نے نبیوں کو قتل کیا، پیغمبروں کے روشن طریقے کو مٹایا اور ظالموں کے طور طریقے کو زندہ کیا اور کہاں ہیں وہ لوگ جو لشکروں کو لے کر بڑھے، ہزاروں کو شکست دی اور فوجوں کو فراہم کر کے شہروں کو آباد کیا۔<sup>[۳]</sup>

دیگر روایات میں بھی اسی چیز کی طرف زیادہ توجہ دی گئی ہے اور تاریخ نے اسے معرفت کے ایک منبع کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے، خصوصاً اخلاقی مسائل، تہذیب نفس اور انسانی زندگی کے حقائق کی طرف توجہ کے لیے۔

ایک روایت میں ہے کہ جب حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام اپنے لشکر کے ساتھ میدان صفین کی طرف جا رہے تھے تو شہر ساباط اور وہاں سے ”بھرسیر“<sup>[۴]</sup> نامی شہر کے پاس جا پہنچے۔ (مقتدر ساسانی بادشاہوں کی حکومت کے مرکزی علاقہ میں) تو آپ کے ایک ساتھی کی نگاہ اچانک کسری (ساسانی بادشاہ) کے آثار پر جا پڑی تو اس نے عرب کے اس مشہور شعر کو تمثیل کے طور پر پڑھا:

جرت الرياح علی مکان دیارہم

فکانہم کانوا علی المیعاد

ہوایں ان کے گھروں اور قصور و محلات پر چلیں۔ گویا ان سب کی ایک مقررہ مدت تھی جو (وہ پوری کر کے چلے گئے)

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا تم نے ان آیات کی تلاوت کیوں نہیں کی؟

”کہ تر کو امن جنات و عیون و زروع و مقام کریم و نعمة کانوا فیہا“

[۱] ”عمالقہ“ قدیم اقوام سے تھے جو شمالی حجاز میں رہتے تھے، فراعنہ مصر کے زمانہ میں مصر کو فتح کیا اور وہیں پر حکومت چلاتے رہے (نہایت ہی طاقتور، قوی، جبار اور ستیگر قوم کے فرد تھے)۔

[۲] بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ”اصحاب رس“ ایک قوم تھی جو جزیرہ نماے عرب کے جنوب کی سرزمین یمامہ میں رہتی تھی۔ اس قوم کے نام ”مخطلہ“ نامی پیغمبر بھی بھیجے گئے، جبکہ کچھ اور لوگ انہیں حضرت شعیب کی قوم سمجھتے تھے اور بعض لوگوں نے اس قوم کا محل سکونت شام اور حجاز کے درمیان کی آبادیوں کو لکھا ہے (ملاحظہ ہو تفسیر نمونہ، جلد ۱۵)

[۳] نوح البلاغہ، خطبہ ۱۸۲

[۴] بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ نام فارسی کلمہ ”بہ اردشیر“ یا ”دہ اردشیر“ سے لیا گیا ہے اور یہ ”مدائن“ کے سات شہروں میں سے ایک شہر تھا، جو دجلہ کے مغرب میں واقع تھا۔ مجمع البلدان، جلد ۱، ص ۵۱۵

فاکھین کذالك واورثناھا قوما اخرین۔ فمابکت علیھم السباء

والارض وما كانوا منظرین“

وہ لوگ کس قدر باغات، چشمے اور کھیتیاں چھوڑ کر چلے گئے، اور دلکش قیمتی محلات اور دوسری بہت سی نعمتیں کہ جن سے وہ بہرہ مند ہوا کرتے تھے، تو یہ تھا ان کا ماجرا اور ہم نے ان چیزوں کو دوسری اقوام کی میراث قرار دے دیا۔ لیکن نہ تو ان پر آسمان رویا اور نہ ہی زمین! (اور جب ان موت کا فرمان ان کے پاس پہنچ گیا) تو انہیں کوئی مہلت نہ دی گئی۔

اس کے بعد امام علیہ السلام نے فرمایا:

یہ لوگ ایک دن ایسا تھا کہ دوسروں کی املاک کے وارث تھے اور ایک دن انہوں نے اپنا سب کچھ دوسروں کے لیے وراثت کے طور پر چھوڑ دیا۔ انہوں نے خدا کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کیا اور ان کی دنیا ان کے گناہوں کی وجہ سے برباد ہو گئی لہذا تم کفرانِ نعمت سے بچو تا کہ تم پر عذاب الہی نازل نہ ہو۔<sup>[۱]</sup>

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ ایک دن حضرت داؤد، علیہ السلام، زبور پڑھتے ہوئے باہر آئے، چنانچہ آپؑ جب بھی زبور کی تلاوت کرتے تھے تمام پہاڑ چرند و پرند ان کے ہم صدا ہو جاتے تھے۔

زبور پڑھتے ہوئے ایک پہاڑ پر جا پہنچے۔ اس کی چوٹی پر ایک عابد بیٹھ رہتے تھے، جن کا نام حزقیل تھا۔ جب حضرت حزقیل نے پہاڑوں، پرندوں اور درندوں کے زمزمہ کو سنا تو سمجھ گئے کہ حضرت داؤد آگئے ہیں حضرت داؤد نے ان سے اوپر آنے کی اجازت طلب کی حضرت حزقیل نے انہیں اجازت نہیں دی۔ داؤد علیہ السلام نے رونا شروع کر دیا۔ خداوند کریم نے حزقیل کی طرف وحی کی کہ آپ داؤد کو سرزنش نہ کریں اور مجھ سے عافیت طلب کریں۔

یہ سن کر حزقیل کھڑے ہو گئے اور حضرت داؤد کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جگہ پر لے آئے اور ان دونوں کے درمیان یوں گفتگو کا تبادلہ ہوا:

داؤد: کیا آپ کو کبھی گناہ کی خواہش بھی ہوئی ہے!

حزقیل: نہیں۔

داؤد: عبادت کی وجہ سے بھی آپ کے دل میں غرور و تکبر پیدا ہوا ہے؟

حزقیل: نہیں۔

داؤد: آپ کے دل میں کبھی دنیا کا رجحان بھی پیدا ہوا ہے اور دنیاوی لذات اور خواہشات کے لیے جی چاہتا ہے؟

حزقیل: جی ہاں! کبھی ایسا ہوتا ہے۔

داؤد: تو پھر اس وقت کیا کرتے ہیں؟

خز قیل: یہ جو سامنے درہ دیکھ رہے ہیں اس کے اندر چلا جاتا ہوں اور اس میں جو کچھ ہے اس سے عبرت حاصل کرتا ہوں۔  
یہ سن کر حضرت داؤد اس درہ کے اندر چلے گئے وہاں پر لوہے کا ایک تخت دیکھا جس پر قدیم زمانے کی ایک بوسیدہ انسانی کھوپڑی اور منتشر ہڈیاں پڑی ہوئی تھیں اور ساتھ ہی ایک تختی تھی جس پر کچھ تحریر تھا۔ حضرت داؤد نے اس نوشتہ کو پڑھا تو معلوم ہوا کہ ان تمام چیزوں کا تعلق ایک بادشاہ سے ہے جو نہایت ہی طاقتور تھا اور عرصہ دراز تک حکومت کرتا رہا، کافی تعداد میں شہروں کو زیرِ نگین کیا، ایک عظیم حرم سرا کا مالک تھا، لیکن انجام کار اس کی اس صورت میں ہوا..... □

## معرفت عطا کرنے والی تاریخ کے بارے میں حرفِ آخر

معرفت وآگاہی عطا کرنے والی تاریخ کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ اس بات کے ساتھ مشروط ہے کہ:

- ۱۔ انسان کو چاہیے کہ تاریخ کا مطالعہ صرف وقت گزارنے کے لیے نہ کرے۔
- ۲۔ تاریخ کے واقعی مسائل کا انسانی اعمال کے ساتھ کیا تعلق اور رابطہ ہے، اس پر اچھی طرح سے غور و فکر کرے اور، بخت و اتفاق یا جبر و قضاء و قدر جیسی موہوم اور باطل توجیہات سے تاریخ کے مسائل کا تجزیہ و تحلیل نہ کرے، (جیسا کہ بعض بے سمجھ لوگ اس بارے میں ایسا کرتے ہیں اور اسے انسانی قدرت کے سلب کا نام دیتے ہیں)
- ۳۔ تاریخ کے کلی قوانین کو جزئی حادثات و واقعات سے استنباط کرے اور ان واقعات کے اصول و نتائج کا ہر ایک واقعہ میں تجزیہ و تحلیل کرے اور پھر خود کو ہی ایک مصداق کے عنوان سے ان قوانین میں شامل سمجھے اور ان سے نتیجہ حاصل کرے۔
- ۴۔ اسے اس بات کی امید نہیں رکھنی چاہیے کہ جس حادثہ اور واقعہ کو دوسرے لوگوں نے آزمایا ہے وہ خود بھی آزمائے تاکہ ”صن جرب المجرّب حلت بہ الندامة“ آزمائے کو آزمانا باعثِ ندامت ہے کے مصداق پشیمانی اس کے بھی دانگیر ہو۔
- ۵۔ تاریخی مسائل کو تنقید کی نگاہ سے دیکھے اور تاریخی مسلمات کو مشکوک باتوں سے، حقائق کو افسانوں سے اور خالص کو ناخالص سے جدا کرے۔

قصہ مختصر تاریخ کا معرفت و شناخت کے الہام بخش منبع کی حیثیت سے اپنی زندگی میں مطالعہ کرے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے، نہ کہ اس کی انحرافی اور گمراہ کن حیثیت سے۔

## معرفت کا چوتھا منبع فطرت، ضمیر اور باطنی شعور

اشارہ

انسان جب عقل و شعور کی عمر کو پہنچتا ہے تو کسی استاد اور معلم کی رہنمائی کے بغیر کچھ حقائق کو جان لیتا ہے۔ بدیہی یعنی واضح ترین مسائل اس پر روشنی کی طرح عیاں ہوتے ہیں مثلاً دو ضدیں یا دو نقیضین ایک جگہ اکٹھا نہیں ہو سکتیں اور ان کا اجتماع خیال ہوتا ہے۔ بہت سی چیزوں کے حسن و قبح (اچھائی اور برائی) کا ادراک کر لیتا ہے، ظلم و ستم کو برا اور عدل و احسان کو اچھا سمجھتا ہے۔ جب کوئی غلط کام اس سے سرزد ہو جاتا ہے تو اپنے باطن سے ایک آواز سنتا ہے جو اسے سرزنش اور تنبیہ کر رہی ہوتی ہے اور اس کے برعکس اگر کوئی نیک کام کرتا ہے تو اپنے اندر ایک قسم کا سکون اور اطمینان محسوس کرتا ہے۔ اچھی اور خوبصورت چیزوں سے پیار کرتا ہے اور علم و خرد کو دوست رکھتا ہے۔ اور اندرونی طور پر ایک مقدس مبداء کے ساتھ اپنے تعلق کا احساس کرتا ہے، یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اپنے دل کی گہرائیوں سے خدا کی طرف کھینچ کر چلا جاتا ہے۔

ان تمام چیزوں سے پتہ چلتا ہے کہ معرفت کا ایک اور عظیم منبع ان چیزوں کے علاوہ جو اب تک بتائی جا چکی ہیں انسان کے اندر بھی موجود ہے جس کو ہم فطرت یا ضمیر یا باطنی شعور کا نام دیتے ہیں۔

عقل اور فطرت و ضمیر کی حدود کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کے لیے مندرجہ ذیل وضاحت پر غور فرماہیے۔

انسانی روح ایک عجیب مخلوق ہے جس کے کئی زاویے ہیں، جن میں سے کچھ تو پہچانے جا چکے ہیں اور کچھ کی ابھی تک پہچان نہیں کی جا سکی۔ اور وہ زاویے اور پہلو مختلف ہونے کی بنا پر ان کی سرگرمیاں بھی مختلف ہوتی ہیں۔

ان میں سے کچھ سرگرمیوں کا تعلق عقل و خرد سے ہے جن کا کام غور و فکر کرنا ہے، اس کا ایک اور حصہ بھی ہے جس کا نام، حافظہ ہے جو انسان کی تمام معلومات کو اکٹھا کرتا ہے، انہیں ترتیب دیتا اور انہیں ریکارڈ میں لاتا ہے اور بوقت ضرورت، صرف اور صرف ضروری چیز کو ہی لاکھوں، کروڑوں مطالب کے درمیان سے ڈھونڈھ نکالتا ہے، اور وہ بھی برق رفتاری اور معجزانہ انداز میں۔

اس کا ایک اور حصہ محبتوں، دوستی، اور دشمنی پر مشتمل تعلقات اور عشق و محبت سے تعلق رکھتا ہے۔

ایک اور حصے کا تعلق انسان کے اندرونی اعمال سے ہے، مثلاً کسی چیز کا انتخاب کرنا، ارادہ کرنا اور فیصلہ کرنا وغیرہ۔

الغرض روح ایک ایسا سمندر ہے جس میں ہر قسم کے عجائبات پائے جاتے ہیں اور جو قوانین اس پر حکم فرما ہیں وہ نہایت ہی عجیب اور نہایت ہی پیچیدہ ہیں۔

البتہ ایک لحاظ سے روح کو دو اہم ترین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

- ۱۔ ایک حصہ کا تعلق غور و فکر اور نظری ادراکات یعنی جنہیں انسان استدلال کے ذریعہ حاصل کرتا ہے، سے ہوتا ہے۔
- ۲۔ ایک حصہ کا تعلق بدیہی یعنی ظاہری ادراکات سے ہوتا ہے، یا پھر ضمیر و وجدان سے ہوتا ہے یعنی ایسے امور جو بغیر کسی قسم کی دلیل و برہان سے معلوم ہو جائیں۔

چنانچہ اس گفتگو میں ہم جہاں پر بھی فطرت اور ضمیر کی بات کریں گے تو اس سے مراد اسی دوسرے قسم کے انسانی ادراکات ہوں گے۔ فطرت یعنی اولین تخلیق، یعنی روح اور جان کی تخلیق جس میں ضروری معلومات کا کچھ حصہ ملا ہوا ہوتا ہے۔ ضمیر یعنی وہ چیز کہ جسے انسان اپنے اندر پاتا ہے اور اسے حاصل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ باطنی شعور یعنی وہ ادراک اور نظر جو انسان کی جان کی گہرائیوں میں موجود ہوتی ہے اور اسی کے ذریعہ سے انسان الہام لیتا ہے۔ بہر حال حقائق کی شناخت اور معرفت کا الہام عطا کرنے والا ایک منبع یہ بھی ہے جسے کبھی کبھی دل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اور یہ عقل سے بالکل جدا ہے جو کہ نظری افکار و ادراکات کا مرکز ہے، ہر چند کہ یہ سب ایک ہی درخت کی شاخیں اور روح انسان کے شجرہ کا ثمر ہیں۔ (غور کیجئے گا)

البتہ یہ بات بھی یاد رہے کہ جو کچھ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ضروری نہیں وہ تمام فلاسفہ کے لیے قابل قبول ہو، بلکہ یہاں یہ سب کچھ بیان کرنے کا مقصد صرف اس بات کی طرف اشارہ کرنا تھا اور انشاء اللہ ہم آگے چل کر مفصل اور متدل طریقہ سے اس پر بحث کریں گے۔ اس اشارے کی طرف توجہ کرتے ہوئے اب ہم قرآن مجید کی چند آیات کو بیان کرتے ہیں تاکہ دیکھیں کہ معرفت کے اس منبع سے کیونکر پردہ اٹھایا گیا ہے۔

تو سب سے پہلے ہم مندرجہ ذیل آیات پر نگاہ ڈالتے ہیں۔

## آیات

- ۱۔ وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّيْنَاهَا ۚ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۗ (شمس ۴-۸)
- ۲۔ فَرَجَعُوا إِلَىٰ أَنفُسِهِمْ فَقَالُوا إِنَّكُمْ أَنْتُمُ الظَّالِمُونَ ۗ (سورہ انبیاء ۶۴)
- ۳۔ وَلَئِن سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ ۗ (سورہ لقمان ۲۵)

۴۔ فَإِذَا رَكَبُوا فِي الْفُلِكِ دَعَوْا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ ﴿٤٥﴾ (سورہ عنکبوت ۶۵)

۵۔ صِبْغَةَ اللَّهِ ۚ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً ۖ وَنَحْنُ لَهُ عِبْدُونَ ﴿١٣٨﴾

(سورہ البقرہ ۱۳۸)

۶۔ خَلَقَ الْإِنْسَانَ ﴿٣﴾ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ﴿٤﴾ (سورہ الرحمن ۳-۴)

۷۔ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ﴿٥﴾ (سورہ علق ۵)

۸۔ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۖ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا

تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۗ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۚ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٠﴾

(سورہ روم ۳۰)

ترجمہ

۱۔ قسم ہے آدمی کی روح کی اور اس کی کہ جس نے روح کو موزوں بنایا، پھر فحور اور تقویٰ کی راہیں اسے الہام کیں۔

۲۔ (بابل کے بت پرست، جناب ابراہیم کے دندان شکن دلائل کے بعد) اپنے آپ کی طرف لوٹ آئے اور خود کو کہنے لگے تم ہی تو ظالم اور ستمگار ہو۔

۳۔ اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے، تو وہ کہیں گے کہ خدا نے!

۴۔ جب وہ کشتی میں سوار ہو جاتے ہیں تو خدا کو خلوص کے ساتھ پکارتے ہیں لیکن خدا انہیں خشکی پر پہنچا دیتا ہے اور نجات دے دیتا ہے تو پھر وہ مشرک ہو جاتے ہیں۔

۵۔ ہم تو خدائی رنگ قبول کریں گے (توحید اور اسلام کے رنگ کو) اور خدائی رنگ سے بڑھ کر اور کونسا رنگ بہتر ہو سکتا ہے اور ہم تو اس کی عبادت کرتے ہیں۔

۶۔ خدا، جس نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بات کرنا سکھایا۔

۷۔ خدا نے انسان کو اس چیز کی تعلیم دی جسے وہ نہیں جانتا تھا۔

۸۔ اپنے چہرے کو پروردگار کے خالص چہرے کی طرف متوجہ کرو، یہ وہ فطرۃ ہے جس پر خدا نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اور خدائی تخلیق میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہے۔ یہ ہے ایک محکم اور جاودا نہ دین



لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

## الفاظ کی تشریح

”الہمہا“، ”الہام“ کے مادہ سے ہے اور جیسا کہ بزرگ اہل لغت نے بتایا ہے اس کے معنی وہ چیز ہیں جو انسان کے دل پر نازل ہوتی ہے، لیکن راغب نے مفردات میں تحریر کیا ہے کہ یہ لفظ صرف اس چیز کے بارے میں استعمال ہوتا ہے جو خداوند عالم اور عالم بالا سے انسان کے دل پر نازل ہوتی ہے۔ [۱]

پھر انہوں نے آیت ”فَالْهَمُّ فَجُورٌهَا وَتَقْوَاهَا“ کو اس معنی پر شاہد کے طور پر پیش کیا ہے۔ لسان العرب میں مذکور ہے کہ اس لغت کی اصل ”لہم“ (بروزن فہم) ہے جس کے معنی نکلتا ہیں۔ اور الہام کے معنی خدائی تلقین ہیں اور وہ وحی کی ایک قسم ہے (وحی اپنے کلمہ کے وسیع معنی کے لحاظ سے)۔

اس کلمہ کی اصل کی طرف دیکھتے ہوئے جو کہ ابھی بتایا گیا ہے، اس کے معنی کی مذکورہ تشریح کے ساتھ مناسبت واضح ہو جاتی ہے، گویا انسانی روح اپنا منہ کھولتی ہے اور خدائی تعلیمات کے ذریعہ حقیقت کو نگل جاتی ہے۔

فطرت فطر (بروزن سطر) کے مادہ سے ہے بعض لوگوں کے نظریہ کے مطابق اس کے اصل معنی، پھاڑنا ہیں جبکہ بعض دوسرے حضرات کے نزدیک اس کے معنی طول میں پھاڑنا ہیں۔ [۲] پھر اس کا استعمال مخلوق کی پیدائش کے معنی میں ہونے لگا ہے، گویا کہ عدم کا پردہ پھاڑ کر موجودات منصفہ شہود پر آ جاتی ہیں روزہ توڑنے کو بھی افطار کہا جاتا ہے کیونکہ روزہ ایک متصل اور طویل امر ہوتا ہے جسے اس طرح پھاڑ دیا جاتا ہے۔

کھمبی جیسی نباتات جو زمین کو پھاڑ کر باہر آتی ہیں کو فطر (بروزن قطر) کہا جاتا ہے کیونکہ وہ زمین کو بڑی تیزی سے پھاڑ کر باہر آتی ہیں۔ اسی لیے انگلیوں کے پوروں کے ساتھ جانوروں کے پستان کو دوہنے کو فطر (بروزن سطر) کہا جاتا ہے یہ لفظ آٹا گوند ہنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے یعنی جب آٹا گوندھیں اور فوراً اس سے روٹی پکائیں۔ [۳] بہر حال ان آیات میں اس لفظ سے مراد خدائی تخلیق، اولین پیدائش اور ایک سلسلہ حقائق کی طرف رہنمائی ہے جو آغاز ہی سے انسان کے اندرون میں امانت کے طور پر رکھے گئے ہیں اور اس کے وجود کے ضمیر میں شامل ہیں۔

[۱] ”فَالْهَمُّ“، ”الْقَاءُ الشَّيْ فِي الرُّوعِ وَيَخْتَصُّ ذَلِكَ بِمَا كَانَ مِنْ جِهَةِ اللَّهِ وَجِهَةِ الْمَلَاءِ الْأَعْلَى“ (روح بروزن نوح کے معنی دل ہیں اور روع بروزن شوق کے معنی خوف یا تعجب ہیں۔

[۲] لسان العرب

[۳] ”کتاب العین“، ”لسان العرب“، ”مفردات راغب“

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے نفس بمعنی انسانی، روح کے ہے اور کبھی کسی چیز کی ذات کو بھی نفس کہا جاتا ہے جیسا کہ ہم قرآن مجید میں پڑھتے ہیں ”و یحذر کہ اللہ نفسہ“ (اور خدا تمہیں اپنی ذات (کی مخالفت) سے خبردار کرتا ہے) اور یہ لفظ، خون آنکھ اور شخص کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔<sup>[۱]</sup>

اور کبھی بالخصوص نفس امارہ یعنی سرکش نفس کو بھی نفس کہتے ہیں۔

لیکن مذکورہ آیات میں، ضمیر اور وجدان کے معنی میں آیا ہے جو انسانی روح کا ایک حصہ ہے۔

”صبغہ“، ”صبغ“ کے مادہ سے ہے جس کے اصل معنی، رنگ کرنا ہیں۔ اور نتیجے کے طور پر اسے صبغہ کہا جاتا ہے اور صبغ (بروزن صدق) کے معنی سالن، اور وہ غذا ہے جو انسان روٹی کے ساتھ کھاتا ہے کیونکہ روٹی اس سے رنگین ہو جاتی ہے۔ اور بعض حضرات نے اسے روغن زیتون کے معنی میں بھی لیا ہے جس سے روٹی کو بھگو کر کھاتے ہیں۔

راغب کے بقول زیر بحث آیت میں صبغہ کا لفظ عقل کی طرف اشارہ ہے جسے خداوند عالم نے انسانی وجود کے اندر قرار دیا ہے اور

فطرت کی مانند اس کے ذریعہ بھی انسان کو دوسرے جانوروں اور چوپایوں سے جدا کیا ہے۔<sup>[۲]</sup>

جیسا کہ کئی ارباب لغت نے بتایا ہے زیر بحث آیت میں یہ تعبیر شاید اس لیے ہے کہ جب نصاریٰ کے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوتا تھا تو وہ ساتویں دن کے بعد اسے ایسے پانی سے غسل دیتے تھے جس میں زرد رنگ کا مادہ ملا ہوتا تھا۔ (یعنی پنجمہ مراد ہے) اور ان کا عقیدہ تھا کہ یہ رنگ اسے پاک و پاکیزہ بنا دیتا ہے اور قرآن کہتا ہے کہ رنگِ الہی یعنی اسلام اور توحید ہی ان سب سے بہتر اور بالاتر ہے۔

تو اس طرح سے مندرجہ بالا آیت میں صبغہ کی تعبیر فطرت اور اولین تخلیق کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے، خصوصاً جبکہ بہت سی روایات میں اسلام اور ولایت سے بھی تفسیر کی گئی ہے۔<sup>[۳]</sup>

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

سب سے پہلی آیت میں انسانی روح اور اس خدا کی قسم کھائی گئی ہے جس نے روح کو فراوانی کے ساتھ استعداد اور لیاقت عطا فرمائی ہے اور اسے نظام عطا فرمایا ہے۔ اس قسم کے بعد انسان کے اخلاقی وجدان، (ضمیر) اور آگاہی کے منبع یعنی فحور، اور تقویٰ کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے کہتا ہے:

ان امور پر آگاہی الہام کی صورت میں اوائل میں انسان کے اندرون جان سے ہوئی ہے۔

[۱] ”مجمع البحرین“، طریقی مادہ نفس اور مفردات راغب

[۲] مفردات راغب، مادہ ”صبغ“

[۳] تفسیر برہان، جلد ۱ ص ۱۵۷، ۱۵۸

اس طرح کے مقصود کی طرف ایک اور آیت میں بھی انسان کی آفرینش کے بعد اشارہ کیا گیا ہے۔ ”وہدینا العنجدین“ (اور ہم نے انسان کو اس کے خیر و شر کی ہدایت کر دی ہے)

توجہ رہے کہ بخدا لغت میں دراصل بلند مکان کو کہتے ہیں اور اس کے مقابل کا لفظ ”ہما مہ“ (بروزن علاقہ) ہے جس کے معنی ہیں پست سرزمین اور یہاں پر قبل و بعد کی آیات کے قرینہ اور ان آیات کی تفسیر میں وارد ہونے والی روایات کے قرینہ کی رو سے یہ تعبیریں خیر و شر اور خوش قسمتی اور بد قسمتی کے عوامل سے کننا یہ ہیں۔ [۱]

ممکن ہے سورہ حل اتی کی تیسری آیت بھی اسی بات کی طرف اشارہ ہو جس میں بتایا گیا ہے ”انا ہدینا العنجدین اما شاکرا واما کفورا“ (ہم نے انسان کو راہ دکھادی ہے خواہ وہ شکر کرے یا کفران کرنے والا بنے) یا کم از کم اس آیت میں بیان ہونے والی ہدایت کے کلی مفہوم میں ہدایت فطری تو آہی جائے گی۔

دوسری آیت میں توحید کے بطل جلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بت شکنی اور بابل کے بت پرستوں کی طرف سے آپ پر مقدمہ چلانے کے واقعات کو بیان کیا جا رہا ہے جب انہوں نے حضرات ابراہیم کو بلایا اور پوچھا کیا تو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ ایسا کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا بلکہ ان کے بڑے نے ایسا کیا ہوگا، ان سے پوچھئے اگر وہ بولتے ہیں۔

اس مقام پر زیر بحث آیت کہتی ہے وہ اپنے آپ کی طرف (اپنے ضمیر کی طرف) لوٹ آئے اور اپنے آپ سے کہا یقیناً تم ہی ظالم ہو (ایک تو تم اپنے آپ پر ظلم کیا ہے اور دوسرے اس معاشرے پر ظلم کیا ہے جس میں تم رہ رہے ہو اور تیسرے اپنے خالق و مالک اور تمام نعمتیں عطا کرنے والے پروردگار پر)

اگرچہ بعض مفسرین نے احتمال پیش کیا ہے کہ ”فرجعوا الی انفسہم“ کے جملہ سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے ایک دوسرے کو ملامت اور سرزنش کی لیکن یہ تفسیر آیت کے ظاہر کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی اور پہلا معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

جی ہاں! یہی ضمیر ہی تو ہے جو خود غرض اور مغرور بت پرستوں تک کو اپنی ملامت کے تازیانے لگاتا ہے اور واضح طور پر ان کے خلاف فیصلہ دیتا ہے۔

سورہ قیامت کی دوسری آیت ”ولا اقسد بالنفس اللوامہ“ میں نفس لوامہ سے اسی عدالت کی طرف واضح اشارہ ہے، خاص کر جب ”لا اقسد بیوم القیامۃ“ (روز قیامت کی قسم) کے ساتھ ہی اسے ذکر کیا گیا ہے جس طرح قیامت، عدالت کا دن ہے، اسی طرح نفس لوامہ بھی اندرونی فطری اور ضمیر کی عدالت کا نام ہے

تیسری آیت میں مشرکین عرب کی کیفیت بیان کرنے کے بعد اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب انہیں کہا جاتا تھا کہ آیات الہی کی پیروی کرو تو وہ کہتے کہ ہم نے اپنے بزرگوں کی پیروی کریں گے۔

[۱] تفسیر قرطبی، جلد ۱۰، ص ۱۵۵، مجمع البیان، جلد ۱۰، ص ۴۹۴

پس خدا فرماتا ہے: اگر تم ان سے آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق کے بارے میں سوال کرو تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ان سب کا خالق خدا ہے۔

لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ اس عظیم اور بزرگ خالق کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرتے بلکہ اس کے برعکس ایسے مجموعوں اور تصویروں کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں جنہیں انہوں نے اپنے ہی ہاتھوں سے بنایا ہے اور یہ کس قدر نادانی اور لاعلمی کی دلیل ہے؟ بلکہ اکثر ہمہ لایعلمون۔

وہ خالق کائنات کے بارے میں سوال کا جو جواب دیتے ہیں ممکن ہے وہ ان کی فطرت کی آواز ہو، اور وہ اس حقیقت کو بیان کر رہی ہو کہ اس نور الہی کی تجلی تمام انسانوں کی سرشت میں داخل ہے اور وہ اس فطری حکم کی پروا نہ کرتے ہوئے غلط راستوں پر بھٹکتے پھرتے ہیں۔ چوتھی آیت میں بھی اسی معنی کو پیش نظر رکھا گیا ہے تو حید فطری جو کہ مہایت ہی بحرانی حالات میں انسان کے اندرون جان میں متجلی ہوتی ہے، کے معنی کو واضح کرنے کیلئے ایک واضح ترین مثال پیش فرماتا ہے اور ایسی حالت کو مجسم کرتا ہے کہ، لوگ کشتی میں سوار ہیں اور سمندر کی موجوں، گردابوں اور طوفانوں میں پھنس چکے ہیں اب کوئی طاقت انہیں ایسی نظر نہیں آتی جو انہیں ساحل نجات تک پہنچائے تو یہی موقع ہے کہ اندھی تقلید، خرافائی رسومات، غلط تعلیمات اور نادرست تجربے کے پردے ہٹ جاتے ہیں اور خدا جوئی کی فطرت نمایاں ہو کر سامنے آ جاتی ہے اور وہ بے ساختہ خدا کی یاد میں پڑ جاتے ہیں اور اسے مکمل خلوص کے ساتھ پکارتے ہیں لیکن جو نہی طوفان تھم جاتا ہے اور وہ ساحل نجات پر پہنچ جاتے ہیں تو شرک آلود افکار ان کے دلوں پر حملہ آور ہو جاتے ہیں اور ان کے اندرون قلب بتوں کو ٹھکانے مل جاتے ہیں کیونکہ وہی پردے پھر ان کی فطرت پر آپڑتے ہیں۔

پانچویں آیت میں پہلے تو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل، اسحاق، یعقوب، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام جیسے بزرگ انبیاء کا دین تو حید ہے۔ پھر فرماتا ہے، آپ بت پرستوں سے کہہ دیجئے کہ ہم خدائی رنگ کو قبول کرتے ہیں اور خدائی رنگ سے بڑھ کر اور کونسا رنگ بہتر ہو سکتا ہے؟ ہم تو اسے ہی پوجتے ہیں۔

مشرک مسیحی جو تو حید کی بجائے تین خداؤں کی عبادت کیا کرتے تھے، وہ اپنے بچوں کی ولادت کے بعد بپتسمہ کرتے، یعنی ولادت کا غسل دیا کرتے تھے اور بسا اوقات اس میں ایک مخصوص قسم کے زرد رنگ کا اضافہ بھی کیا کرتے تھے اور اپنے نومولود کو باپ بیٹا اور روح القدس کے نام سے غسل دیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ غسل نومولود کے گناہوں سے پاک ہونے کا باعث ہے کہ اسے آدم سے وراثت میں ملا ہے۔<sup>[۱]</sup>

[۱] ”کتاب مقدس“ کی قاموس میں آیا ہے کہ ”بپتسمہ“ مقدس دینی قواعد میں سے ایک ہے جو حضرت مسیح کے ظہور سے بہت پہلے سے معروف ہے اور وہ کلیسا کے فرائض میں سے ایک فریضہ ہے کہ جب اقا نیم ثلثہ کے لیے پانی کو استعمال کیا جاتا ہے تو یہ گناہ کی نجاست و ناپاکی کی علامت ہوتی ہے..... بہت سے عیسائیوں کا خیال ہے کہ مومنین کے بچوں کا بپتسمہ واجب ہے۔ (قاموس ص ۲۵۷، ص ۲۵۸)

قرآن مجید نے ایسے افکار پر خط بطلان کھینچ دیا اور فرمایا کہ اس خرافاتی رنگ کی بجائے توحید اور خدائی رنگ کو قبول کرو تا کہ وہ تمہاری روح اور تمہاری جان کو ہر قسم کے شرک بت پرستی اور گناہ سے پاک کر دے۔

جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں متعدد روایات میں یہ بات درج ہے کہ رنگِ الہی سے مراد وہی اسلام اور ولایتِ کارنگ ہے ﴿﴾ اور یہ انسان کی ذات میں فطری الہامات کے وجود کی ایک تاکید ہے۔

چھٹی اور ساتویں آیات میں انسانی تخلیق کے بعد پروردگار کے ذریعہ تعلیم بیان کی بات ہو رہی ہے، اور تعلیم بھی ایسی چیز کی جسے انسان نہیں جانتا لیکن اس کا جاننا ضروری ہوتا ہے۔

اور ایک اور مقام پر لکھنے میں انسان کا معلم خدا بتایا گیا ہے، کہ ”الذی علم بالقلم“ (علق ۴) اس طرح سے وہ معلم بیان بھی ہے اور معلم قلم بھی، اور ایسی چیزوں کا علم بھی جن سے خود انسان آگاہ نہیں ہے۔ ان تعلیمات سے ممکن ہے کہ فطری تعلیمات کی طرف اشارہ ہو جو خلاصہ کے طور پر اور سر بستہ راز کی صورت میں انسان کے اندرون موجود ہیں..... اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد وہ اور زار، اسباب اور مقدمات ہوں جو خدا نے انسان کے اندر تخلیق فرمائے ہیں اور اس کائنات میں زبان و خط اور دوسری اور وضعیات کی ایجاد پر قادر بنایا ہے۔

اور پہلی صورت میں ہماری بحث کا شاہد ہے۔

اسی موضوع کی آٹھویں اور آخری آیت میں دینِ فطرت کی بات ہو رہی ہے۔ خداوند متعال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دے رہا ہے کہ پروردگار عالم کے خالص دین کی طرف توجہ کریں، وہی دین جو خالق کائنات نے تمام انسانوں کی فطرت میں داخل کر رکھا ہے اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی رونما نہیں ہوتی، بلکہ وہ پائیدار اور استوار ہے۔

پھر لطف کی بات یہ ہے کہ قرآن یہاں پر یہ نہیں کہتا کہ خدا شناسی فطری ہے، بلکہ فرماتا ہے کہ دین اور آئین الہی مکمل طور پر اور ہر لحاظ سے ایک فطری امر ہے۔

البتہ تشریحی اور تکنیکی امور کی ہم آہنگی اور یک جہتی کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسا ہونا چاہیے یعنی جو چیز عالم تشریحی میں مفصل طور پر بیان ہوئی ہے وہ اجمالی طور پر انسان کی تکوین اور فطرت میں رکھ دی گئی ہے اور فطرت کی آواز جو انبیاء اور شریعت کی آواز سے ہم آہنگ ہوتی ہے، وہ انسان کو راہِ حق میں رہنمائی کرتی ہے اور صحیح راستے پر قائم رکھتی ہے۔

انشاء اللہ العزیز، توحید فطری کی بحث (بعد کی جلد) میں اس سلسلے میں تفصیلی گفتگو کریں گے۔

## نتیجہ گفتگو

اس طرح قرآن مجید نے فطرت اور وجدان کو معرفت کے ایک مکمل اور جامع منبع کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے اور متعدد آیات میں تمام لوگوں کو اس منبع کی اہمیت کی طرف متوجہ کرایا ہے۔

## تشریحات

## ۱۔ فطرت و وجدان اور ضمیر کی قسمیں

جو معرفت اور آگاہی فطرت اور وجدان سے عمل میں آتی ہے اس کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے زیادہ اہم مندرجہ ذیل چار قسمیں ہیں اور یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں سے ہر ایک آیت بھی انہی کی طرف اشارہ ہے۔

۱۔ اخلاقی حسن و قبح اور اچھائی اور برائی کا ادراک: جسے بعض اوقات اخلاقی وجدان کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کسی استاد اور معلم کی رہنمائی کے بغیر بہت سی صفات کو اچھا سمجھتا ہے، جیسے دوسروں کے ساتھ بھلائی، احسان، عدل و انصاف، شجاعت، ایثار، عفو و درگزر، سچائی اور امانت وغیرہ۔

اور ان کے مقابلے میں کچھ ایسی صفات بھی ہیں جنہیں انسان اچھا نہیں سمجھتا بلکہ بری صفات کے زمرے میں انہیں شمار کرتا ہے۔ جیسے ظلم و ستم، بخل، حسد، کینہ، جھوٹ اور خیانت وغیرہ۔ چنانچہ ”فالفہمها فجو رہا و تقواھا“ والی آیت اسی کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ عقلی بدیہیات کا ادراک: اسی پر نظر استدلال کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور اس کے بغیر کسی موضوع کے لیے کوئی بھی دلیل قائم نہیں کی جاسکتی۔

اس کی تشریح یہ ہے کہ علم ریاضی میں کچھ قضیے ایسے ہیں جو بدیہی کہلاتے ہیں اور ریاضی کے تمام استدلال کا سلسلہ آخر میں انہی پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ اور اس کا تعلق وجدان سے ہوتا ہے، مثلاً کل جزء سے بڑا ہوتا ہے دو برابر کی چیزیں ایک دوسرے کی مساوی ہوتی ہے یا دو برابر کی چیزوں سے مساوی مقدار میں کچھ کم کر دیا جائے پھر بھی وہ مساوی رہتی ہیں، یا مساوی مقدار میں ان میں اضافہ کر دیا جائے پھر بھی وہ مساوی رہتی ہیں وغیرہ۔

اسی طرح عقلی اور فلسفی استدلال کی کیفیت ہے کہ اگر ان میں مسلم اور بدیہی اصولوں سے استفادہ نہ کیا جائے تو تمام استدلال کی عمارت ہی مہندم ہو جائے، مثلاً دوسروں کا اجتماع یا دو تقیضوں کا یکجا ہونا محال ہے۔

قرآن مجید نے بھی بعض اوقات اہم مسائل کے اثبات کے لیے اس قسم کے بدیہی اصولوں کو بیان کیا ہے۔ مثلاً سورہ زمر ۹ میں ارشاد ہوتا ہے ”هل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون“ (آیا جو لوگ جانتے ہیں اور جو لوگ نہیں جانتے برابر ہو سکتے ہیں؟)

یا ایک اور جگہ سورہ رعد ۱۶ میں ارشاد ہوتا ہے ”قل هل یستوی الاعمی والبصیر ام هل تستوی الظلمات والنور“ (کہہ دیجئے یا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہیں؟ یا ظلمات اور نور یکساں ہیں؟)

۳۔ فطرت مذہبی: یعنی کچھ عقیدتی مسائل ہیں جنہیں انسان کسی استاد اور معلم کی تعلیم کے بغیر جانتا ہے، جن میں خدا شناسی اور معاد، اور اس طرح کے کئی دوسرے عقیدتی مسائل ہیں جن کی تفصیل انشاء اللہ اسی کتاب کی دوسری جلد میں آئے گی۔ اور ”فاذا ركبوا فی الفلك دعوا اللہ مخلصین له الدین“ کی آیت اسی چیز کی طرف اشارہ ہے۔

یہی بات اس امر کی دلیل ہے کہ تاریخ انسانی میں ایک مقدس مبداء پر ایمان موجود رہا ہے حتیٰ کہ ایسے دلائل اور ثبوت موجود ہیں کہ زمانہ قبل از تاریخ کے ادوار میں بھی اسی مبداء پر ایمان و اعتقاد انسان کے اندر پایا جاتا تھا، اور جیسا کہ بعد میں اس کی تفصیل بیان کریں گے اس بات کا امکان ہی نہیں ہے کہ کسی چیز میں یہ فطری امر موجود نہ ہو اور وہ اس وسعت اور دوام کے ساتھ پائی جاتی ہو۔

۲۔ ضمیر یا وجدان کی عدالت: جو انسان کے اندرون موجود ہے اور ایک ایسی عجیب و غریب عدالت ہے کہ اسے قیامت صغریٰ کا نام دیا جاسکتا ہے۔ یہ ایسی عدالت ہے جو انسان پر اس کے اعمال کے سامنے ہی مقدمہ چلاتی ہے۔ اچھائیوں کے بدلے میں تشویق اور برائیوں کے بدلے میں سزا دیتی ہے۔ اس تشویق اور سزا کو ہم سب مختلف انداز میں اپنے اندر محسوس کرتے ہیں۔ اسی لیے کبھی کہتے ہیں میرا وجدان اس کام پر راضی ہے، میرا ضمیر تخت بے قرار اور ناراحت ہے، اور ضمیر اور ضمیر وجدان کی یہ بیقراری اور بے چینی راتوں کا خواب حرام کر دیتی ہے اور سگھ اور چین انسان سے مکمل طور پر چھین لیتی ہے، اور اگر حد سے بڑھ جائے تو دردناک انجام سے بھی دوچار کر دیتی ہے اور انسان خود کشی پر مجبور ہو جاتا ہے، یا دیوانگی اور دوسری نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ آیت ”فرجعوا الی انفسہم“ اسی چیز کی طرف اشارہ ہے۔

## ۲۔ آيا شناخت فطری کا وجود ہے؟

باوجودیکہ ہر شخص اس منبع کو اجمالی طور پر اپنے اندر محسوس کرتا ہے یعنی کچھ اندرونی پیغامات اور باطنی الہامات، یا الفاظ دیگر کچھ ایسے ادراکات ہیں جنہیں رو بکار لانے کے لیے انسان کو کسی استاد اور معلم کی ضرورت نہیں ہوتی، پھر بھی کچھ فلاسفہ (خاص کر مادہ بینین) ایسے ہیں جو شناخت کے اس منبع کے اصل وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس مقام پر تقریباً تین مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔

الف: ایسے لوگوں کا نظریہ ہے جو کہتے ہیں کہ انسان کسی استثناء کے بغیر تمام معلومات پہلے سے اپنے اندر رکھتا ہے اور اس دنیا میں جو



کچھ وہ یاد کرتا ہے درحقیقت اس کی بھولی بسری یادیں اور معلومات ہیں نہ کہ نئی تعلیم۔ اور یہ نظریہ افلاطون اور اس کے پیروکاروں کا ہے۔<sup>[۱]</sup>  
ب: ایسے لوگوں کا نظریہ ہے جو کہتے ہیں کہ انسان کے اندر کسی قسم کی فطری شناخت اور معرفت نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے اندر مختلف مسائل کے یاد کرنے کی استعداد اور لیاقت پائی جاتی ہے۔ اور یہ لوگ انسان کے فطری ادراکات کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ نتیجہ ہیں اس کے تجربات ضرورتوں اور اجتماعی تقاضوں کا۔

مشہور ماہر نفسیات، فرائیڈ کا اخلاقی وجدان کے بارے میں نظریہ یہ ہے کہ یہ وجدان کچھ اجتماعی رکاوٹوں اور نامکمل خواہشات کا مجموعہ ہے جو انسان کے مخفی ضمیر میں موجود ہوتی ہیں اس کا کہنا ہے کہ اخلاقی وجدان انسان کے عمیق روح اور ذاتی عمل کا نمائندہ نہیں ہے، بلکہ سادہ اجتماعی رکاوٹوں کی اندرونی کیفیت کا نام ہے۔ اچھائی اور برائی تصورات کا دنیا میں وجود ہی نہیں ہے، نہ کسی فرد کی تاریخ میں ان کا وجود ملتا ہے اور نہ کسی بشری تاریخ میں بلکہ یہ تصورات صرف اور صرف خارج اور اجتماعی ماحول کی پیداوار ہیں۔<sup>[۲]</sup>

میٹر یا لزم اور ڈائیکریٹک مکتب کے طرفدار بھی اپنے مشہور اصل کہ ہر چیز اقتصادی صورتحال کا نتیجہ ہے کے مطابق فطری مسائل کی بھی اسی اصول کے مطابق تفسیر کرتے ہیں۔

ج: ان لوگوں کا نظریہ ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری کچھ معلومات ایسی ہیں جن کا اصل تعلق فطرت سے ہے، جبکہ کچھ کا تعلق کسب واکتساب سے ہے اور ہمارے کسی ادراکات کا فطری ادراکات پر موقوف ہے اور منطقی، عقلی اور آیات و احادیث پر مشتمل نقلی دلائل تھی اسی نظریہ کی تائید کرتے ہیں کیونکہ:

۱۔ اگر ہمارے پاس ریاضی کے چند مسلمہ اور بدیہی اصول نہ ہوں تو ریاضی کے کسی بھی قضیہ کو ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح دوسرے استدلالی مسائل میں بھی یقیناً کچھ بدیہی امور کا ہونا ضروری ہے جو کہ فطرت کے ذریعہ درک کیے جاتے ہیں اور نظری استدلالات کا محور ہوتے ہیں۔

بالفاظ دیگر اگر فطری اصول کا مکمل طور پر انکار کر دیں تو کائنات کی کسی بھی چیز کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکیں گے، تمام

[۱] ”افلاطون“ کہتے ہیں کہ انسانی روح بدن میں داخل ہونے اور مجازی دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے عالم مجردات اور عالم معقولات میں تھی اور ”مثل“، یعنی حقائق کا ادراک کر چکی تھی اور جب اس کا ورود عالم کون و فساد میں ہوا تو اس نے تمام حقائق کو فراموش کر دیا۔ لیکن وہ مکمل طور پر محو اور نیست و نابود نہیں ہوئی تھی یہی وجہ ہے جب انسان کسی چیز کے پر تو اور سایہ کو دیکھتا ہے، یعنی ایسی چیزوں کو دیکھتا ہے جن کا ”مثل“ کے ساتھ تعلق ہے، تو تھوڑی سی توجہ کے ساتھ حقائق کا ادراک کر لیتا ہے۔ پس علم اور معرفت کا حصول درحقیقت ایک یاد دہانی ہے۔ اگر انسان بالکل ہی نادان اور بے علم ہوتا، یعنی علم کا مایہ اس کے اندر نہ ہوتا، تو علم کا حصول اس کے لیے قطعاً ناممکن بن جاتا۔ (ملاحظہ ہو کتاب ”سیر حکمت دراروپا“، جلد ۱ ص ۲۳، نظریات افلاطون)۔

[۲] کتاب ”اندیشہ ہائے فروید“ ص ۶۴



عقلی مسائل مشکوک ہو کر رہ جائیں گے اور سفسطہ کے گہرے کھڈے میں جا گریں گے۔

مثال کے طور پر اگر ہم نے حس و تجربہ یا کسی ایک عقلی دلیل کے ساتھ کسی موضوع کے وجود کو ثابت کر دیا، لیکن ایک بدیہی ترین اور واضح ترین اصول اجتماع نقیضین مجال کو اپنے ضمیر و وجدان کے ساتھ قبول نہ کریں تو یہ بات کہہ سکتے ہیں کیا حرج ہے کہ وہ موضوع موجود ہو بھی اور موجود نہ بھی ہو۔

اور اگر اس بدیہی اصول کو تجربہ اور استدلال کے ذریعہ بھی ثابت کرنا چاہیں تو دور اور تسلسل تک معاملہ جا پہنچے گا جو کسی سے مخفی نہیں ہے۔  
۲۔ اس کے علاوہ سفسطائیوں کے مقابلے میں جو کہ ہر شے کی وجود کے منکر ہیں اور آئیڈیالسطوں کے مقابلے میں جو کہ خارجی اشیاء کا انکار کرتے ہیں اور ذہنی اشیاء کے وجود کے قائل ہیں، ہم وجدان و ضمیر پر تکیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارا وجدان اس قسم کے نظریات کے باطل ہونے پر گواہ ہے کیونکہ ہم اچھی طرح اپنی ذات کا اور دوسری کائنات کا خارج میں ادراک کرتے ہیں یہی ضرورت وجدانی بھی اس بات کا پتہ دے رہی ہے کہ بہت سے ادراکات ہماری ذات کے اندر موجود ہیں۔

جیسا کہ ہم بہت سی جسمانی اور روحانی خواہشات کو اپنے اندر محسوس کرتے ہیں (جسمانی خواہشات و ضروریات کی مثال غذا اور نیند ہے اور روحانی خواہشات کی مثال جیسے علم، اچھائی اور خوبصورتی، پرستش اور قدامت بعض عظیم نفسیات شناسوں کے بقول یہ چار ایسے عناصر ہیں جن سے انسانی روح تشکیل پاتی ہے)

یہی وجدان اور ضمیر ہمیں بتاتے ہیں کہ نیکی اور عدالت اچھی چیزیں ہیں اور ظلامت اور دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنا بڑی بات ہے اور اس قسم کے ادراک میں ہمیں کسی منبع کی ضرورت نہیں ہے، خواہ وہ اجتماعی یا اقتصادی ہو یا کوئی اور!

فرائیڈ اور مارکس جیسے افراد کا عذر بھی معلوم ہے۔ انہوں نے پہلے ہی ایک اصل کے بارے میں فیصلہ کر لیا ہے اور اس کو وہ قبول بھی کر چکے ہیں، مثلاً وہ پہلے ہی سے اس بات کا فیصلہ کر چکے ہیں کہ فکر و اجتماع کے بارے میں منصفہ شہود پر آنے والے تمام مسائل کا تعلق یا جنسی مسائل سے ہے یا اقتصادی مسائل سے۔ پھر وہ اس بات پر مضمحل ہیں کہ ساری دنیا کے مسائل کو اسی معیار پر رکھ کر ان کے بارے میں گفتگو کی جائے۔

۳۔ توحیدی نقطہ نگاہ سے اس بات کی زیادہ وضاحت ہوتی ہے۔ کیونکہ جب ہم اس اصول کو تسلیم کر چکے ہیں کہ انسان ایک الہی طریقہ کے تحت، ارتقائی مراحل کو طے کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے، لہذا بغیر کسی شک و تردید کے اس راہ کو طے کرنے کے لیے اس کے اندر اسباب و وسائل بھی آمادہ ہونا چاہئیں، جو کچھ اور آسمانی کتابیں اپنے ساتھ لائی ہیں وہ اس کی تکوینی تخلیق سے ہم آہنگ ہے۔

اس طرح تکوین و خلقت کا عالم وحی اور تشریح کی کائنات سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے، یا بالفاظ دیگر ان تعلیمات کا ضمیر، مایہ، نچوڑ اور خلاصہ خود انسان کی جان کے اندر موجود ہے اور آسمانی شریعتوں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ اس خلاصے کی تفصیل ہے۔

پس اسی بنا پر فطری شناخت کے وجود میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ عقل اور توحیدی نقطہ نظر سے بھی اس کی تائید و تصدیق ہوتی ہے۔

## سوال

ہوسکتا ہے یہاں پر یہ سوال پیش کیا جائے کہ قرآن مجید صاف طور پر یہ کیوں کہہ رہا ہے:

وَاللّٰهُ اٰخَرُ جَاكُم مِّنْ بُطُوْنٍ اَمْهِنِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا ۗ وَجَعَلَ لَكُمْ السَّمْعَ  
وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ ۗ

خداوند عالم نے تمہیں تمہاری ماؤں کے شکموں سے باہر نکالا ہے حالانکہ اس وقت تم کچھ نہیں جانتے تھے اور اس نے تمہارے لیے کان، آنکھیں اور عقل قرار دی ہیں۔ (نحل ۷۸)

کیا اس تعبیر سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ فطری معلومات نام کی کوئی چیز نہیں ہے؟

## جواب

پہلی بات تو یہ ہے کہ جس لمحہ انسان شکم مادر سے باہر آتا ہے تو مسلم سی بات ہے کہ وہ کچھ نہیں جانتا ہوتا، حتیٰ کہ فطری معلومات بھی فعلی صورت میں اس کے سامنے موجود نہیں ہوتیں لیکن جوں جوں وہ ہوش سنبھالتا ہے اس کے اندر عقل و تہیز پیدا ہوتے جاتے ہیں کسی استاد و معلم اور حسن و تجربہ کے بغیر فطری معلومات اس کے اندر پروان چڑھتی رہتی ہیں، وگرنہ ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ انسان تمام چیزوں، حتیٰ کہ اپنے وجود کا علم بھی آزمائش اور تجربہ وغیرہ کے بعد حاصل کرتا ہے۔<sup>[۱]</sup>

دوسری بات یہ ہے کہ کیا ہم یہ نہیں کہتے کہ قرآنی آیات ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں؟ تو جو آیات یہ کہتی ہیں کہ خداوند عالم نے انسان کو پیدا کیا اور اسے اچھائی برائی بھی الہام کر دی، یا دین الہی کو فطری صورت میں انسان کے اندرون جان میں قرار دے دیا، دوسری آیات مثلاً جو کہ اسی بحث کے آغاز میں بیان ہوئی ہیں کہ ”واللہ اٰخِرُ جَاكُم مِّنْ يُّطُوْنٍ اَمْهَاتِكُمْ“ کی تفسیر کر رہی ہے اور فطری معلومات کو اس سے مستثنیٰ قرار دے رہی ہے۔

## ایک اور سوال

یہاں پر ایک اور سوال ہے جو دوسرے سوال کے برعکس ہے اور وہ یہ کہ قرآن مجید نے بہت سے مقامات پر انسانی علوم کو تذکرہ سے

[۱] ”دیکارٹ“ سے ایک مشہور و معروف جملہ منقول ہے کہ ”مجھے تو خود ہی اپنے وجود میں شک ہے، لیکن میں نے جب دیکھا کہ میں سوچ رہا ہوں تو میں نے سمجھ لیا کہ میں ہوں“ یہ غلط فہمی سے لبریز ایک جملہ ہے، کیونکہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ ”میں سوچ رہا ہوں“ تو پہلے وہ اپنے ”میں“ کے وجود کا اعتراف کر چکا ہے، پھر اس نے اپنی سوچ کو پہچانا ہے، تب کہیں جا کر ”میں“ کو۔

موسوم کیا ہے، مثلاً "ان فی ذالک لآیات لقوم یتذکرون" (اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو تذکر کام لیتے ہیں۔ (سورہ نحل ۱۳) اور فرماتا ہے "وما یذکر الا اولوا الالباب" (صاحبان عقل کے علاوہ اور کوئی تذکر نہیں کرتے۔ (سورہ آل عمران ۷) نیز فرماتا ہے "ویبین آیاتہ للناس لعلہم یتذکرون" خدا اپنی آیات کو لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے تاکہ وہ متذکر ہوں۔ (سورہ بقرہ ۲۲۱) یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہاں پر تذکر کے معنی یاد آوری نہیں ہیں؟ اور اس سے افلاطون کے نظریہ کو تقویت نہیں ملتی کہ علم خواہ کوئی بھی ہو، یاد آوری ہی ہوتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ تذکر ذکر کے مادہ سے ہے اور ارباب لغت نے ذکر کا اصلی معنی حفظ لکھا ہے جیسا کہ راغب اپنی کتاب مفردات میں لکھتے ہیں کہ ذکر بھی تو نفسیاتی کیفیت اور حالت کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے علوم و معارف کے حفظ پر قادر ہوتا ہے اور کبھی کسی چیز کے دل میں حاضر ہونے یا بیان کرنے کو کہتے ہیں۔

لسان العرب میں بھی اسی سے ملتا جلتا معنی ذکر کیا گیا ہے، جیسا کہ ذکر کا معنی کسی چیز کو حفظ کرنا ہے، نیز اس مطلب کو بھی ذکر کہتے ہیں جو زبان پر جاری ہوتا ہے۔

بنابراین ذکر اور تذکر، کا معنی صرف فراموشی کے بعد یاد آوری یا کسی بھولے بسرے واقعہ کو از سر نو ذہن میں لانا نہیں ہے بلکہ تمام معلومات کو شامل ہے۔

### ۳۔ اسلامی روایات میں، فطرت اور وجدان

انسان کے اندر شناخت کے اس منبع کا وجود ان مسائل میں سے ہے جن کی طرف اسلامی روایات میں کافی حد تک اشارے پائے جاتے ہیں۔ بطور نمونہ مندرجہ ذیل آیات پر غور کیجئے۔

۱۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک مشہور حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں:

**کل مولود یولد علی الفطرة حتی یكون ابواہ یهودانہ وینصرانہ**

ہر مولود فطرت (توحید و اسلام) پر پیدا ہوتا ہے اور یہی فطرت اس کے اندر اسی طرح برقرار رہتی ہے یہاں تک

کہ اس کے والدین اسے کسی اور دین، یعنی یہودیت یا نصرانیت کا پیروکار بنا دیتے ہیں۔ [۱]

یہ حدیث بخوبی دلالت کر رہی ہے کہ صرف توحید ہی نہیں اسلام کے تمام بنیادی اصول بھی تمام انسانوں کے وجود میں موجود ہیں۔ [۲]

۲۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے بارے میں ہے کہ ایک شخص نے آپ سے قرآن مجید کی آیت "فطرة الله التي فطر

[۱] بحار الانوار، جلد ۳، ص ۲۸۱

[۲] اس کی تفصیل ہم انشاء اللہ دوسری جلد میں بیان کریں گے۔

المناس علیہا“ کے بارے میں استفسار کیا، تو آپؐ نے فرمایا:

امامؑ نے فرمایا: ”التوحید“ (فطرت وہی توحید ہی ہے)۔ [۱]

۳۔ آپؐ سے منقول ہے کہ ”ہی الاسلام“ (فطرت وہی اسلام ہی ہے)۔ [۲]

۴۔ ایک اور حدیث میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

”فطرهم علی المعرفة بہ“

(خداوند عالم نے لوگوں کو اپنی معرفت سے پیدا کیا ہے)۔ [۳]

۵۔ ”صبغة الله ومن احسن من الله صبغة“ کی تفسیر میں بھی متعدد روایات موجود ہیں۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ

السلام فرماتے ہیں: ”صبغة الله“ (رنگ الہی) سے مراد ہی اسلام ہے۔ [۴]

۶۔ حدیث قدسی میں خداوند فرماتا ہے ”خلقت عبادی حنفاء“۔ مجمع الجریں اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ حق کو

قبول کرنے کے لیے آمادہ پھر تحریر کیا ہے کہ ”کل مولود یولد علی الفطرة“ اس حدیث کے مساوی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآنی آیات اور اسلامی روایات میں نیک کاموں کو معروف (پہچانے ہوئے) کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا

ہے لہذا امر بالمعروف کہا جاتا ہے اور برے اور ناشائستہ کاموں کو منکر (ان جانے) کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی

ہے کہ اخلاقی فضائل کے مفہوم ایسی چیز ہیں جو انسانی روح سے آشنا اور اس کے نزدیک پہچانے ہوئے ہیں جبکہ اس کے برعکس برائیاں اور قباحتیں

قابل نفرت اور ناپسندیدہ ہیں، جو روح کے لیے انجانی اور غیر معروف ہوتی ہیں۔

[۱] اصول کافی، جلد ۲، ”باب فطرة الخلق علی التوحید“، حدیث نمبر ۱، ۲، ۳۔ ”فطرت“ کے بارے میں احادیث بکثرت موجود ہیں،

بحار الانوار، جلد سوم، باب یازدہم (ابواب توحید) اور اصول کافی، جلد دوم، باب ”فطرة الخلق علی التوحید“ کی طرف رجوع کرنے سے

یہ حقیقت بخوبی روشن ہو جائے گی۔

[۲] اصول کافی، جلد ۲، ”باب فطرة الخلق علی التوحید“، حدیث نمبر ۱، ۲، ۳۔ ”فطرت“ کے بارے میں احادیث بکثرت موجود

ہیں، بحار الانوار، جلد سوم، باب یازدہم (ابواب توحید) اور اصول کافی، جلد دوم، باب ”فطرة الخلق علی التوحید“ کی طرف رجوع کرنے

سے یہ حقیقت بخوبی روشن ہو جائے گی۔

[۳] اصول کافی، جلد ۲، ”باب فطرة الخلق علی التوحید“، حدیث نمبر ۱، ۲، ۳۔ ”فطرت“ کے بارے میں احادیث بکثرت موجود

ہیں، بحار الانوار، جلد سوم، باب یازدہم (ابواب توحید) اور اصول کافی، جلد دوم، باب ”فطرة الخلق علی التوحید“ کی طرف رجوع کرنے

سے یہ حقیقت بخوبی روشن ہو جائے گی۔

[۴] بحار الانوار جلد ۳ ص ۲۸۰

## معرفت کا پانچواں منبع آسمانی وحی

### اشارہ

قرآن مجید کی اس منبع کے بارے میں بہت سی آیات موجود ہیں نہ صرف قرآن مجید میں اس کا تذکرہ ہے بلکہ تمام آسمانی کتابوں میں اس کا ذکر ہے۔ اصول کی بات تو یہ ہے کہ آسمانی ادیان کے پیروکار وحی کو ہی معرفت کے دوسرے تمام منابع سے اہم سمجھتے ہیں کیونکہ اس کا براہ راست تعلق خداوند عالم سے ہے جبکہ باقی منابع کا انسان کے ساتھ تعلق ہوتا ہے جو کہ خدا کے مقابلے میں نہایت ہی محدود اور ناچیز ہے۔

توحید الہی کے نظریہ کے حامل کہتے ہیں کہ خداوند عالم نے ہمیشہ اپنے بندوں کی ہدایت (بمعنی راستہ دکھانے) کے لیے رجال وحی یعنی عظیم انبیاء کرام کو بھیجا ہے۔ ارتقاء اور سعادت کی راہیں طے کرنے کے لیے ہر قسم کی انسانی ضروریات کو انہی بزرگواروں کے ذریعہ پیدا فرمایا۔

اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ہماری عقلیں زبردست طاقتور روشنی کی مانند ہیں اور فطرت و وجدان اور تجربہ وغیرہ دوسری طاقتور روشنیوں کی طرح تو وحی کا مرتبہ آفتاب عالمتاب کی طرح ہوگا اور اس کی قلم و نہایت ہی وسیع اور بے انتہا عریض ہوگی۔ اسی لیے خدا پرستوں کی نگاہ میں وحی ایک نہایت ہی اہم اور نہایت ہی مستغنی منبع معرفت کی حیثیت رکھتی ہے، اسی لیے ہم اس پر تفصیلی گفتگو کرتے ہیں اور سب سے پہلے مندرجہ ذیل آیات کو گوش دل سے سماعت کرتے ہیں۔

### آیات

۱۔ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَائِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ

رَسُولًا فَيُوحِي بِأَذْنِهِ مَا يَشَاءُ ۗ إِنَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿۵۱﴾ (سورہ شوریٰ ۵۱)

۲۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۗ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ﴿۳﴾ (سورہ نجم ۳، ۴)

۳۔ قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ (سورہ فصلت ۴)

۴۔ ذٰلِكَ هِمَّ اَوْحٰى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ط (سورہ بنی اسرائیل ۳۹)

۵۔ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلْجِبْرِيلَ فَاِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

(سورہ بقرہ ۹۷)

۶۔ وَنَزَّلْنَا عَلٰىكَ الْكِتٰبَ تَبْيٰنًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (سورہ نحل ۸۹)

۷۔ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ط مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا

الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُورًا مِّنْ نَّشَآءِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَاءُ مِّنْ عِبَادِنَا ط وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْ

اِلٰى صِرٰطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (سورہ شوریٰ ۵۲)

۸۔ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوحِيْ اِلَيْهِمْ (سورہ نحل ۴۳)

۹۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُوْمَ

النَّاسُ بِالْقِسْطِ ؕ (سورہ حدید ۲۵)

۱۰۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (سورہ حجر ۹)

۱۱۔ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمْ الْاٰیٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (سورہ آل عمران ۱۱۸)

۱۲۔ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوسٰى تَكْلِيْمًا ۝ (سورہ نساء ۱۶۴)

ترجمہ

۱۔ کسی انسان کے لائق یہ بات نہیں ہے کہ خداوند عالم اس سے بات کرے مگر وحی کے ذریعہ سے، یا پشت پر دہ سے، یا کوئی رسول بھیجتا ہے اور وہ اس کے حکم کے مطابق جو کچھ کہتا ہے وحی کرتا ہے کیونکہ وہ بلند مقام کا مالک اور صاحب حکمت ہے۔

۲۔ وہ کبھی اپنی خواہش کے مطابق بات نہیں کرتا، وہ جو کچھ لایا ہے، وحی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

۳۔ کہہ دو کہ میں تو صرف تمہارے جیسا ایک انسان ہوں کہ یہ حقیقت مجھ پر وحی ہوتی ہے۔

۴۔ یہ احکام ان حکمت کی باتوں میں سے ہیں کہ تیرے پروردگار نے تجھ پر وحی کی ہے۔

۵۔ (وہ کہتے ہیں چونکہ جو فرشتہ آپ پر وحی لے آتا ہے وہ جبرائیل ہے اور ہم جبرائیل کے دشمن ہیں لہذا ہم آپ

پرایمان نہیں لاتے) تو آپ کہہ دیجئے کہ جو شخص جبرائیل کا دشمن ہے (درحقیقت وہ خدا کا دشمن ہے) کیونکہ اس نے حکم خدا کے مطابق قرآن کو آپ کے دل پر نازل کیا ہے۔

۶۔ اور ہم نے اس (آسمانی) کتاب کو آپ پر نازل کیا ہے جو ہر چیز کو بیان کرتی ہے۔

۷۔ جیسا کہ ہم نے گزشتہ انبیاء پر وحی نازل کی ہے آپ کی طرف بھی ہم نے اپنے فرمان کے مطابق روح کو وحی کیا ہے۔ اس سے پہلے تمہیں معلوم نہیں تھا کہ کتاب اور ایمان کیا ہے؟ (مضامین قرآن کو نہیں جانتے تھے)۔

لیکن ہم نے اسے نور قرار دیا ہے، کہ جس کے ذریعہ ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہیں ہدایت کریں۔ اور یقیناً آپ لوگوں کو راہِ راست کی ہدایت کرتے ہیں۔

۸۔ اور آپ سے پہلے ہم نے مردوں کو نہیں بھیجا مگر ان کی طرف ہم وحی کرتے تھے۔

۹۔ ہم نے اپنے رسولوں کو روشن دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ (آسمانی) کتاب اور (باطل سے حق کی) پیمان اور عادلانہ قوانین کا) میزان نازل کیا تاکہ لوگ عدل پر قائم رہیں۔

۱۰۔ ہم ہی نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی یقیناً اس کی حفاظت کریں گے۔

۱۱۔ ہم نے آیات (اور ان لوگوں کے شر کے بچاؤ کے راستے) کو تمہارے لیے بیان کر دیا ہے، اگر تم عقل سے کام لو۔

۱۲۔ اور خداوند عالم نے موسیٰ سے باتیں کیں۔

## الفاظ کے معانی اور تشریح

وحی قرآن مجید، اسلامی روایات اور عربی ادب میں وحی کا لفظ بہت سے معانی کے لیے استعمال ہوا ہے لیکن اس کے اصل معنی جیسا کہ راغب نے مفردات میں لکھا ہے سربح اشارہ ہیں، اسی لیے سربح اور تیزی سے انجام پانے والے کاموں کو بھی وحی کہا جاتا ہے اسی طرح اشاروں اور کنایوں میں جلد از جلد انجام پانے والی گفتگو کو بھی وحی کہا جاتا ہے اور یہ یا تو اشاروں کے ساتھ یا تحریری طور پر حاصل ہوتا ہے لیکن اب ان معارفِ الہیہ کو وحی کہا جاتا ہے جو انبیاء یا اولیاء پر القاء ہوتے ہیں۔

وحی کی مختلف شکلیں ہیں کبھی تو فرشتہ وحی کو دیکھ کر اور اس کی باتیں سن کر ہی یہ کیفیت حاصل ہوتی ہے جس طرح جناب جبرائیل علیہ السلام حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس نازل ہوتے تھے۔ کبھی صرف باتوں کو سنا جاتا ہے لیکن فرشتے کی شکل کو نہیں دیکھا جاتا، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کلام خدا کو سنتے تھے۔

کبھی صرف دل ہی میں کوئی مطلب ڈال دیا جاتا ہے۔



کبھی الہام کے ذریعہ سے ہوتی ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی داستان میں بیان ہوا ہے۔  
 کبھی تسخیر کے ذریعہ سے ہوتی ہے جیسا کہ ”واوحی ربك الى النحل“ تیرے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طرف وحی بھیجی)  
 اور کبھی خواب کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ (جیسے کہ روئے صادقہ یعنی سچے خواب ہیں) [۱]  
 لیکن خلیل بن احمد نے اپنی کتاب العین میں وحی کے اصل معنی کتابت یعنی لکھنا تحریر کیا ہے جبکہ ابن منظور نے کتاب لسان العرب  
 میں وحی کے مندرجہ ذیل معانی تحریر کیے ہیں مثلاً اشارہ کتابت رسالت الہام مخفی گفتگو اور ہر وہ چیز جو دوسروں کو القاء ہوتی ہے۔  
 اس تمام گفتگو سے مجموعی طور پر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ وحی کے اصل معنی تو سربیع اشارہ اشاروں پر مبنی گفتگو اور اشاروں یا خطوط  
 کے ذریعہ مخفی پیغامات ہیں۔ اور چونکہ عظیم الشان انبیاء کو اشاروں کی زبان میں معارف الہیہ کی تعلیم دی جاتی ہے، لہذا یہ کلمہ اسی معنی میں استعمال  
 ہوتا ہے۔

کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ جن الفاظ سے ہم کام لیتے ہیں وہ ہماری روزمرہ کی زندگی کے لیے وضع کیے گئے ہیں لہذا جب ہم ایسے  
 مطالب اور مفہیم کو بیان کرنا چاہیں گے جو ہماری روزمرہ زندگی سے ماوراء ہیں تو ان الفاظ کے مفہیم کو وسعت دیں گے، یا پھر ان سے خالی کر  
 کے استعمال کریں گے، پھر کسی مناسبت کو وہاں پر کام میں لائیں گے۔

مرحوم شیخ مفید رضوان اللہ علیہ شرح اعتقادات میں فرماتے ہیں:

وحی کے اصل معنی تو مخفی کلام ہے لیکن اس کا استعمال ایسے مطلب پر بھی ہونے لگا ہے جو مخاطب کو ایسے مخفی انداز

میں سمجھایا جاتا ہے جس سے دوسرے لوگ بے خبر ہوتے ہیں۔ [۲]

۲۔ ”انزال“ اور ”تنزیل“ دو ایسے الفاظ ہیں جو نزول کے مادہ سے لیے گئے ہیں جن کا اصل معنی اوپر سے نیچے آنا یعنی اترنا ہے  
 اور نیزان کے متعدد معانی بھی ہیں جن میں سے نیچے لانا اور بھیجنا، بھی ہیں۔

کبھی تو نزول یعنی اوپر سے نیچے بھیجنے کے معنی میں حسی پہلو موجود ہے جیسے ”انزلنا من السماء ماء طهوراً“ یعنی ہم نے آسمان  
 سے پاک و پاکیزہ اور پاک کرنے والا پانی بھیجا ہے

اور کبھی اس بخشش اور عطا کے معنی میں آتا ہے جو حکام بالا کی طرف سے اپنے ماتحتوں کو ہوتی ہے۔ جیسے ”وانزل لکم من  
 الانعام ثمانية ازواج“ یعنی اس نے تمہارے لیے آٹھ جوڑے چوپایوں کے نازل کیے ہیں یعنی بخشے ہیں۔

اور کبھی خداوند عالم کی طرف سے الہی معارف اور مطالب کے القاء کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں اور قرآن مجید میں بھی یہ الفاظ کئی  
 مقامات پر اسی معنی میں استعمال ہوئے ہیں

[۱] مفردات راغب مادہ ”وحی“

[۲] سفینۃ البحار، جلد ۲ ص ۶۳۸



آیا "انزال" اور "تنزیل" ایک ہی معنی کے دو مختلف الفاظ ہیں یا نہیں؟ ارباب لغت میں اس بارے میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ان دو کے درمیان کوئی فرق نہیں سوائے اس کے کہ تنزیل میں کثرت اور زیادتی کا معنی پایا جاتا ہے۔<sup>[۱]</sup> جبکہ بعض دوسرے حضرات کا خیال ہے کہ ان دونوں کے درمیان اساسی فرق ہے تنزیل کے معنی کسی چیز کو تدریجی طور پر نیچے بھیجنا ہیں۔ اور انزال کے معنی میں یکبارگی اور تدریج دونوں پائے جاتے ہیں راغب نے مفردات میں اس فرق کو مندرجہ ذیل آیت کے ذریعہ واضح کیا ہے۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُورَةٌ ۖ فَإِذَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَذُكِرَ فِيهَا الْقِتَالُ ۖ رَأَيْتَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنظُرُونَ إِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۗ

مؤمنین کہتے رہتے ہیں کہ کیوں نہیں (ایسی) سورت نازل ہوتی (جس میں جہاد کا حکم ہو) لیکن جب کوئی محکم سورت نازل ہوتی ہے جس میں جنگ کا ذکر ہوتا ہے تو بیمار دل (منافقین) کو دیکھو گے کہ وہ تمہاری طرف یوں دیکھتے ہیں جیسے کوئی شخص موت کی دہلیز پر پہنچ چکا ہو۔ (سورہ محمد ۲۰)

اس آیت میں پہلے تو آیات جہاد کے تدریجی نزول کی درخواست ہے لیکن بعد میں اس فرمان کے ایک قطعی اور جامع صورت میں نزول کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ منافقین وحشت زدہ ہو گئے کیونکہ وہ جہاد کے اس حکم کے سامنے غفلت کا شکار ہو گئے۔

۳۔ "تبدیلین"، "بین" کے مادہ سے ہے جس کے معنی دو چیزوں کا درمیانی فاصلہ ہے۔ یہ ہوئے اور واضح اور آشکار کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے، کیونکہ دو چیزوں کے درمیان فاصلہ اپنے اندر ان دونوں نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ بعد میں یہ لفظ ان دونوں معانی کے لیے بطور جداگانہ استعمال ہونے لگا ہے، کبھی توجہ دائی کے لیے اور کبھی واضح ہونے کے لیے۔

کتاب صحاح اللغۃ میں ہے کہ بین دو متضاد معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے یعنی کبھی بمعنی جدا یا اور کبھی بمعنی اور وصل کے (لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اصلی معنی وہی ہے جو لغت کی دوسری کتابوں میں درج ہے، یعنی جدائی اور فراق کے معنی) البتہ چونکہ کسی چیز سے جدائی بسا اوقات کسی دوسری چیز سے جاننے کا باعث بن جاتی ہے لہذا اس کے لازمہ پر اس کا اطلاق کیا گیا ہے۔

بہر حال یہ کلمہ یعنی تین قرآن مجید کی بہت سی آیات میں ظہور، انکشاف اور واضح ہونے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ لہذا بینہ ایسی چیز کو کہا جاتا ہے جو روشن اور آشکارا دلیل ہوتی ہے خواہ وہ دلیل عقلی ہو یا محسوس۔ اسی وجہ سے قانونی امور میں جن دو عادل افراد کی گواہی ثبوت کا درجہ رکھتی ہے کو بینہ کہا جاتا ہے اور انبیاء علیہم السلام کے معجزات کو بھی بینہ کہا جاتا ہے اور بیان کے معنی کسی چیز سے پردہ ہٹانا ہوتے ہیں خواہ وہ

[۱] "ابوالحسن" نے اس نظریے کو "لسان العرب" سے نقل کیا ہے۔

زبان کے ذریعہ ہو یا تحریر کے اور شاہد حال کے ذریعہ۔

۴۔ تکلم اور تکلم، لفظ کلم، (بروزن زخم) کے مادہ سے ہے اور مفردات میں بقول راغب اس کے اصل معنی کسی چیز پر تاثیر کرنا ہے، ایسی تاثیر جو آنکھ یا کان سے محسوس ہو، جو چیز آنکھ سے محسوس ہوتی ہے وہ زخم یا جراحت ہے جو کسی کے بدن پر واقع ہوتی ہے۔ اور جو چیز کان سے محسوس ہوتی ہے وہ وہ باتیں ہیں جو ہم دوسروں سے سنتے ہیں۔

العین میں خلیل بن احمد سے مجروح کرنے کے معنی میں جانتے ہیں اسی لیے اس لفظ کا اطلاق بات کرنے پر اس لیے ہوتا ہے کیونکہ سننے والے پر اس کا گہرا اور عمیق اثر ہوتا ہے بلکہ بسا اوقات تلوار اور خنجر سے بھی بڑھ کر۔ چنانچہ عرب کا ایک مشہور شعر ہے:

جراحات اللسان لها التیام

ولا یلتام ماجرح اللسان

نیزے کے زخم تو مندمل ہو سکتے لیکن زبان کے زخم مندمل نہیں ہو سکتے۔

بعض تعبیرات سے معلوم ہوتا ہے کہ تکلم اور تکلم کے ایک ہی معنی ہیں اور دونوں کے معنی بات کرنا ہے، اسی لیے خدا کی صفات (ثبوتیہ) میں سے ایک صفت متکلم ہے۔ حالانکہ اگر ہم ”و کلم اللہ موسیٰ تکلیماً“ کی اساس پر بات کریں تو کہیں گے کہ خدا متکلم ہے۔ اور یہ احتمال بھی بعید نہیں ہے کہ تکلم کی لفظ ایسے مقامات پر استعمال ہوتا ہے جہاں ایک شخص دوسرے سے بات کرتا ہے لیکن تکلم مکالمہ کی مانند ایسی بات کو کہتے ہیں جو دو افراد کے درمیان رد و بدل ہوتی ہے۔ کوہ طور پر موسیٰ علیہ السلام سے خدا کی گفتگو کرنا بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔

”علم عقائد“ کو اسی بنا پر ”علم کلام“ کہتے ہیں کہ اسلام میں عقائد کی اولین بحث کا آغاز، کلام اللہ یعنی قرآن مجید کے سلسلے میں ہوا کیونکہ کچھ لوگوں کا عقیدہ تھا کہ کلام خدا قدیم اور ازلی ہے جبکہ بعض لوگ اسے حادث سمجھتے تھے اسلام کی قرون اولیہ میں اس بارے میں بڑی شد و مد کے ساتھ بحث و مباحثہ اور جھگڑے اور نزاع کا سلسلہ جاری رہا ہے۔<sup>[۱]</sup>

اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ اس قسم کا جھگڑا فضول اور بے بنیاد تھا، کیونکہ اگر قرآن سے مراد اس کے مفہوم اور مضامین ہیں تو مسلم ہے کہ ازل سے وہ علم خدا میں تھے۔ اور اگر اس سے مراد الفاظ کتابت اور وحی کا نزول تھا تو بلا خوف و تردید اس کی صورت زمانہ سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں عمل میں آئی۔ بہر کیف علم عقائد کو علم کلام کہنے کی وجہ تسمیہ بیان کی جا رہی تھی۔

[۱] بیسویں صدی کے انسائیکلو پیڈیا میں ”علم کلام“ کی وجہ تسمیہ کا موضوع سب سے پہلا عنوان کے طور پر ذکر ہوا ہے،

(ملاحظہ ہو دائرة المعارف، فرید و جدی، جلد ۸، مادہ کلام)۔

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### آفتابِ وحی

قرآن مجید میں مسئلہ وحی بڑی شد و مد کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

قرآن پاک میں سینکڑوں آیات ایسی ہیں جن میں وحی کو شناخت و معرفت کے عظیم منبع کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے۔ کہیں پر خود وحی کے لفظ کے ساتھ کہیں پر تنزیل اور انزال کے عنوان سے، کسی جگہ پر خدائی آیات کی تئیں کے عنوان سے اور کہیں پر خدا کی انبیاء کے ساتھ گفتگو کے طور پر اور کہیں پر دوسرے عنوانوں کے ساتھ۔

اس بارے میں بہترین تعبیر یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ اگر حقائق کو بیان کرنے کے لیے قرآنی نقطہ نظر سے عقل ایک طاقتور روشنی کی مانند ہے تو وحی آفتابِ عالمتاب کی طرح ہے۔

زیر بحث آیات میں سب سے پہلی آیت میں خدا کا انبیاء کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کے تین ذرائع بیان کیے گئے ہیں ارشاد ہوتا ہے کوئی بھی شخص خدا کے روبرو نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ جسم و جسمانیات سے پاک و منزہ ہے، مگر وحی کے طریقہ اور ان کے دل میں مخفی الہام کے ذریعہ سے، پھر فرماتا ہے یا پھر حجاب کی اوٹ سے پروردگار کا کلام سننے سے (جیسا کہ خدا نے کوہ طور پر موسیٰ بن عمران سے باتیں کیں اور وہ اس طرح کہ فضا میں صوتی لہریں پیدا کر دیتا تھا اور اس طرح سے اپنا پیغام حضرت موسیٰ تک پہنچا دیتا تھا)

یا پھر اپنے قاصد کو بھیج کر اس کا پیغام اس کے رسول تک پہنچائے، جیسا کہ فرشتہ وحی حضرت جبرائیل امین پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا کرتے تھے۔

بنا بریں قلبی الہام صوتی لہروں کی ایجاد اور فرشتہ وحی کا نزول یہ تین ایسے مختلف ذرائع ہیں جن کے ساتھ انبیاء الہی عالم ماوراء طبعیت کے ساتھ اپنا رابطہ قائم کرتے تھے۔

دوسری آیت میں اس بات کی قسم کھائی گئی ہے جب کہ ستارہ غروب کر رہا ہوتا ہے، پھر فرماتا ہے، پیغمبر خدا ہرگز گمراہ نہیں ہوئے اور اپنے مقصد و منزل مقصود کو گم نہیں کر دیا۔ وہ تو کبھی بھی اپنی ذاتی خواہشات کے مطابق بات نہیں کرتا۔ جو کچھ بھی کہتا ہے وہ آسمانی وحی ہوتی ہے۔

قسم ہے ستاروں کی جب وہ غروب کرتے ہیں ممکن ہے یہ عصر جاہلیت میں میدان افکار سے نور و ایمان و ہدایت کے غروب کی طرف اشارہ ہو۔ ایسا غروب جو کسی اور طلوع کا پیش خیمہ بن رہا ہو یعنی زبان پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان حقیقت ترجمان سے آفتابِ وحی کا طلوع۔

اس طرح سے یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام کلام کو ایک کلی اصول کے تحت وحی اور ایک نبی کائنات کے ساتھ رابطہ اور وحی کی پیداوار سمجھتی ہے۔

لوگوں کے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عجیب و غریب تقاضوں کے پیش نظر تیسری آیت میں آنحضرتؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی حقیقت کو واضح کریں اور لوگوں سے صاف صاف کہہ دیں: میں نہ تو اس بات کا دعویٰ کرتا ہوں کہ فرشتہ ہوں اور نہ ہی مانوق البشر کوئی مخلوق، نہ تو خدا کا بیٹا ہوں اور نہ ہی اس کا شریک! میں تو صرف تمہارے جیسا ایک انسان ہوں، فرق صرف یہ ہے کہ مجھ پر وحی ہوتی ہے اور مادراء لطیفۃ کائنات سے میرا رابطہ ہے۔

اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسرے لوگوں سے اپنا طرہ امتیاز یہ بنایا ہے کہ وہ معرفت کے اس منبع تک دسترس رکھتے ہیں۔

چوتھی آیت میں اسلام کے چھ اہم احکام (قتل اولاد کی حرمت، زنا کی حرمت، قتل نفس کی حرمت، یتیموں کے مال کی لوٹ کھسوٹ سے پرہیز، ایفائے عہد کا وجوب اور کم فروشی کی حرمت) کو بیان کرنے کے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کر کے فرماتا ہے: یہ احکام ان حکمتوں میں سے ہیں جن کے بارے میں تیرے رب نے تیری طرف وحی کی ہے۔

اس آیت کے مطابق اصول عقائد نہیں بلکہ اسلام کے جزوی احکامات بھی وحی کے ذریعہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوتے تھے۔

پانچویں آیت میں یہودیوں کے اس ٹولے کے اعتراض کا جواب ہے جب ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ آنحضرتؐ پر نازل ہونے والا ملک وحی جناب حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں، اور وہ ان لوگوں کے دشمن ہیں تو آنحضرتؐ کو حکم ہوا کہ، آپ کہہ دیجئے کہ جو جبرائیل کا دشمن ہے درحقیقت وہ خدا کا دشمن ہے کیونکہ انہوں نے تو حکم خدا کے مطابق قرآن پاک کی یہ آیات اور اسلامی تعلیمات و حکام آپ کے قلب پر نازل کی ہیں۔

اس تعبیر سے واضح ہوتا ہے کہ جبرائیل علیہ السلام کبھی تو قرآنی آیات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب مبارک پر براہ راست نازل کرتے، جبکہ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ کبھی انسانی صورت میں مجسم ہو کر آنحضرتؐ کے سامنے آئے اور آپ تک خدا کا پیغام پہنچاتے۔<sup>[۱]</sup> چھٹی آیت اس حقیقت کو پوری وضاحت کیساتھ بیان کر رہی ہے کہ ہم نے اس قرآن کو آپؐ پر نازل کیا ہے جو تمام اشیاء کا بیان کرنے والا ہدایت، رحمت اور بشارت کا سرچشمہ ہے اسی لیے یہ تمام معارف وحی کے منبع سے ہیں۔

ظاہری بات ہے کہ ہر چیز سے مراد وہ تمام امور ہیں جن کا انسانی سعادت سے تعلق ہے جی ہاں! ان تمام امر کے اصل خواہ وہ معنوی

[۱] ”فخر رازی“ اس آیت کی تفسیر میں اس بات پر مصر ہیں کہ آیت کی توجیہ کی جائے اور کہا جائے ”جبرائیل علیہ السلام آنحضرتؐ کے قلب پر نازل ہوتے تھے اور آیات الہی کو ان کے سامنے بیان کرتے تھے، نہ کہ آپ کے قلب مبارک پر نازل کرتے تھے۔ لیکن چونکہ ان آیات کے حفظ کا مرکز آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قلب مبارک تھا اسی لیے ”فانہ نزلہ علی قلبک“ کے جملوں سے اسے بیان کیا گیا ہے۔“ (تفسیر کبیر فخر رازی، جلد ۳، ص ۱۹۶) لیکن چونکہ اس توجیہ کو ہم خلاف ظاہر نہیں جانتے لہذا اس کی تردید نہیں کرتے کیونکہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ممکن ہے کہ کبھی جبرائیل علیہ السلام کا رابطہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روحانی ہوتا اور کبھی جسمانی۔

مسائل سے متعلق ہوں، یا مساوی ہوں، یا دنیاوی اور مادی مسائل سے، قرآن مجید میں کلی قوانین کی صورت میں بیان ہوئے ہیں۔ ساتویں آیت بڑی صراحت کے ساتھ کہہ رہی ہے قرآن خدا کی جانب سے ایک روح ہے جو آپ پر نازل ہوئی ہے اور اس سے پہلے آپ نہ تو اس کتاب کے مضامین سے باخبر تھے اور نہ ہی اس کتاب کے مضامین پر ایمان سے۔ قرآن مجید کی روح اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ دلوں کی حیات، جانوں کی زندگی اور انسانی معاشروں کی حیات و زندگی ہے اور یہ وہ کلام ہے جسے بہت سے مفسرین نے قبول کیا ہے۔<sup>[۱]</sup> اور جو یہ قرآن نے کہا ہے کہ آپ اس سے پہلے آگاہ نہیں تھے، اس سے مراد آنحضرتؐ کی ان آیات کے مضامین سے عدم آگاہی بعثت سے پہلے ہے وگرنہ بہت سے تاریخی شواہد اور متعدد روایات بخوبی اس بات کی نشاندہی کر رہے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آغازِ عمر ہی سے معرفتِ الہی میں ثابت قدم تھے۔

بہر حال یہ آیت وحی کو معرفت کا ایک اہم منبع کی حیثیت سے تسلیم کر کے اس کی عظمت کو دوبالا کر رہی ہے، کیونکہ قرآن کو روح بھی کہا گیا ہے اور نور اور سرچشمہ ہدایت بھی۔

آٹھویں آیت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی معاملہ آگے بڑھ گیا ہے اور تمام انبیاء کی طرف ایک مختصر سے اشارے کے ساتھ فرماتا ہے وہ بھی ایسے مرد تھے جن کی طرف وحی بھی جاتی تھی اگر تم نہیں جانتے تو ان لوگوں سے جا کر پوچھتے جو اس سے باخبر ہیں، کیونکہ وہ سارے کے سارے معرفت کے اس منبع سے تعلق رکھتے تھے۔

نویں آیت انبیاء و مرسلین پر بیانات اور آسمانی کتب اور قوانین حق و عدالت کے نزول کی بات کر رہی ہے کہ ان کے ایک ہاتھ میں معجزات اور دوسرے ہاتھ میں کتاب اور قوانین ہوتے تھے تاکہ لوگ عدالت پر قائم رہ سکیں اور ظلم و بیداد کی بیخ کنی کی جاسکے جی ہاں! ان بزرگواروں نے یہ سب کچھ وحی کے منبع کے ذریعہ حاصل کیا۔

دسویں آیت ذکر کی تزیل اور اسے بھیجنے کے بارے میں ہے یعنی جو آیات بیداری کا سبب بنتی ہیں ان کی بات ہو رہی ہے اور ساتھ ہی اس بات کا وعدہ بھی کر رہی ہے کہ خداوند عالم نے ان آیات کی ہر طرح سے تحریف کمی، بیشی اور محو و نابودی سے حفاظت کا ذمہ لے لیا ہے۔ پس لوگوں کی ہر قسم کی آگاہی اور بیداری کا ذریعہ وحی ہے اور چونکہ خداوند عالم خود ہی اس کا محافظ ہے۔ لہذا اس کی اصلیت اپنی جگہ پر ثابت اور برقرار ہے۔

گیارہویں آیت میں فرماتا ہے، ہم نے تمہارے لیے آیات کو بیان کر دیا ہے، اگر تم عقل سے کام لو اور یہ چیز بذاتِ خود دلیل ہے کہ اس بات پر کہ آیاتِ الہی عقل کو بیدار کرتی ہیں اور افکار کو متحرک رکھتی ہیں۔

اور آخر میں بارہویں آیت حضرت موسیٰؑ سے خدا کی گفتگو کے بارے میں ہے، ایسی گفتگو جو اس عظیم الشان پیغمبر کے معارف کا سرچشمہ تھی اور گفتگو بھی ایسی جو ایک قسم کی وحی تھی۔

[۱] راغب، مفردات میں کہتے ہیں "سمس القرآن روحاً... لكون القرآن سبباً للحیوة الاخریة"۔

یہ چند ایک آیات قرآنی بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں جن میں بڑی وضاحت کے ساتھ اور بغیر کسی الہام کے وحی کو نہایت ہی عمدہ طریقہ سے شناخت و معرفت کا ایک منبع بتایا گیا ہے۔

اور یہ ایسی صورت میں ہے کہ مادی فلاسطفہ مطلقاً اس کے مخالف ہیں اور وحی کے بارے میں وہ مختلف تفسیریں بیان کرتے ہیں جنہیں ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔

اصل منبع کی وضاحت کے بعد اب ہم ایسے مسائل کو بیان کرتے ہیں جو وحی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔

## تفصیلات

### ۱۔ قرآن مجید میں وحی کی قسمیں

قرآنی آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ وحی کے مختلف معانی ہیں، کچھ تو وحی تکوینی ہوتی ہے اور کچھ وحی تشریحی۔ چنانچہ ان دونوں معانی کو پیش نظر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل سات قسمیں بنتی ہیں۔

۱۔ ”وحی تشریحی“: جو انبیاء پر نازل ہوتی ہے اور چند آیات بطور نمونہ اس بارے میں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

۲۔ وحی بمعنی: ایسے الہامات جو غیر انبیاء پر ہوتے ہیں جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے بارے میں آیا ہے کہ ”واوحینا الی امر موسیٰ ان ارضعہ“ یعنی ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی کی (الہام کیا) کہ اسے دودھ دے، اور جب اس کے بارے میں تجھے خوف ہو تو اسے دریا میں ڈال دے، اور نہ تو ڈرا اور نہ غمگین ہو، کیونکہ ہم اسے تیری طرف لوٹا دیں گے، اور اسے رسولوں میں قرار دیں گے۔

اس سے ملتی جلتی صورت حال بلکہ زیادہ مکمل طور پر، سورہ مریم میں حضرت مریم علیہا السلام کے بارے میں بیان ہوئی ہے کہ فرشتہ وحی ان کے سامنے آیا اور انہیں عیسیٰ کی ولادت کی خوشخبری دی۔ (سورہ مریم ۱۷ تا ۱۹)

۳۔ فرشتوں کی وحی: یعنی خود فرشتوں کو خدا کا پیغام، جیسا کہ سورہ انفال میں غزوہ بدر کی داستان میں مذکور ہے ”اذیوحی ربك الی الملائکة انی معکم فثبتوا الذین امنوا“ یعنی اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں کو وحی کی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، بس جو لوگ ایمان لائے ہیں انہیں ثابت قدم رکھو۔

۴۔ وحی بمعنی: اشارہ کے ساتھ پیغام جیسا کہ ذکر یا علیہ السلام کی داستان میں ذکر ہوا ہے ”فخرج علی قومہ من المحراب فاوحی الیہم ان سبحوا بكرة وعشیا“ یعنی وہ محراب عبادت سے نکل کر لوگوں کے پاس آئے اور انہیں اشارے کے ساتھ کہا کہ صبح وشام (خدا کی) تسبیح کیا کرو۔

۵۔ وحی بمعنی ”خفیہ شیطانی القاء“ جیسے ”و کذالك جعلنا لکل نبی عدوا شیاطین الانس والجن یوحی

بعضہم الی بعض زخرف القول غرورا۔ یعنی اسی طرح ہم نے ہر پیغمبر کے لیے انسانی اور جنی شیطانوں میں سے دشمن قرار دیئے ہیں

جو لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے مخفی طور پر فریب پر مبنی بے بنیاد باتیں ایک دوسرے کو بتاتے ہیں۔ (سورہ انعام ۱۱۲)

۶۔ وحی بمعنی ”تکوینی کائنات میں قوانین الہی کا تعین“ جیسے ”واوحی فی کل سماء امرھا“ یعنی خداوند عالم نے ہر ایک آسمان

میں تقدیر اور تدبیر کو لازم قرار دے دیا ہے۔ (فصلت ۱۲)

اور قیامت میں زمین کی شہادت کے بارے میں جو آیا ہے کہ ”یومئذ تحدث اخبارها یابان ربک اوحی لھا“ یعنی اس دن زمین اپنی خبریں بیان کرے گی کیونکہ تیرے رب نے اسے وحی کی ہے۔ (سورہ اذالزلزلت) بھی ممکن ہے کہ اسی چیز کی طرف اشارہ ہو۔

وحی بمعنی ”عزیزوں کی تخلیق“، جیسے ”واوحی ربک الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتا ومن الشجر و مما یعرشون“ یعنی تیرے پروردگار نے شہد کی مکھی کو طرف وحی کی (الہام عزیزی کیا) کہ پہاڑوں، درختوں اور ان چھجوں پر اپنا گھر بنا جو لوگ بناتے ہیں۔ (نحل ۶۸)

یہ سب کچھ تو رہا ایک طرف ادھر دوسری طرف انبیاء پر وحی کا نزول بھی مختلف صورتوں میں انجام پاتا رہا ہے کیونکہ قرآن مجید اور روایات میں کم از کم ان چار صورتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

۱۔ کبھی فرشتہ کے نزول اور اس کے مشاہدہ کی صورت میں۔

۲۔ کبھی فرشتہ کی آواز سننے اور خود اسے نہ دیکھنے کی صورت میں۔

۳۔ کبھی دل میں الہام کی صورت میں۔

۴۔ کبھی خواب اور رویائے صادقہ کی صورت میں جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی داستان میں ان کے فرزند کو ذبح کرنے کے بارے میں مذکور ہے۔ (صافات ۱۰۲) یا جیسے خود حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ہے کہ جب انہیں اس بات کی بشارت دی گئی تھی کہ وہ نہایت ہی امن و امان کے ساتھ خانہ خدا کی زیارت کے لیے مکہ میں داخل ہوں گے۔

ایک روایت میں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے ایک صحابی نے آپؐ کی خدمت میں عرض کی کہ، آپؐ پر وحی کیونکر نازل ہوتی ہے، تو آپؐ

نے ارشاد فرمایا

”احیاناً یأتینی مثل صلصلة الجرس، وهو اشدہ علی، فینصم عنی فقد

وعیت ما قال، و احیاناً یتمثل لی الملک رجلاً فیکلمنی فاعی ما یقول۔

یعنی کبھی تو مجھے گھنٹی کے بجنے کی آواز سنائی دیتی ہے اور یہ صورت حال مجھ پر سب سے زیادہ سخت ہوتی ہے، حقائق کو مجھ پر روشن کر دیتی ہے اور وہ جو کچھ کہتی ہے میں یاد کر لیتا ہوں۔ اور کبھی فرشتہ وحی مرد کی صورت میں میرے ساتھ سامنے آجاتا ہے اور مجھ سے باتیں کرتا ہے اور وہ جو کچھ کہتا ہے میں اُسے یاد کر لیتا ہوں۔ [۱]



ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

انبیاء اور رسولوں کے چار طبقے ہیں:

بعض وہ ہیں جن کے دل پر الہام ہوتا ہے اور وہ اپنے آپ سے آگے نہیں بڑھتے۔ بعض وہ ہیں جو فرشتہ کو خواب میں بھی دیکھتے ہیں اور بیداری میں بھی اس کی آواز کو سنتے ہیں، لیکن کسی کو نہیں دیکھتے ہیں، اور وہ کسی کی طرف مبعوث بھی نہیں ہوتے۔

بعض وہ ہیں جو خواب میں اسے دیکھتے ہیں، بیداری میں بھی اس کی آواز سنتے ہیں اور اسے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھتے ہیں، اور ایک مخصوص گروہ کی طرف مبعوث ہوتے ہیں، خواہ وہ کم ہو یا زیادہ۔

اور بعض وہ ہیں جو اسے خواب میں بھی دیکھتے ہیں، بیداری میں بھی اس کی صدا سنتے ہیں اور فرشتہ کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھتے ہیں اور وہ (دنیا بھر کے لوگوں کے) امام اور پیشوا ہوتے ہیں۔ [۱]

## ۲۔ وحی کی حقیقت کیا ہے؟

وحی کی حقیقت کے بارے میں بہت کچھ کہا اور سنا جا چکا ہے، لیکن واضح سی بات ہے کہ جس عالم تک ہماری رسائی نہیں ہے اور ہم اس سے مکمل طور پر ناواقف ہیں، وہاں تک رسائی حاصل کرنا ہمارے بس سے بالکل باہر ہے حتیٰ کہ اگر خود پیشنمبر گرامی کی ذات والا صفات بھی ہمارے لیے اس کی پوری پوری وضاحت کریں پھر بھی ہمارے لیے صرف ایک دھندلکے کی مانند ہوگا، کیونکہ وہ کائنات اور عالم ہی مرموز اور اسرار آمیز ہے۔

اس کی مثال ایسے ہے جیسے کئی آنکھوں والا شخص کسی،، مادرزاد نابینا،، کے سامنے سورج کی دلکش شعاعوں، سمندر کی لہروں، مور کے رنگارنگ پروں اور پھولوں اور کلیوں کے دلفریب مناظر کو ایک خوش و خرم اور سرسبز و شاداب باغ میں بیان کرے۔

ہوسکتا ہے کہ یہ الفاظ مبہم سے کچھ تصورات اس کے ذہن میں پیدا کریں لیکن وہ ان مسائل کی حقیقت کو ہرگز درک نہیں کر پائے گا۔ لیکن ہم وحی کو اس کے آثار، اہداف اور نتائج کے ذریعہ وضاحت کر سکتے ہیں اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ وحی وہی خدائی القاء ہے جو ثبوت کو حقیقت کا جامہ پہنانے اور بشارت اور ڈرانے کے لیے عمل میں آتا ہے یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک ایسا نور ہے جس کے ذریعہ خداوند عالم اپنے جن بندوں کو ہدایت کرنا چاہتا ہے۔ ہدایت کرتا ہے، یا اسی طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ عالم غیب کے ساتھ رابطے کا ایک ذریعہ اور اس عالم کے معارف کے ادراک کا ایک وسیلہ ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے صرف آثار وحی کی بات کی ہے حقیقت وحی کی نہیں۔



ہمیں اس معنی پر نہ تو استعجاب کرنا چاہیے اور نہ اس کی حقیقت کو درک نہ کر سکنے کو اس کے وجود کی نفی کی دلیل سمجھنا چاہیے اور نہ ہی اس کی مادی اور جسمانی توجیہات کرنی چاہیے۔ کیونکہ عالم نبوت تو ایک سہل سا امر ہے۔ اس مادی دنیا میں عالم حیوانات ہے جنہیں ہم اپنے سے پست مخلوق سمجھتے ہیں ان میں بھی کچھ ایسے احساسات اور ادراکات پائے جاتے ہیں جو ہمارے ادراک سے باہر ہیں۔

ہم سب جانتے ہیں کہ کچھ جانور ایسے ہیں جو زلزلہ کے وقوع پذیر ہونے سے کچھ عرصہ قبل اپنی مرموز اور مخفی حس کے ذریعہ اس سے مطلع ہو جاتے ہیں جبکہ ہم مکمل طور پر اس سے بے خبر ہوتے ہیں۔ ان میں بے چینی اور اضطراب پیدا ہو جاتا ہے، بلکہ بسا اوقات تو وہ مل کر شور مچانا شروع کر دیتے ہیں اور ایسی دلخراش آوازیں نکالنا شروع کر دیتے ہیں جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما ہونے والا ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ رسیوں اور زنجیروں سے اپنے آپ کو چھڑا کر بھاگ جاتے ہیں، جبکہ ہمارے نہایت ہی معیاری اور اعلیٰ ترین قسم کے زلزلہ پیما آلات اس طرح کا پتہ نہیں چلا سکتے۔

اسی طرح کچھ جانور ایسے ہیں جو موسمی حالات کا کئی ماہ پہلے پتہ چلا لیتے ہیں اور اپنے گھریا گھونسلے اسی کے مطابق بناتے ہیں اور اس مدت تک کے لیے ضروری غذا کٹھی کر لیتے ہیں مثلاً اگر آنے والا موسم سرما سخت اور زیادہ سرد درپیش ہو تو اس کے لئے ان کا در عمل کچھ اور ہوتا ہے اور اگر زیادہ سخت و سرد نہ ہو تو کچھ اور!! مہاجر پرندوں کی اجتماعی حرکت اور استوائی منطقہ سے قطبی منطقوں کی طرف یا قطبی منطقوں استوائی منطقہ کی طرف طولانی مسافت کا طے کرنا، حتیٰ کہ بعض اوقات رات کے وقت اور آلود فضاؤں میں ایسا سفر کرنا ان ہی کا کام ہے جبکہ کوئی انسان نہایت یہی اہم اور پیچیدہ آلات کے بغیر اس کا ایک فیصد حصہ بھی طے نہیں کر سکتا۔

چگاڈو کارات کی مکمل تاریکی میں پرواز کرنا، نہایت ہی پیچیدہ رکاوٹوں سے گزر کر رات کی مطلق تاریکی میں اپنے شکار کو تلاش کر لینا، بلکہ بعض اوقات تو پانی کی موجوں کے نیچے سے شکار کو پکڑنا، اور اس قسم کے کئی دوسرے حقائق ایسے ہیں جو ہم انسانوں کے لیے ناقابل اعتبار ہیں، لیکن علم اور سائنس نے اس کی تصدیق کی ہے اور ثابت کیا ہے۔

ان واقعات کا وجود کہ جس سے علم، تجربہ اور مشاہدے پر وہ اٹھایا ہے، اس بات کا غماز ہے کہ ان کے اندر مخفی درک اور شعور موجود ہے اور ہم اس سے بے بہرہ ہیں۔ البتہ حیوانات کے اسرار آریز جہاں تک ہماری رسائی ممکن نہیں۔ لیکن پھر بھی یہ ایک ایسی حقیقت اور واقعیت ہے جس سے انکار ناممکن ہے۔ [۱]

باوجودیکہ حیوانات کے حواس کا تعلق مادہ اور طبیعت سے ہے نہ کہ ماداء الطبیعیہ سے لیکن ہم ان کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ تو پھر ہم وحی کی اسرار آریز دنیا کو جس کا عالم وراء الطبیعیہ ہے و رک نہ کر سکنے کی وجہ سے اس کا کیونکر انکار کر سکتے ہیں؟

ہم نے جو کچھ ابھی بیان کیا ہے اس سے وحی کے مسئلہ کے اثبات پر استدلال مقصود نہیں تھا، بلکہ اس استبعاد کو دور کرنا مقصود تھا اور ان لوگوں کا جواب تھا جو اس کی حقیقت کے ادراک نہ کر سکنے کی وجہ سے اس کا انکار کر دیتے ہیں۔

[۱] کتاب ”حواس اسرار آریز حیوانات“ کی طرف رجوع فرمائیں

مسئلہ وحی کے اثبات کے لیے ہمارے لیے روشن راہیں موجود ہیں جن میں سے دو تین کو یہاں پر بیان کیا جاتا ہے:

۱۔ ایک طرف تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اپنے ساتھ کتابیں اور تعلیمات بھی لے آئے جو انسانی فکر و قدرت سے بالاتر ہیں۔ ایک انسان جس نے کسی سے درس نہ پڑھا ہو اور عصرِ جاہلیت میں نہایت ہی پسماندہ اور عقب افتادہ ماحول میں ظاہر ہوا ہو، اس کے لیے کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے ساتھ قرآن مجید جیسی عظیم کتاب لائے جو آج تک پوری دنیا کو چیلنج کر رہی ہے۔

۲۔ دوسری طرف یہ ہے کہ انبیاء کی طرف سے وحی کا دعویٰ ہمیشہ معجزات اور خارق العادہ امور کے ساتھ ہم آہنگ تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ایک ماوراء الطبیعتہ جہان سے رابطہ ہے۔

۳۔ ادھر تیسری طرف یہ ہے کہ توحیدی نقطہ نظر یہ بتاتا ہے کہ خداوند عالم نے ہمیں ارتقاء اور اپنی لامحدود اور بے حد و انتہا ذات کی طرف حرکت کرنے کے لیے تخلیق فرمایا ہے۔ اور یہ بات بھی مسلم ہے کہ پیچ و خم، نشیب و فراز اور خطرات و مشکلات سے گھرا ہوا یہ راستہ صرف اور صرف انسانی عقل کے پاؤں سے طے کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہے، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے ایسے حقائق ہیں جن کے ادراک کے لیے انسانی عقل عاجز اور ناتواں ہے اور پھر ساتھ ہی صاحبانِ فکر و دانش کے درمیان سخت اختلافات پائے جاتے ہیں اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اپنی عقل اور ان قوانین کے ذریعہ چلانا چاہتے ہیں جنہیں انہوں نے خود وضع کیا ہے۔

اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ خداوند عالم بنی نوع انسان کو تنہا نہیں چھوڑتا بلکہ عقل کی طاقت کے ساتھ ساتھ ان کی ایسے رہروں کے ذریعہ راہنمائی بھی کرتا ہے جن کا عالم غیب سے رابطہ اور تعلق ہے اور وہ بحرِ علومِ الہیہ سے سیراب ہوتے ہیں۔ وہ ان کے ذریعہ بنی نوع انسان کی امداد اور دستگیری کرتا اور انہیں منزلِ مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔

ہم ان تینوں قرآن سے عالمِ انسانیت اور عالمِ ماوراء الطبیعتہ کے درمیان رابطے کو بخوبی درک کر سکتے ہیں اور وحی سے حاصل ہونے والے امور پر ایمان لاسکتے ہیں، اگرچہ ہم اس کی ماہیت کو نہ بھی پہچانتے ہوں، بالفاظِ دیگر بہت سے دوسرے مواقع کی مانند اس موقع پر بھی ہمارا علم اجمال ہے نہ کہ تفصیلی!

### ۳۔ وحی کے بارے میں شرق و غرب کے فلاسفہ کیا کہتے ہیں؟

بہت سے فلاسفہ کی یہی کوشش رہی ہے کہ وہ وحی کی اسرار آرمیز دنیا تک رسائی حاصل کریں، خواہ وہ فلاسفہ قدیم ہوں یا جدید، مشرقی ہوں یا غربی! اور پھر وہ اس کوشش میں بھی تھے کہ وہ اپنے اپنے فلسفہ کی بنیاد پر اس کی تفسیر کریں۔ لیکن جب ان کی مباحث کے نتائج کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں اکثر لوگ بے راہروی کا شکار ہوتے ہیں اور اگر صحیح راستہ اختیار کیا بھی ہے تو صرف اس حد تک گویا اسرار آرمیز دنیا کے صرف ایک معمولی سے سایہ تک رسائی حاصل کی ہے۔

کسی دانشور کا کہنا ہے کہ:

سولھویں صدی عیسوی تک دوسری اقوام کی مانند فلاسفہ غرب بھی،، وحی،، پر ایمان رکھتے تھے، کیونکہ ان کی

کتا میں انبیاء کرام کی خبروں سے لبریز تھیں لیکن جونہی جدید (سائنس اور طبیعی) علوم نے پر پُرزے نکالنے شروع کیے اور تمام مسائل مادی محور کے گرد گھومنے لگے تو فلاسفہ غرب نے وحی کا مکمل طور پر انکار کر دیا، بلکہ بعض اوقات اسے، خرافات اور قصہ ہائے پارینہ، کے نام سے یاد کرنے لگے اور اس کے ساتھ ہی وہ خدا، روح اور ماوراء الطبیعیۃ کی دنیا کا انکار بھی کرنے لگے۔ حتیٰ کہ ان کی جسارت اور گستاخی اس حد تک پہنچ گئی کہ وہ وحی کو خیالات کو مجموعہ یا اعصابی بیماریوں کا دوسرا نام دینے پر تمل گئے۔

یہ سلسلہ انیسویں صدی کے وسط تک جاری رہا یہاں تک کہ سائنسی اور تجربی علوم کے ذریعہ ان کے لیے عالم ارواح دریافت ہوا اور ان کے نزدیک عالم ماوراء الطبیعیۃ کا مسئلہ تجربی مسائل کے زمرے میں شامل ہو گیا۔ چنانچہ اس بارے میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں کتابیں اور مقالے لکھے گئے۔<sup>[۱]</sup>

اس موقع پر ”مسئلہ وحی“ کو ایک نئی صورت ملی، اگرچہ اب بھی وہ اس حد تک نہیں پہنچ پائے جس حد تک وحی کی حقیقت کو ادیان الہی کے پیروکار، بالخصوص قرآن کی روشنی میں مسلمان تسلیم کرتے ہیں۔ پھر بھی اس بارے میں ایک نہایت ہی اہم قدم اٹھایا جا چکا ہے۔<sup>[۲]</sup>

جدید اور قدیم فلاسفہ کے درمیان وحی کے بارے میں مجموعی طور پر دو مختلف نظریے موجود ہیں اور ان میں سے کو بھی اس نظریے کے مطابق نہیں ہے جو قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ کچھ قدیم فلاسفہ کہتے ہیں،، وحی،، کا سرچشمہ وہی،، عقل فعال،، ہی ہے اور پھر وہ عقل فعال کو ہمارے وجود سے الگ ایک اور مستقل اور روحانی وجود تسلیم کرتے ہیں، جو تمام علوم و دانش کا منبع اور خزانہ ہے ان کا عقیدہ ہے کہ انبیاء کرام کا،، عقل فعال،، کے ساتھ نہایت ہی قریبی رابطہ ہوتا ہے اور وہ اسی سے الہام لیتے ہیں اور وحی کی حقیقت بھی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں، درحقیقت اس گروہ کے پاس اپنے اس دعوے کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ وحی،، عقل فعال،، سے رابطے کا نام ہے اس سے قطع نظر، ایک بات اور بھی ہے اور وہ یہ کہ،، عقل فعال،، علم و دانش کے عنوان سے ایک مستقل منبع کی حیثیت رکھتی ہو اس کے اثبات کے لیے آج تک کوئی دلیل پیش نہیں کی جاسکی، جیسا کہ فلسفی مباحث میں اس پر گفتگو کی جا چکی ہے۔

پس اس طرح سے مندرجہ بالا نظریہ ایک احتمالی نظریہ ہے اور دوسرے مفروضات پر مبنی ایک مفروضہ ہے۔ اور ان دونوں مفروضوں میں سے کوئی بھی مفروضہ پایہ ثبوت تک نہیں پہنچا۔ تو پھر ایسی کیا ضرورت ہے کہ اس قسم کی توجیہات کا سہارا لیں؟ بس اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ،، وحی عالم ماوراء الطبیعیۃ اور ذات کردگار کے ساتھ رابطے کا نام ہے لیکن کیسے؟ اور کس طرح سے؟ بات ہم پر واضح نہیں ہے، ہم صرف اس کے

[۱] دائرۃ المعارف، قرن ہفتم، جلد ۱۰، ص ۱۲

[۲] دائرۃ المعارف، قرن ہفتم، جلد ۱۰، ص ۱۲

آثار کو دیکھتے ہیں اور آثار دیکھ کر ہی ہم اس کے وجود کا پتہ لگاتے ہیں اور اس کی ماہیت کا پتہ لگائے بغیر اس سے آگاہ ہوتے ہیں اور اس دنیا میں اس قسم کے بہت سے حقائق ہیں۔

۲۔ دورِ حاضر کے کئی فلاسفہ کا یہ نظریہ ہے کہ،، وحی،، درحقیقت،، نا آگاہ و شعور،، کی تجلی یا اس جہان کے حقائق کے ساتھ مخفی کے رابطے کا نام ہے کبھی تو،، باطنی نبوغ،، کبھی ریاضت،، اور اس قسم کی دوسری کششوں کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔

جدید نفسیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ انسان دو طرح کی شخصیات کا حامل ہوتا ہے، ایک ظاہر اور آگاہ،، شخصیت جو کہ ادراک، تفکر اور معلومات پر مشتمل ہوتی ہے اور ان عام اور معمولی حواس سے پیدا ہوتی ہے۔ اور دوسری،، غیر مرئی اور نا آگاہ،، جسے کبھی،، مخفی وجدان،، یا،، باطنی ضمیر،، یا نا آگاہ شعور،، کے نام سے بھی تعبیر کرتے ہیں اور اسے بہت سے روحانی اور نفسیاتی مسائل کے حل کی کنجی سمجھتے ہیں۔

ان کے نظریہ کے مطابق انسان کی دوسری قسم کی شخصیت کے اثر و رسوخ کا دائرہ پہلی قسم کی شخصیت کے دائرہ سے کئی درجہ زیادہ وسیع ہے۔

ایک مشہور و معروف ماہر نفسیات اس بارے میں یوں لکھتا ہے:

ہم،، آگاہ شعور،، کو برف کے اس ٹکڑے سے تشبیہ دے سکتے ہیں جو پانی پر تیر رہا ہوتا ہے اور تقریباً اس کا  $1/2$  حصہ پانی سے باہر ہو، چنانچہ اس کا بیرونی حصہ وہی ہماری شخصیت کا ایک حصہ ہے، جس کے وجود سے ہم واقف اور باخبر ہیں جبکہ اس کے مقابلے میں نا آگاہ و شعور جو ہماری دینی معالیت کا ایک اور حصہ ہے کہ جس کے وجود ہے ہم خود بھی آگاہ نہیں ہیں، اور نہ ہی اس کا اختیار ہمارے اپنے ہاتھ میں ہے اور وہ انسانی شخصیت کے ایک عظیم حصے کو تشکیل دیتا ہے اور پانی تیرتے ہوئے برف کے بقیہ  $8/9$  حصے کی مانند ہے جو پانی کے اندر ہے اور جسے نہیں دیکھا جاسکتا۔<sup>[۱]</sup>

ہمیں اس سے غرض نہیں ہے کہ انسان کی دوسری شخصیت کو کس نے دریافت کیا ہے؟ فرائیڈ نے یا کسی اور نے؟ آیا اس بارے میں متقدمین کا کوئی قول ملتا ہے جس میں اس چیز کی طرف اشارہ ہو یا نہیں ملتا ہمیں اس سے بھی کوئی سروکار نہیں۔ ہمارے لیے جو چیز سب سے زیادہ اور غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے وہ یہ ہے کہ بہت سے ماہرین نفسیات نے،، نا آگاہ شعور،، کے دریافت کر لینے اور اس کے ذریعہ توجیہ کریں اور کہیں،، وحی درحقیقت انبیاء کرام کے شعور نا آگاہ کا نتیجہ ہے جو فکری جولانیوں کی وجہ سے ان سے ظاہر ہوتا ہے۔

اور پھر انبیاء کے فکری نبوغ اور اس کے ساتھ ہی مسلسل ریاضتوں اور افکار سے کام لینے نے اس کے لیے سونے پر سہاگے کا کام دیا ہے۔ اور مفروضہ کے مطابق،، وحی،، عالم ماوراء الطبیعیہ کے ساتھ خاص رابطے اور دیگر افراد انسانی کے فکری اور عقلی روابط کے منافی ہونے کا نام نہیں ہے، جو ہمارے وجود سے الگ ایک اور مستقل وجود بنام پیک وحی یا فرشتہ کے ذریعہ انجام پائے، خود انبیاء کرام کے مخفی ضمیر کی صدائے

[۱] کتاب ”خود شناسی“ ترجمہ ڈاکٹر سعدی، ص ۶ و ۷ (قدرے وضاحت کے ساتھ)۔

بازگشت یارِ عمل کا دوسرا نام ہے۔

چنانچہ یہ، نظریہ، بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں یہ، مفروضہ، بھی قدیم فلاسفہ کے مفروضہ کی مانند ہر قسم کی دلیل سے عاری ہے جو وحی کو، عقلی فعال، کے ساتھ متعلق سمجھتے تھے۔

جن لوگوں نے وحی کی ان الفاظ میں تفسیر کی ہے شاید ان کا یہ ارادہ نہ ہو کہ وہ اسے ایک ثابت شدہ حقیقت کے عنوان سے تسلیم کریں بس وہ اس قدر کہنا چاہتے ہیں کہ، وحی، کے آثار جدید علوم سے سازگار ہیں اور انہیں انبیاء کے، نا آگاہ شعور، کی تجلی سے تفسیر کیا جاسکتا ہے۔ اس سے زیادہ واضح الفاظ میں کہیں کہ:

بہت سے دانشوروں کا اس بات پر اصرار ہے کہ وہ کائنات کی ہر چیز کی سائنسی اصولوں سے مطابقت دیں یہی وجہ ہے کہ وہ جب بھی کسی نئی چیز کا سامنا کرتے ہیں ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اسے انہی اصولوں پر رکھیں اور اگر انہیں اپنے مقصد کے اثبات کے لیے کوئی دلیل نہ ملے تو اپنے مفروضوں کے بیان پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں۔

لیکن ہمارا اشکال یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز کے ساتھ اس طرح سلوک کرنا مناسب نہیں ہے کیونکہ اس طرح سے تو یہ سمجھا جائے گا کہ ہم کائنات پر حکم فرما تمام بنیادی اصولوں کو پہچان چکے ہیں۔ لہذا اب کوئی بھی موضوع ایسا نہیں ہے جو ہمارے پہچانے ہوئے اصولوں سے باہر ہو

لیکن یہ ایک عظیم دعویٰ ہے کہ نہ صرف اس کے ثبوت کے لیے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں بلکہ اس کے برعکس اس کی مخالفت پر ہمارے پاس کئی دلائل ہیں، کیونکہ ہم سب جانتے ہیں اور ہمارے مشاہدے میں یہ بات آچکی ہے کہ زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کائنات کے نظام کے لیے نئے اصول دریافت ہوتے رہتے ہیں اور موجود قرائن سے پتہ ہے کہ جو کچھ ہم اس دنیا کے بارے میں جانتے ہیں یعنی اس کائنات کے بارے میں ہماری علم اس سے لاعلمی کے مقابلے میں وہ حیثیت رکھتا ہے جو ایک قطرے کی سمندر کے سامنے ہوتی ہے۔ ہماری حالت تو یہ ہے کہ ہم حیوانات کے اسرار آمیز حواس کی مکاحقہ، معرفت سے عاجز ہیں اور اس سے بالاتر خود اپنی ذات کے اسرار کی معرفت سے ناتواں اور عاجز ہیں، البتہ ہم صرف اتنا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ان اسرار میں سے صرف چند ایک ہی کو پہچان سکے ہیں۔

جب صورت حال یہ ہو تو پھر ہمیں کیا ضرورت ہے کہ اس بات پر اصرار کریں کہ ہم کائنات کی ہر چیز کو اپنے معلوماتی اصولوں کے مطابق ہی تسلیم اور اس کی تفسیر کریں پس ہمیں یہی کہنا چاہیے کہ وحی ایک واقعی حقیقت ہے جس کے آثار ہم دیکھتے ہیں لیکن اس کے اسرار سے بے خبر ہیں۔

## ۴۔ وحی کے غریزی ہونے کا مفروضہ

بعض مسلم مفکرین نے وحی کے بارے میں یورپی دانشوروں کے افکار سے مرعوب ہو کر ایک اور مفروضے کا اظہار کیا ہے جو اصولی طور پر بھی ان کے ساتھ یکساں ہے، ہر چند کہ ظاہری طور پر ان سے مختلف ہے۔

یہ مفروضہ مندرجہ ذیل اصولوں پر استوار ہے:

۱۔ لغت میں ”وحی“ کا معنی ”آہستہ اور سرگوشی کی صورت میں بات کرنا“ ہے اور قرآن مجید میں اس کا وسیع مہوم ہے جو مخفی ہدایتوں کی مختلف انواع کو بھی شامل ہے وحی کے ذریعہ جمادات نباتات اور حیوانات کی ہدایت سے لے کر انسانوں کی ہدایت سب اس میں آجاتی ہیں۔

۲۔ عزیزہ کی ایک قسم ہے اور ہدایت وحی، ہدایت عزیزہ کی سوا اور کچھ نہیں۔

۳۔ اجتماعی نقطہ نظر سے وحی، انسان کی ہدایت ہوتی ہے۔ یعنی انسانی معاشرہ اس لہذا سے کہ وہ ایک اکائی ہے جس کی اپنی ایک راہ، کچھ قوانین اور حرکت و تحرک ہے، لہذا اسے ہدایت کی ضرورت ہے اور ”نبی“ اس وحی کے حصول کا ایک ذریعہ ہے جو اپنے عزیزہ کے طور پر وہ سب کچھ حاصل کرتا ہے جو بنی نوع انسان کے لیے ضروری ہے۔

۴۔ تمام جاندار چیزیں ابتدائی مراحل میں عزیزہ کے ذریعہ ہی ہدایت کی جاتی ہیں اور وہ ارتقاء کے درجات میں جوں جوں آگے بڑھتی جاتی ہیں اور ان کے حسن تخیل اور افکار کی طاقت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اسی قدر ان کی قدرت عزیزہ میں کمی واقع ہوتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حشرات میں نہایت ہی طاقتور غرائز پائے جاتے ہیں جبکہ انسانوں میں ان کی نسبت بہت ہی کم۔

۵۔ اجتماعی نقطہ نظر سے انسانی معاشرہ تسلسل کے ساتھ ایک ارتقائی راستے پر گامزن ہے جیسا کہ حیوانات ابتدائی مراحل میں عزیزہ کے محتاج ہوتے ہیں اور جوں جوں حسن تخیل، حتیٰ کہ تفکر کی طاقت ان میں ترقی کرتی جاتی ہے اسی قدر حسّی اور فکری ہدایت، عزیزہ کی ہدایت کی جانشین ہوتی جاتی ہے۔ اسی طرح انسانی معاشرہ بھی ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے بالترتیب ایسی جگہ پر پہنچ چکا ہے کہ جہاں پر عقل کی طاقت ترقی کر چکی ہے۔ اسی لیے وہ عزیزہ (وحی) کی کمزوری کا سبب بن چکی ہے۔

۶۔ انسانی کائنات کے دو بنیادی دور اپنے ہیں۔ ۱۔ ہدایت وحی کا دورانیہ۔ ۲۔ طبیعت تاریخ میں تفکر اور تدبیر کا دورانیہ۔

۷۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو خاتم النبیین کا تعلق قدیم دنیا سے بھی ہے اور جدید دنیا سے بھی اپنے منبع الہام یعنی وحی کے لحاظ سے نہ کہ طبیعت اور تاریخ کے تجرباتی مطالعہ کی رو سے ان کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے، اور اپنی تعلیمات کی روح کے لحاظ سے کہ جس میں طبیعت اور تاریخ کے بارے میں تدبیر، تفکر اور مطالعہ کی دعوت دی گئی ہے، جب یہ امور پیدا ہو جاتے ہیں تو وحی کا سلسلہ رک جاتا ہے، ان تمام باتوں کا تعلق نئی اور جدید دنیا سے ہے۔ [۱]

اس مفروضے کا نچوڑ یہ ہے کہ وحی ناخود آگاہانہ معرفت کی ایک قسم ہے جیسے غرائز ہیں جو کہ خود آگاہانہ معرفت سے کم درجہ پر ہے جو کہ حسن، تجربہ، اور عقل کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، اور فکر و عقل کے ارتقاء کے ساتھ ہی وحی کا مجموعی ڈھانچہ کمزور ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ عقل

[۱] شہید مطہری کی کتاب ”مقدمہ بر جہان بینی اسلامی“، (مرحوم شہید مطہری نے مندرجہ بالا اسات امور کو جس میں وحی کے سلسلہ میں علامہ انقلاب لاہوری کے نظریات کو بیان کیا گیا ہے، ان کی کتاب ”اسلام میں فکر دینی کا احیاء“ سے خلاصہ کر کے پیش کیا ہے اور پھر اس پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی ہے)۔



لے لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نبوت کا خاتمہ ہو چکا ہے، اور ختم نبوت کا نظریہ یہیں سے پیدا ہوتا ہے۔

یہ مفروضہ اگرچہ ایک اسلامی دانشور کی طرف سے ظاہر ہوا ہے لیکن کئی جہالت سے مغربی دانشوروں اور اہل قلم کے مفروضات سے کئی درجے پست اور کمزور ہے، جو وہ وحی کے بارے میں قائم کیے ہوئے ہیں ہر چند کہ دلیل کے فقدان کے لحاظ سے ان کے اب تک مفروضات سے قطعاً مختلف نہیں ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا وحی کے بارے میں اب تک پیش ہونے والے نظریات میں سے بدترین نظریہ ہے۔ کیونکہ: اولاً: مغربی مفکرین وحی کو انسان کے حسی اور عقلی ادراک سے ما فوق سمجھتے ہیں جبکہ اس مفروضہ کے تحت وحی کا درجہ حس اور عقل سے کمتر ہے۔ اور یہ واقعاً عجیب سوچ ہے!!!

ثانیاً: ایک مسلمان جو قرآن سے آشنا ہے، اس کے لیے یہ بہت اچھی طرح واضح ہے کہ قرآنی نقطہ نظر سے ”وحی“ خدا کے علم کے ساتھ ایک طرح کا رابطہ اور تعلق ہے۔ وہ عظیم ترین معارف جنہیں انسان عقل کے ذریعہ ہرگز حاصل نہیں کر سکتا وہ وحی کے بیکراں سمندر سے حاصل ہوتے ہیں۔

قرآنی نقطہ نظر سے ”وحی“ مکمل طور پر خود آگاہ ہدایت کا نام ہے جو ”ہدایت عقلی“ سے کئی درجے بالاتر ہے اور جیسا کہ ہم اس سے پہلے تشبیہ کے طور پر بیان کر چکے ہیں کہ اگر ہم عقل کو ایک طاقتور چراغ سمجھیں تو وحی کا درجہ آفتاب عالمیت کا ہوگا۔

قرآن مجید نے ایک طرف تو انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ”وما اوتیتہم من العلم الا قليلاً“ یعنی تمہارے پاس علم و دانش کا ایک تھوڑا سا حصہ ہے۔ (بنی اسرائیل ۸۵)

اور دوسری طرف علم الہی کی وسعت کون الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

”اگر تمام سمندر سیاہی بن جائیں اور تمام درخت قلم، پھر بھی اس کے لامتناہی علم کو ہرگز نہیں لکھ پائیں گے۔“

(لقمان ۲۷)

اور نبوت کی وحی کا اسی لامتناہی علم کے ساتھ ہی تعلق ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے کھلم کھلا لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معلم خود خدا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

**أَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۗ**

یعنی خداوند عالم نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی اور جو چیز آپ نہیں جانتے تھے اس کی آپ کو تعلیم دی۔

(نساء ۱۱۳)

انسانی علم و دانش جس قدر بھی ترقی کر جائے پھر بھی اس کے بس سے باہر ہے کہ انسان کو وحی کی ہدایت کے بغیر سعادت و خوش بختی کے پُر پیچ راستوں سے باخبر کرے چنانچہ بہت سے فلاسفہ کا عجیب و غریب انحراف کا شکار ہو جانا ہمارے اس دعویٰ کی بین دلیل ہے۔

بہت سے لوگ اسلامی مفکر کے عنوان سے مشہور ہو چکے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اسلامی مفکر کی نسبت ”مغربی مفکر“ زیادہ ہیں اور ان کے نظریات میں ”مغربی مفکرین“ کا رنگ غالب ہے۔ اسی وجہ سے وہ مافوق الطبیعتہ حقائق کے لیے طبعی توجیہات کرتے ہیں۔ اگر یورپی مفکرین کا اسی معنی پر اصرار ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ عالم مارواہ الطبیعتہ کے منکر ہیں۔ لیکن کسی مسلمان کو اسلامی نظریہ کا حامل ہونے اور وسیع ترین ماوراء الطبیعتہ کائنات پر ایمان رکھنے کے باوجود ان لوگوں کا پیروکار نہیں ہونا چاہیے کہ اس قسم کے تمام مسائل کے لیے سائنسی اور طبعی توجیہات پیش کرتا رہے۔

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ دورِ حاضر میں جو لوگ مسلمان گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن یورپ میں تعلیم حاصل کی ہے اور ان کی اسلامی معلومات مغربی معلومات کی نسبت کمزور ہیں، ان کی تحریر میں مغربی مفکرین کی اتباع پائی جاتی ہے۔

## ۵۔ پیغمبر کو کیسے یقین ہوتا ہے کہ وحی خدا کی طرف سے ہے؟

وحی کے بارے میں ہونے والے سوالات میں سے ایک یہی سوال ہے کہ جب پہلی مرتبہ کسی پیغمبر پر وحی نازل ہوتی ہے تو اسے کیونکر یقین آجاتا ہے کہ ”یہ خدا کی طرف سے وحی ہے نہ کہ شیطان القاء؟ اس علم اور یقین کا منبع اور مرکز کہاں ہے؟

اس سوال کا جواب بالکل واضح ہے کیونکہ اس بات سے قطع نظر کرتے ہوئے کے مطالب اور موضوعات کے لحاظ سے رحمانی پیغامات اور شیطانی القانات کا زمین و آسمان جتنا فرق ہوتا ہے، اور ہر ایک کے مطالب سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ اسے کہاں سے بھیجا جا رہا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی پیغمبر عالم وراء الطبیعتہ یا وحی کے قاصد کے ساتھ رابطہ پیدا کرتا ہے تو وہ اندرونی مشاہدہ کے ذریعہ اس حقیقت کو واضح طور پر دریافت کر لیتا ہے کہ اس کا خدا کے ساتھ رابطہ قائم ہو چکا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے ہم سورج کی ٹکیہ کو دیکھ رہے ہوں اگر اس موقع پر کوئی یہ کہے کہ تمہیں کیسے معلوم ہے کہ اس وقت عالم بیداری میں تم سورج کی ٹکیہ کو دیکھ رہے ہو؟ شاید یہ سب کچھ خواب میں دیکھ رہے ہو؟ تو صاف سی بات ہے کہ ہم اس کی اس قسم کی باتوں کو ہرگز لائق اعتناء نہیں سمجھیں گے، کیونکہ جو چیز ہم محسوس کر رہے ہیں وہ قطعی اور ناقابل تردید ہے۔

آیہ ”فلما اتاھا نودی یا موسیٰ انی انار بک“ (سورہ طہ ۱۱، ۱۲) کی تفسیر میں علامہ سید محمد حسین طباطبائی مرحوم کے بقول:

”جب خدا کا کو پیغمبر اور رسول پہلی بار وحی اور رسالت کا سامنا کرتا ہے تو اس کے لیے کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ وحی کے بھیجنے والا خداوند سبحان ہی ہے۔ اور اسے اس بارے میں تحقیق، استدلال اور حجت قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور اگر ضرورت محسوس ہو تو وہ غیبی اور بلا واسطہ وحی نہیں ہوگی بلکہ برہان عقلی سے استدلال اور استفادہ کی ایک قسم ہوگی“۔ [۱]

یہیں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ بعض روایات جعلی ہیں جو یہ کہتی ہیں کہ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سب سے



پہلی وحی نازل ہوئی اور آپؐ کو حرا سے حضرت خدیجہؓ کے گھر تشریف لائے اور جو کچھ دیکھا تھا وہ حضرت خدیجہؓ سے بیان کر دیا، پھر فرمایا ”مجھے اپنا خوف ہے“ (یعنی میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ یہ خدا کی وحی نہ ہو!!) جناب خدیجہؓ نے انہیں تسلی دی اور اپنے چچا زاد بھائی ”ورقہ بن نوفل“ کے پاس جا کر تمام ماجرا بیان کیا۔

ورقہ وہ شخص ہے جس نے زمانہ جاہلیت میں دین مسیحی اختیار کیا ہوا تھا، ایک پڑھا لکھا اور عربی و عبری (عبرانی) زبانوں سے واقف تھا۔ اس نے آنحضرتؐ سے تمام ماجرا بیان کرنے کی درخواست کی تو آپؐ نے سب کچھ اس کے سامنے بیان فرما دیا، یہ سن کر اس نے کہا: ”یہی تو وہ ناموس (فرشتہ وحی) ہے جو موسیٰؑ پر نازل ہوتا تھا۔“

پھر کہا ”کاش کہ میں اس وقت تک زندہ رہتا جس وقت آپؐ کی قوم آپؐ کو اس شہر سے نکالے گی، اور میں آپؐ کی مدد کرتا۔“<sup>[۱]</sup> اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی روایات کا شمار جعلی روایات میں ہوتا ہے۔ کیونکہ جو پیغمبر واضح طور پر عالم غیب سے تعلق پیدا کر لیتا ہے اسے کیا ضرورت ہوتی ہے کہ وہ ورقہ بن نوفل جیسے عیسائی کا ہنوں کی پیش گوئیوں اور غیب کی خبروں کا محتاج ہو، اور اس طرح کی وحی پر کیونکر اعتماد کیا جاسکتا ہے؟

جب جناب موسیٰؑ علیہ السلام پر سب سے پہلی وحی وادی طور پر نازل ہوئی تو انہوں نے اس بارے میں شک و شبہ کا اظہار کیوں نہ کیا جب کہ انہوں نے تو صرف آواز ہی سنی تھی اور فرشتہ کو نہیں دیکھا تھا؟ آیا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ دشمن کے مخفی ہاتھوں نے وحی اور نبوت اسلامی کی بنیادیں کمزور کرنے کے لیے اس قسم کی خرافات کو جعل کر کے اسلامی کتب میں درج کرا دیا ہے!!

## ۶۔ اسلامی روایات میں قرآن مجید معرفت کا اہم ترین منبع ہے

ہم اس بحث کو اس اشارے کے ساتھ مزید آگے بڑھاتے ہیں کہ وحی کے عظیم ترین مصداق یعنی قرآن مجید کی عظیم پیشواؤں کے کلام میں کس قدر اہمیت ہے اور وہ کس حد تک جامع اور مستغنی ہے تاکہ ایک تو اصل مسئلہ کی تاکید ہو جائے اور معرفت کے اس عظیم منبع کی اپنی ذاتی حیثیت کا بھی پتہ چل جائے۔ دوسرے ان ”کج اندیش دانشوروں“ کا جواب بھی ہو جائے جو وحی کو ”حیوانات کے غرائز“ میں شمار کرتے اور عقلی ادراکات سے کم درجے میں شمار کرتے ہیں اور اس بات کے معتقد ہیں کہ انسانی عقول کی پیش رفت سے نہ تو وحی کی ضرورت رہتی ہے اور نہ ہی ان معارف کی وحی جن کا سرچشمہ ہے، تا معلوم ہو جائے۔

صلاح	کارو	من	خراب	کجا
بہین	تفاوت	رہ	از کجاست	تایکجا؟

[۱] اس موضوع کو ابلسنت کے بہت سے محدثین اور مفسرین نے ذکر کیا ہے۔ مغلہ صحیح بخاری، صحیح مسلم، تفسیر فی ظلال القرآن (سورہ علق کے آغاز میں) اور دائرۃ المعارف، قرن ہجری (مادہ وحی) جیسی کتابوں کی طرف رجوع فرمائیں۔

۱۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

«إذا التبت عليكم الامور كقطع الليل المظلم فعليكم بالقرآن..... من جعله امامه قاده الى الجنة، ومن جعله خلفه ساقه الى النار، وهو اوضح دليل الى خير سبيل، من قال به صدق، ومن عمل به اجر، ومن حكم به عدل.»

”جب تم پر رات کے تاریک ٹکڑوں کی مانند اور مشتتبہ ہونے لگ جائیں تو تمہیں چاہیے کہ قرآن کے دامن سے متمسک ہو جاؤ..... جو شخص قرآن کو اپنے آگے قرار دے قرآن اسے بہشت تک لیجائے گا، جو اسے پس پشت ڈال دے گا وہ اسے جہنم کی طرف پہنچا دے گا۔ قرآن بہترین راہوں کی طرف بہترین رہنما ہے، جو اس کے مطابق بات کرے گا وہ سچا ہوگا، جو اس پر عمل کرے گا اسے اجر ملے گا اور جو اس کے مطابق فیصلے کرے گا وہ عادل ہوگا۔“ [۱]

۲۔ حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالبؓ نبی البلاغہ کے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں:

«ثم انزل عليه الكتاب نورا لا تطفأ مصابيحہ، وسراجا لا يخبو توقده،  
وبجرا لا يدرك قعره، ومنها جا لا يضل نهجه، وشعاعا لا يظلم ضوئه،  
وفرقانا لا يخمد برهانه، وتبياناً لا تهدم اركانہ، وشفاء الا تخشى  
اسقامه، وعز الا تهزم انصاره، وحقلاً تخذل اعوانه»  
«فهو معدن الايمان وبحر حته، وينابيع العلم وبحوره، ورياض العدل  
وغدرانه، واثافي الاسلام وبنيانہ»

یعنی پھر خداوند عالم نے آپؐ پر ایک کتاب نازل فرمائی وہ ایک ایسا نور ہے جو بجھنے میں نہیں آتا، ایسا چراغ ہے جس کے فروغ کو زوال نہیں، ایسا سمندر ہے جس کی گہرائیوں تک رسائی نہیں، ایسا راستہ ہے جس میں گمراہی

[۱] اس حدیث کو مرحوم علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار میں درج کیا ہے جسے ابوسعید خدری نے آنحضرتؐ کے ایک خطبہ کے ضمن میں نقل کیا ہے۔

نہیں، ایسی روشنی ہے جس میں تاریکی نہیں، حق اور باطل کو اس طرح جدا کرتا ہے کہ جس کی دلیل کی روشنی کبھی نہیں بجھتی، ایسی بنیاد ہے جس کے ستون مہندم نہیں ہوتے، ایسی شفا ہے کہ جس کے ہوتے ہوئے بیماریوں سے خوف نہیں کھایا جاسکتا، ایسی قدرت ہے جس کے معاونین کو شکست نہیں ہوتی، ایسا حق ہے جس کے مددگاروں کو کبھی تنہائی نصیب نہیں ہوتی۔

قرآن ایمان کا مرکز و معدن ہے، علم کا چشمہ اور سمندر ہے، عدل و انصاف کا منبع اور سرچشمہ ہے، نیز اسلام کی بنیاد اور اساس ہے۔<sup>[۱]</sup>

۳۔ حضرت امام علی رضا علیہ السلام فرماتے ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے کسی نے پوچھا:

”ما بال القرآن لا یزداد علی النثر والدرس الا عصابة“

یعنی کیا وجہ ہے کہ قرآن مجید نشر و شاعت اور مطالعہ کی وسعت کے ساتھ طراوت ہی پیدا کرتا ہے؟ تو امام عالی مقام نے ارشاد فرمایا:

”لان الله تبارک و تعالیٰ لم یجعلہ لزمان دون زمان، ولا للناس دون

ناس، فهو فی کل زمان جدید و عند کل قوم عض الی یوم القیامة“

کیونکہ خداوند عالم نے اسے کسی مقرر اور معین زمانے کے لیے قرار نہیں دیا اور نہ ہی کسی خاص قوم کے لیے قرار دیا ہے۔ لہذا وہ ہر زمانے میں تروتازہ اور تازہ روز قیامت ہر قوم کے لیے سرسبز و شاداب ہے۔<sup>[۲]</sup>

اس سلسلے کی بہت سی روایات موجود ہیں، شیعہ منابع میں بھی اور سنی منابع میں بھی۔ ہم نے صرف نمونے کے طور پر مندرجہ بالا تین حدیثیں پیش کی ہیں، ایک حدیث پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے، ایک حدیث حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام سے اور ایک حدیث حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے۔

۷۔ غیر انبیاء کی وحی (یا وحی الہامی)

جیسا کہ ہم نے بحث کے آغاز میں کہا تھا ”وحی“ کے وسیع معنی ہیں جن میں سے ایک معنی کا تعلق، وحی نبوت و رسالت سے ہے جبکہ اس کی ایک اور قسم ہے جو غیر انبیاء کے دل پر اترتی ہے، یا وہ پیغام ہے جو بعض فرشتوں کے ذریعہ غیر انبیاء تک پہنچایا جاتا ہے۔

[۱] نہج البلاغہ، خطبہ نمبر ۱۹۸

[۲] بحار الانوار، جلد ۸۹، ص ۱۵

اس کا پہلا نمونہ تو وہی ہے جو قرآن مجید نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے بارے میں کہا ہے:

”وَ اَوْحَيْنَا اِلَىٰ اِمْرَاةِ مَرْيَمَ اِذَا خَفَتْ عَلَيْهِ غُلَابُهَا وَ اَوْحَيْنَا اِلَىٰ مَرْيَمَ اِذَا خَفَتْ عَلَيْهِ غُلَابُهَا وَ اَوْحَيْنَا اِلَىٰ مَرْيَمَ اِذَا خَفَتْ عَلَيْهِ غُلَابُهَا وَ اَوْحَيْنَا اِلَىٰ مَرْيَمَ اِذَا خَفَتْ عَلَيْهِ غُلَابُهَا“

”وَ اَوْحَيْنَا اِلَىٰ مَرْيَمَ اِذَا خَفَتْ عَلَيْهِ غُلَابُهَا“

یعنی ہم نے مادرِ موسیٰ کے دل میں الہام کیا کہ تو (اپنے نومولود کو) دودھ پلا اور جب تو اس کے بارے میں (دشمنوں سے) ڈرے تو اسے دریاے (نیل) میں ڈال دے اور نہ تو ڈر اور نہ ہی غمگین ہو۔ (قصص ۷)

اس قسم کی گفتگو حضرت عیسیٰ کے حواریوں کے بارے میں بھی ہوئی ہے۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے:

”وَ اَوْحَيْنَا اِلَىٰ الْحَوَارِيِّينَ اَنْ اٰمِنُوْا بِنَبِيِّ وَاَوْحَيْنَا اِلَىٰ مَرْيَمَ اِذَا خَفَتْ عَلَيْهِ غُلَابُهَا“

”مُسْلِمُوْنَ“

یعنی اس وقت کو یاد کرو جب میں نے حواریوں کی طرف وحی بھیجی کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لے آؤ، تو انہوں نے کہا ہم ایمان لے آئے اور تو گواہ رہ کہ ہم مسلمان ہیں۔ (مانندہ ۱۱۱)

نیز حضرت یوسف علیہ السلام پر بھی مقامِ نبوت پر پہنچنے، سے قبل وحی ہوئی تھی۔ جب ان کے بھائیوں نے طے کر لیا کہ انہیں کنوئیں میں ڈالیں، تو اسی موقع کی مناسبت سے قرآن کہتا ہے:

”وَ اَوْحَيْنَا اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِ رَءِيسِهِمْ هٰذَا وَ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ“

ہم نے اس وقت یوسف کی طرف وحی بھیجی کہ مستقبل میں (جب تم اقتدار حاصل کر لو گے) انہیں ان کی ان کارستانیوں سے باخبر کرو گے، جبکہ وہ تمہیں نہیں پہچانتے ہوں گے۔ (یوسف ۱۵)

اسی سورت کی بائیسویں آیت کے بموجب یہ وحی ”وحی نبوت“ نہیں تھی، بلکہ خدا کی طرف سے یوسفؑ کے دل میں ایک الہام تھا تا کہ اسے معلوم ہو جائے کہ وہ اکیلے نہیں ہیں بلکہ خدا ان کا محافظ ہے اور وہی نہیں اقتدار عطا فرمائے گا اور ان کے بھائی اپنی ان کارستانیوں پر پشیمان ہوں گے۔ اور یہی چیز ان دردناک لمحات میں وحی تھی جس نے یوسفؑ کے دل میں امید کی کرن کا کام کیا۔

فخر رازی نے سورہ طحہ کی ۸۳ ویں آیت کے ذیل میں مادرِ موسیٰ پر وحی کے بارے میں گفتگو کے ضمن میں چھ احتمال پیش کیے ہیں جن میں سے بیشتر خلافِ ظاہر ہیں، کیونکہ اس کا ظاہری معنی تو ”قلب میں القا“ ہے یا ”فرشتے کی آواز کا سننا، ہے جو اس کے لغوی معنی سے بھی ہم آہنگ ہے۔ [۱]

اور دوسری قسم وہ پیغام ہے جو خدا کے کسی فرشتے کے ذریعہ جناب مریمؑ تک ان کے بیٹے (حضرت مسیحؑ) کی ولادت کے بارے میں

[۱] مزید تفصیل کے لیے تفسیر کبیر کی بائیسویں جلد کے صفحہ ۵۱ کا مطالعہ فرمائیں۔

بھیجا گیا، اور قرآن مجید نے سورہ مریم کے اوائل میں جناب مریم کی اس فرشتے کے ساتھ تفصیلی گفتگو کا تذکرہ کیا ہے جو ایک خوبصورت انسان کی شکل میں ان کے سامنے مجسم ہو کر آ گیا تھا۔

اس قسم کی وحی کا روشن نمونہ وہ الہام ہے جو آئمہ معصومین علیہم السلام کے مقدس دلوں میں ہوتا ہے اور روایات میں اس سلسلے میں کئی مرتبہ ذکر کیا گیا ہے۔

جب امام جعفر صادق علیہ السلام سے آئمہ اطہار علیہم السلام کے منبع علم کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا:

”مبلغ علمنا ثلاثة وجوه، ماض، وغابر وحادث، فاما الماضی فمفسر،

واما الغابر فمذبور واما الحارث فقدف في القلوب، ونقر في الاسماع،

وهو افضل علمنا ولا نبی بعد نبینا“

یعنی ہماری علمی حدود (اور اس کا منبع) تین قسموں پر ہے، گزشتہ، آئندہ اور حادث۔

جو گزشتہ ہے وہ وہ ہے جس کی (ہمارے لیے گزشتہ آئمہ اور حضرت رسول اکرم کی طرف سے) تفسیر

کی گئی ہے جو آئندہ ہے وہ لکھا جا چکا ہے (اور وہ ایسی تعلیمات ہیں جو گزشتہ معصومین کی طرف سے ہمارے لیے

یادگار کے طور پر موجود ہیں) اور جو حادث ہے وہ وہ ہے جو ہمارے دلوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ (اور الہام ہوتا

ہے) اور آہستہ سی آواز ہے جو ہمارے کانوں میں جا پہنچتی ہے۔ اور یہ قسم ہمارے علوم کی اعلیٰ ترین قسم ہے۔

البتہ ہمارے پیغمبر (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد کوئی اور پیغمبر کبھی نہیں آئے گا۔ [۱]

ایک اور حدیث میں امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں:

”واما النکت في القلوب فهو الالهام، واما النقر في الاسماع فحدیث

الملائكة، نسبع كلامهم ولا نرى اشخاصهم“

جو دلوں میں اشارہ ہوتا ہے، وہ وہی الہام ہے۔ جو کانوں میں اشارہ ہوتا ہے وہ فرشتوں کا کلام ہے۔ ہم ان کی

باتوں کو سنتے ہیں لیکن ان کے جسموں کو نہیں دیکھتے۔ [۲]

تقریباً روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام معصوم علیہ السلام کے علوم چند ذرائع سے حاصل ہوتے ہیں! وہ علوم جو انہیں پیغمبر اکرم

یا سابق امام سے انہیں وراثت میں ملتے ہیں، یا دستور العمل کی صورت میں لکھے ہوئے ان کے دے دیئے جاتے ہیں اور بعض اوقات روایات

[۱] بحار الانوار، جلد ۲۶، ص ۵۶

[۲] ارشاد مفید، جلد ۲، ص ۸۰، بحار الانوار، جلد ۲۶، ص ۱۸

میں اسے ”جامعہ“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اور اگر کوئی ایسا مسلّمہ درپیش آجاتا ہے جو ان منابع میں نہیں ہوتا تو خداوند عالم کی طرف سے انہیں یا تو قلبی الہام ہوتا ہے یا پھر فرشتے کی آواز کے ذریعہ آگاہ ہو جاتے ہیں (جیسا کہ حضرت مریمؑ آگاہ ہوئی تھیں)۔  
لیکن یہ بات مسلّم ہے کہ اس وحی کا ”وحی نبوت“ سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کی وحی کی قسم سے ہوتی ہے۔

اصولی طور پر آج کی اصطلاح میں عام طور پر وحی کا اطلاق ”وحی نبوت“ پر ہوتا ہے، اور ان جیسے حالات کو ”الہام“ کہتے ہیں اور علامہ طباطبائی مرحوم کے بقول کیا ہی بہتر ہے کہ ہم ایسی چیزوں کو ”الہام کہیں“ کیونکہ یہ دینی ادب کے لحاظ سے نہایت ہی مناسب ہے۔<sup>[۱]</sup>  
اس بارے میں مزید وضاحت کے لیے بحار الانوار جلد ۲۶، ابواب علوم آئمہ اور اصول کافی، جلد اول، باب ”ان الائمة محمد ثون“ کی طرف رجوع کریں۔

## ۸۔ پیغمبر اسلامؐ پر وحی کیونکر نازل ہوتی تھی؟

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں ہم وحی کی حقیقت سے بے خبر ہیں کیونکہ اس کا تعلق ایسے ادراک اور بصیرت سے ہے جو ہمارے احساس اور عقل کی دنیا سے باہر ہے۔ ہم تو صرف وحی کے آثار کو ہی دیکھتے ہیں اور اثر سے مؤثر کے وجود کا پتہ لگاتے ہیں۔ اسی لیے اس اسرار آمیز کائنات تک رسائی کی کوشش بیہودہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا کسی معصوم امام علیہ السلام سے کیفیت وحی کے بارے میں سوال ہوتا تو وہ اس کا سربستہ جواب دیتے جو ”وحی“ کی حقیقت کا نقطہ ایک پر تو ہوتا۔  
شیخ صدوق علیہ الرحمۃ نے ”اعتقادات“ میں وحی کے بارے میں ایک تفصیلی گفتگو کی ہے جو تقریباً اخبار اور روایات ہی سے لی گئی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

”ہمارا عقیدہ ہے کہ اسرافیل کے سامنے ایک لوح ہے، جب خداوند عالم کوئی وحی بھیجنا چاہتا ہے تو وہ لوح اسرافیل کی پیشانی سے جالمتی ہے اور وہ اس کو دیکھتے ہیں اور اس میں جو کچھ درج ہوتا ہے اسے پڑھ لیتے ہیں۔ پھر وہ سب کچھ میکائیل کو القاء کرتے ہیں۔ میکائیل جبرائیل کو اور جبرائیل انبیاء کو القاء کرتے ہیں۔ لیکن وہ بیہوشی کی حالت جو آنحضرتؐ کو عارض ہو جاتی بدن سنگین ہو جاتا اور پسینہ سے شرابور ہو جاتے تھے، وہ اس وقت ہوتی تھی جب خداوند عالم انہیں راہ راست مخاطب فرماتا تھا لیکن جبرائیل علیہ السلام آنحضرتؐ کے پاس کبھی بھی بغیر

اجازت کے نہیں آتے تھے اور آپ کے سامنے بڑے ادب سے بیٹھتے تھے۔<sup>[۱]</sup>

اس قسم کی حدیث کا روایات میں اجمالی ذکر موجود ہے۔

ایک اور حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ جب آنحضرتؐ پر وحی نازل ہوئی تو آپ اپنے چہرے کے سامنے آہستہ سے زمزمہ کی آواز کو

سماعت فرماتے تھے۔<sup>[۲]</sup>

ایک اور حدیث میں ہے کہ جب سرکار رسالتؐ پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپ کی پیشانی مبارک سے پسینہ جاری ہو جاتا تھا خواہ وہ دن

سخت سرد ہی کیوں نہ ہوتا۔<sup>[۳]</sup>

بہر صورت روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی مختلف صورتوں میں نازل ہوتی تھی اور ہر ایک صورت

کے اپنے آثار ہوتے تھے۔

نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جبرائیلؑ کبھی تو اپنی اس اصلی صورت میں نازل ہوتے جو خدا نے بنائی ہے اور ایسا تقریباً آنحضرتؐ

کی ساری زندگی میں صرف دو بار ہوا ہے (جیسا کہ بعض تفاسیر کی بناء پر سورہ نجم میں اسی چیز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے)۔<sup>[۴]</sup> اور کبھی فرشتہ وحی

”توحید کلبی“ کی صورت میں نمایاں ہوتے۔<sup>[۵]</sup> و<sup>[۶]</sup>

## ۹۔ غریزی الہامات

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ قرآن مجید اور اسی طرح لغت کی کتابوں میں ”وحی“ کا ایک نہایت ہی وسیع معنی ہے، جن میں سے ایک کا ایک

مصدق خاص ”غریزی ادراک“ ہے جو حیوانات میں پایا جاتا ہے اور اس کی کوئی مساوی تفسیر نہیں کی جاسکتی، بلکہ ان کا وجود عالم مادرائے طبیعت

[۱] اعتقادات، صدوق ص ۱۰۰

[۲] بحار الانوار، جلد ۱۸، ص ۲۵۳، حدیث ۹ ص ۲۵۶ حدیث ۶

[۳] بحار الانوار، جلد ۱۸، ص ۲۶۱

[۴] فی ضلال القرآن، جلد ۷، ص ۳۰۶

[۵] بحار الانوار، جلد ۱۸، ص ۲۶۷

[۶] ”وحیہ بن خلیفہ کلبی“ پیغمبر اکرمؐ کے رضاعی بھائی تھے اور اس دور کے خوبصورت ترین انسان تھے۔ جب جبرائیل امینؑ آنحضرت صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کے پاس آتے تو انہی کی صورت میں ظاہر ہوتے (مجمع البحرین، مادہ وحی) ان کا شمار آنحضرتؐ کے مشہور اصحاب میں ہوتا ہے اور

خوبصورتی میں مشہور تھے۔ حضور اکرمؐ نے انہیں اپنا سفیر بنا کر روم کے بادشاہ ”ہرقل“ کی طرف بھیجا تھا۔ ۶ھ یا ۷ھ میں معاویہ کی حکومت

کے زمانے تک زندہ رہے۔ (لغت نامہ دہخدا)



میں علم و قدرت کے اس عظیم منبع کے وجود پر ایک دلیل ہے۔

قرآن مجید نے شہد کی مکھی کے بارے میں وحی کا لفظ استعمال کیا ہے جیسا کہ سورہ نحل کی آیات ۶۸، ۶۹ میں اس جانور کی حیران کن کیفیت کی طرف ایک پرمعنی اشارہ ہے۔

دورِ حاضر میں دانشوروں نے شہد کی مکھیوں پر زبردست تحقیق کی ہے جس سے آج تک حاصل ہونے والے نتائج سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی تعجب آور اور حیران کن اجتماعی زندگی اور تمدن ہے جو انسانی زندگی اور تمدن پر کئی لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے۔ ایسی خوبصورتی اور چابکدستی سے گھرتیار کرتی ہیں کہ انجینئرنگ کے تمام قواعد کو پوری طرح پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ شہد کی مکھی جمع آوری، اسے تیار کرنے، اکٹھا کرنے اور اسے ہر قسم کی آلودگی سے محفوظ رکھنے کے طور طریقے، اولاد کی تربیت کا انداز، دشمن کے مقابلے میں اپنا دفاع، بچوں کی پرورش، پھولوں کے وجود کا پتہ لگانے والی مکھیوں کا چھتے میں رہنے والی دوسری مکھیوں کو مطلع کرنے کا طریقہ کار، اور انہیں اس جگہ کے فاصلے، درجے اور زاویے کے لحاظ سے صحیح صحیح نشان دہی کرنا تاکہ وہ وہاں تک اجتماعی صورت میں پہنچ سکیں، وغیرہ ایسے امور میں جن میں سے ہر ایک کے بارے میں تفصیلی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور یہ ایسے امور ہیں جن کی انجام دہی ”غریزی الہام“ کے بغیر قطعاً ناممکن ہے۔

بعض ماہرین کے بقول اب تک جنگلی زنبور غسل کی ۴۵۰۰ قسمیں دریافت کی جا چکی ہیں، لیکن جو باعثِ تعجب ہے وہ یہ کہ ان سب کی ہجرت، چھتہ بنانے اور پھولوں وغیرہ سے رس حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔<sup>[۱]</sup>

انسوس کہ ہماری بحث کی نوعیت ہی اس قسم کی ہے کہ اصل موضوع سے باہر نہ ہوں، وگرنہ زنبور غسل اور ان کی اسرار آمیز زندگی کے بارے میں گفتگو کے لیے بہت کچھ ہے، جن میں سے ان کا صرف ایک نمونہ اس کا چھ ضلعی گھر بنانا ہے جس میں انجینئرنگ کے اصولوں کو پیش نظر رکھ کر ان کے زاویوں کی صحیح معنوں میں رعایت کی گئی ہے۔

ماہرین تعمیرات بڑی کاوشوں، تجربوں اور مطالعات کے بعد اس نیچے پر پہنچے ہیں کہ اس کے کمروں میں رہنے والوں کے لیے کافی گنجائش ہوتی ہے لیکن ان پر مواد (میٹریل) بہت کم خرچ آتا ہے، کیونکہ ہندی اشکال میں سے صرف تین شکلیں ایسی ہیں کہ جن سے گھر کی صورت بنتی ہے جبکہ ان کے درمیان کوئی فاصلہ نہ ہو۔ (مثلاً متساوی الاضلاع، چار ضلعی اور چھ ضلعی) لیکن انجینئرنگ کے نقطہ نظر سے چھ ضلعی کمرے کے بنانے پر تعمیراتی سامان بھی کم خرچ آتا ہے اور اس میں پائیداری اور قوت مزاحمت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زنبور غسل نے دوسری دو قسموں کو چھوڑ کر اسے اپنا یا ہے۔۔

اس نے یہ غریزی الہامات کہاں سے حاصل کیے؟ کس یونیورسٹی میں یہ درس پڑھا؟

لیکن یہ غریزی الہامات شہد کی مکھیوں ہی میں منحصر نہیں بہت سے دوسرے حیوانات میں بھی اس قسم کے مخیر العقول نمونے دیکھنے میں آتے ہیں جن میں سے ہر ایک ایک دوسرے سے بڑھ کر ہوتا ہے بطور نمونہ: ایک دانشور اپنی کتاب بنام ”دریاد یا عجائب“ میں رقمطراز ہے کہ:



”بعض مچھلیوں کا طریقہ کار اسرارِ فطرت میں شمار ہوتا ہے اور کوئی بھی شخص اس کی علت بیان نہیں کر سکتا۔“  
 ”قرنِ آلا‘ نامی مچھلی سمندر کو ترک کر کے دریاؤں کے ان میٹھے پانیوں کی طرف لوٹ جاتی ہے جہاں اس نے زندگی کا آغاز کیا تھا۔ اپنی پوری طاقت کے ساتھ دریا کی مخالف سمت میں تیرتی ہوئی وہاں پہنچتی ہے۔ اگر درمیان میں پتھر کی کوئی چٹان آجائے تو وہ اس پر سے کود جاتی ہے، حتیٰ کہ آبشاروں کے نیچے سے بھی کود کر اوپر آ جاتی ہے بعض اوقات ان کی تعداد اس قدر زیادہ ہو جاتی ہے کہ تمام راستہ ان سے اٹ جاتا ہے، اور جب یہ مچھلیاں اس مقام پر پہنچ جاتی ہیں جس کی جستجو میں ہوتی ہیں تو وہیں پرانڈے دیتی ہیں اور پھر مرجاتی ہیں۔ یہ مچھلیاں کیونکر کسی مناسب نہر یا دریا کو حاصل کر لیتی ہیں یہ ریڈیو اور ٹیلی وژن سے بھی زیادہ عجیب کام ہے کیونکہ نہ تو ان کے پاس کوئی نقشہ ہوتا ہے اور نہ ہی پانی کے نیچے ان کی نگاہ زیادہ دور تک جاسکتی ہے اور نہ ہی کوئی ہوتا ہے جو ان کی راہنمائی کرے۔“

پھر کہتا ہے کہ:

”اس سے زیادہ عجیب‘ مارماہی‘ کا طریقہ کار ہے برطانوی مارماہی جب آٹھ سال کی عمر کو پہنچتی ہیں تو اس جھیل یا دریا کو ترک کر دیتی ہیں جس میں وہ رہ رہی ہوتی ہیں اور سانپ کی مانند رات کے وقت گیلی گھاس میں جا چھپتی ہیں اور چھپتے چھپاتے سمندر کے کنارے پہنچ جاتی ہیں اور پھر تیر کر اوقیانوسِ اطلسی کو (چوڑائی میں) طے کرتی ہیں اور ’برمودا کے نزدیکی پانیوں میں جا پہنچتی ہیں۔ وہاں پر پانی کی تہہ میں جا کر انڈے دیتی ہیں اور پھر مرجاتی ہیں۔۔۔ مارماہی کے بچے پانی کی سطح پر آ کر اپنے مادری وطن کی جانب سفر کا آغاز کرتے ہیں (وطن پہنچتے پہنچتے) انہیں دو تین سال لگ جاتے ہیں۔“

سوال یہ پیدا ہوتا کہ مارماہی نے یہ راستہ اس پہلے سے نہیں دیکھا تھا پھر کہ کیونکر اپنی منزل مقصود تک

پہنچ جاتی ہے؟

اور یہ وہ سوال ہے جس کا جواب آپ بھی دوسرے عقلمندوں کی طرح دے سکتے ہیں (یعنی منفی

جواب) کیونکہ اس کا سوال جواب کسی کو معلوم نہیں۔<sup>[۱]</sup>

بعض مہاجر پرندے بہت طویل راستے طے کرتے ہیں حتیٰ کہ بعض اوقات وہ یورپ سے جنوبی افریقہ تک کی دور دراز راہوں کو طے کرتے ہیں اور اپنے راستے میں کبھی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوتے ایک لمبے عرصے تک یہ موضوع زیر بحث رہا ہے کہ یہ پرندے اس قدر دشواری کے باوجود ایسے کٹھن راستوں کو کیونکر طے کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور کافی مدت تک یہ راز کسی کو معلوم نہیں تھا۔

[۱] ”دریادریا عجائب“ ص ۱۱۶، ص ۱۱۷

چنانچہ بعض دانشوروں نے مفصل اور پیچیدہ تجربات سے ثابت کے ہے کہ ان میسے کچھ پرندے ایسے ہیں جو اپنی رواہوں کو آسمانی ستاروں کے ذریعہ متعین کرتے ہیں۔

تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ غریزی طور پر ہی ستاروں کے مجموعوں کو پہچانتے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ آسمان میں کیونکر اپنی جگہ بدلتے ہیں اور سال کے بارہ مہینوں میں ان کی جگہ کہاں کہاں ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ جب موسم ابر آلود ہو اور کبھی کبھار ایک ستارہ چمکتا ہوا نظر آجائے تو بھی اس کے ذریعہ وہ اس راہ کا پتہ چلا لیتے ہیں۔

تجربات سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ ان پرندوں کی آسمان 'فلکی صورت حال' ستاروں کی حرکات وغیرہ کی شناخت انہیں وراثت میں ملی ہے یعنی اگر انہوں نے آسمان کو نہ بھی دیکھا ہو تو بھی وہ اسے پہلی مرتبہ دیکھ کر ہی سب کچھ معلوم کر لیتے ہیں۔

دانشوروں کو اب تک اس بات کا علم نہیں ہو سکا کہ آسمان اور دیگر ماحول کی اس قدر تفصیلی تصویر ان جانوروں کو کیونکر وراثت میں ملتی ہے، جبکہ صدیاں ڈگڑ گڑنے کے ساتھ ساتھ آسمان کی نوعیت بھی تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ (تو پھر) ابتدائی نسلیں یہ معلومات کہاں سے حاصل کر پائی ہیں؟ [۱]

اس موضوع کا ایک اور واضح نمونہ وہ عمل ہے جو "آکسیک لوپ" نامی پرندہ انڈے دیتے وقت انجام دیتا ہے۔ ایک فرانسیسی دانشور مسٹر "وارڈ" اس پرندہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"میں نے اس پرندہ کے بارے میں کافی مطالعہ کیا ہے۔ اس کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب اس کے انڈے دینے کی مدت پوری ہو جاتی ہے تو اور مر جاتا ہے یعنی اس نے کبھی بھی اپنے نومولود چوزوں کی صورت نہیں دیکھی۔ اسی طرح نومولود بچوں نے کبھی اپنی مہربان ماں کا چہرہ نہیں دیکھا جب وہ انڈوں سے باہر آتے ہیں تو بے پروبال کیڑوں کی مانند ہوتے ہیں اور اپنی خوراک حاصل کرنے پر قادر نہیں ہوتے حتیٰ کہ ان حوادث کا دفاع بھی نہیں کر سکتے جو ان کی زندگی سے جنگ کرتے ہیں۔ لہذا انہیں ایسی حالت میں کسی محفوظ مقام پر ایک سال تک رہنا چاہیے اور اس عرصے کی غذا بھی ان کے پہلو میں موجود ہو رہنی چاہیے یہی وجہ کہ جب مادہ پرندہ کو اس احساس ہوتا ہے کہ اس کے انڈے دینے کا وقت قریب آ گیا ہے تو وہ بڑی لکڑی کا ایک ٹکڑا تلاش کرتی ہے اور اس میں ایک بہت گہرا سوراخ کرتی ہے پھر وہ اپنی خوراک کی تلاش میں نکل جاتی ہے اور درخت کے نرم پتے اور شگوفے اکٹھے کرتی ہے جو نومولود کے لیے غذا کی صورت میں قابل استفادہ ہوتی ہے یہ ایک سال کی مدت تک کے لیے نوزاد کے لیے کافی ہوتی ہے اور اسے وہ سوراخ کے آخر میں جمع کر دیتی ہے پھر اس کے اوپر ایک انڈہ دیتی ہے اور لکڑی کے برادے کے خمیر کی ایک مضبوط سی چھت اس کے بنا دیتی ہے پھر غذا کی تلاش میں نکل

[۱] کتاب "حواس اسرار آمیز حیوانات" از "ویٹس ڈروچر" ترجمہ لالہ زاری ص ۱۶۷ و ص ۱۷۱

جاتی ہے اور ایک سال کی غذا جمع کرنے کے بعد اس پر ایک اور انڈہ دیتی ہے اور اس کا اسی طرح منہ بند کر دیتی ہے۔ اسی طرح کی کئی منزل تیار کر کے انڈوں کا نصاب مکمل کر لینے کے بعد مر جاتی ہے۔<sup>[۱]</sup>

اس قسم کی وسیع معلومات پرندوں اور جانوروں کو کس نے بہم پہنچائی ہیں جنہوں نے مال کی صورت تک کو نہیں دیکھا ہوتا، یا ماؤں نے بچوں کے چیزوں کو نہیں دیکھا ہوتا کسی کے پاس اس کا سوال کا جواب نہیں ہے سوائے اس کے کہ کہا جائے کہ ”خداوند بزرگ و برتر کی طرف سے غریزی الہامات ہی نے انہیں سب کچھ سمجھا دیا ہے۔“

## چھٹا منبع کشف شہود

### اشارہ

معرفت کا چھٹا اور آخری منبع ”قلبی مشاہدہ اور مکاشفہ“ ہے۔

سب سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس منبع کی تعریف کی جائے جس سے بہت لوگ ناواقف ہیں، تاکہ اس طرح سے ایک تو اس کا دوسرے منابع یعنی وحی والہام، فطرت اور عقلی ادراکات سے فرق واضح ہو جائے اور دوسرے نادان اور بے سمجھ لوگ اسے وہم و خیال پر محمول نہ کریں۔

اور ساتھ ہی اس کے ذریعہ سے جو لوگ ناجائز مفاد اٹھاتے ہیں وہ رستے بھی بند ہو جائیں کیونکہ اس طرح سے بہت سے لوگوں کے دلوں میں اس منبع کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ اسے مسترد کر دیتے ہیں۔

اصولی طور پر اس کائنات کی تمام چیزیں دو قسموں پر ہیں۔

۱۔ وہ چیزیں جو حسن کے ساتھ قابل ادراک ہیں اسے ”عالم حسن“ کہتے ہیں۔

۲۔ وہ چیزیں جو ہماری حس سے مخفی اور غائب ہیں اسے ”عالم غیب“ کہتے ہیں۔

لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان ایک تازہ ادراک اور نظر پیدا کر لیتا ہے جس کے ذریعہ وہ غیب کی دنیا تک رسائی حاصل کر لیتا ہے اور اپنی قدرت و توانائی کے مطابق اس عالم کے کچھ حصے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے، بالفاظ دیگر درمیان سے سارے پردے اٹھ جاتے ہیں اور غیب کی دنیا کے بعض حقائق اس پر منکشف ہو جاتے ہیں، بلکہ اسی طرح جس طرح انسان اپنی آنکھوں کے ساتھ عالم محسوسات میں دوسری چیزوں کو دیکھ رہا ہوتا ہے، بلکہ اس سے بھی کئی درجے تسلی بخش اور واضح تر صورت میں۔ اور اس حالت کو ”مکاشفہ یا شہود باطن“ کہتے ہیں اور وہ وہی چیز ہے جسے قرآن مجید نے سورہ نکات کی پانچویں اور چھٹی آیت میں یوں پیش کیا ہے:

”کَلالو تعلمون علم الیقین الترون الجحیم“ ایسا ہرگز نہیں ہے جیسا کہ تم سمجھتے ہو اگر تمہارے پاس علم الیقین ہو تو تم دوزخ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔

مختلف اسلامی روایات میں ”مجرمین“ اور ”مومنین“ جب مرنے کے قریب ہوتے ہیں تو ان پر شہود کی حالت ”طاری ہو جاتی ہے اور وہ فرشتوں کا یا خدا کے نیک بندوں کی ارواح کا مشاہدہ کرتے ہیں جبکہ ان کے بالکل ہی قریب کے لوگ اس قسم کے ادراک سے قطعاً

عاجز ہوتے ہیں۔

بعینہ اسی طرح جس طرح جنگِ خندق میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر طاری ہوئی تھی۔ جب آپ نے پتھر پر تھوڑا مارا تو اس سے ایک چنگاری اٹھی تو آپ نے ارشاد فرمایا ”میں نے کسریٰ یا قیصر روم یا یمن کے شاہی محلات کو دیکھا ہے (چنانچہ اس کی شرح آگے آئے گی)“ [۱]

وہی کچھ جو اس مشہور و معروف حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مادرِ گرامی جناب آمنہ کے بارے میں آیا ہے کہ انہوں نے کہا جب سرکارِ رسالتؐ آئے میرے شکم مبارک میں تھے ”میں نے دیکھا کہ ایک نور مجھ سے باہر آیا ہے جس کی روشنی میں میں نے شام میں سر زمین ”بصری“ کو دیکھ لیا“ اور اس قسم کے دوسرے بہت سے نمونے ہیں۔ انشاء اللہ العزیز بعد میں آیات و احادیث کے ذریعہ ان سب کی طرف اشارہ کیا جائے گا اور بتایا جائے گا کہ یہ نہ تو وحی ہے اور نہ ہی قلبی الہام، بلکہ ایک قسم کا مشاہدہ اور درک و دید ہے جو حسی مشاہدہ سے بالکل ہی مختلف ہے۔

یہ وہی چیز ہے جسے مشہور و معروف عارف اور سخن سنج نے اپنے الفاظ میں یوں ادا کیا ہے:

”اگر تمہاری آنکھ غیب کو دیکھ سکتی ہو تو اس دنیا کا ایک ایک ذرہ تمہارا ہماز ہو سکتا ہے۔ جب صورت حال یہ ہو جائے گی تو کائنات میں موجود تمام چیزوں کی تسبیح کے غلغلہ کو سن کر ہر قسم کی تاویلوں کے وسوسے تم سے دور ہو جائیں گے نامحرم لوگوں کے کان ایسے حقائق کو نہیں سن سکتے۔ لیکن جو لوگ محرم راز بن جاتے ہیں وہی ان آوازوں کے سننے اور رازوں کو پہچاننے کے قابل ہو جاتے ہیں۔“ [۲]

بنا بریں ”کشف شہود“ کی ان مختصر الفاظ میں یوں تعریف کی جاسکتی ہے کہ:

کشف و شہود نام ہے حس سے ماوراء ایک اور عالم تک رسائی کا اور اندر کی آنکھوں کے ذریعہ اس عالم کے حقائق کے مشاہدہ کے ایسا مشاہدہ جو بالکل حسی مشاہدہ کی مانند ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر طاقتور یا گوش جان سے ان زمزموں کے سننے کا۔

البتہ یہ بات ہرگز نہیں ہے کہ ہر کس و ناکس جو بھی اس چیز کا دعویٰ کرے اسے قبول کر لیا جائے اور نہ ہی ہر مدعی کی باتوں پر کان دھرا جا سکتا ہے۔ لیکن ہماری گفتگو معرفت کے اس منبع کے اصل وجود کے بارے میں ہے اور بعد میں یہ بتایا جائے گا کہ وہاں تک کیسے رسائی حاصل کی جا سکتی ہے اور آخر میں اس منبع کے سچے اور جھوٹے دعویداروں کی شناخت کا طریقہ بتایا جائے گا۔

مندرجہ بالا تصریحات کو پیش نظر رکھ کر مندرجہ ذیل آیات کی تلاوت کا ثواب حاصل کرتے ہیں:

[۱] تاریخ کامل، ابن اثیر جلد ۲، ص ۱۷۹

[۲] مشہور اشعار کا خلاصہ

## آیات

۱۔ وَكَذَلِكَ نُرِيّ إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنُ مِنَ الْمُؤَقِنِيْنَ ﴿٤٥﴾ (سورہ انعام ۴۵)

۲۔ وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ط وَسَتُرَدُّوْنَ اِلَى عَلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿١٠٥﴾ (سورہ توبہ ۱۰۵)

۳۔ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاى ﴿١١﴾ اَفْتَبْرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ﴿١٢﴾ وَلَقَدْ رَاَهٗ نَزَّلَهٗ اٰخْرٰى ﴿١٣﴾ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴿١٤﴾ (سورہ نجم ۱۱ تا ۱۴)

۴۔ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ﴿٥﴾ لَتَرُوْنَ الْجَحِيْمَ ﴿٦﴾ (سورہ تکوین ۵ تا ۶)

۵۔ يَوْمَ يَرُوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حٰجِرًا مَّحْجُوْرًا ﴿٢٢﴾ (سورہ فرقان ۲۲)

۶۔ وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غٰلِبَ لَكُمْ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّىْ جَارٌ لَّكُمْ ؕ فَلَمَّا تَرٰءَتِ الْفِئَتَيْنِ نَكَصَ عَلٰى عَقْبَيْهِ وَقَالَ اِنِّىْ بِرِئٰىءٍ مِّنْكُمْ اِنِّىْ اَرٰى مَا لَا تَرُوْنَ اِنِّىْ اَخَافُ اللّٰهَ ط وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿٣٨﴾ (سورہ انفال ۳۸)

۷۔ وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّىْ لَاجِدٌ رِّجْ يُّوْسُفَ لَوْلَا اَنْ تُفَنِّدُوْنَ ﴿٩٣﴾ (سورہ یوسف ۹۳)

۸۔ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ؕ فَاَرْسَلْنَا اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿١٤﴾ (سورہ مریم ۱۴)

## ترجمہ

۱۔ ہم نے یوں ابراہیم کو زمین و آسمان کی ملکوت دکھائیں تاکہ وہ اہل یقین بن جائے۔  
۲۔ کہہ دو کہ عمل کیسے جاؤ۔ خدا اس کا رسول اور مؤمنین تمہارے اعمال کو دیکھتے ہیں۔ اور تم بہت جلد ہی اس کی طرف پلٹ جاؤ گے جو چھپی ہوئی اور ظاہری چیزوں کو جانتا ہے۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے تمہیں باخبر کرے گا۔

۳۔ جو کچھ اس (پیغمبرؑ) نے دیکھا، اس کے دل نے ہرگز جھوٹ نہیں بولا۔ کیا تم اس کے ساتھ اس چیز میں جھگڑتے ہو جو کچھ اس نے دیکھا ہے اور ایک اور مرتبہ اس کا مشاہدہ کیا ہے، سدرۃ المننتی کے قریب؟  
۴۔ اس طرح نہیں ہے جیسے تم سمجھتے ہو۔ اگر تم علم الیقین رکھتے ہو تو دوزخ کو اپنی آنکھوں کے ساتھ دیکھو گے۔  
۵۔ جس دن وہ فرشتوں کو دیکھیں گے تو وہ دن مجرمین کی خوشخبری کا نہیں ہوگا (بلکہ ان کی سزا کا دن ہوگا)۔ وہ کہیں گے ہمیں امان دو ہمیں معاف کر دو۔

۶۔ اور (جنگ بدر کے دن کو یاد کرو) جب شیطان نے ان (مشرکین) کے اعمال کو ان کی نگاہوں میں مزین کر کے کہا آج لوگوں میں سے کوئی شخص تمہارے اوپر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اور میں تمہارے ساتھ (تمہارا پشت پناہ) ہوں۔ لیکن جب انہوں نے (مسلمانوں اور ان کے حامی فرشتوں کے) دو گروہوں کو دیکھا تو وہ پیچھے پلٹ کر کہنے لگا میں تم سے بیزار ہوں میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے ہیں خدا سے ڈرتا ہوں اور خدا تو شدید العقاب ہے

۷۔ جب (مصر کی سرزمین سے) قافلہ جدا ہوا تو ان کے باپ (یعقوبؑ) نے کہا: میں یوسف کی خوشبو کو محسوس کر رہا ہوں اگر تم مجھے نادانی اور بے عقلی کی نسبت نہ دو تو!!

۸۔ اور (مریمؑ نے) ایک پردہ اپنے اور ان کے درمیان ڈال دیا (تاکہ اس کی خلوت کا مقام ہر لحاظ سے آمادہ ہو) اور اس حالت میں ہم نے اس کی طرف اپنی روح کو بھیجا اور وہ (روح) ایک بے نقص و عیب انسانی شکل و صورت میں مریمؑ پر ظاہر ہوئی۔

## الفاظ کی تشریح

”ملکوت“ دراصل ”ملک“ (بروزن حکم) کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کے معنی ”حاکمیت“ اور ”مالکیت“ ہیں اور اس کے ساتھ ”و“ اور ”ت“ کا اضافہ تاکہ اید اور مبالغہ کے لیے کیا گیا ہے اور ”ملکوۃ“ (بروزن مردک) کے معنی ”حکومت اور عزت“ ہیں۔



علامہ ”طریحی“، مجمع البحرین ”میں کہتے ہیں کہ ”ملکوت“ (بروزن برہوت) عزت، سلطنت اور مملکت کے معنی میں آیا ہے۔ اور بعض ارباب لغت نے تو اس کا معنی ”عظیم حکومت“ کیا ہے اور وہ ”مفرداتِ راغب“ کے معنی کے بھی مطابق ہے۔ اور تفسیر المیزان میں اس کے متعلق یوں تحریر ہے:

عرف قرآن میں ”ملکوت“ کے معنی چیزوں کی باطنی صورت ”ہیں، جس کا ہمیشہ خداوند متعال سے رابطہ اور تعلق رہتا ہے اور ہمیشہ اس باطنی صورت کا مشاہدہ ”یقینی ایمان کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے جیسا کہ سورہ یس کی ۸۳ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے ”فسبحان الذی بیدہ ملکوت کل شیء“ یعنی پاک و منزہ ہے وہ ذات جس کے دستِ قدرت میں ہر چیز کی حکومت ہے۔<sup>[۱]</sup>

”قوٰد“ کے بارے میں جیسا کہ پہلے بھی تفصیل کے ساتھ بتایا جا چکا ہے، اس کے معنی ”قلب“ اور ”روح“ ہیں جب وہ پختگی کی حد کمال تک پہنچ جائے اور ”قوٰد“ (بروزن ابر) کے بادہ سے لیا گیا ہے جس کا معنی ”بھونا“ ہے۔

”آجِدُ“ ”وجود“ کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کا منی ”پانا“ ہے کبھی تو یہ ”پانا“ حواس کی ظاہری صورت سے عمل میں آتا ہے، جیسے کہ آنکھ کے ساتھ دیکھنا کان کے ساتھ سننا خوشبو یا بدبو کا قوتِ شامہ کے ذریعہ سونگھنا اور کبھی اندرونی حواس کے ذریعہ عمل میں آتا ہے، جیسے بھوک اور پیاس کا احساس، یا سیر ہونے کا احساس یا رنج و غم کا احساس، اور کبھی عقل کے ذریعہ عمل میں آتا ہے، جیسے خدا کو مختلف دلائل کے ساتھ پالینا۔

”تمثل“ ”مثول“ (بروزن عقول) کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں کسی شخص یا چیز کے سامنے سیدھا کھڑا ہونا، کیونکہ ”تمثل“ بروزن مفصل اس شخص یا چیز کو کہتے ہیں کہ جو کسی دوسرے شخص یا دوسری چیز کے سامنے نمایاں یعنی ظاہر ہو، اسلامی روایات اور تورات میں ”تمثل“ کا بار بار تذکرہ ملتا ہے۔ مثلاً ”دارالندوہ“ میں اہلبیس کا عرب کے مشرکین کے سامنے ظاہر ہونا، جس دن کہ وہ پینچمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا چراغ گل کرنے کے لیے اکٹھے ہو کر سازشیں تیار کرنے میں مصروف تھے، تو وہ (اہلبیس) خیر اندیش اور خیر خواہ شخص کی صورت میں ”تمثل“ (ظاہر) ہوا۔<sup>[۲]</sup>

اسی طرح حضرت امیر علیہ السلام کے سامنے ”دنیا“ کا ایک دلربا اور دل فریب عورت کی صورت میں ظاہر ہونا اور آنجنابؐ پر اس کا کوئی جاو نہ چلنا کہ یہ داستان بہت مشہور ہے۔

یا قبر اور قیامت میں انسان کے اعمال کا مناسب صورت میں مجسم ہو کر سامنے آ جانا، جسے اسلامی روایات میں ”تمثل“ کے ساتھ یاد کیا گیا ہے۔

اور ان سب کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص یا کوئی صورت ایک اور شکل اختیار کر لے گی لیکن اس کے باطن اور ماہیت میں کسی قسم کی تبدیلی

[۱] تفسیر المیزان، جلد ۸ ص ۳۶۴

[۲] تفسیر المیزان، جلد ۱۴ ص ۳۷

رو نما نہیں ہوگی۔ [۱]

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### غیب کا مشاہدہ

زیر بحث آیات کے سلسلے کی پہلی آیت میں توحید کے علمبردار نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شرک اور بت پرستی کے ساتھ نبرد آزمانی کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ابراہیم ہی کے ایمان و یقین کی بلند منزلوں اور اس کے دلائل کا ذکر ہے۔ اور شاید یہ اُن حضرت کے لیے خداوند تعالیٰ کی طرف سے اس بات کا انعام ہو جو انہوں نے بت پرستی کے ساتھ نبرد آزمانی کی ہے اور وہ یہ کہ خدا نے انہیں آسمان اور زمین کی ملکوت دکھائیں اور وہ اہل یقین ہو گئے یعنی عین الیقین اور حق الیقین کے مقام و مرتبے تک پہنچ گئے۔

”السنوات“ جمع کا صیغہ ہے اور اس پر الف لام بھی داخل ہے جو عموم کے معنی میں ہے، جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خداوند عالم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنی ملکوت یعنی حاکمیت سے آگاہ کیا، خواہ وہ آسمانوں میں تھی یا کواکب اور ثوابت و سیار اور کہکشانوں وغیرہ میں۔ اسی طرح تمام روئے زمین کی حاکمیت سے بھی آگاہ کیا خواہ وہ ظاہری تھی یا باطنی۔ اور قرآن مجید نے اس آگاہ سازی کو ”اراءہ“ (دکھلانے) سے تعبیر کیا ہے۔ اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ انسان ظاہری آنکھ اور عقلی دلائل سے ان تمام حقائق کا مشاہدہ نہیں کر سکتا اسی لیے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے اندرونی شہود کے ذریعہ اور ان پردوں کو ہٹا کر ہی یہ حقائق ابراہیم کو دکھائے جو عام طور پر ہماری آنکھوں پر پڑے رہتے ہیں اور ہم سے بہت سے حقائق کو چھپائے ہوئے ہیں۔

”فخر الدین رازی“ نے اپنی تفسیر میں اس ”اراءہ“ (دکھلانے) کے بارے میں دو احتمال ذکر کیے ہیں ایک تو یہ کہ اس سے مراد ”حسی اراءہ“ ہے اور دوسرا یہ کہ عقلی دلائل کے ذریعہ اراءہ ہے۔ پھر اس بارے میں نو مختلف دلائل بیان کرنے کے بعد دوسرے احتمال کی آیت کی تفسیر میں وضاحت کرتے ہیں۔ [۲]

لیکن جس طرح کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کوئی انسان نہ تو حس کے ذریعہ اور نہ ہی عقل کے ذریعہ تمام کائنات پر خدا کی حاکمیت کے تمام اسرار سے مطلع ہو سکتا ہے، بلکہ اس بات کے لیے ایک اور ادراک اور بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لیے ہم تفسیر ”فی ظلال القرآن“ میں پڑھتے ہیں کہ:

”اس سے مراد حضرت ابراہیم کو آفرینش کے مخفی امور سے آگاہ کرنا ہے اور ان آیات سے پردہ اٹھانا ہے جو کتاب ہستی (کائنات)

[۱] تفسیر المیزان، جلد ۱۴، ص ۳۷

[۲] تفسیر کبیر، جلد ۱۳، ص ۴۳

کے اوراق پر مشتمل ہیں، تاکہ وہ یقین کامل کے درجہ تک پہنچ جائیں [۱]۔

بالفاظ دیگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے فطری اور استدلالی توحید کے مراحل کو سورج چاند اور ستاروں کے طلوع اور غروب سے طے کیا، اور بت پرستوں کے ساتھ نبرد آزمائی میں لگ گئے اور اس عظیم جہاد کے پرتو میں توحید کے مراحل یکے بعد دیگر لے لے کر تے رہے۔ آخر کار اس مرحلہ تک پہنچے کہ خداوند نے ان کے دل میں تمام پردے ہٹا دیئے اور وہ عالم کے باطن کے شہود تک پہنچے۔ اسی لیے ہم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی اسی آیت کی تفسیر کے سلسلے میں ایک حدیث پڑھتے ہیں:

”كشط لابرہیم عليه السلام السموات السبع حتى نظر ما فوق العرش و كشط

له الارضون السبع و فعل بمحمد مثل ذلك ..... والائمة من بعده

قد فعل بهم مثل ذلك“

”خداوند عالم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے سے ساتوں آسمانوں کے پردے ہٹا دیئے، حتیٰ کہ ان کی

نگاہیں عرش کے اوپر تک پہنچ گئیں۔ اسی طرح ساتوں زمینوں کے پردے بھی ہٹا دیئے، اور یہی کام حضرت محمد

مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کیا..... اور آپ کے بعد آنے والے آئمہ علیہم السلام کے ساتھ بھی۔ [۲]

تفسیر ”برہان“ میں اس بارے میں بہت سی احادیث نقل کی گئی ہیں جو ساری کی ساری اس بات کی شاہد ہیں کہ اس قسم کا درک اور بصیرت، حسی اور عقلی درک و بصیرت سے بالکل مختلف ہے۔ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، تفسیر المیزان میں ہے کہ ”ملکوت“ اشارہ ہے اشیاء کے وجود کی طرف کیونکہ ان کی نسبت ان کی طرف ہوتی ہے اور وہ اس کی ذات پاک سے وابستہ ہوتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جس کا ابراہیم نے مشاہدہ فرمایا تھا اور جس کے ذریعہ وہ خالص توحید سے آشنا ہوئے تھے۔ [۳]

تفسیر ”درمنثور“ میں بھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک روایت ابن عباس کے ذریعہ نقل ہوئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے پردے ہٹا دیئے تھے اور ملکوت آسمانی یعنی پوری کائنات پر اپنی قدرت اور حاکمیت کے اسرار ابراہیم علیہ السلام کو دکھادیئے تھے۔ [۴]

دوسری آیت میں زکوٰۃ، صدقات اور توبہ کے حکم کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے

[۱] فی ظلال القرآن، جلد ۳ ص ۲۹۱

[۲] تفسیر برہان، جلد ۱، ص ۵۳۱ حدیث ۲ (حدیث ۴۳ و ۴۴ بھی اسی چیز کو بیان کر رہی ہیں)۔

[۳] المیزان، جلد ۷، ص ۱۷۸

[۴] المیزان، جلد ۳، ص ۲۴

”مؤمنین سے کہہ دیجئے کہ عمل بجالاتے رہو کیونکہ خدا، رسول اور مؤمنین تمہارے اعمال کو دیکھ رہے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ خدا کی طرف سے اعمال کا مشاہدہ تمام انسانوں کے تمام اعمال کا مشاہدہ ہے، خواہ وہ نیک ہیں یا بد کسی کے سامنے انجام دیئے جائیں یا چھپ کر۔ اسی دلیل کے تحت (سیاق کے اتحاد کے پیش نظر) پیغمبر اکرمؐ کا مشاہدہ بھی اسی قسم کا ہونا چاہیے، کیونکہ آیت مطلق ہے اور اس میں کسی قسم کی قید اور شرط نہیں ہے۔ لیکن ”مؤمنین“ سے کون لوگ مراد ہیں؟ اگر مختلف قرآن کو دیکھا جائے تو اس سے مراد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معصوم جانشین ہیں (نہ کہ تمام مؤمنین)۔

اور چونکہ حسی مشاہدہ یا عقلی دلائل کے ساتھ تمام انسانوں کے تمام اعمال سے آگاہی حاصل نہیں ہو سکتی لہذا یہ آیت بھی اس حقیقت کو بیان کر رہی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اطہراؑ ایک اور ادراک و بصیرت کے حامل ہیں جو مؤمنین کے نیک و بد اعمال کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

اور فخر رازی نے اپنی تفسیر میں جو یہ کہا ہے کہ ”اس سے مراد تمام مؤمنین ہیں“ تو پھر وہ اس مشکل میں پھنس گئے ہیں کہ تمام مؤمنین ایک دوسرے کے اچھے اور برے اعمال سے باخبر نہیں ہوتے۔ پھر وہ خود ہی اس کا جواب دیتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ”ان اعمال کی خبر ان تک پہنچ جاتی ہے“ حالانکہ یہ ایک لا حاصل تکلف ہے اور مکمل طور پر ظاہر کے خلاف ہے

علاوہ ازیں اسی آیت کی تفسیر میں آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں جو سب کی سب اس بات کی شاہد ہیں کہ ”ہر صبح کو (صبح کے ذکر کے بغیر) بندوں کے اعمال پیغمبر خداؐ اور آئمہ اطہراؑ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں اور وہ ان کے اعمال کو دیکھتے ہیں۔ اگر یہ اعمال معصیت اور گناہ پر مبنی ہوں تو وہ غمگین ہو جاتے ہیں (اور اگر اطاعت پر مبنی ہوں تو خوش ہوتے ہیں) [۱]۔

یہ آیت، اس قدر روایات کے ساتھ تمام راہبان راہ حق کے لیے ایک عظیم درس ہے کہ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے اعمال ہمیشہ عظیم ہستیوں کے زیر نگرانی انجام پارہے ہیں، اور اس حقیقت پر ایمان زبردست تریبی اثر کا حامل ہو سکتا ہے۔ لہذا حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے معصوم امام کے بارے میں اس سلسلے میں بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں۔ چنانچہ امام فرماتے ہیں:

”اذا صار الامر اليه جعل الله له عمودا من نور يبصر به ما يعمل به اهل

كل بلدة“

جب امام کے پاس امامت پہنچتی ہے تو خداوند عالم اس کے لیے نور کا ایک ستون قرار دیتا ہے جس کے ذریعے سے

[۱] تفسیر برہان، اسی آیت کے ذیل میں۔ بحار الانوار جلد ۲۳، ص ۳۲۶ اور اس کے بعد بیسیوں روایات اس بارے میں نقل کی گئی ہیں اور انہیں مجموعی طور پر تو اتر کا درجہ دیا جاسکتا ہے اور اصول کافی، جلد ۲، ص ۱۵۷ اور جلد اول ”باب عرض الاعمال“ میں تفصیل کے ساتھ یہ ذکر موجود ہے۔

وہ ہر شہر کے لوگوں کے اعمال دیکھ سکتا ہے۔<sup>[۱]</sup>

اسی سلسلے کی تیسری آیت بہت سے مفسرین کے بقول پیغمبر اکرمؐ کے حضرت جبرائیلؑ کو دیکھنے کی طرف اشارہ ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں تمام عمر میں دو مرتبہ ان کی اصلی صورت میں مشاہدہ کیا۔ ایک مرتبہ تو بعثت آغاز میں ”جبرائیل“ بالائی افق میں ظاہر ہوئے اور تمام مشرق اور مغرب کو اپنے احاطہ میں لے لیا اور اس قدر باعظمت تھے کہ آنحضرت بھی متعجب ہو گئے۔ اور دوسری مرتبہ معراج کے موقع پر۔ اور سورہ نجم کی آیات بھی اس سے پہلے اور دوسرے مشاہدات کی طرف اشارہ ہیں۔

ان دونوں مشاہدات کے بارے میں ایک اور تفسیر بھی ہے اور وہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ شہود ہے جو آپ کو ذات کر دگار کی طرف سے نصیب ہوا۔ ذات باری تعالیٰ کا یہ مشاہدہ ظاہری آنکھوں سے نہیں بلکہ باطنی آنکھوں سے تھا، اور اس دنیا میں ”لقاء اللہ“ کا روشن مصداق تھا۔ اس کی تفصیل تفسیر نمونہ میں سورہ نجم کی آیات کے ذیل میں بیان ہو چکی ہے۔<sup>[۲]</sup>

بہر حال زیر بحث آیات کہہ رہی ہیں کہ پیغمبرؐ نے دل کی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا وہ حق اور سچ تھا۔ ان کے دل نے جو کچھ دیکھا تھا سب صحیح تھا اور ہرگز جھوٹ نہ تھا۔

یہ تعبیر صورت کشف اور شہود باطنی کے مسئلہ پر ایک شاہد ہے جو انسان کی معرفت کے منابع میں سے ایک منبع ہے۔ انسان بھی عام نہیں رسول اکرمؐ جیسے انسان۔

تفسیر المیزان میں ہم پڑھتے ہیں کہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ خداوند عالم نے یہاں پر مشاہدہ کو قلب کی طرف نسبت دی ہے، کیونکہ انسان ایک اور قسم کے شہودی ادراک کا حامل ہے جو ظاہری حواس کے ساتھ ادراک اور باطنی قوتوں کے ساتھ تحیل اور تفکر سے ماوراء ہے، جیسا کہ ہم اسی شہد کے ساتھ اپنے وجود کا ادراک کرتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم موجود ہیں، ہماری اپنے وجود سے یہ آگاہی نہ تو ظاہری آنکھوں کے ساتھ ہے اور نہ ہی غور و فکر کے ذریعہ سے بلکہ نفس کے سامنے ایک قسم کا ظہور اور حضور ہے، قرآن میں جسے ”فؤاد“ کہا گیا ہے۔<sup>[۳]</sup>

بعض اور مفسرین نے بھی صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ اس آیت میں ”رؤیت“ سے مراد وہی دل کی آنکھوں کے ساتھ مشاہدہ ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت امام علی بن موسیٰ (رضا) علیہ السلام سے آپ کے ایک صحابی نے پوچھا:

”هل رای رسول الله (ص) ربه عز وجل؟“ آیا پیغمبر کریمؐ نے اپنے پروردگار کو دیکھا ہے؟ تو آپ نے جواب میں

ارشاد فرمایا:

[۱] ”منہاج البراعہ فی شرح نوح البلاغہ“ جلد ۵ ص ۲۰۰ (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اس بارے میں احادیث بہت ہیں جو اسی کتاب میں جمع کی گئی ہیں) اور تفسیر برہان میں ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

[۲] تفسیر نمونہ، جلد ۲۲۔

[۳] تفسیر المیزان، جلد ۱۹، ص ۲۹

”نعم بقلبه رآه، اما سمعت الله عزوجل يقول: ما كذب الفواد مآراي، لم يره بالبصر ولكن رآه بالفواد“۔ جی ہاں! انہوں نے خدا کو دل کی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ آیاتم نے خدا کا یہ قول نہیں سنا کہ قلب نے جو کچھ دیکھا جھوٹ نہیں بولتا۔ یقیناً پیغمبر اکرمؐ نے خدا کو ظاہری آنکھوں سے نہیں بلکہ چشم دل کے ساتھ مشاہدہ فرمایا۔<sup>[۱]</sup>

یقیناً ”مشاہدہ قلبی“ سے مراد فکر و استدلال نہیں کیونکہ یہ چیز تو دنیا کے تمام خدا پرستوں اور صاحبان ایمان کو حاصل ہے، صرف پیغمبر اکرمؐ ہی سے مخصوص نہیں۔

چوتھی آیت میں مومنین یا تمام انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”یہ بات وہ نہیں جو تم سمجھتے ہو۔ اگر تمہیں علم الیقین حاصل ہوتا تو تم جہنم کو دیکھ لیتے“ پھر فرماتا ہے ”ثم لترونها عين اليقين“ پھر تم اس کے بعد جہنم کو عین الیقین کے ساتھ دیکھ لو گے۔ آیا یہ مشاہدہ دنیا میں ہوگا یا آخرت میں؟ یا پہلا مشاہدہ دنیا میں اور دوسرا آخرت میں؟ تو اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ جو کچھ ظاہری طور پر آیات سے سمجھا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ دوسری آیت (ثم لترونها عين اليقين) آخرت میں دوزخ کے مشاہدے کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ اس کے بعد فرماتا ہے ”ثم لتسئلن يومئذ عن النعيم“ یعنی پھر اس دن تم سے الہی نعمتوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔

بنابریں قاعدہ کی رو سے پہلی آیت یعنی (لترون الجحيم) دنیا کی طرف اشارہ ہونا چاہیے۔

تفسیر المیزان میں بھی آیا ہے کہ اس آیت کا ظاہر روز قیامت سے قبل دوزخ کا مشاہدہ ہے اور مشاہدہ بھی دل کی آنکھوں کے ساتھ جو ایمان اور یقین کے آثار میں سے ہے، جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کی داستان میں آسمان وزمین کے ملکوت کے مشاہدہ کی بابت مذکور ہے۔

البتہ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں بعض مفسرین ہر دو طرح کی رویت کو قیامت سے مربوط سمجھتے ہیں، لیکن ان دونوں کے فرق و بیان کرنے میں سخت مشکل میں پھنس گئے، جیسا کہ فخر رازی کی تفسیر کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔<sup>[۲]</sup>

بہر حال زیر بحث آیت کا ظاہر بتا رہا ہے کہ ممکن ہے کوئی شخص یقین کے اس مرحلہ پر پہنچ جائے کہ اس کی آنکھوں کے سامنے سے قردے ہٹا دیئے جائیں اور وہ عالم غیب کے بعض حقائق کو دیکھ لے۔

پانچویں آیت کافروں کے بار بار کے تقاضوں کی طرف اشارہ ہے جب وہ کہتے تھے ”ہم پر فرشتے کیوں نہیں نازل ہوتے یا ہم خدا کو کیوں نہیں دیکھتے“ (فرقان ۲۱)

قرآن اس سوال کے جواب میں کہتا ہے کہ جب وہ فرشتوں کو دیکھیں گے تو پانی سر سے گرز چکا ہوگا اور وہ اس وقت خدا کے عذاب میں مبتلا ہو چکے ہوں گے اور اس دن مجرمین کے لیے کوئی خوشخبری نہیں ہوگی۔

[۱] تفسیر نور الثقلین، جلد ۵، ۱۵۳ حدیث ۳۴۔

[۲] تفسیر کبیر، فخر رازی، جلد ۳۲، ص ۸۰

”اس دن“ سے مراد کونسا دن ہے، اس بارے میں مفسرین کے دو نظریے ہیں۔ کچھ تو اسے روز قیامت کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ انسان فرشتوں کو دیکھیں گے، لیکن بعض دوسرے حضرات ان آیات کو پیش نظر رکھ کر جو ”قبض ارواح“ کے فرشتوں کے بارے میں ہیں، کہ اس سے مراد جان کنی کے موقع پر فرشتوں کا مشاہدہ ہے، جیسا کہ سورہ انعام کی آیت ۹۳ میں ہے:

”ولو تری اذا الظالمون فی غمرات الموت والملائكة باسطوا ايديهم

اخرجوا انفسكم“

اگر تو ظالموں کو اس وقت دیکھے جب وہ موت کی لہروں میں پھنسے ہوئے ہیں اور فرشتے اپنے ہاتھوں کو کھولے

ہوئے ہوتے ہیں اور انہیں کہتے ہیں کہ اپنی جانوں کو باہر نکالو۔

یا پھر اس سے مراد مرنے کے بعد اور قیامت سے پہلے فرشتوں کا مشاہدہ ہے۔ اور یہ نظریہ مشہور مفسر ابن عباس سے نقل ہوا ہے۔<sup>[۱]</sup>

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ:

”جب جان کفار کے گلے تک پہنچ جائے گی تو فرشتے ان کے چہرے اور پشت پر ماریں گے اور کہیں گے اپنی جانوں کو باہر نکالو.....

اور یہی ہے معنی اس آیت کا کہ جس میں کہا گیا ہے ”یوم یرون الملائكة لا بشری یومئذ للمجرمین“<sup>[۲]</sup>

اس تفسیر کے مطابق، موت کے قریب ہی انسان کی آنکھوں سے پردے اٹھادیئے جائیں گے اور وہ خدا کے فرشتوں کو دیکھیں گے اور ان پر کشف و شہود کی حالت طاری ہو جائے گی۔

چھٹی آیت ”جنگ بدر“ سے متعلق ہے جس دن کہ شیطان نے مشرکین کے اعمال کو مزین کر کے ان کی آنکھوں کے سامنے پیش کیا تا

کہ وہ کاموں سے امیدوار، دلگرم اور مطمئن رہیں۔

ادھر دوسری طرف سے مشرکین کی فوج قریش اپنی بھاری تعداد اور پوری قوت کے ساتھ (مسلمانوں کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ) مسلمانوں کی صفوں کے سامنے کھڑے تھے اور شیطان مسلسل ان کے دلوں میں یہ بات ڈال رہا تھا کہ اس قدر وسیع، آمادہ اور اسلحہ سے لیس لشکر کے ہوتے ہوئے تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا اور میں بھی تمہارے دوش بدوش تمہاری حمایت کر رہا ہوں۔

لیکن جب جنگ کی آگ بھڑک اٹھی اور فرشتے حکم خدا سے لشکر توحید کی حمایت میں کمر بستہ ہو کر کھڑے ہو گئے تو شیطان پیچھے ہٹ گیا اور آواز دے کر کہا: ”اے مشرکین! میں تم سے بیزار ہوں“ میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے۔ میں مسلمانوں کی فتح کے آثار اور خدائی رحمت اور غیبی امدادوں کی علامتیں دیکھ رہا ہوں میں خدا کی دردناک سزا سے ڈرتا ہوں اور جانتا ہوں کہ خدا کی سزا بہت ہی سخت ہے۔

اس آیت کے دو حصوں کے بارے میں مفسرین کے درمیان تفصیلی گفتگو ہے۔

[۱] تفسیر کبیر فخر رازی، جلد ۲۴، ص ۷۰

[۲] تفسیر برہان، جلد ۳، ص ۱۵۸، حدیث ۱



۱۔ آیا واقعاً ”شیطان“ انسانی صورت میں مجسم ہو کر مشرکین کے سامنے آ گیا تھا اور ان کے دلوں میں اس قسم کی باتیں ڈالی تھیں یا نہیں بلکہ معمول کے مطابق باطنی طور پر ان میں نفوذ کر کے ان کے دلوں میں اثر ڈال رہا تھا؟ بہت سے مفسرین نے پہلے قول کو اختیار کیا ہے اور معروف روایات بھی اس کی تائید کرتی ہیں کہ وہ ”سراقہ بن مالک“ جو قبیلہ ”بنی کنانہ“ کا مشہور و معروف شخص تھا، کی صورت میں ان کے سامنے ظاہر ہوا۔

جس طرح کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت کی داستان میں ہے کہ جب مشرکین مکہ نے ”دار الندوہ“ میں اکٹھے ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کی تجویزوں پر غور و خوض کرنا شروع کیا تو شیطان نے بھی ”مخدیوں“ کی صورت اختیار کر کے ان کی میٹنگ میں شرکت کی تھی۔ اور یہ کوئی ناممکن بات نہیں ہے کہ شیطان مجسم ہو کر سامنے آجائے، جس طرح کہ فرشتوں کے بارے میں یہ بات ممکن ہے۔ (جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ اور جناب مریمؑ کی داستان میں بیان ہوا ہے)۔

ب۔ آیا واقعاً شیطان نے فرشتوں کو دیکھ لیا تھا کہ وہ میدان میں اتر چکے ہیں یا نہیں۔ بلکہ جب اس نے میدان جنگ میں غیر متوقع کامیابی کے آثار دیکھے تو اس نے فرشتوں کے نزول اور غیبی امداد کا یقین کر لیا؟ تو اس مقام پر بھی دو نظریے ہیں۔ بہت سے مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس سے مراد وہی فرشتوں کا دیکھنا ہے اور بعد کی آیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو میدان بدر میں فرشتوں کے نزول کو صریحاً بیان کر رہی ہیں، آیت کا ظاہر بھی یہی ہے۔

اس طرح سے ”مومنین“ اور ”مشرکین“ میں سے کوئی بھی میدان جنگ بدر میں فرشتوں کی موجودگی کو نہیں دیکھ رہا تھا جبکہ شیطان کی آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹائے جا چکے تھے اور وہ فرشتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ شیطان کے لیے ایک قسم کا کشف و شہود تھا جو ایک خاص مقصد کے تحت خدا کے حکم سے معرض وجود میں آیا۔

ساتویں آیت حضرت یوسفؑ کی داستان کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب حضرت یعقوبؑ کے فرزند ایک کاروان کے ہمراہ خوشی خوشی مصر سے کنعان کی طرف چل پڑے تھے اور اپنے بھائی جناب یوسفؑ کو تخت قدرت پر دیکھ چکے تھے اور ان کا گرتا باپ کی ”روشنی چشم کے لیے“ تحفہ لیے جا رہے تھے۔ جو نہی قافلے نے مصر سے حرکت کی یعقوب علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا ”میں یوسفؑ کی خوشبو سونگھ رہا ہوں، اگر تم مجھے نادانی کی نسبت نہ دو“ یقیناً یعقوب علیہ السلام سچ فرما رہے تھے اور دروازے کے فاصلے سے یوسفؑ کے گرتے کی خوشبو سونگھ رہے تھے۔ یہ ایک ایسا کام تھا جو عام قسم کی قوتِ شامہ کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ساتھیوں میں سے کسی نے اس چیز کو باور نہیں کیا تھا کیونکہ انہوں نے اس طرح محسوس نہیں کیا تھا۔ اسی لیے انہوں نے اللہ کے بزرگ نبی کو گمراہی کی نسبت دیتے ہوئے کہا: ”تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِي ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ“ یعنی خدا کی قسم تم تو اپنی سابقہ غلط فہمیوں اور گمراہی پر ہی ہو۔

لیکن جب برادران یوسفؑ آگئے تو معلوم ہوا کہ حق پیر کنعان کے ساتھ ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ ”مصر“ اور ”کنعان“ کے درمیان دس دن کا فاصلہ ہے اور بعض میں آٹھ دن کا اور بعض میں دس

فرخ کا۔ [۱]

کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس آیت کو مجاز پر حمل کریں اور کہیں کہ یوسفؑ کے پیراہن کی خوشبو سوگھنا اس بات سے کنایہ تھا کہ ان کی عنقریب ملاقات ہونے والی ہے اور یہ چیز باپ کے دل پر الہام ہوئی تھی (جیسے بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ اسلام کی کامیابی کی خوشبو سوگھنے میں آ رہی ہے) کیونکہ ادبیات کے مسلم قواعد کی رو سے جب تک الفاظ کا حقیقت پر عمل کرنا ممکن ہے، مجاز پر حمل کرنا جائز نہیں ہوگا۔

اور آخر میں ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو ”مکاشفہ“ ہوا تھا، پردے ہٹ چکے تھے اور وہ اس ظاہری احساس سے مافوق ایک اور احساس کی وجہ سے اپنے فرزند یوسفؑ کے پیراہن کی خوشبو سوگھ رہے تھے۔

زیر بحث آیات کے سلسلے میں آٹھویں اور آخری آیت حضرت مریم علیہا السلام کے سامنے خدا کے فرشتے کا مجسم اور مثل ہو کر آنے کو قرآن مجید صراحت کے ساتھ کہہ رہا ہے:

”مریم اپنے کنبے سے جدا ہو کر مشرقی طرف (بیت المقدس) چلی گئیں۔ اپنے اور لوگوں کے درمیان پردہ ڈال دیا (یہ پردہ یا تو اس لیے تھا تا کہ اطمینان خاطر کے ساتھ مکمل طور پر اپنے رب کی عبادت کر سکیں اور اس کے ساتھ راز و نیاز میں مشغول رہیں۔ یا پھر نہانے دھونے کے لیے تھا) جو کچھ بھی تھا، ایسی حالت میں خدا کی روح یعنی وہ عظیم فرشتہ ان کی طرف آیا اس وقت وہ بالکل صحیح سالم اور ہر قسم کے عیب اور نقص سے پاک، انسانی صورت میں ان کے سامنے آ موجود ہوا۔ مریم نے پہلے تو اس سے وحشت کی، لیکن پھر فوراً سمجھ لیا کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا فرشتہ ہے اور حضرت مسیحؑ کی ولادت کی خوشخبری دینے کے لیے آیا ہوا ہے، اور وہ اس کے ساتھ گفتگو کرنے لگیں۔

یہ داستان سورہ مریم کی آیات میں تفصیل سے مذکور ہے۔ [۲]

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ خدا کا فرشتہ حضرت مریم کی حسن پینائی کے سامنے یوں مجسم ہوا (نہ کہ ظاہری حالت میں) لیکن یہ نظریہ آیت کے ظاہر کا مخالف ہے اور اس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے قرآن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شہود صرف اور صرف حضرت مریم علیہا السلام کے لیے واقع ہوا تھا، اگر کوئی اور وہاں پر موجود ہوتا تو شاید وہ اسے نہ دیکھ سکتا۔ بنا بریں ممکن ہے کہ یہ آیت غیر انبیاء کے لیے امکان شہود کے مسئلہ پر ایک اور قرینہ ہو۔

[۱] تفسیر مجمع البیان، جلد ۵، ص ۲۶۲، تفسیر فخر رازی، جلد ۱۸، ص ۲۰۷

[۲] تفسیر نمونہ، جلد ۱۳، سورہ مریم کی تفسیر۔

نتیجہ

اس وقت تک جو کچھ کہا گیا ہے اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ شناخت اور معرفت کے جو منابع اب تک شمار کیے گئے ہیں ان کے علاوہ ایک اور منبع بھی ہے جو کئی لحاظ سے ہمارے لیے نامعلوم اور مبہم ہے، لیکن قرآنی آیات سے یہ بات بخوبی سمجھی جاتی ہے کہ اس قسم کا منبع موجود ہے جو صرف انبیاء اور آئمہ ہی کو نہیں بعض اوقات کئی دوسرے لوگوں کو بھی حاصل ہوتا ہے، کیونکہ بالفرض اگر ہم مندرجہ بالا بعض آیات کی دلالت کے بارے میں شک بھی کریں تاہم مجموعی طور پر مدعا کے ثبوت کے لیے کافی ہیں۔

البتہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم ہر اس شخص کی باتوں کو مان لیں جو بھی اس کا دعویٰ کرے۔ اس سے تو ناجائز مفاد اٹھانے کی راہیں کھل جائیں گی۔ اسی لیے اس موضوع کے لیے کئی علامات ہیں جو انشاء اللہ بعد میں بیان ہوں گی۔

## چند توضیحات

### 1۔ روایت میں کشف و شہود کے چند دلچسپ نمونے

معرفت کے اس منبع پر دلالت کرنے والی روایات کم نہیں ہیں۔ اور ”علم حدیث“ کی اصطلاح میں حد ”استفاضہ“ تک پہنچی ہوئی ہیں۔ مندرجہ ذیل روایات اس قسم کے چند نمونے ہیں۔

1۔ جنگ ”احزاب“ (خندق) کی تاریخ میں ہے کہ ایک دن مدینہ کے اطراف میں خندق کی کھدائی کے دوران (جو کہ مشرکین کے لشکر کے حملوں سے بچاؤ کا ذریعہ تھا) سخت اور بڑے پتھر کا ایک ٹکڑا ظاہر ہوا۔ یہ ایک ایسا پتھر تھا جس کو نہ تو مجاہدین اسلام ہلا سکتے تھے اور نہ ہی توڑ سکتے تھے، کیونکہ اس پر کوئی بھی ہتھوڑا کارگر نہیں ہوتا تھا۔ مسلمانوں نے رسالت مآب کی خدمت میں یہ خبر پہنچائی تو آنحضرتؐ بذات خود خندق میں تشریف لے گئے اور ہتھوڑا پتھر کے سر پر مارا جس سے کچھ حصے ٹوٹ کر الگ جا گرا، اور ایک بجلی کی سی چمک پیدا ہوئی۔ یہ دیکھ کر آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح کی تکبیر بلند کی۔ یہ سن کر مسلمانوں نے بھی تکبیر کہی۔

آپؐ نے پھر زور سے ہتھوڑا مارا، اسی طرح کچھ پتھر اور ٹوٹ کر اس سے الگ ہو گئے اور بجلی کی سی چمک پیدا ہوئی آنحضرتؐ نے بھی تکبیر کہی اور مسلمانوں نے بھی۔

آپؐ نے پھر تیسری بار وار کیا تو تمام پتھر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اسی طرح آپؐ نے بھی تکبیر کہی اور مسلمانوں نے بھی۔

حضرت سلمان کہتے کہیں میں نے آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان تکبیروں کا سبب دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا:

بجلی کی پہلی چمک میں میں نے سرزمین ”حیرہ“ اور ”ایرانی بادشاہوں کے محلات دیکھا“ اور جبرائیل نے مجھے خوشخبری دی ہے کہ میری امت انہیں فتح کرے گی، دوسری چمک میں ”روم اور شام کے سرخ محلات“ کو دیکھا

اور جبرائیل نے مجھے خبر دی کہ میری امت انہیں بھی فتح کرے گی، اور تیسری چمک میں مجھے صنعا، اور یمن کے محلات نظر آئے اور جبرائیل نے انہیں بھی فتح کرنے کی خوشخبری سنائی ہے۔ مسلمانو! تمہیں بھی خوشخبری ہو!! ﴿۱﴾

البتہ اس دور کے منافقین ان حقائق کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ لہذا انہوں نے اس چیز کا مذاق اڑانا شروع کر دیا اور کہنے لگے: ”یہ بڑی عجیب بات ہے کہ وہ مدینے میں بیٹھ کر ایران، روم اور یمن کے بادشاہوں کے محلات کی خوشخبری دے رہے ہیں، حالانکہ اس وقت خود مُٹھی بھر عربوں کے گھیرے میں ہیں۔ کیا بے بنیاد اور بے تکی باتیں ہیں؟

لیکن بعد کے حالات نے ثابت کر دکھایا کہ پینتھمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس خاص شہود میں اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا تھا وہ بالکل حقیقت تھی۔

ممکن ہے کہ کچھ لوگ اس موقع پر ”مشاہدہ“ اور ”رؤیت“ کو اس کے مجازی معنوں پر محمول کریں لیکن ایسی کوئی دلیل نہیں ملتی کہ ہم اسے مجازی پر حمل کریں جبکہ حقیقی معنی پر حمل کرنا ممکن ہے۔

۲۔ جنگ موتہ (جو جزیرہ نماے عرب کے شمال میں مشرقی روم اور مسلمانوں کے درمیان واقع ہوئی) اس جنگ کی داستان میں ہم پڑھتے ہیں کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

(جب مسلمان جعفر بن ابی طالب کی کمان میں رومی فوجوں سے لڑنے کے لیے ”موتہ“ جا چکے تھے تو) ایک دن پینتھمبر اکرم مسجد میں تشریف فرما تھے۔ اچانک زمین کی تمام بلندیاں اور پستیاں آپ کے سامنے ہموار ہو گئیں اور آپ نے (میدان موتہ) میں جعفر کو دیکھا کہ وہ کفار کے ساتھ لڑ رہے ہیں۔ آنحضرت نے فرمایا: جعفر شہید ہو گئے۔ ﴿۲﴾

بعض روایات میں اس بارے میں قدرے زیادہ تفصیل ہے اور وہ یہ ہے کہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صبح کی نماز کے بعد منبر پر تشریف لے گئے اور لوگوں کے سامنے جنگ موتہ کے تفصیلی حالات بیان کرنے لگے اور حضرات جعفر صادق بن ابی طالب، زید بن حارثہ اور عبد اللہ بن رواحہ کی شہادت کے تفصیلی حالات بیان فرمائے۔ یوں معلوم ہوتا تھا گویا آپ میدان جنگ کو اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ مشہور تاریخوں کے مطابق آپ نے اسی دوران یہ بھی فرمایا:

”یہ تینوں شہد سونے کے تخت پر بہشت کی جانب لے جائے جا چکے ہیں اور میں نے اس بارے میں پوچھا تو جواب ملا، جعفر اور زید نے پورے عزم راسخ کے ساتھ قدم بڑھائے لیکن عبد اللہ نے اپنے اندر تھوڑے سے

﴿۱﴾ کامل ابن اثیر، جلد ۲، ص ۹۷ اور سیرت ابن ہشام میں بھی یہی ماجرا تھوڑے سے فرق کے ساتھ موجود ہے۔

﴿۲﴾ بحار الانوار، جلد ۲۱، ص ۵۸، حدیث ۹

## شک سے کام لیا پھر آگے بڑھا۔ [۱]

(”میں نے دیکھا“ کی تعبیر روایت کے اس حصے میں بڑی معنی خیز ہے جو شہود کا ایک نمونہ ہے۔)

۳۔ ”وان من اهل الكتاب لمن يؤمن بالله وما انزل اليكم وما انزل اليهم“ کی تفسیر میں ایک حدیث میں آیا ہے کہ اس آیت کا شان نزول ”حبشہ“ کا بادشاہ ”نجاشی“ ہے۔ چنانچہ جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوا تو اس کی موت کی خبر آنحضرتؐ کو جبرائیل امینؑ نے پہنچائی، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ”باہر آ جاؤ اور اپنے اس بھائی پر نماز پڑھو جو دوسری سرزمین میں فوت ہوا ہے“ صحابہ کرام نے عرض کی ”حضور وہ کون ہے؟“ تو آپؐ نے فرمایا ”نجاشی“ ہے!

پھر سب لوگ قبرستان بقیع میں آئے اور مدینہ سے سرزمین حبشہ آنحضرتؐ کی مبارک آنکھوں کے سامنے ظاہر ہوئی، آپؐ نے نجاشی کے تابوت کو دیکھا اور اس پر نماز (جنازہ) پڑھی۔ [۲]

۴۔ حضور پاکؐ کی والدہ گرامی جناب آمنہ علیہا السلام کی تاریخ زندگی میں لکھا ہے کہ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے شکم مبارک میں تھے تو ایک فرشتے نے جناب آمنہؓ سے کہا ”آپ کے شکم بارک میں اس امت کا سردار اور آقا ہے۔ جب وہ پیدا ہو تو آپ کہیں کہ میں اسے ہر حاسد کے شر سے خدا کی پناہ میں دیتی ہوں۔ پھر آپ اس کا نام ”محمد“ رکھیں“ چنانچہ اس معظم خاتون نے حمل کے دوران ہی مشاہدہ فرمایا کہ آپ کے جسم مبارک سے ایک نور ظاہر ہوا جس سے انہوں نے سرزمین شام میں ”بصری“ کے محلات کا مشاہدہ کیا۔ [۳]

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ انبیاء اور آئمہ کے علاوہ دوسرے لوگوں پر بھی کشف و شہود طاری ہو سکتا ہے۔

۵۔ حضرت علیؑ علیہ السلام سے ایک مشہور روایت ہے، آپؑ فرماتے ہیں کہ:

”میں ایک دن فدک کے ایک باغ میں کام کر رہا تھا جبکہ فدک حضرت زہراؑ کو منتقل ہو چکا تھا، تو اچانک دیکھا کہ ایک اجنبی عورت بڑے اطمینان کیساتھ میرے پاس آئی، اس وقت میرے ہاتھ میں نیلچہ تھا جس سے میں کام میں مشغول تھا۔ اس نے آتے ہی کہا:

”دائے ابوطالب کے بیٹے! کیا آپ میرے ساتھ عقد کرنے کے لیے تیار ہیں؟ اس طرح سے میں آپ کو نیلچے چلانے سے بے نیاز کر دوں گی اور زمین کے ایسے خزانے آپ کو بتاؤں گی کہ آپ اور آپ کی اولاد ساری زندگی دولت سے مالا مال رہیں گے“

میں نے کہا: تو کون ہے؟ تاکہ تیرے خاندان والوں سے تیری خواستگاری کروں گا“

اُس نے کہا: میں دنیا ہوں“

[۱] کامل ابن اثیر، جلد ۲، ص ۲۳

[۲] بحار الانوار، جلد ۸، ص ۴۱۱

[۳] سیرة ابن ہشام، جلد ۱، ص ۱۶۶

میں نے کہا: تو واپس چلی جا، اور میرے علاوہ کسی اور کو جا کر اپنا شوہر بنا، پھر میں نے یہ اشعار پڑھے،  
(ان اشعار کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت امامؑ لوگوں کو دنیا کے فریب سے باخبر کرتے ہوئے اس سے جینے کی تاکید کرتے ہیں اور اس  
دنیاوی زندگی کی ناپائیداری کے متعلق اپنی معلومات کا اظہار فرماتے ہیں اور اسے فرماتے ہیں کہ جاکسی اور کو جا کر فریب دے، کیونکہ میں تجھے  
اچھی طرح پہچانتا ہوں)۔ [۱]

ممکن ہے کچھ لوگ اس روایت کو بھی ”تشبیہ“، ”تمثیلی“ یا ”مجاز“ پر محمول کریں، لیکن اگر ہم روایت کے ظاہر کا بھی تحفظ کریں تو اس کا معنی  
یہ ہوگا کہ عالم مکاشفہ میں دنیا کی حقیقت ایک فریب کار خوب صورت عورت کی صورت میں امامؑ کے سامنے آئی اور آپؑ نے اسے نفی میں جواب  
دے کر واپس بھیج دیا۔

اس سے ملتا جلتا واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بھی ہے کہ دنیا ان کے سامنے بھی ایک فریب کار عورت کی صورت میں مجسم ہو کر  
آئی تھی۔ [۲]

۶۔ حضرت امام سجاد علی بن الحسین زین العابدین کے حالات میں ہے کہ (جب عبد اللہ بن زبیر کے فتنہ نے تمام حجاز کو اپنی لپیٹ میں  
لے رکھا تھا اور سب لوگ اس فکر میں تھے کہ آخر اس کا کیا انجام ہوگا؟) امام علیہ السلام فرماتے ہیں:  
”میں گھر سے باہر آیا ہوا تھا۔ ایک دیوار کے پاس پہنچ کر اس کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ (اور سوچ رہا تھا) کہ اچانک ایک مرد کو  
دیکھا جس نے سفید کپڑے زیب تن کیے ہوئے تھے، وہ میرے پاس آ کر کہنے لگا:

”اے علی بن الحسین! آپ کیوں غمگین اور مغموم نظر آ رہے ہیں۔ آیا آپ کو دنیا کا غم ہے؟

خدا کا رزق تو ہر نیک اور بد سب کے لیے آمادہ ہے

میں نے کہا: نہیں، مجھے دنیا کا غم نہیں ہے۔ اور حقیقت وہی ہے جیسے آپ کہہ رہے ہیں۔

اس نے کہا: پھر آخرت کا غم ہے؟ وہ تو خدا کا وعدہ برحق ہے، سلطانِ قاہر (یا قادر) اس دن فیصلہ کرے گا۔

میں نے کہا: نہیں آخرت کا غم بھی نہیں ہے! اور حقیقت وہی ہے جو آپ کہتے ہیں۔

اس نے کہا: ”تو پھر غم کس بات کا ہے؟“۔

میں نے کہا: عبد اللہ بن زبیر کے فتنہ سے گھبراہوں کہ لوگوں کی کیا حالت ہو رہی ہے۔

وہ مسکرا کر کہنے لگا: اے علی بن الحسین! آیا آپ نے اب تک کسی کو دیکھا ہے کہ اس نے خدا کو پکارا ہو اور خدا نے اسے جواب

نہ دیا ہو؟

[۱] مکاسب شیخ انصاری، منقول از ”امام جعفر صادق علیہ السلام کا خط والی اہواز“ ”نجاشی“ کے نام، (بحث ولایت جاز)

[۲] بحار الانوار، جلد ۷۰، ص ۱۲۶، باب ”حب الدنیا و ذہما“ حدیث ۱۲۰۔

میں نے کہا: نہیں!

اس نے کہا: ”اچھا تو کسی کو دیکھا ہے کہ اس نے خدا پر توکل کیا ہو اور خدا نے اس کی مشکل دور نہ کی ہو؟“

میں نے کہا: ”نہیں!“

اس نے کہا: ”تو پھر کسی کو دیکھا ہے کہ اس نے خدا سے درخواست کی ہو اور خدا نے اسے عطا نہ کیا ہو؟“

میں نے کہا: ”نہیں!“

اس نے کہا اور میری آنکھوں سے غائب ہو گیا۔<sup>[۱]</sup>

۷۔ انہی حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے منقول ہے، آپ نے فرمایا:

”گویا میں دیکھ رہا ہوں قبر حسین علیہ السلام کے ارد گرد محل اور خوبصورت عمارتیں بن چکی ہیں اور گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ قبر کے چاروں طرف بازار لگے ہوئے ہیں۔ کوئی دن اور رات ایسی نہیں ہے جس میں روئے زمین کے لوگ وہاں نہ آ رہے ہوں، اور یہ اس وقت ہوگا جب نبی مروان کی حکومت منقرض ہو جائے گی۔<sup>[۲]</sup>

۸۔ امالی شیخ صدوق میں ”حزبن یزید ریاحی“ کے حالات میں مذکور ہے، وہ کہتے ہیں کہ:

**”لباخرجت من الكوفة نوديت يا حרב الجنة، فقلت ويل للحري بشر**

**بالجنة وهو يسير الى حرب ابن بنت رسول الله (ص)“**

”جب میں کوفہ سے باہر نکلا تو مجھے ایک آواز سنائی دی کہ اے حُر! تجھے جنت کی خوشخبری ہو، لیکن میں نے اپنے

آپ سے کہا پھٹکار ہے حُر پر! اسے بہشت کی کیونکر خوشخبری دی جا رہی ہے جبکہ وہ رسول کے نواسے کے ساتھ

جنگ کرنے جا رہا ہے۔<sup>[۳]</sup>

۹۔ ایک اور روایت میں رسول پاک کی زوجہ محترمہ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حضرت امام حسین علیہ السلام کے ساتھ

گفتگو کا تذکرہ ہے جس میں امام علیہ السلام نے انہیں سرزمین کربلا کی زیارت کرائی اور اپنی شہادت کا مقام انہیں دکھایا۔<sup>[۴]</sup>

۱۔ مکاشفہ کے بارے میں بزرگ علماء، بافقوی افراد اور سچے مؤمنین کے حالات میں بھی بہت سے مکاشفات نقل کیے گئے ہیں جن

کو بیان کرنے سے کتاب طولانی ہو جائے گی۔ لیکن اتنا ضرور کہیں گے کہ ان مکاشفات کی فہرست اس قدر طویل ہے کہ خبر واحد سے باہر اور علم

[۱] اصول کافی، جلد ۲، باب تفویض الی اللہ، حدیث ۲۵۔

[۲] بحار الانوار، جلد ۹۸، ص ۱۱۴، ”کتاب المزار“، حدیث ۳۶۔

[۳] امالی صدوق، ص ۹۳، مجلس ۳۰۔

[۴] مدینۃ المعجزہ، ص ۲۴۴۔



حدیث کی اصلاح میں خبر مستفیض کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ اور اس بارے میں ہماری بہترین موید ثابث ہو سکتی ہے۔

## ۲۔ پردے کیونکر اٹھتے ہیں؟

مندرجہ بالا احادیث و روایات جو کہ کشف و شہود کا عملی نمونہ ہیں کے علاوہ کچھ ایسی تعبیرات بھی روایات میں بیان ہوئی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے انسان کا ایمان اور یقین جتنا پڑھتا جائے گا اور گناہوں اور بُری صفات کی وجہ سے جو پردے دل پر پڑے ہوئے ہیں، وہ اس سے ہٹتے جائیں گے، اس کے لیے کائنات کے بہت سے حقائق منکشف ہوتے جائیں گے۔ آخر کار وہ یقین کی اس منزل تک جا پہنچے گا کہ ابراہیمؑ کی مانند زمین و آسمان کی ملکوت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔

انسان کا قلب و روح اس آئینہ کی مانند ہے جس پر گناہ و معصیت کا زنگ اور برے اخلاق کی گرد پڑ جاتی ہے اور وہ کسی حقیقت کو منعکس نہیں کر پاتا، لیکن جب وہ توبہ کے پانی سے اس گرد و غبار کو دھو ڈالتا ہے اور تہذیبِ نفس کے ذریعہ اس زنگ کو دور کر کے اسے صیقل کر دیتا ہے تو حقیقت اس میں پرتو افگن ہو جاتی ہے اور صاحبِ قلب محرم اسرار الہی بن جاتا ہے اور جن بیخامات کو نامحرم لوگوں کے کان سننے سے محروم ہوتے ہیں، وہ انہیں سن لیتا ہے۔

درج ذیل احادیث اس بات کی گواہ ہیں۔

۱۔ عیسیٰؑ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں:

”لولا ان الشیاطین یحرمون الی قلوب بنی آدم لنظر والی الملکوت“

”اگر شیاطین نے بنی آدم کے دلوں کو نہ گھیرا ہوا ہوتا تو وہ ملکوتی کائنات کو دیکھ لیتے۔“ [۱]

۲۔ ایک اور روایت میں آنحضرتؐ ہی سے منقول ہے:

”لیس العلم بکثرة التعلم و انما العلم نور یقذفہ اللہ فی قلب من

یحب، فیفتح لہ، و یشاہد الغیب، و ینشرح صدرہ، فیتحمل البلاء، قبیل

یا رسول اللہ و هل لذلک من علامۃ؟ قبیل التجانی عن دار الغرور، والا

نابة الی دار الخلود والاستعداد للموت قبل نزولہ“

”حقیقی علم زیادہ پڑھنے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک ایسا نور ہوتا ہے جسے خداوند عالم اس شخص کے دل میں ڈال دیتا ہے جس کو وہ دوست رکھتا ہے۔ اس کے دل کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور وہ غیب کو

[۱] بحار الانوار، جلد ۷ ص ۵۹، باب باب القلب وصلاح، حدیث ۳۹

دیکھنے لگتا ہے، سینہ کشادہ ہو جاتا ہے اور وہ بلا اور آزمائش کا مقابلہ کرنے کے لیے پختہ ہو جاتا ہے! کسی نے پوچھا یا رسول اللہ! اس کی کوئی علامت بھی ہے؟ تو آپ نے فرمایا اس کی علامت دنیا سے بے اعتنائی اور آخرت کی طرف توجہ اور موت کے آنے سے پہلے اس کے لیے (اعمالِ صالح کے ساتھ) مکمل تیاری ہے۔<sup>[۱]</sup>

۳۔ نوح البلاغہ میں ان لوگوں کی تعریف ہے جو زمین میں لوگوں پر خدا کی حجت ہیں، علیٰ فرماتے ہیں:

”جعم بہم العلم علی حقیقة البصیر و بأشروا روح الیقین،  
واستلنوا ما استعورہ المترفون، وانسوا بما استوحش منه الجاہلون،  
وصحبوا دنیا بآبدان، ارواحها معلقة بالمحل الاعلیٰ، اولئک خلفاء اللہ  
فی ارضہ، والدعاة الی دینہ“

”علم اور دانش ان کی حقیقت بینائی کی طرف متوجہ ہو چکے ہیں اور خود وہ روح یقین کے ساتھ مل چکے ہیں، جس چیز کو ہوس باز دنیا پرست مشکل سمجھتے ہیں وہ ان کے لیے آسان ہے اور جس چیز سے جاہل لوگ وحشت کھاتے ہیں وہ اس کے ساتھ مانوس ہیں اور دنیا میں ایسے ابدان کے ساتھ زندہ رہتے ہیں کہ جن کی روہیں عالم بالا کے ساتھ پیوند ہیں۔ وہ زمین میں خدا کے ہیں اور دین خدا کی طرف دعوت دینے والے ہیں۔“<sup>[۲]</sup>

۴۔ ”ذعلب یمانی“ حضرت امیر علیہ السلام کے سخور اور زیرک دوستوں میں سے تھے۔ نوح البلاغہ میں ان کی ایک مشہور داستان ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے ایک دن حضرت امیر سے یہ عجیب سوال کیا:

ذعلب: ”هل رأیت ربک یا امیر المومنین؟“ یا علی! آپ نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟

امام: ”افاعبد ما لا اری“ تو کیا جس کو میں نہ دیکھوں اس کی عبادت کروں؟

ذعلب: ”و کیف تراہ؟“ تو پھر آپ اسے کیونکر دیکھتے ہیں؟

امام: ”لا تدرکہ العیون بمشاهدة العیان، ولكن تدرکہ القلوب بحقائق الایمان“ ظاہری آنکھیں حسی مشاہدہ کے ساتھ اسے نہیں دیکھ سکتیں، لیکن قلوب (دل) اسے حقائق ایمان کے ساتھ درک کر لیتے ہیں۔ (اور دیکھ لیتے ہیں)۔  
پھر فرمایا:

”قرب من الاشیاء غیر ملابس، بعید منها غیر مباین“

[۱] تفسیر الصراط المستقیم جلد ۱ ص ۲۶۷

[۲] نوح البلاغہ، کلمات قصار، کلمہ ۱۴۷

”وہ ہر شے کے نزدیک لیکن اس طرح سے نہیں کہ اس کے ساتھ چمٹا ہوا ہوا اور ہر چیز سے دور ہے لیکن ایسے نہیں

کہ اس سے بیگانہ ہو۔“ [۱]

ظاہر ہے امام علیہ السلام کی مراد عقلی دلائل کے ساتھ وجود خدا کی پہچان نہیں ہے کیونکہ یہ مقام تو ہر خدا پرست کو حاصل ہے حتیٰ کہ وہ بڑھیا بھی اس راہ کو طے کر چکی ہے جس نے اپنے چرنے کے معروف استدلال سے عظیم چرخ گردوں کے چلانے والے کا پتہ بتایا۔ پس اس سے مراد وہ درک اور نظر ہے جو اس درک و نظر سے بالاتر ہے اور اندرونی شہود ہے جو اس قدر روشن ہے کہ گویا اسے یہ آنکھیں دیکھ رہی ہوتی ہیں۔ (غور کیجیے گا)

۵۔ امیر المؤمنین علیہ السلام ہی کی ایک معروف حدیث ہے کہ:

”لو كشف الغطاء لبا از ددت یقیناً“

”اگر پردے ہٹا بھی دیئے تا ہم میرے یقین میں اضافہ نہیں ہوگا۔“ [۲]

یعنی میں اس وقت تک تمام حقائق کو غیب کے پس پردہ سے اندرونی شہود کے ساتھ دیکھ رہا ہوں اور میری چشم بصیرت پردوں کو ٹنکا فتہ کر کے غیب کے پردوں سے پار نکل جاتی ہے۔

۶۔ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں:

”الا ان للعبد اربع اعین: عینان یبصر بہما امر دینہ و دنیاہ، و عینان

یبصر بہما امر آخرتہ، فاذا اراد اللہ بعد خیر افتح لہ العینین اللتین فی

قلبہ، فابصر بہما الغیب و امر آخرتہ“

”تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہر بندے کی چار آنکھیں ہیں۔ دو آنکھیں تو وہ جن کے ذریعہ وہ دین اور دنیا کے کاموں کو دیکھتا ہے اور دو آنکھیں وہ ہیں جن کے ذریعہ وہ اپنی آخرت کے کاموں کو دیکھتا ہے۔ جب خداوند عالم کسی بندے سے نیکی کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اس کے دل کی اندرونی آنکھوں کو کھول دیتا ہے تاکہ وہ غیب اور

[۱] نوح البلاغہ، خطبہ ۱۷۹

[۲] اس حدیث کے بارے میں بحث کرتے ہوئے ابن سینا نے ”معراج نامہ“ میں ”علی بن فضل اللہ جبلائی سے یہ چیز نقل کی ہے کہ ”یقیناً چونکہ بصیرت کی آنکھوں کے ساتھ ہی عقل اسرار کا ادراک کرتی ہے جو تمام حقائق کے درک کرنے اور دیکھنے کا حکم دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولا علی نے فرمایا ”لو كشف الغطاء لبا از ددت یقیناً“ (منقول از ترجمہ تفسیر نوح البلاغہ جلد ۷ ص ۱۳۹)

آخرت کے امر کو دیکھئے۔<sup>[۱]</sup>

اسی سے ملتی جلتی ایک اور روایت ہے جو حقیقی شیعوں کے بارے میں وارد ہوئی ہے۔<sup>[۲]</sup>  
 ۷۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک روایت میں ہم پڑھتے ہیں کہ ایک مرتبہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سامنا آپ کے ایک صحابی ”حارثہ“ سے ہوا۔ آنحضرت نے ان سے پوچھا:  
 ”حارثہ! تمہارا کیا حال ہے؟“

حارثہ: ”انا یا رسول اللہ مومن حقا“ اے رسول خدا! میں صحیح معنوں میں مومن ہوں  
 فرمایا: ”لک شیء حقیقۃ و ما حقیقۃ قولک؟“ ہر چیز کی حقیقت اور علامت ہوتی ہے، تمہاری اس بات کی کیا علامت ہے؟  
 حارثہ: ”وہ علامت یہ ہے کہ میں دنیا سے بالکل بے اعتنا ہوں، رات کو بیدار رہتا (اور عبادت کرتا) ہوں، سخت گرمی میں پیاسا رہتا  
 (اور روزہ رکھتا) ہوں، گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے پروردگار کا عرش حساب کے لیے آمادہ ہے اور گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ اہل بہشت، بہشت  
 میں ایک دوسرے سے ملاقات کر رہے ہیں اور گویا میں جہنمیوں کی جہنم میں چیخ و پکار سن رہا ہوں“  
 فرمایا: ”عبد نور اللہ قلبہ، ابصر فاثبت“ یہ ایسا بندہ ہے خدا نے جس کے دل کو نورانی بنا دیا ہے۔ تو نے حقیقت کو دیکھ لیا  
 ہے۔ اسی پر ثابت قدم رہ۔

حارثہ: ”یا رسول اللہ! ادع اللہ لی ان یرزقنی الشهادة معک“ اللہ کے رسول! آپ خدا سے دعا کریں کہ میں آپ کی مدد  
 کرتا ہوا شہید ہو جاؤں۔“

فرمایا: ”اللهم ارزق حارثہ الشهادة“ خداوند! حارثہ کو شہادت نصیب فرما۔  
 ابھی چند دن ہی گزرے تھے، پیغمبر اکرم نے کچھ لوگوں کو جنگ کے لیے بھیجا جس میں یہی ”حارثہ“ بھی تھے۔ انہوں نے جنگ کی  
 اور ۸ یا ۹ لوگوں کو قتل کرنے کے بعد جام شہادت نوش فرمایا۔<sup>[۳]</sup>  
 ۸۔ کتب اہلسنت میں پیغمبر اکرم کی ایک حدیث درج ہے کہ:

”لولا تکثیر فی کلامکم و تمریج فی قلوبکم لرأیتم ما اری و لسمعتوم

ما اسمع“

”اگر تم زیادہ باتیں نہ کرتے ہوتے اور فساد کے لیے تمہارے دلوں میں آزادی نہ ہوتی تو تم بھی وہی کچھ دیکھتے

[۱] نخصال صدوق ص ۲۶۵ حدیث ۹۰

[۲] بحار الانوار جلد ۶ ص ۵۸ حدیث ۳۵

[۳] اصول کافی جلد ۲، باب حقیقۃ الایمان والیقین، حدیث ۳

جو میں دیکھتا ہوں، اور وہی کچھ سنتے جو میں سنتا ہوں۔ [۱]

یہ اور اس قسم کی دوسری احادیث روحانی مکاشفات کے ایمان اور یقین کے ساتھ رابطے کو واضح کرتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ انسان کے معنوی ارتقاء کے ساتھ ممکن ہے کہ اسے اس طرح ادراک اور نظر حاصل ہو جائیں، ایسے ادراک اور نظر جن کے متعلق ہمیں اس سے زیادہ اور کچھ معلوم نہیں کہ یہ ہیں اور بس!

## ۳۔ قرآن میں سات سچے خواب

شہود اور مکاشفہ کی ایک قسم ”رویائے صادقہ“ ہیں، یعنی ایسے خواب جو حقیقت کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور صحیح ثابت ہوتے ہیں۔ اس قسم کے خوابوں کو مکاشفہ کی ایک قسم سمجھا جاتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ روحانی فلاسفہ کا نظریہ ہے کہ خواب اور رویا کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں جبکہ اس کے برخلاف مادی فلاسفہ خواب اور رویا کو روزمرہ کے کاموں کا براہ راست نتیجہ یا حاصل نہ ہونے والی آرزوؤں کا نتیجہ یا مختلف امور کی بدولت حاصل ہونے والے خوف اور وحشت کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ بہر حال روحانی فلاسفہ کے خوابوں کی چند قسمیں ہیں۔

- ۱۔ ایسے خواب کہ جن کا تعلق ماضی کی آرزوؤں اور تمناؤں سے ہوتا ہے۔
- ۲۔ ایسے خواب جو پریشان اور غیر مفہوم ہوتے ہیں، عرب جنہیں ”اضغاث احلام“ کہتے ہیں اور یہ نتیجہ ہوتے ہیں قوت خیال اور قوت وہم کا۔
- ۳۔ ایسے خواب جن کا تعلق مستقبل سے ہوتا ہے اور وہ مستقبل کے کئی رازوں سے پردہ اٹھاتے ہیں، یا بالفاظ دیگر ایسا شہود ہوتا ہے جو حالت خواب میں انجام پاتا ہے۔

مادی فلاسفہ کے پاس تیسری قسم کی نفی کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس کے برعکس ہمارے پاس ایسے بہت سے شواہد ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تیسری قسم واقعیت اور حقیقت کی حامل ہے۔ ہم نے اس کے کئی زندہ نمونے جو قطعاً ناقابل انکار ہیں، تفسیر نمونہ میں ذکر کیے ہیں۔

[۲]

دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں بھی کم از کم سات مقامات پر ان رویائے صادقہ (سچے خوابوں) کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، تفسیر موضوعی کی بحث میں جن کا ذکر بالکل مناسب معلوم ہوتا ہے:

- ۱۔ قرین مجید سورہ ”فتح“ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک سچا خواب بیان کرتا ہے کہ ”آنحضرت نے خواب میں دیکھا کہ اپنے

[۱] تفسیر المیزان جلد ۵ ص ۲۹۲

[۲] تفسیر نمونہ جلد ۹

ساتھیوں کے ہمراہ خانہ خدا کی زیارت اور عمرہ کے مناسک انجام دینے کے لیے مکہ میں داخل ہوئے۔“ آپ نے اپنا یہ خواب اپنے ساتھیوں سے بیان کیا۔ سب لوگ خوش ہو گئے۔ لیکن انہوں نے پہلے تو گمان کیا کہ اس کی تعبیر ہجرت کے چھٹے سال ظاہر ہوگی جس میں صلح حدیبیہ واقع ہوتی تھی۔ لیکن یہ تعبیر اس سال ظاہر نہ ہوئی۔ البتہ پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں یقین دلا یا کہ یہ خواب سچا تھا اور ضرور پورا ہو کر رہے گا۔ قرآن مجید نے اس بارے میں ان لوگوں کو مندرجہ ذیل جواب دیا ہے جن کے دلوں میں شکوک پیدا ہو گئے تھے۔

لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۗ لَتَدْخُلَنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ  
 أَمِينِينَ ۗ مَحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ ۗ لَا تَخَافُونَ ۗ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوا  
 فَجَعَلَ مِنْ دُونِ ذَلِكَ فَتْحًا قَرِيبًا ﴿۶۰﴾ (فتح ۲۷)

”جو خواب خداوند تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو دیکھا یا وہ سچ ہے۔ یقیناً تم سب انشاء اللہ مسجد الحرام میں امن کے ساتھ داخل ہو گے (عمرہ کے مناسک کے مطابق) اپنے سروں کو مونڈے ہوئے اور اپنے ناخنوں کو کوتاہ کیے ہوئے، اور تم کسی سے کسی قسم کا خوف کھائے بغیر یہ کام انجام دو گے۔ خداوند عالم وہ کچھ جانتا تھا جو تم نہیں جانتے تھے (اور اس تاخیر میں بھی کوئی حکمت ہے) اور اس سے پہلے قریبی فتح قرار دی۔ (خیبر کے مضبوط قلعوں کی فتح یا صلح حدیبیہ جو بذات خود ایک عظیم فتح ہے)۔“

یہ خواب ہجرت کے ساتویں سال ذوالقعدہ کے مہینے میں اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ پورا ہو گیا۔ جو تاریخ میں ”عمرۃ القضاء“ کے نام سے مشہور ہے۔ کیونکہ مسلمان تو چاہتے تھے کہ یہ عمرہ اس کے ایک سال قبل بجالائیں لیکن قریش کی ممانعت کی وجہ سے اس سال ایسا نہ ہو سکا۔ باوجودیکہ تمام مسلمان غیر مسلح ہو کر ہی مکہ میں داخل ہوئے تھے، جو اس وقت دشمن کی طاقت کا مرکز تھا۔ لیکن ان کی عظمت اور دبدبہ اس قدر محیط تھا کہ ”آمنین“ (مطمئن ہو کر) اور ”لا تخافون“ (کسی سے خوف کھائے بغیر) کی تعبیر ان پر مکمل طور پر صادق آ رہی تھی۔ انہوں نے دشمن سے خوف کھائے بغیر خانہ خدا کی زیارت کے مراسم انجام دیئے، جو تاریخ اسلام کے عجائبات میں سے ایک ہے۔ اس طرح سے وہ خواب اپنی تمام خصوصیات سمیت پورا ہو گیا جس کی ایسے حالات میں پیش گوئی کسی طرح بھی ناممکن تھی۔

۲۔ سورہ بنی اسرائیل میں حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک اور خواب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اشارہ بھی مختصر اور نہایت سربستہ۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِي آرَيْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً لِلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُونَةَ فِي  
 الْقُرْآنِ ۗ وَنُحُوفُهُمْ ۗ فَمَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا طُغْيَانًا كَبِيرًا ﴿۶۱﴾ (بنی اسرائیل ۶۰)

”جو خواب ہم نے آپ کو دیکھا یا وہ تو لوگوں کے لیے صرف ایک آزمائش تھا۔ اسی طرح جس شجرہ ملعونہ (لعنت

شده درخت) کا ہم نے قرآن میں ذکر کیا ہے ہم انہیں ڈراتے (اور تشبیہ کرتے) ہیں لیکن ان کے طغیان اور سرکشی کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہیں ہوتا۔“

ایک مشہور و معروف حدیث جسے بہت سے شیعہ اور سنی مفسرین نے نقل کیا ہے کہ یہ ایک مشہور خواب کی طرف اشارہ ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا کہ بندر آپ کے منبر پر اچھل کھود رہے ہیں اس پر آپ بہت غمگین ہوئے کیونکہ یہ خواب آپ کے بعد مسلمانوں کی قیادت کے بارے میں ناخوشگوار حوادث کی طرف اشارہ تھا۔ (اس خواب کی حکومت بنی امیہ سے تفسیر کی گئی ہے۔ جو یکے بعد دیگرے رسول اللہ کے منبر پر بیٹھے، انہوں نے رسوم جاہلیت میں ایک دوسرے کی تقلید کی، وہ بے حیثیت افراد تھے، وہ اسلامی حکومت اور خلافت رسول اللہ کو تباہی کی طرف لے گئے)۔ [۱]

بعض مفسرین نے اس روایہ سے مراد مسجد الحرام میں داخل ہونے کے رویا کو لیا ہے جبکہ سورہ بنی اسرائیل مکہ میں نازل ہوئی اور یہ روایہ مسلم طور پر مدینہ میں دیکھا گیا اور وہ بھی ۶ھ میں حدیبیہ کے ماجرا سے بھی پہلے۔

”فخر رازی“ کی طرح کے دوسرے علماء نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ رویا کے معنی رویت یعنی بیداری کی حالت میں دیکھنا ہے اور وہ واقعہ معراج کی طرف اشارہ ہے۔ [۲]

یہ احتمال بہت کمزور ہے کیونکہ ”رویا“ کا اصل لغوی معنی نیند کی حالت میں دیکھنا ہے، نہ کہ بیداری کی حالت میں بنا بریں صحیح وہی پہلی تفسیر ہے۔

”شجرہ ملعونہ“ (لعنت شدہ درخت) سے کیا مراد ہے؟ بعض نے تو اس کی ”شجرہ زقوم“ سے تفسیر کی ہے جو سورہ صافات کے مطابق جہنم کی بنیادوں میں اگتا ہے اور نہایت ہی بد مزہ اور ناخوشگوار پھل ہے اور سورہ دخان کی ۴۶ ویں اور ۴۷ ویں آیت کے مطابق جہنمیوں اور گناہ گاروں کی غذا ہے۔

بعض مفسرین نے اس کی تفسیر یہود کی سرکش قوم سے کی ہے۔ وہ ایسے درخت کی مانند تھی کہ جس کی شاخ و برگ بہت ہوں، لیکن درگاہ رب العزت سے دھتکاری ہوئی قوم۔

لیکن بہت سی شیعہ اور سنی مشہور کتابوں میں ”شجرہ ملعونہ“ سے ”بنی امیہ“ تفسیر کیے گئے ہیں۔ امام فخر رازی نے مشہور اسلامی مفسر ابن

[۱] تفسیر فخر رازی، جلد ۲۰، ص ۲۳۶

[۲] یہ روایت تفسیر قرطبی، مجمع البیان، صافی اور تفسیر فخر رازی میں بیان ہوئی ہے اور مرحوم فیض کاشانی فرماتے ہیں کہ یہ ایسی روایت ہے جو خاصہ اور عامہ (شیعہ اور سنی) کے درمیان مشہور ہے۔



عباس سے یہی تفسیر نقل کی ہے [۱] اور یہ تفسیر اس موضوع سے مکمل مطابقت رکھتی ہے جو پیغمبر اکرمؐ کے خواب کے بارے میں بیان ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ بات کہی جائے کہ قرآن مجید میں اس شجرہ ملعونہ کا کہیں ذکر نہیں ہوا ہے، لیکن اگر اس بات پر توجہ دی جائے کہ قرآن مجید نے منافقین کو سخت لعنت کی ہے (ملاحظہ ہو سورہ محمد آیت ۲۳) اور بنی امیہ ایسے منافقین کے سرغنے تھے، تو یہ مشکل بھی حل ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ”نخوفہم فما یزیدہم الا طغیاناً کبیراً“ (ہم انہیں ڈراتے اور تنبیہ کرتے ہیں لیکن ان کے طغیان اور سرکشی کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہیں ہوتا) کی تعبیر بھی پوری طرح انہی پر صادق آتی ہے۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے کچھ صحابیوں نے آپؑ سے (یا آپؑ کے والد گرامی حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے) اسی آیت کے بارے میں سوال کیا تو انہیں نے فرمایا ”شجرہ ملعونہ سے مراد بنی امیہ ہیں۔“ [۲] یہی چیز امیر المؤمنین علیؑ اور حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے بھی بیان ہوئی ہے اور علی بن ابراہیم نے اسے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

[۳]

”سیوطی“ نے بھی تفسیر ”در منثور“ میں ”شجرہ ملعونہ“ اور ”پیغمبر اکرمؐ کے خواب“ کے بارے میں متعدد روایات بیان کی ہیں، جن میں سے بعض میں ”بنی امیہ“ بعض میں ”بنی الحکم“ اور بعض میں ”بنی العاص“ کا ذکر ہے (جو سب کے سب ایک ہی شجرہ خبیثہ سے ہیں)۔ [۴] بہر حال یہ خواب بعد از وفات پیغمبر متمدنہ تعبیر ہوا اور آخر کار اس شجرہ ملعونہ کے افراد یکے بعد دیگرے پیغمبرؐ کی جگہ پر بیٹھتے رہے اور عظیم بلاؤں اور فتنوں کو جو وہیں لاتے رہے اور مسلمانوں کے لیے بہت بڑی آزمائش کا سبب بنے۔

۳۔ ایک اور روایا صادقہ (سچا خواب) حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خواب ہے جو ان کے فرزند (حضرت اسماعیلؑ) کے ذبح کے بارے میں ہے۔

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جو کہ مخلوق خدا کی رہبری اور امامت کے منصب تک پہنچنے کے لیے آزمائش کی عظیم وادی میں قدم رکھ چکے تھے، انہیں اپنے عزیز بیٹے اسماعیلؑ کے ذبح کا حکم ہوا اور عجیب بات یہ ہے کہ انہیں یہ حکم خواب کے عالم میں دیا گیا۔ ایسا خواب جو ان کے لیے وحی کی حیثیت رکھتا تھا اور وحی کی مانند حقیقت کا حامل تھا۔ چنانچہ سورہ صافات کی آیت ۱۰۲ میں ارشاد ہوتا ہے:

”فلما بلغ معه السعی قال یبنی انی اری فی المنام انی اذبحک فانظر ماذا“

[۱] قرطبی نے اس روایت کو ابن عباس سے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے (جلد ۶، ص ۶۹۰ اور فخر رازی نے بھی اسے ابن عباس ہی سے نقل کیا ہے) (جلد ۲۰ ص ۲۳۷)

[۲] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۱۸۰، حدیث ۲۷۸

[۳] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۱۸۰، ۱۸۱، حدیث ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۶

[۴] تفسیر المیزان، جلد ۱۳ ص ۱۵۷

### تری قال یا ابت افعل ما تو مر ستجدنی ان شاء اللہ من الصابریں

”جب (حضرت ابراہیمؑ) ان (حضرت اسماعیلؑ) کے ساتھ مقام سعی پر پہنچے تو کہا میرے پیارے بیٹے میں خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ تجھے ذبح کروں، دیکھو تو تمہاری کیا رائے ہے؟ تو (اسماعیلؑ) نے کہا بابا جان! جو آپ کو حکم ملا ہے اسے کر گزریئے۔ انشاء اللہ آپ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔“

لفظ ”اری“ (میں دیکھ رہا ہوں) فعل مضارع ہے اور استمرار پر دلالت کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیمؑ نے یہ خواب کئی مرتبہ دیکھا: اس حد تک کہ انہوں نے مکمل اطمینان پیدا کر لیا کہ حکم خدا ہے۔ اسی لیے ان کے فرزند حضرت اسماعیلؑ نے انہیں کہا: بابا جان! جو آپ کو حکم ملا ہے اسے کر گزریئے۔ میں نے سر تسلیم خم کیا ہوا ہے اور صبر کروں گا۔

نیز اسی دلیل کی بنا پر، اسی سورہ کی آیت ۱۰۴ اور ۱۰۵ میں آیا ہے ”ہم نے اسے آواز دی کہ اے ابراہیمؑ! جو حکم تمہیں خواب میں دیا گیا تھا وہ تم نے سچ کر دکھایا“ (ونادینا ان یا ابراہیمہ قد صدقت الرویا)۔ یہ ماجرا ان لوگوں کے لیے روشن دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ انبیاء و مرسلین کے لیے خواب بھی وحی کی حیثیت رکھتا ہے اور روایات میں بھی آیا ہے کہ:

### ”ان الرویا الصادقة جزء من سبعین جزء امن النبوة“

”یعنی سچا خواب نبوت کی نوے اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔“ [۱]

اگرچہ بعض اصولیوں نے اس حکم کے بارے میں شک کا اظہار کیا ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ حکم الہی عمل کیے جانے سے پہلے ہی منسوخ ہو جائے۔ لیکن جیسا کہ اپنے مقام پر بتایا جا چکا ہے یہ اس وقت ہے جب ”امتحان کا حکم“ نہ ہو کہ جس سے کسی شخص یا چیز کو آزما یا جاتا ہے اور ”قد صدقت الرویا“ (جو خواب تو نے دیکھا ہے اس کی تصدیق کر دی اور اسے سچا کر دکھایا) کی تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ ابراہیمؑ نے اپنے فرزند جناب اسماعیلؑ کے ذبح کے تمام مقدمات تیار کر لیے تھے اور بے نظیر اور عظیم ایثار کے لیے مکمل طور پر تیار ہو چکے تھے اور جو ان کا فریضہ تھا وہ سارے کا سارا انجام دے دیا تھا۔

۴۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے والد کے گھر میں خواب ہے جو دوسرے سچے خوابوں میں شمار ہوتا ہے، جس کے بارے میں سورہ یوسف کے آغاز میں ارشاد ہوتا ہے:

إِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ إِنَّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ  
رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ ﴿۳﴾ (یوسف ۴)

”اس زمانے کو یاد کرو جب یوسفؑ نے اپنے باپ سے کہا: باب جان! میں نے خواب میں گیارہ ستارے اور سورج اور چاند کو اپنے لیے سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔  
 باپ نے یہ خواب سن کر آئندہ کے حادثات کی پیش گوئی کر دی اور انہیں کہا ”خدا تمہیں ایک بلند مقام عطا فرمائے گا اور تم پر اور آل یعقوب پر اپنی پوری نعمتیں کرے گا۔“

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے یہ خواب بارہ سال کی عمر میں دیکھا اور اسے پورا ہوتے ہوئے چالیس سال کا عرصہ لگ گیا، اس وقت کہ جب وہ مصر کی حکومت پر فائز اور تخت حکومت پر براجمان ہوئے اور انکے گیارہ بھائی اور ماں، باپ انہیں کنعان سے ملنے مصر تشریف لے گئے اور انہیں خضوع کے لیے، یا نعمت کے شکرانہ کے طور پر خدا کا سجدہ ادا کیا۔ چنانچہ اسی سورت کے اواخر میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ:

وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا ۖ وَقَالَ يَا أَبَتِ هَذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ

مِنْ قَبْلُ ۚ قَدْ جَعَلْنَا رُبِّي حَقًّا ۖ (یوسف ۱۰۰)

”اپنے ماں باپ کو تخت پر بٹھایا اور سب کے سب ان کے لیے سجدہ میں گر گئے اور کہا: بابا جان! یہ اسی خواب کی تعبیر ہے جسے میں نے پہلے دیکھا تھا۔ خدا نے اسے سچ کر دکھایا۔“

اس ماجرا سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ ممکن ہے کہ جو حادث چالیس سال بعد واقع ہوں، وہ ایک سچے خواب کی صورت میں ایک پاک اور ذی استعداد دل میں منعکس ہو جائیں۔ اگرچہ چالیس کا عدد قرآنی آیات کے متن میں مذکور نہیں ہے، لیکن آیات کے قرآن سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ خواب دیکھنے اور اس کی تعبیر ظاہر ہونے کا درمیانی فاصلہ بہت زیادہ تھا۔  
 یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے اس خواب کے دیکھنے کے بعد اپنے معصوم چھوٹے بچے کو جو خوشخبری دی وہ یہ تھی:

وَيُعَلِّمُكَ مِنَ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ (یوسف ۶)

”تجھے تعبیر خواب کی تعلیم دے گا۔“

اس جملہ کی خواہ علم تعبیر خواب کے معنی میں تفسیر کی جائے جیسا کہ بہت سے مفسرین نے کہا ہے، خواہ تفسیر المیزان کی تصریحات کے مطابق اس کی تعبیر خواب کے علم سے بھی وسیع تر معنی میں تفسیر کی جائے، یعنی اس کے حوادث اور نتائج کے سرچشمہ کی معرفت، [۱] صورت حال خواہ کچھ بھی ہو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ بات ممکن ہے کہ بعض خواب سچے ہوں اور ان کی تاویل عینی اور واقعی ہو۔

۶۰۵۔ جب حضرت یوسفؑ پاکدامنی کے جرم میں عزیز مصر کی قید میں تھے اس وقت ان کے ساتھ زندان میں رہنے والے دو قیدیوں نے دو

الگ الگ خواب دیکھے۔ قرآن نے ان خوابوں کو اسی سورہ یوسف میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيْنِ ۖ قَالَ أَحَدُهُمَا إِنِّي أَرِنِّي أَخَصِرُ خَمْرًا ۖ وَقَالَ  
الْآخَرُ إِنِّي أَرِنِّي أَحْمِلُ فَوْقَ رَأْسِي خُبْرًا تَأْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ۖ نَبِّئْنَا بِتَأْوِيلِهِ ۗ  
إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۳۶﴾ (یوسف ۳۶)

”دو جوان اس کے ہمراہ قید خانے میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے کہا میں نے خواب میں دیکھا ہے شراب (کے لیے انگور) نچوڑ رہا ہوں، اور دوسرے نے کہا میں نے خواب میں دیکھا کہ روٹیوں کو سوس پراٹھائے ہوئے ہوں اور پرندے اس میں سے کھا رہے ہیں۔ ہمیں اس کی تعبیر سے آگاہ کرو کیونکہ ہم آپ کو نیکو کاروں میں سے دیکھتے ہیں۔“

یوسف علیہ السلام نے پہلے تو انہیں خدائے واحد کی توحید اور عبادت کی طرف دعوت دی۔ پھر ان کے لیے خواب کی یوں تعبیر بیان کی۔ جس شخص نے یہ خواب دیکھا تھا کہ وہ شراب کے لیے انگور نچوڑ رہا ہے، اس سے کہا:

”تم قید خانے سے رہا ہو جاؤ گے۔“

لیکن دوسرے شخص سے، جس نے خواب میں دیکھا تھا کہ روٹیاں سر پراٹھائے ہوئے ہے اور اس میں سے پرندے کھا رہے ہیں، کہا:

”تمہیں سزائے موت ہوگی۔“

چنانچہ دونوں کی تعبیریں سچی ثابت ہوئیں۔ (فطری بات ہے کہ مصر جیسے فاسد ماحول میں جہاں خود خواہ اور جبار بادشاہوں کی حکومت ہو اور یوسف جیسے معصوموں کو پاکدامنی کے جرم میں زندان میں ڈالا جاتا ہو، وہاں پر ظالم حکام کے ساتھ سودے بازی اور ان کے لیے شراب تیار کرنا آزادی کا موجب ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن جب لوگوں میں مظلوم اور مستضعف لوگوں کی حمایت کا جذبہ اور پرندوں کو کھانا کھلانے کی فکر ہو انہیں سزائے موت ہی مل سکتی ہے)۔

بہر حال یہ دونوں خواب کہ تشریح قرآن مجید میں بڑی صراحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے، اس سے یہ بات بخوبی سمجھی جاتی ہے کہ کبھی خواب بھی معرفت کے منبع کی صورت اختیار کر سکتے ہیں، ہاں البتہ نہ تو ہر خواب اور نہ ہی ہر تعبیر و تفسیر کرنے والے کے لیے۔

## ۷۔ سلطان مصر کا خواب

یوسف علیہ السلام کی اسی داستان میں، قرآن مجید میں ایک اور خواب کا بھی ذکر ہے جو سچے خوابوں کا ایک روشن اور واضح نمونہ ہے۔ بادشاہ نے خواب میں دیکھا کہ:

”سات دہلی پتلی گائیں، سات موٹی تازی گایوں پر حملہ کر کے انہیں کھا گئی ہیں اور گندم کی سات خشک بالیاں، سات سرسبز بالیوں

کے گرد لپٹ کر انہیں چٹ کر گئی ہیں۔“

وہ اس خواب سے وحشت زدہ ہو گیا اور اپنے اطراف والوں سے اس کی تعبیر کا مطالبہ کیا۔

وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أَرَى سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعُ عِجَافٍ وَسَبْعُ  
سُنْبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَبْسُطُ ۗ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ الْأَفْتُونُ فِي رُءْيَايَ إِن كُنْتُمْ  
لِلرُّءْيَا تَعْبُرُونَ ﴿۳۳﴾ (یوسف ۳۳)

اور چونکہ اس کی اطراف والے خواب کی تعبیر کو نہیں جانتے تھے، لہذا انہوں نے کہا:

”یہ تو خواب پریشاں ہیں جن کی تعبیر نہیں ہوتی اور ہم تاویل خواب سے بھی بے خبر ہیں۔“

شاید اس طرح سے وہ سلطان مصر کو اس پریشانی سے نجات دلانا چاہتے تھے۔ (تو جرہے کہ مصر کا بادشاہ یا فرعون مصر، اس پورے ملک کا حاکم تھا۔ بعض مفسرین کے مطابق ”عزیز مصر“ اس ملک کے وزیر خزانہ کو کہتے تھے۔ جو فرعون مصر جناب یوسف علیہ السلام کا معاصر تھا اس کا نام ”ریان بن ولید“ تھا اور عزیز مصر کا نام ”قطفیر“ یا ”عطفیر“ تھا)۔<sup>[۱]</sup>

لیکن یہاں پر بادشاہ کے ساقی (یا ندیم) جو اپنے خواب کے ماجرا کے بعد قید خانے سے رہا ہو چکا تھا، کو ایک مرتبہ اپنے عالم، زیرک اور صدیق اور راستباز دوست یعنی یوسفؑ کی یاد آئی اور تمام ماجرا بادشاہ سے بیان کیا۔ بادشاہ نے یوسفؑ کو قید خانے سے باہر نکالا اور اپنے پاس بلا کر ان سے اپنا خواب بیان کیا تو انہوں نے خواب کی یوں تعبیر ارشاد فرمائی:

”تمہارے آنے والے سات سال نہایت ہی بابرکت ہوں گے۔ ہر چیز کی فراوانی ہوگی۔ خوب محنت سے کام لو، ذراعت پر زیادہ توجہ دو، گندم کے جو کھیت کاٹو انہیں بالیوں سمیت اکٹھا کرتے جاؤ، اپنی ضروریات کی حد تک ہی اس سے مصرف کرو، بچت سے کام لیتے رہو، کیونکہ ان سات سالوں کے بعد دوسرے سات سال نہایت ہی خشک ہوں گے، بارشیں بہت کم ہوں گی، کھیتی باڑی میں نہایت کمی واقع ہو جائے گی، اس لیے تمہیں اس غلے سے سات سال تک استفادہ کرنا ہوگا وگرنہ ہلاک و برباد ہو جاؤ گے اور پھر قحط کے ان سات سالوں میں تمہیں تمام غلے کو بھی خرچ نہیں کرنا ہوگا بلکہ کچھ غلہ اس سے اگلے سال کے لیے بھی بچائے رکھنا جو بارشوں اور برکتوں کا سال ہوگا۔“ (یوسف ۷ تا ۹۳)

[۱] فخر رازی کی تفسیر کبیر میں یہی معنی بعض مفسرین سے نقل کیے گئے ہیں۔ (جلد ۱۸، ص ۱۰۸) اس سلسلے میں مزید تفصیل کے لیے کتاب ”اعلام القرآن“ ص ۶۷۳ کی طرف رجوع فرمائیں۔ ابوالفتوح رازی نے بھی یہ تصریح کی ہے کہ یوسف علیہ السلام انجام کار سلطنت مصر کے عہدہ تک جا پہنچے۔ تفسیر ابوالفتوح رازی، جلد ۶، ص ۲۰۱

یہ تعبیر بھی حرف بحرف پوری ہوئی اور چونکہ اس میں یوسفؑ کی صداقت، راست بازی، معرفت اور ذکاوت نمایاں تھی لہذا اس کی آزادی وزارت خزانہ تک پہنچنے کا سبب بن گئی۔ پھر ان کی حکومت تمام مصر پر مسلم اور مستحکم ہو گئی۔

## نتیجہ

ان مجموعی آیات سے بخوبی استفادہ ہوتا ہے کہ ممکن ہے کچھ خواب ایسے ہوں جو کچھ حقائق کے ادراک کا منبع بن جائیں۔ یا بالفاظ دیگر ممکن ہے کہ کشف و شہود کا مسئلہ خواب میں جامہ عمل پہننے لیکن بیداری میں نہیں۔ تو صرف اس قسم کے خواب کی آیات بالا کی دو سے تین قسمیں ہیں:

۱۔ بعض تو بعینہ اور بغیر کسی قسم کی تبدیلی کے بیداری ہی میں نظر آ جاتے ہیں جیسے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خواب کہ آپؐ خانہ کعبہ کی زیارت کر رہے ہیں اور جس کا تذکرہ سورہ فتح میں آیا ہے۔

۲۔ ایسے خواب بھی ہیں جو تعبیر کی صورت میں جامہ عمل پہننے ہیں۔ یعنی ان کے لیے ضروری ہے کہ ان کی تفسیر کی جائے اور تفسیر بھی ایسے جسے صاحب علم و آگاہ مگر ہی جانتا ہے (جیسے حضرت یوسف، سلطان مصر اور قیدیوں کے خواب میں جو سارے کے سارے سورہ یوسف میں بیان کیے گئے ہیں)۔

۳۔ ایسے خواب جو حکم اور فرمان کی حیثیت رکھتے ہیں اور نیند کی حالت میں وحی کی حیثیت رکھتے ہیں (جیسے حضرت ابراہیمؑ کا خواب ہے)۔ لیکن اس قسم کی گفتگو کا یہ مقصد نہیں کہ ہر ایک خواب کو کشف و شہود سمجھا جائے، بلکہ بہت سے ایسے خواب ہیں جو ”اضغاث احلام“ (پریشان خواب) ہوتے ہیں اور ان کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی۔ ایسے خواب ہوتے ہیں جو وہم کی طاقتوں کی فعالیت کا نتیجہ ہوتے ہیں یا پھر محرومیوں، ناکامیوں اور پرکار عمل ہوتے ہیں۔

## سوال

ممکن ہے کہ اس مقام پر کچھ لوگ یہ سوال کریں کہ آیا آئندہ کے حالات کے ساتھ خوابوں کا تعلق علمی حیثیت کا حامل ہوتا ہے، جبکہ مشہور ماہر نفسیات ”فرائیڈ“ کی پیروی کرتے ہوئے کچھ لوگوں کا نظریہ ہے کہ خواب تو صرف پوری نہ ہونے والی خواہشات اور ضروریات کا رد عمل ہوتے ہیں جو ”من“ کو دھوکہ دینے کے لیے مختلف تبدیلیوں کے ساتھ ذہن کے خود آگاہ میدان میں آجھنچتے ہیں، یا بالفاظ دیگر ضمیر باطن میں جو خواہشات پوری نہیں ہوتیں اور کبھی تو بغیر تعبیر کے ظاہر ہوتے ہیں (جیسا کہ وہ عاشق کا محبوب اس سے جدا ہو گیا ہو اور وہ اسے خواب میں دیکھتا ہے) اور کبھی شکل تبدیل کر کے مناسب صورت میں منعکس ہوتے ہیں، تو ایسی صورت میں اس کی تعبیر کی ضرورت ہوگی۔

## جواب

یہ ایک مفروضہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے پاس اس مدعا کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ خواب ایسے ہوں لیکن یہ دعویٰ کہ تمام خواب ایسے ہیں، دعویٰ بلا دلیل ہے۔<sup>[۱]</sup>

اس میں شک نہیں ہے کہ خوابوں کی کئی قسمیں ہیں۔ ان میں سے صرف ایک قسم ایسی ہے جس کا نام ”روی صادقہ“ ہے اور یہ بعض حقائق کے انکشاف کی دلیل ہے۔ ان حقائق کو ہم نے سب سے پہلے مرحلے میں تو قرآن پاک سے اخذ کیا ہے جو کہ خدائی وحی ہے اور دوسرے مرحلہ پر وہ تجربات ہیں جو اس بارے میں انجام پائے ہیں۔ اس سے مراد بے بنیاد قصے کہانیاں نہیں ہیں بلکہ وہ واقعات ہیں جو ہمارے زمانے میں یا اس سے پہلے کے زمانے میں عظیم اور مشہور و معروف افراد کے درپیش آئے ہیں اور انہوں نے ان کو اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔ (ہم نے بھی تفسیر نمونہ، جلد ۹ میں، اس کے کئی واضح نمونے درج کیے ہیں)۔

ضمنی طور پر ہم یہ بھی بتاتے چلیں کہ خواب کو خواب ہونے کی حیثیت سے ”معرفت کے منبع“ کے طور پر تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ خواب حجت نہیں بن سکتا، بلکہ کئی دوسرے بیرونی قرائن اور شواہد کا بھی ان کے ساتھ ہونا ضروری ہے تاکہ اس طرح سے وہ واضح اور ناقابل تردید اور ٹھوس ثبوت بن سکیں۔

## ۴۔ ”رحمانی“ اور ”شیطانی“ مکاشفہ

شاید اس بات کے ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہ ہو کہ حقیقی اور واقعی کشف و شہود وہ ہوتا ہے جو یا تو کامل ایمان اور یقین کی وجہ سے وجود میں آتا ہے یا پھر ریاضتوں اور مشقتوں کے بعد۔ اس کے مقابلے میں بہت سے کشف اور شہود ایسے ہوتے ہیں جن کا منبع اور مرکز وہم اور خیال ہوتے ہیں، جو یا تو فکرو ذہن کے بار بار کی راہ راست سے لغزشوں یا کبھی شیطانی وسوسوں کی وجہ سے ایسی صورت حال انسان کے سامنے مجسم ہو کر آ جاتی ہے جس کا حقیقت اور واقعیت سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہوتا اور سوائے چند وہم و خیال کے اور کچھ نہیں ہوتا، اکثر و بیشتر ”صوفیا“ جس قسم کے کشف و شہود کا دعویٰ کرتے ہیں۔

سادہ لوح مرید آغاز کار میں کچھ لوگوں کے پراپیگنڈہ سے متاثر ہو کر معتقد ہو جاتا ہے اور خواب اور رویا کے ذریعہ اپنے حقیقی راہنما اور ”مرشد“ کو تلاش کرنا چاہیے اور روز بروز اس کی یہ فکر مستحکم ہوتی جاتی ہے اور وہ ہمیشہ اس بات کا منتظر رہتا ہے کہ عالم خواب میں اپنے مرشد کی زیارت کرے (غالباً وہ کچھ لوگوں کو اپنی نگاہوں میں اس منصب کے لیے منتخب کر لیتا ہے، اگرچہ بطور کامل کسی کو منتخب نہ بھی کرے کئی لحاظ سے

[۱] دور حاضر کے دانشمند آج تک اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکے ہیں کہ خود ”نیند“ کی اصل وجہ کیا ہے؟ آیا انسان کسی ”فزیکل“ عامل کی وجہ سے نیند کرتا ہے یا کسی ”کیمیکل“ وجہ سے سوتا ہے، یا دونوں کی وجہ سے؟ یا بلکہ اعصاب کی فعالیت کا ایک علیحدہ سسٹم ہے۔ خود ”نیند“ کا اصل مسئلہ ہی معمہ بنا ہوا ہو تو پھر وہاں کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ ”خواب“ کے مسئلہ کو حل کیا جائے جو نیند سے کئی درجے پیچیدہ ہے۔



اس کی حدود اور خاص امتیاز صفات کو ذہن میں ضرور مد نظر رکھتا ہے۔

کبھی مشقت آور ریاضتوں اور مزاجی انحراف کی وجہ سے انسان اپنی فکر کے طبعی توازن کو کھو بیٹھتا ہے اور اس میں قوت خیال کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ناگہاں ایک رات عالم خواب میں اشخاص کو اپنے مقصود کی حدود میں دیکھ لیتا ہے۔ اگر مکمل طور پر انہیں نہ بھی دیکھ سکے تو تھوڑی سی توجیہ اور تفسیر کے ساتھ اس میں ترمیم کر لیتا ہے اور اس طرح سے اس کی ”مریدی“ عملی جامہ پہنتی ہے۔

ممکن ہے یہی صورت حال اسے عالم بیداری میں بھی حاصل ہو جائے، کیونکہ اس سادہ لوح اور سادہ ذہن ”مرید“ کی آنکھیں اور کان راہ پر لگے ہوئے ہیں اور وہ عالم غیب کی طرف متوجہ ہے۔ اس کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ اس جہان کا کوئی دروازہ اس پر کھل جائے یا اس کے کان میں کوئی آواز پہنچ پائے۔ وہ ہمیشہ اسی چیز کو اپنے اندر دہراتا رہتا ہے اور عالم ذہن میں اسے پروان چڑھاتا رہتا ہے اور رات دن اسی بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ قوت خیالی کی سرگرمیوں کی وجہ سے اچانک اس کے کان میں کوئی آواز پہنچتی ہے یا کوئی صورت اس کے سامنے مجسم ہو کر آ جاتی ہے اور وہ اسے بنیاد بنا کر اپنے عقائد کی عمارت اس پر استوار کرتا ہے۔

ذوق پر مبنی اور نشاط آور مطالب جو کبھی تو دلچسپ اشعار اور دماغ کو مسحور کر دینے والی دھنوں پر مشتمل ہوتے ہیں، اس قسم کی صورت حال کو جلا بخشتے ہیں۔

صوفیاء کا وہ گروہ جو وجد اور سماع<sup>[1]</sup> کا حامی ہے، وجد اور سماع کی حالت میں اس قدر مست ہو جاتے ہیں کہ جوش و خروش میں آ کر بے خود اور بے سدھ ہو جاتے ہیں اور قوت عاقلہ کو گم کر دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں قوت وہمیہ کی فعالیت کے لیے میدان خالی ہو جاتا ہے اور جو لوگ ہمیشہ عالم غیب کے کشف اور مشاہدہ کے خیال میں مگن رہتے ہیں انہیں تمام عالموں کی سیر کے لیے لے اڑتی ہے اور ان عالموں کی سیر کراتی ہے جو ان کی قوت خیال میں سمائے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے نور کے دریا اور کوہ طور کو اور ساتوں طبق آسمان اور زمین کو مجسم دیکھتے ہیں۔ ان کی قوت وہمیہ جس شکل و صورت کو پسند کرتی ہے وہی ان کے سامنے مجسم ہو کر آ جاتی ہے۔

وہ ایسی صورت حال کو دیکھ کر زبردست مسرور اور شادمان ہوتے ہیں اور اس گمان سے کہ وہ اپنے مطلوب و مقصود کو بالمشاہدہ پا چکے ہیں، نعرے لگانا اور شور مچانا شرع کر دیتے ہیں اور یہی چیز ان کی کیفیت میں شدت پیدا کر دیتی ہے جس کی وجہ سے وہ آخر میں غشی جیسی صورت حال سے دوچار ہو جاتے ہیں اور جب اس سے افاقہ ہوتا ہے تو اس دوران انہوں نے جو کچھ دیکھا ہوتا ہے وہ اپنے مکاشفات کے عنوان سے دوسروں کو بتاتے ہیں۔

درحقیقت وہ لوگ ”آب“ کے گمان سے ”سراب“ کے پیچھے لگے ہوئے ہوتے ہیں اور کسی جگہ تک پہنچنے بغیر ان امور میں پھنس جاتے ہیں جو کلی طور پر حقیقت سے خالی ہوتے ہیں۔

[1] ”سماع“ سے مراد موسیقی کی مختلف دھنیں یا گانے والوں کے نغمے ہیں جو صوفیوں کی بعض مجالس میں رانج ہیں اور ”وجد“ سے مراد ذوق اور شوق کی وہ حالت ہے جو سماع پسند صوفیوں کی حالت ہوتی ہے اور رقص سے ملتی جلتی حرکات سے ملی ہوئی ہوتی ہے۔

قصہ مختصر ایسی بات ہرگز نہیں ہے کہ جو شخص بھی کشف و شہود کا دعویٰ کرے اس کو کسی جیل و جنت کے بغیر تسلیم کر لیا جائے، یا اگر کوئی صورت اس کی نگاہوں میں مجسم ہو کر آجائے، یا کوئی آواز اس کے کانوں میں پہنچ جائے، اسے خدائی اور واقعی سمجھا جائے، کیونکہ شیطانی مکاشفے بھی تو کم نہیں ہیں۔

کتاب ”احتجاج طبری“ میں ایک روایت ابن عباس سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام ”حسن بصر“ کے پاس گزر رہے تھے اور وہ (حسن بصری) وضو میں مشغول تھے۔ (اور وہ وضو کا پانی استعمال کرنے میں سختی سے کام لیتے تھے) حضرت امام نے ان سے فرمایا ”حسن! وضو کو زیادہ پانی کے ساتھ انجام دیا کرو (سختی سے کام نہ لیا کرو)۔“

حسن بصری نے کہا: ”اے امیر المومنین! آپ نے کل (میدان جنگ جمل میں) ایسے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے جو خدا کی وحدانیت، پیغمبری رسالت کی گواہی دیتے تھے، پنجگانہ نمازیں پڑھتے تھے وضو کے لیے کھلا پانی استعمال کرتے تھے۔“

امام نے فرمایا: ”اگر ایسا ہی ہے تو پھر تم نے ان کی مدد کیوں نہیں کی؟“

حسن نے کہا: ”خدا کی قسم میں آپ کی باتوں کی تصدیق کرتا ہوں اے امیر المومنین! سو اس بارے میں عرض ہے کہ میں پہلے دن باہر آیا، غسل کیا، حنوط ملا اور اسلحہ اٹھا کر چل پڑا اور مجھے اس بارے میں ذرہ برابر بھی شک نہیں تھا کہ عائشہ کی امداد سے دستبرداری کفر ہے۔ چنانچہ جب میں (بصرہ کے قریب) ”حزینہ“ کے مقام پر پہنچا تو ایک آواز میرے کان میں پہنچی کہ اے حسن! کہاں جا رہے ہو؟ واپس لوٹ جاؤ کیونکہ قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں ہیں۔ میں گھبرا کر واپس آ گیا اور گھر میں بیٹھ گیا۔“

دوسرے دن بھی مجھے یقین کامل تھا کہ عائشہ کی امداد نہ کرنا کفر ہے۔ چنانچہ میں نے پہلے دن کی طرح غسل و حنوط کا بندوبست کیا اور ہتھیار لگا کر باہر آ گیا اور کل والی جگہ پر پہنچا تو وہی آواز سنی کہ اے حسن! بار بار کہاں جا رہے ہو؟ قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں ہیں۔“

حضرت امام علیہ السلام نے فرمایا: ”تم نے سچ کہا، لیکن معلوم بھی ہے کہ وہ ندا دینے والا کون تھا؟“

حسن نے کہا: ”نہیں!“

امام نے فرمایا: ”وہ تمہارا بھائی شیطان تھا اور ایک لحاظ سے اس نے ٹھیک کہا تھا، کیونکہ اس گروہ کے قاتل اور مقتول دونوں قسم کے لوگ جہنمی ہیں۔ (کیونکہ وہ جمل کے بلوائی تھے جنہوں نے مسلمانوں کی حکومت اور امام وقت یعنی حضرت علی علیہ السلام کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا)۔“ [۱]

اس قسم کے شبہی مکاشفے اور آوازیں بعینہ وہی چیزیں ہیں جن کو قرآن مجید میں ”شیطانی وحی“ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ سورہ انعام ۱۱۲ میں ہم پڑھتے ہیں:

وَكذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيْطٰنِ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ اِلٰى

### بَعْضُ زُخْرَفِ الْقَوْلِ غُرُورًا ط

”اسی طرح ہم نے ہر پیغمبر کے مقابلے میں جنوں اور انسانوں سے کچھ شیاطین قرار دیئے ہیں جو بے بنیاد اور دھوکے پر مبنی باتوں کو مخفی طور پر ایک دوسرے سے کہتے ہیں۔“  
درحقیقت یہ ایک قسم کی آزمائش عمل میں آتی ہے اور امتحان ہوتا ہے کہ مومنین کی صفیں غیر مومنین سے جدا ہو جائیں۔ چنانچہ اسی سلسلے میں سورہ انعام ہی کی ۱۲۱ ویں آیت میں ہم پڑھتے ہیں:

### وَإِنَّ الشَّيْطَانَ لِيَوْحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَٰهِمْ

”یعنی شیاطین مخفی طور پر کچھ باتیں اپنے دوستوں تک پہنچاتے ہیں۔“

یہی وجہ ہے کہ جب انسان ”صوفیا“ کی کتابوں کی طرف رجوع کرتا ہے تو انہیں ایسے مکاشفوں سے لبریز دیکھتا ہے جو نہایت ہی وحشت ناک ہوتے ہیں اور جن کے غلط آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس مقام پر ہم صرف چند نمونوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں تاکہ ہم اصل مطلب سے دور نہ نکل جائیں۔ اس اجمال سے آپ خود ہی تفصیلی جائزہ مرتب فرمائیں۔

۱۔ کتاب ”صفوة الصفا“ جو ”شیخ صنی الدین اردبیلی“ کے حالات میں اس کے ایک مرید نے لکھی ہے، میں یوں لکھا ہوا ہے:  
”ایک کارکن شخص نے شیخ سے کہا: میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ شیخ کی آستین کا سراعرش سے تحت الثریٰ تک پہنچا ہوا تھا تو شیخ نے کہا یہ تو تجھے تیرے حوصلے کے مطابق دکھایا گیا ہے۔“

۲۔ ”حجی الدین عربی“ کتاب ”مسامرة الابرار“ میں کہتے ہیں:  
”رجبوں وہ لوگ ہیں جن میں ایک قسم کی ریاضت پائی جاتی ہے اور اس کی علامت یہ ہے کہ مکاشفے کی حالت میں وہ ”رافضیوں“ (شیعوں) کو خنزیر کی حالت میں دیکھتے ہیں۔“

۳۔ شیخ عطار کتاب ”تذکرۃ الاولیاء“ میں ”بایزید بسطامی“ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ بایزید نے کہا میں ایک مدت تک خانہ کعبہ کا طواف کرتا رہا جب میں حق تک پہنچ گیا تو خانہ کعبہ کو دیکھا کہ وہ میرے گرد گھوم رہا ہے..... حق تعالیٰ نے مجھے ایسے مقام تک پہنچا دیا کہ تمام مخلوق کو دو انگلیوں کے درمیان دیکھنے لگا۔“ [۱]

۴۔ اسی کتاب میں لکھا ہے ”بایزید“ نے کہا:  
”حق تعالیٰ نے مجھے دو ہزار مقام اپنے سامنے حاضر کیا اور ہر مقام میں مجھے ایک مملکت پیش کی، لیکن میں نے قبول نہیں کی۔“ [۲]  
یہ اس قسم کے دعوے ہیں کہ جن کے متعلق نہ تو کسی بنی مرسل سے اور نہ ہی کسی معصوم امام سے سنا گیا ہے بلکہ بارگاہ رب العزت اور

[۱] تذکرۃ الاولیاء ص ۱۰۲

[۲] تذکرۃ الاولیاء ص ۱۰۱

خانہ کعبہ کے پاس دعائیں اور مناجاتیں ان کے خضوع و خشوع اور تذلل و زاری کی غماز ہیں اور اس بات کی دلیل ہیں کہ اس قسم کے مکاشفات اگرچہ عمدی طور پر نہ بھی ہوں، شیطانی اوہام اور خیالات ضرور ہیں، جو مختلف عوامل کی بناء پر جن میں سے بعض کی طرف ابھی اشارہ ہوا ہے بعض لوگوں کے ذہن منتقل ہو جاتے ہیں اور اس کی وسعت ان لوگوں کے تخیلات اور بلند پروازی کے مطابق ہی ہوا کرتی ہے۔

## سوال

یہاں پر یہ سوال پیش آتا ہے کہ آیا ”رحمانی“ اور ”شیطانی“ مکاشفات یا ”واقعیت“ اور ”خیال“ کی کوئی شناختی علامات ہیں یا نہیں؟

## جواب

جی ہاں! اس کی تین اہم ترین علامتیں ہیں اور اجمالی طور پر ان دونوں کا آپس میں فرق یوں معلوم کیا جاسکتا ہے کہ: ”رحمانی مکاشفے“ یقین اور قطعی ہونے کے ساتھ ساتھ یقین، ایمان، معرفت، اخلاص، توحید اور عمل صالح کے اعلیٰ معیار سے مزین ہوتے ہیں، جبکہ ”شیطانی مکاشفے“ اور خیالات و اوہام ان چیزوں سے بالکل عاری ہوتے ہیں۔ بنا بریں اگر اس قسم کی باتیں ان لوگوں سے سنی جائیں جن میں یہ شرائط نہیں پائے جاتے تو وہ ہر لحاظ سے ناقابل اعتبار ہوں گے۔

ہم ابھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث بیان کر چکے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: ”علم ایک نور ہے جسے خداوند عالم اس شخص کے دل میں ڈالتا ہے جسے وہ دوست رکھتا ہے۔ دل کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور وہ غیب کو دیکھتا ہے۔ اس کا سینہ کشادہ ہو جاتا ہے اور وہ مشکلات و آزمائش کو برداشت کرتا ہے۔“

آپؐ سے پوچھا گیا یا رسول اللہ! کیا اس کی کوئی علامت بھی ہے؟ تو فرمایا: ”ہاں اس کی نشانی یہ ہے کہ اس فریب کار اور دھوکہ باز دنیا سے بے اعتنائی، ہیبتگی سرائے جاودانی کی طرف پوری توجہ اور (ایمان و عمل صالح کے ذریعہ) موت کے لیے آمادگی قبل اس کے کہ وہ نازل ہو۔“ [۱]

دوسری بات یہ ہے کہ ”حقیقی مکاشفات“ ہمیشہ کتاب اور سنت کے ہم آہنگ ہوتے ہیں، آیات الہی اور اقوال معصومین کی روشنی میں ہوتے ہیں اور سوئی کی نوک کے برابر خدا کی اطاعت سے باہر نہیں ہوتے اور گناہ و عصیان سے ذرہ بھی ملوث نہیں ہوتے۔

تیسرے یہ کہ ان کے مضامین اور متعلقات مکمل طور پر عقل کے دوش بدوش ہوتے ہیں اور نامعقول بلند پروازیوں اور خیالی پلاؤ پکانے سے بالکل پاک صاف ہوتے ہیں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے مکاشفہ کی حالت میں ”رافضیوں“ کو سور کی شکل میں دیکھا ہے درحقیقت انہوں نے اپنے اندرونی آئینہ میں اپنی ہی صورت کو دیکھا ہے۔

اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں نے خدا کا اس قدر قرب حاصل کر لیا کہ خانہ کعبہ کو اپنے گرد گھومتے دیکھا ہے، درحقیقت وہ خود سرگردانی کا

شکار ہوا ہے کیونکہ وہ خود کو خدا کے گھر کے طواف سے بے نیاز اور اسے اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے، جبکہ خود سرکار ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخری سال میں ”حجۃ الوداع“ ادا کیا، مراسم حج کے طور پر خانہ کعبہ کا طواف اور دیگر مراسم بجالائے۔

کشف وشہود کے بارے میں آخری بات یہ ہے کہ معرفت کا یہ منبع، دوسرے منابع کی مانند نہیں ہے جیسے عقل، حس اور تاریخ وغیرہ ہوتے ہیں، بلکہ یہ ایک خصوصی منبع ہے جس کی سخت اور کڑی شرطیں ہیں۔ (غور کیجئے گا)

## معرفت کی راہ میں رکاوٹیں اور آفتیں

اشارہ

اب تک ہم معرفت اور شناخت کی منزلیں طے کرنے کے سلسلے میں کئی منازل طے کر چکے ہیں۔ ہم اپنے فکر اور عقل سے باہر کی حقیقتوں اور واقعیتوں کو قبول کر چکے ہیں اور یہ بھی تسلیم کر چکے ہیں کہ انسان کسی حد تک ان حقائق تک پہنچ سکتا ہے۔

حقیقت کی شناخت و معرفت کے لیے چھ منابع کو بھی اچھی طرح پہچان چکے ہیں۔ اور یہ بھی جانتے ہیں کہ ان میں سے پانچ منابع یعنی ”حس“، ”عقل“، ”فطرت“، ”تاریخ“، اور ”وحی“ کی عمومی حیثیت ہوتی ہے لیکن چھٹا منبع شہود باطنی کی حیثیت عمومی نہیں ہوتی بلکہ یہ مومنین اور اللہ کے اولیاء کے لیے خاص ہے۔

اب ہمارے راستے میں صرف دو منزلیں باقی رہتی ہیں جن سے گزر کر ہم اپنی منزل مقصود تک جا پہنچیں گے۔ ایک تو ہے ”معرفت کی راہ میں رکاوٹیں“ اور دوسری ہے ”معرفت کے معاونین“، لیکن اس وقت ہماری بحث کا موضوع ”معرفت کی راہ میں رکاوٹیں“ ہے۔

اس بات میں کسی قسم کا شک نہیں کہ دنیا کی مختلف موجودات اور اشخاص کے چہروں کو دیکھنے کے لیے صرف دو آنکھیں ہی کافی نہیں، بلکہ درمیان میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ اور حجاب بھی نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ہماری فضا کے اطراف کو سیاہ دھوئیں یا گہرے گرد وغبار نے اپنی پلیٹ میں لے لیا ہو تو ہم اپنے پاؤں کے ساتھ تک کی چیزوں کو بھی نہیں دیکھ پاتے۔ اسی طرح اگر آفتاب عالمتاب کہ جس کی روشنی ہر جگہ ضرب المثل ہے، تاریک اور گہرے بادلوں کے پیچھے چھپ جائے تو اسے کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا۔

اگر کوئی شخص اپنی آنکھوں پر سیاہ عینک چڑھائے تو وہ یقیناً کسی بھی چیز کو نہیں دیکھ سکے گا اور اگر وہ رنگین ہو تو سب کچھ رنگین نظر آئے گا اگر اس کے شیشے میلے اور ناموزوں ہوں تو چیزوں کے چہرے کج مچ یعنی ٹیڑھے ہی نظر آئیں گے۔ اگر کوئی شخص یرقان کی بیماری میں مبتلا ہو تو وہ ہر چیز کو زرد ہی دیکھے گا۔ اگر بھینگ کسی چیز کو دیکھتا ہے تو وہ اسے خلاف حقیقت نظر آتی ہے۔

بعینہ اسی طرح اس بات کا امکان بھی ہوتا ہے کہ انسان کی عقل اور فطرت کے لیے کچھ رکاوٹیں پیدا ہو جائیں اور تاریخ کے آئینہ کے سامنے ممکن ہے کہ کچھ موانع معرض وجود میں آجائیں۔ جب رکاوٹیں کھڑی ہو جاتی ہیں یا موانع ایجاد ہو جاتے ہیں تو ان کی وجہ سے وحی کا صحیح معنی میں ادراک اور کلام معصومین علیہم السلام کا صحیح معنی میں سمجھنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہو جاتا ہے۔ یہاں سے یہ بات بخوبی سمجھی جاسکتی ہے کہ ایسی رکاوٹوں اور موانع کے بارے میں تحقیقات کتنا ضروری ہے؟

چونکہ تفسیر موضوعی کی بحثوں میں ہم قرآنی روایات کی پیروی کرتے ہیں لہذا اس بارے میں بھی سب سے پہلے آیات کو بیان کریں گے اور ہم صرف ان موانع اور آفات کی بحث کریں گے جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں اور یہ کام بنیادی ہے۔

معرفت کی رکاوٹوں کے بارے میں آیات قرآنی نے دو طرح سے بحث کی ہے، ایک تو کلی بحث ہے جو ”خبردار کرنے والی“ ہے اور دوسری جزئی بحث ہے جو ”آگاہ کرنے والی“ ہے۔ لیکن فی الحال ہم کلی بحث کو شروع کرتے ہیں۔

## کلی طور پر معرفت کے پردے

سب سے پہلے ہم مندرجہ ذیل آیات کو گوش جان سے سماعت کرتے ہیں:

## آیات

(۱) أَفَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ فَرَآهُ حَسَنًا ط (سورہ فاطر ۸)

(۲) وَلَكِنْ قَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۳۳﴾

(سورہ انعام ۳۳)

(۳) فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ

(سورہ آل عمران ۷)

(۴) كَلَّا بَلْ يَسْتُرَانِ عَلٰی قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۱۳﴾ (سورہ مطفین ۱۳)

(۵) يَجْعَلُ مَا يُلْقَى الشَّيْطَانُ فِتْنَةً لِلَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ (سورہ حج ۵۳)

(۶) وَجَعَلْنَا عَلٰی قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ط

(سورہ بنی اسرائیل ۳۶)

(۷) وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ ط بَلْ لَعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ ﴿۸۸﴾

(سورہ بقرہ ۸۸)

(۸) وَنَطَّبَعُ عَلٰی قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿۱۰۰﴾ (سورہ اعراف ۱۰۰)

(۹) وَطَبَعَ عَلٰی قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ ﴿۸۷﴾ (سورہ توبہ ۸۷)

(۱۰) خَتَمَ اللَّهُ عَلٰی قُلُوبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ ط وَعَلٰی أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةً ز

(سورہ بقرہ ۷)



(۱۱) أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ  
وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً (سورہ جاثیہ ۲۳)

(۱۲) أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا (سورہ محمد ۲۳)

(۱۳) فَإِنَّهَا لَا تَعْمَىٰ الْأَبْصَارُ وَلَكِنْ تَعْمَىٰ الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ (سورہ حج ۳۶)

(۱۴) لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ  
لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا (سورہ اعراف ۱۷۹)

ترجمہ

- (۱) آیا وہ شخص جس کا برا عمل مزین ہوا ہے اور وہ اسے اچھا دیکھتا ہے.....
- (۲) لیکن ان کے دل سخت ہو گئے ہیں اور وہ جو عمل بھی کرتے ہیں شیطان نے انہیں ان کے لیے مزین کر دیا ہے۔
- (۳) لیکن وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی اور انحراف ہے وہ مشابہات کی پیروی کرتے ہیں تاکہ وہ فتنہ انگیزی کریں۔
- (۴) بات وہ نہیں ہے جو وہ لوگ خیال کرتے ہیں بلکہ ان کے اعمال ان کے دلوں پر رنگ کی طرح بیٹھ چکے ہیں۔
- (۵) مقصد یہ تھا کہ خداوند عالم نے شیطانی القاء کو ان لوگوں کے لیے آزمائش قرار دیا جن کے دل میں بیماری ہے۔
- (۶) جن کے دلوں پر ہم نے پردے قرار دیئے ہیں تاکہ وہ کچھ نہ سمجھ سکیں اور ان کے کانوں میں ڈاٹ ہیں۔
- (۷) اور انہوں نے (مذاق کے طور پر) کہا ہمارے دل غلافوں میں ہیں۔ خداوند عالم نے انہیں ان کے کفر کی وجہ سے دور کر دیا ہے۔ (اسی وجہ سے وہ کسی چیز کو درک نہیں کرتے) اور بہت کم ایمان لے آتے ہیں۔
- (۸) اور ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں تاکہ وہ (حق کی آواز کو) نہ سن سکیں۔

- (۹) اور ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے لہذا وہ کچھ نہیں سمجھتے۔
- (۱۰) خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔
- (۱۱) آیا تو نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہشات کو معبود قرار دے دیا ہے؟ اور خداوند عالم نے اسے جانتے ہوئے (کہ ہدایت کے لائق نہیں) گمراہ کیا ہے اور اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے۔
- (۱۲) آیا وہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے؟ یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔
- (۱۳) ظاہری آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ جو دل سینوں میں ہیں وہ بینائی اور بصیرت کو کھوپکے ہیں۔
- (۱۴) ان کے دل (عقلیں) ہیں وہ ان کے ساتھ سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں وہ ان کے ساتھ دیکھتے نہیں۔ وہ تو چوپایوں کی مانند ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ، وہی لوگ ہی تو غافل ہیں۔

## الفاظ کے معانی اور تشریح

سب سے پہلے ہم ان مختلف اور ظریف الفاظ پر ایک تحقیقی نظر ڈالتے ہیں جو مندرجہ بالا آیات میں انسان کے معرفت سے محروم ہونے اور شناخت کے مانع ہونے کے بارے میں استعمال ہوئے ہیں، کیونکہ ان میں سے ہر ایک انسانی فکر کے انحراف اور معرفت سے محروم ہونے کے مرحلہ کی طرف اشارہ ہے جو کہ کمزور مرحلے سے شروع ہو کر سخت اور خطرناک قسم کے مراحل تک جا پہنچتا ہے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ تشخص کی حس اس سے سلب ہو جاتی ہے، بلکہ حقیقت کا چہرہ اس کی نگاہوں میں الٹا نظر آتا ہے۔ وہ دیو کو فرشتہ، بد صورتی کی خوبصورتی اور باطل کو حق کی صورت میں دیکھتا ہے۔

”زیغ“ ارباب لغت کے بقول ”انحراف“ یا ”حق و صداقت سے انحراف“ کے معنی میں ہے۔ اسی لیے ہم قرآن میں پڑھتے ہیں ”ربنا لا نزغ قلوبنا“ اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں کو ایمان اور حق سے منحرف نہ فرما۔<sup>[۱]</sup>

”ران“، ”رین“ (بروزن عین) کے مادہ سے ہے جس کے معنی وہ رنگ ہے جو قیمتی اشیاء پر چڑھتا ہے۔ یہ قول ”مفردات“ میں راغب“ کا ہے۔ بعض دوسرے ارباب لغت نے کہا کہ ”وہ سرخ رنگ کی تہہ ہے جو ہوا کی نمی کی وجہ سے لوہے جیسی دھاتوں پر چڑھ جاتی ہے“ جسے اردو میں ”رنگ“ اور فارسی میں ”رنگ“ یا ”رنگار“ کہتے ہیں۔ اور یہ چیز عام طور پر دھات کی چیزوں کے گلنے سڑنے اور ضائع ہونے کی علامت اور ان کی چمک اور شفافیت کے ختم ہو جانے کا سبب بنتی ہے۔

بعض ارباب لغت نے اس کی ”ایک چیز کا دوسری چیز پر تسلط“ یا ”ایسے حادثے کا شکار ہونا جس سے نکلنا دشوار ہو“ کے معنی میں تفسیر کی

ہے۔ اسی لیے ”شراب“ کو بھی ”رینہ“ کہتے ہیں کیونکہ وہ انسان کی عقل پر غالب آ جاتی ہے۔ [۱]  
 ”وقر“ (بروز عقل) اس قدر بہرے پن کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے انسان کسی بات کو بڑی مشکل سے سن سکے۔  
 ”وقر“ (بروز فکر) ہر طرح کے بوجھ کو کہتے ہیں خواہ وہ انسان کی پیٹھ پر ہو یا سر پر اور بوجھل اور بھاری چیزوں کو ”وقر“ بھی کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صاحبان عقل و متانت کو ”صاحب وقار“ کہتے ہیں۔

”غشاوۃ“ کا معنی ہے ہر وہ چیز جو دوسری چیز کو چھپالے۔ اسی لیے پردے کو ”غشاوۃ“ کہتے ہیں اور قیامت کو بھی اسی لیے ”غاشیہ“ کہتے ہیں کہ اس سے اٹھنے والے ہر قسم کے اضطراب اور بے چینی سے سب چیزیں چھپ جائیں گی اور رات کی ایسی گہری تاریکی کو بھی ”غشاوۃ“ کہتے ہیں جو پردے کی مانند سطح زمین پر پڑتی ہے اور یہ لفظ ”خیمہ“ کے معنی میں بھی بولا گیا ہے۔

”اکنۃ“، ”کنان“ (بروزن زیان) کی جمع ہے جو دراصل ہر قسم کے اس پردے کے معنی میں ہے جس سے کسی چیز کو چھپایا جاتا ہے اور ”کن“ (بروزن جن) اس ظرف (برتن) کو کہتے ہیں جس میں کسی چیز کو محفوظ رکھیں اور گھر پر بھی اور ہر اس چیز پر بھی بولا جاتا ہے جو انسان کو سردی اور گرمی سے بچاتی ہے اور دلوں پر ”اکنہ“ کے پڑنے کا مقصد یہ ہے کہ ان سے تشخص کی قوت سلب ہوگئی ہے۔

”غلف“ (بروزن قفل) ”اغلف“ کی جمع ہے جو ”غلاف“ کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں تلوار یا کسی اور چیز کا پردہ (نیام) وغیرہ اور ”قلوب غلف“ ایسے دلوں کی طرف اشارہ ہے جن میں حقائق اور واقعیت کے درک کی قدرت نہیں ہوتی۔ گویا کہ وہ غلاف میں بند پڑے ہیں۔

”قسست“، ”قسوۃ“ (بروزن مردہ) اور ”قساوت“ کے مادہ سے ہے جس کے اصل معنی ہیں سخت اور ٹھوس ہونا اور نرمی اور جھکاؤ کو ختم کر دینا اور ”قسسی“ ناخالص چاند کو کہتے ہیں اور ”باقساوت دل“ وہ دل ہوتے ہیں جو حق اور عدالت کے سامنے ہر قسم کی نرمی اور جھکاؤ سے عاری ہوں۔

”نطبع“، ”طبع“ کے مادہ سے ہے جس کے اصل معنی کسی چیز پر نقش قائم کرنا ہے۔ اسی لیے کرنسی سکوں اور ان پر قائم ہونے والے نقوش کو ڈھالنے کے لیے یہ کلمہ استعمال ہوتا ہے اور ان مہروں کو ”طابع“ (بروزن خاتم) کہتے ہیں جن کے ذریعہ خطوط پر مہر لگائی جاتی ہے۔  
 اور جب یہ کلمہ ”عقل“ اور ”دل“ کے بارے میں استعمال ہوتا ہے تو اس سے یہ اشارہ مقصود ہوتا ہے کہ ان میں حقیقت کے درک کرنے کی صلاحیت مفقود ہے۔ کیونکہ ان کے دروازے بند کر کے ان پر مہر لگا دی گئی ہے۔

”طبع“ (بروزن عمل) کا لفظ ایسے رنگ کے معنی میں ہے جو تلوار پر چڑھ جاتا ہے اور جو گناہ اور معصیتیں انسان کے دل کو ڈھانپ دیتی ہیں ان کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

”ختم“ (بروزن حتم) دراصل کسی چیز کے ختم کر دینے کو کہتے ہیں۔ چونکہ خط کے مضمون کو مہر لگا کر ختم کیا جاتا ہے لہذا مہر کو

[۱] تفسیر فخر رازی، سورہ مطفقین کی ۱۴ ویں آیت کے ذیل میں اور ”المنجد“ مادہ ”دین“۔

”خاتم“ کہتے ہیں اور چونکہ گزشتہ زمانے میں بہت سے لوگوں کے نام کی مہراں کی انگوٹھیوں پر ہوتی تھی اور وہ اپنی انگوٹھی کے ساتھ خطوط پر مہر لگایا کرتے تھے اس لیے مہر کو ”خاتم“ کہا جاتا ہے۔

گزشتہ زمانے سے اب تک یہ دستور چلا آ رہا ہے کہ جب کسی خط، صندوق یا گھر کو بند کرنا چاہتے ہیں تاکہ اسے کوئی نہ کھول سکے تو پہلے اسے دھاگے یا تالے سے بند کر دیتے ہیں پھر اس پر لاکھ یا مٹی رکھ کر مہر لگا دیتے ہیں تاکہ اگر کوئی اسے کھولنا بھی چاہے تو ختم اس لاکھ اور مہر کو توڑے۔

دلوں اور عقلوں کے بارے میں ایسی تعبیر کا استعمال کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اس قدر ناقص اور بے کار ہو چکے ہیں کہ انہیں کسی بھی صورت میں نہیں کھولا جاسکتا اور نہ ہی معرفت اور شناخت کی راہوں کو ان تک باز کیا جاسکتا ہے۔

## آیات کی تفسیر اور ان کی جمع بندی

### معرفت کی آفات کا بالترتیب اثر و رسوخ (کجی، زنگ، بیماری، پردہ اور تالہ)

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ”معرفت کی رکاوٹوں“ کی بحث کی اہمیت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اسے دو مرحلوں میں پیش کیا جائے۔  
مرحلہ اول میں ان آفات اور موانع کے اجمالی وجود کا تذکرہ ہے۔ اس مرحلے میں یہ بتایا جائے گا کہ یہ انسان کی عقل، ادراک اور فطرت پر کیونکر اثر انداز ہوتے ہیں؟ اور معرفت کے ان عظیم سرچشموں کو کیونکر آلودہ کر دیتے ہیں؟ اور پھر انہیں معرفت کے کاموں سے کس طرح بیکار کر دیتے ہیں؟

مرحلہ دوم میں ان آفات و موانع میں سے ہر ایک کے بارے میں تفصیلی گفتگو، ان کے جزئیات اور خصوصیات کا بیان ہوگا اور اس بارے میں وارد ہونے والی قرآنی آیات کا ذکر ہوگا۔ یہ نہایت ہی مفصل، مدلل اور سبق آموز بحث ہوگی۔

سب سے پہلے ہم مرحلہ اول کا ذکر کریں گے۔ قابل توجہ یہ چیز ہے کہ قرآن مجید ان آفات کے بالترتیب اور مخفی اثر و رسوخ کے بارے میں اس قدر چجی ملی اور دقیق گفتگو کرتا ہے کہ علم و دانش اور معرفت کے راہیوں کو ان عظیم خطرات سے مکمل طور پر آشنائی حاصل ہو جاتی ہے اور انہیں پے در پے متنبہ کر رہا ہے کہ مبادا ہماری زندگی آب کی بجائے سراب کی تلاش میں گزر جائے اور ہم اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہیں اور سالہا سال حقیقت کی تلاش میں گزارنے کے بعد بھی ہم باطل کے دروازے پر کھڑے نظر آئیں۔

اب ہم مل کر مندرجہ بالا آیات کی تحقیق کرتے ہیں۔

پہلی اور دوسری آیات میں انسانی اعمال کے مزین ہونے کی بات ہو رہی ہے اور تزیین یا تو شیطان کے ذریعے عمل میں آتی ہے (جیسا کہ دوسری آیت میں بیان ہوا ہے) یا پھر خود انسان کی ذہنی سجاوٹوں اور خیالی پلاؤ پکانے کے ساتھ ساتھ ”سبز باغوں“ کی سیر کے ذریعے، یا کسی اور عامل کی وجہ سے عمل میں آتی ہے۔ (جیسا کہ پہلی آیت میں بصورت سربستہ اور فعل مجہول کے عنوان سے اس کا تذکرہ ہے)۔ ارشاد ہوتا

ہے: ”آیا وہ شخص جس کا برا عمل مزین ہوا ہے اور وہ اسے اچھا دیکھتا ہے، اس شخص کی مانند ہے جو اس طرح نہیں ہے؟ یقینی بات ہے کہ پہلا شخص حتمی تباہی اور بربادی کی طرف جا رہا ہے جبکہ دوسرا شخص خدا کے بتائے ہوئے صراطِ مستقیم پر گامزن ہے اور اگر اس سے کوئی برائی سرزد ہو بھی جاتی ہے تو فوراً اس کی توبہ، بازگشت اور تلافی کی فکر میں پڑ جاتا ہے۔

دوسری آیت میں اضافہ ہوتا ہے کہ پہلے تو انسان کا دل سخت اور مڑنے کی قابلیت سے نکل جاتا ہے۔ پھر وہ شیطانی وسوسوں اور اچھائیوں کے لباس میں ظاہر ہونے والی برائیوں کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کچھ لوگ نہ صرف اپنے نازیبا اعمال سے متنفر ہی نہیں بلکہ بعض اوقات ان پر نازاں بھی ہوتے ہیں، حتیٰ کہ ان اعمال کے مفید اور منطقی ہونے پر مصر ہوتے ہیں۔

یہی چیز حضرت یوسف علیہ السلام کی داستان میں بیان ہوئی ہے کہ جب یوسف علیہ السلام کے بھائی انہیں کنوئیں میں ڈال کر ان کا خون آلود کرتے اپنے باپ (حضرت یعقوبؑ) کے پاس لے آئے اور اس بات کا دعویٰ کرنے لگے کہ یوسف کو بھیڑ یا کھا گیا ہے اور ہم اس بات میں سچے ہیں، تو ان کے روشن ضمیر بوڑھے باپ نے انہیں کہا:

### بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا ط

”تمہاری نفسانی خواہشوں نے اس کام کو تمہارے لیے مزین کیا ہے۔“ (یوسف ۱۸)

یعنی تم یہ خیال کرتے ہو کہ اس قدر عظیم جرم کا ارتکاب کر کے تم نے اچھا کام کیا ہے اور یوسف کو ضائع کر دینے سے باپ کے دل میں ان کی خالی جگہ تم لوگوں اور یوسف ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے؟ حالانکہ تم اس بات سے غافل ہو کہ تم خود ہی تو یوسف کی عزت اور حکومت کے اسباب اپنے ہاتھوں سے فراہم کر رہے ہو اور باپ کے دل میں ان کی جگہ ہمیشہ کے لیے خالی کر رہے ہوتا کہ ”بار دیگر گمشدہ پیدا شود“ (ایک بار پھر گمشدہ مل جائے گا)۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآنی آیات میں ”تزئین کی“ کہیں پرتو ”شیطان“ کی طرف نسبت دی گئی ہے اور کہیں پر ”نفس“ کی طرف اور کہیں پر فعل مجہول کی صورت میں بیان ہوئی ہے اور پھر کہیں پر خدا کی طرف منسوب ہے۔ جیسے:

### إِنَّ الدِّينَ لَا يَوْمُنُونَ بِالْآخِرَةِ زَيْنًا لَهُمْ أَعْمَالُهُمْ

”جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے، حساب و کتاب، سزا و جزا اور خدائی انصاف کی عدالت سے بے خبر ہیں،

ہم ان کے اعمال ان کی نگاہوں میں مزین کر دیتے ہیں۔“ (سورہ نمل ۴)

درحقیقت یہ سب ایک ہی چیز کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔ شروع شروع میں ایسے کاموں کے مقدمات خود انسان فراہم کرتا ہے پھر شیطان اس میں رنگ بھرتا ہے۔ چونکہ خداوند عالم مسبب الاسباب اور علت و معلول کا خالق ہے لہذا ان کاموں کے نتیجہ کی نسبت اس کی طرف دی جاتی ہے۔ اس کی حکمت بھی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ایسے افراد ایسے ہی انجام سے دو چار ہوں۔ کس قدر دردناک ہے اس شخص کا حال جس کی نظر میں برائیاں، اچھائیوں میں تبدیل ہو کر جلوہ افروزی کرتی ہیں۔

تیسری آیت میں انحراف قلب کے سب سے پہلے مرحلہ کا ذکر ہے۔ اس کے بعد قرآنی آیات کو ”محکمات“ (یعنی وہ آیات جن کا مفہوم مکمل طور پر واضح اور روشن ہے) اور ”متشابہات“ (جن آیات کے معانی پیچیدہ ہیں) یعنی دو حصوں میں تقسیم کر کے فرماتا ہے۔ ”علم و دانش میں راسخ لوگ ان سب آیات پر ایمان لے آتے ہیں“ (اور متشابہ آیات کی محکم آیات کے ساتھ تفسیر کرتے ہیں)۔ لیکن جن کے دلوں میں ”زلیغ“ یعنی کجی ہے وہ متشابہ آیات کی اپنی مرضی کے مطابق تفسیر کر کے فتنہ انگیزی میں مشغول ہو جاتے ہیں۔“

وہ ہمیشہ اپنے غلط اور ناجائز مقاصد کی توجیہ کے لیے آیات متشابہ کا سہارا لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے منافقین، صاحبان بدعت اور گمراہ کن کتب کے پیروکار جہاں پر دیکھتے ہیں کہ وہاں پر رہنے والے لوگ خلوص قلب کے ساتھ قرآنی آیات پر مکمل طور پر ایمان رکھتے ہیں تو وہ اس پاکیزہ عقیدے سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے متشابہ آیات کی ”تفسیر بالرائے“ کر کے اپنی بدعتوں کو فروغ دیتے ہیں۔ بالفاظ دیگر چونکہ ان کے اپنے ہی قلب و فکر ہوتے ہیں لہذا وہ قرآنی آیات کو بھی منحرف دیکھتے ہیں، بالکل ویسے ہی جیسے ٹیڑھے اور کج مچ آئینے میں صورتیں بھی ٹیڑھی ہی نظر آتی ہیں۔

چوتھی آیت میں دلوں کے زنگ کا مسئلہ بیان کیا جا رہا ہے۔ گناہ آلودہ اعمال سے جو گرد و غبار دل پر بٹھ جاتا ہے اور زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ تہہ در تہہ جم کر پتھر کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور زنگ کی مانند تمام دل کو ڈھانپ لیتا ہے۔ اس بارے میں ارشاد ہوتا ہے: ”بات وہ نہیں جو یہ لوگ سمجھتے ہوئے ہیں بلکہ ان کے برے اعمال زنگ کی مانند ان کے دلوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر وہ حقیقت کے چہرے کو نہ دیکھ کر اس کی تشخیص نہ کریں تو اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے۔“

پانچویں آیت میں اس حالت میں شدت پیدا ہو جانے اور اس کے ایک اندرونی بیماری میں تبدیل ہونے کا تذکرہ اور شیطانی وسوسوں اور وہ بھی انبیاء اور مرسلین کی موجودگی میں ذکر کے بعد فرماتا ہے: ”یہ ماجرا اس لیے ہے تاکہ خداوند عالم شیطانی القاء کو ان لوگوں کے لیے فتنہ قرار دے جن کے دلوں میں بیماری ہے۔“

جی ہاں! یہ بیمار دل ہی تو ہیں، حقیقت کا لذیذ ذائقہ جن کے کام و دہن میں تلخ ہوتا ہے اور تلخی جن کے لیے شیرینی ہوتی ہے اور یہ سب شیطانی وسوسوں کی بدولت ہوتا ہے۔

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ قرآن مجید کی بارہ آیات میں ”فی قلوبہم مرض“ یا ”فی قلبہم مرض“ کا جملہ ذکر ہوا ہے۔ یہ تکرار اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن مجید نے اس چیز کو کس قدر اہمیت دی ہے۔ یہ بھی قابل غور بات ہے کہ قرآن پاک کی یہ آیات غالب طور پر منافقین کے بارے ہی میں ہیں اور بارہ آیات میں سے کئی آیات میں بڑی صراحت کے ساتھ منافقین کا نام لیا گیا ہے۔ [۱]

لیکن مذکورہ آیات میں سے بہت کم آیات میں یہ ”مرض“، ”سرکش شہوات اور ہوس آلود رجحانات“ کے معنی میں ہے، جیسا کہ سورہ احزاب کی ۳۲ ویں آیت ازواج پیغمبر کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے ”فلا تخضعن بالقول فیطبع الذی فی قلبہ مرض“ ہوس

انگیز طریقے سے باتیں نہ کرو ورنہ جن لوگوں کے دل میں بیماری ہے وہ طمع کریں گے۔

بہر حال ان آیات سے بخوبی استفادہ ہوتا ہے کہ جسمانی بیماری کے علاوہ ایک اور بیماری بھی انسان کو عارض ہوتی ہے جو روحانی یا قلبی بیماری کہلاتی ہے اور بیماری کی یہ قسم کبھی تو ”نفاق“ کی وجہ سے اور کبھی ”سرکش نفسانی خواہشات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے؟ انسان کے روحانی ذائقہ کو مکمل طور پر تبدیل کر دیتی ہے جس طرح اکثر سمائی امراض کے مریضوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لذیذ اور شیریں غذاؤں سے متنفر ہوتے ہیں، بلکہ بعض اوقات وہ نفرت انگیز غذاؤں کی خواہش کرتے ہیں۔ ظاہری بات ہے کہ اس قسم کے لوگ حقائق کے ادراک پر قادر نہیں ہوتے، اور صحیح اور سچے معارف سے اجنبی ہوتے ہیں۔

اس سے بھی بڑھ کر قابل افسوس بات یہ ہے کہ وہ جس قدر بھی اس راہ پر گامزن ہوتے جاتے ہیں یہ مرض اس قدر شدت اختیار کرتا جاتا ہے۔ پہلے وہ شک کے مرحلے میں ہوتے ہیں، تو آہستہ آہستہ نوبت انکار تک پھر انکار سے استہزاء اور حق کے ساتھ مخالفت کی حد تک جا پہنچتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے: ”فی قلوبہم مرض فزادہم اللہ مرضاً“ ان کے دلوں میں بیماری ہے اور خداوند عالم ان کی بیماری میں اضافہ کر دیتا ہے۔ ”ولہم عذاب الیم بما کانوا یکذبون“ اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے بوجہ اس کے کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ (بقرہ ۱۰)

چھٹی آیت میں گونا گوں حجابوں اور پردوں کا ذکر ہے جو دلوں پر پڑتے ہیں، ایک نہیں کئی پردے۔ جیسا کہ فرماتا ہے ”ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں تاکہ وہ قرآن کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں سنگین قرار دی ہے۔“ بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ ”۱۰ کدہ“ کی تعبیر بہت زیادہ تعداد میں پردوں پر دلالت کرتی ہے۔ [۱] اس میں شک نہیں ہے کہ ان کے ظاہر کان بہرے نہیں ہیں بلکہ ان کے دل کے کان سنگین اور بہرے ہوتے ہیں اور حق کی باتیں نہیں سن سکتے۔ اسی طرح اس دل پر پردہ نہیں پڑتا جو بدن میں خون کی گردش کا وسیلہ ہوتا ہے بلکہ ان کی عقل اور روح پر پڑتا ہے۔ لیکن یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ممکن ہے کہ خداوند عالم کسی کے دل پر پردے ڈال دے اور کانوں کو بہرا کر دے تاکہ وہ نہ تو حق کو سن سکے اور نہ ہی اس کا ادراک کر سکے؟

بہت سے مفسرین اس سوال کے جواب میں اشکال کا شکار ہو گئے ہیں۔ کبھی تو یہ کہا کہ یہ ایک معجزہ تھا کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم متعصب دشمنوں کی نگاہوں سے چھپ جایا کرتے تھے اور وہ آپ کی باتوں کو نہیں سن پاتے تھے تاکہ وہ اس طرح سے آنجناب کے پروگراموں میں روڑے نہ اٹکائیں اور آپ کی اذیت سے باز رہیں۔ کبھی کہا کہ خداوند عالم اس قسم کے لوگوں سے اپنی مہربانیاں سلب کر لیتا تھا اور انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیتا تھا اور دلوں پر پردہ ڈالنے اور کانوں کو بہرا کرنے کے معنی یہی ہیں۔



لیکن ظاہر بات یہ ہے کہ اس آیت کے اور اس جیسی دوسری اور اس سے ملتی جلتی کئی اور آیات کے معنی کچھ اور ہیں۔ درحقیقت یہ ایک سزا ہے جو خداوند عالم نے متعصب، تنگدل، خودخواہ، مغرور اور گناہگار لوگوں کے لیے مقرر کر رکھی ہے۔ یاد دوسرے لفظوں میں ان کا حقیقت کے ادراک سے محروم ہو جانا ان کی منحوس صفات اور قبیح افعال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ خداوند عالم نے یہ خاصیت ان کے ان افعال میں ہی خلق فرمادی ہے، بالکل ویسے ہی جیسے زہر قاتل میں خلق فرمائی ہے کہ جب کوئی انسان اسے جان بوجھ کر کھاتا ہے یا خود کو آگ میں ڈالتا ہے تو آگ اور زہر کے خالق کا قصور نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس شخص کو ہی ملامت کیا جاتا ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا ہے؟

ساتویں آیت میں یہودی زبان سے یہ بات نقل کی گئی ہے کہ وہ استہزاء کے طور پر پیغمبر اسلام (یا دوسرے انبیاء) سے کہتے تھے ”تم تو جانتے ہو کہ ہمارے دل غلاف میں ہیں اور ہم تمہاری کسی بات کو نہیں سمجھ سکتے۔“ قرآن مجید اسی آیت کے آخر میں فرماتا ہے: ”بل العنہم اللہ بکفرہم فقلیلا ما یؤمنون“ یعنی جی ہاں یہی بات ہے کہ خداوند عالم نے انہیں ان کے کفر کی خاطر ہی لعنت کی ہے اور اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے اور اس قسم کے لوگ حقیقت کا خوبصورت چہرہ کیونکر دیکھ سکتے ہیں!

ممکن ہے کہ ”غلاف“ کی تعبیر کا مفہوم ”اکنہ“ (کئی پردے) کے مفہوم سے بالاتر ہو کیونکہ ”غلاف“ کسی چیز کو تمام اطراف سے ڈھانپ لیتا ہے، جبکہ یہ ممکن ہوتا ہے کہ پردہ کسی چیز کی ایک طرف کو چھپائے اور دیکھنے سے مانع ہو۔ یاد دوسرے لفظوں میں کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ معرفت سے روکنے والی چیز صرف ایک طرف سے حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً صرف فطری مسائل یا عقلی مسائل کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تمام جہات سے معرفت اور شناخت کے منابع پر پردے پڑ جاتے ہیں اور تمام انسانی ادراکات ایک غلاف میں چھپ جاتے ہیں۔ اور بات بھی یہی ہے کہ انسان جس قدر گناہوں سے آلودہ اور فساد میں گرفتار ہوتا جاتا ہے اسی قدر اس کا قلب اور روح بھی حقائق کے مشاہدہ سے دور سے دور تر اور محروم سے محروم تر ہوتے جائیں گے۔

آٹھویں اور نویں آیت میں دلوں پر مہر لگانے کی بات ہو رہی ہے جو اس بات کا سبب بن جاتی ہے کہ انسان حقائق اور واقعات کا ادراک نہیں کر سکتا۔ (آٹھویں آیت میں) فرماتا ہے ”فہم لا یسمعون“ (وہ نہیں سنتے) اور نویں آیت میں فرماتا ہے: ”فہم لا یفہون“ (وہ نہیں سمجھتے) اور چونکہ سننے سے مراد دل کے کانوں سے سننا ہوتا ہے، لہذا دونوں کے معنی ایک ہوتے ہیں۔ یہ نہایت ہی سخت مرحلہ ہوتا ہے۔ سب سے پہلے دل پر پردہ پڑتا ہے، پھر دل غلاف میں لپٹ جاتا ہے اور آخر کار ہر قسم کے اثر و رسوخ کو روکنے اور دل میں کسی کے اثر کرنے سے بچاؤ کے لیے اس پر مہر لگا دی جاتی ہے، جیسا کہ قبل ازیں الفاظ کے معانی اور تشریح کی بحث میں بیان کیا جا چکا ہے۔

البتہ وہ اس رسوا کن انجام سے بلاوجہ دوچار نہیں ہوتے بلکہ اس سے پہلے کی آیات کی رو سے یہ صراحت موجود ہے کہ منافقین کے اس گروہ کو جب جہاد کا حکم ملتا ہے تو وہ کہتے ہیں ”آپ ہمیں رہنے دیں تاکہ ہم قاعدین کے ساتھ رہیں۔“ کیونکہ قاعدین (جہاد نہ کرنے والے) جہاد سے ہوتے ہیں۔

پھر فرماتا ہے کہ ”وہ اس بات پر راضی ہو چکے ہیں کہ وہ جہاد نہ کرنے والوں کے ساتھ رہیں“ اور جو شخص جہاد کی قدرت رکھنے کے

باوجود جہاد سے روگردانی کریں، بعید نہیں ہے کہ ان کے دلوں پر مہر لگی ہوئی ہو۔

دوسری آیت میں فرماتا ہے: باوجودیکہ انہوں نے اپنے سے پہلے لوگوں کی حالت کو دیکھ لیا ہوا ہے کہ وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے کیونکر عذاب الہی میں گرفتار ہوئے ہیں، پھر بھی وہ بیدار نہیں ہوتے، البتہ ایسے دلوں پر مہر لگی ہوئی ہے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ ایک مقام پر (آٹھویں آیت میں) فرماتا ہے: ”ہم ان کے دلوں پر مہر لگاتے ہیں۔“ اور دوسرے مقام پر (نویں آیت میں) فرماتا ہے۔ ”اس کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے۔“ جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ ان کی اپنی بد اعمالیوں اور برے کاموں کا نتیجہ ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس قسم کی آیات میں ”طبع“ سے مراد وہ نقش ہوتا ہے جو سکے پر بنایا جاتا ہے کیونکہ وہ ایک بادوام، پائیدار اور باقی رہنے والا نقش ہوتا ہے اور آسانی کے ساتھ نہیں مٹتا۔ [۱] ان کے دل کے سکوں نے بھی کفر و نفاق اور گناہ کا نقش اپنایا ہوا ہے جو اتنی جلدی سے تبدیل نہیں ہوگا۔

دسویں اور گیارہویں آیت میں ”ختم“ کی بات ہو رہی ہے اور جیسا کہ الفاظ کے معانی کی بحث میں بیان ہو چکا ہے اس کے معنی کسی چیز کا خاتمہ کرنا ہوتا ہے، اور چونکہ خطوط کو آخر میں مہر لگا دیتے ہیں لہذا یہ لفظ مہر لگانے کے معنی میں بھی آتا ہے اور مہر لگانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کو اس حد تک بند کر دیا جائے اور لاکھ لگا دی جائے کہ اسے کوئی شخص کھول نہ سکے۔ مندرجہ بالا آیات میں جو فرماتا ہے کہ ”خداوند عالم کچھ متعصب کفار کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر مہر لگا دیتا ہے“ ”مہر“ سے مراد یہ ہے کہ ان کے اپنے اعمال کی وجہ سے ان سے تشخیص کی حس کو مکمل طور پر اس طرح سے سلب کر لیتا ہے کہ وہ حق کو باطل سے اور نیک کو بد سے تشخیص نہیں دیتے۔ اسی لیے اس سے پہلی آیت میں فرماتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۶۵﴾

(بقرہ ۶۵)

”جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہے ان کے لیے فرق نہیں ہے کہ ان کو خدائی عذاب سے ڈرائیں یا نہ ڈرائیں۔ وہ ایمان نہ لائیں گے۔“

یقیناً یہ حکم تمام کفار کے بارے میں نہیں ہے، بلکہ ان سے مراد وہ متعصب کفار ہیں جو حق کے ساتھ عناد اور دشمنی رکھتے ہیں اور گناہ، ظلم اور فساد میں اس قدر آلودہ ہو چکے ہیں کہ ان کے دل مکمل طور پر تاریک اور ظلمانی ہو چکے ہیں، وگرنہ پیغمبر کا کام ہی منخرفین اور کفار کو ڈرانا، بشارت دینا اور ہدایت کرنا ہی تو ہوتا ہے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ان آیات میں صرف دل پر مہر لگانے کی بات ہی نہیں ہے بلکہ فرماتا ہے: ”آنکھیں اور کان بھی اسی انجام سے دوچار ہوں گے۔“ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ صرف عقلی ادراکات ہی بے کار نہیں ہو جائیں گے بلکہ جو وہ حس کے ذریعہ دیکھتے یا سنتے

ہیں، اس حد تک بے اثر ہو جائیں گے کہ گویا نہ تو انہوں نے کچھ دیکھا ہے اور نہ ہی سنا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ انسان کو اکثر و بیشتر علوم انہی دو راستوں سے ہی حاصل ہوتے ہیں، حتیٰ کہ انسانی وحی اور دعوت انبیاء کی حقانیت کو بھی ان دو راستوں سے پیدا کرتا ہے اور ان دونوں عظیم راستوں کے بیکار ہوجانے سے ہدایت اور نجات کے راستے ان کے لیے بالکل بند ہو جاتے ہیں اور یہ وہی چیز ہے جسے وہ خود چاہتے تھے، یعنی ایسی آگ ہے جسے انہوں نے خود ہی بھڑکایا ہے اور یہ ہرگز جبر کا نتیجہ نہیں ہے جیسا کہ بعض بے خبر لوگ سمجھتے ہیں۔

قرآن مجید کی جن بعض آیات میں ”طبع“ کا لفظ آیا ہے اس کے بھی یہی معنی ہیں۔ مثلاً فرماتا ہے:

**أُولَئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَسَمِعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۗ**

”یہ وہ لوگ ہیں جن کے ”قلب“، ”کان“ اور ”آنکھوں“ پر مہر لگا دی ہے اور وہی لوگ ہی حقیقی غافل ہیں۔“ (نحل ۱۰۸)

اس سے پہلے کی آیات بھی یہ بتاتی ہیں کہ یہ تمام کفار کے بارے میں نہیں ہے بلکہ ان کے بارے میں ہے جنہوں نے اپنا سینہ کفر کے لیے کھول دیا ہے اور اپنی تمام توانائیوں کے ساتھ اس کے استقبال کے لیے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

**وَلَكِنْ مِّنْ شَرِّحٍ بِالْكَفْرِ صَدَدًا (نحل ۱۰۶)**

بارہویں آیت میں ان تالوں کی بات ہو رہی ہے جو دلوں پر ڈالے جاتے ہیں، ایسے تالے کہ بسا اوقات ان کی تاثیر مہروں سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ [۱] ارشاد فرماتا ہے ”آیا وہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے، یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں؟“، یعنی قرآنی آیات اس طرح ہیں کہ اگر انسان کی عقل یا دل کا تھوڑا سا راستہ بھی کھلا ہوا ہو تو اس میں نفوذ کر جاتی ہیں۔ قرآن کی منطق، قرآن کا دلچسپ اور شیریں بیان، قرآن کی عمیق و دقیق تحلیلیں اور قرآن کا وہ مخصوص نور اور روشنائی ہر اس دل پر اثر کرتے ہیں اور اسے اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں جس میں آمادگی پائی جاتی ہے اور جو لوگ سنتے تو ہیں لیکن ان پر ذرہ بھر اثر نہیں ہوتا، ان میں حق کی قبولیت کی قطعاً کوئی آمادگی نہیں ہوتی۔

”اقفال“، ”قفل“ کی جمع ہے۔ جو دراصل ”قفول“ کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے ”لوٹ آنا“ اور چونکہ جب دروازے کو بند کرنے کے بعد اسے تالا لگا دیتے ہیں تو جو بھی وہاں آتا ہے وہ واپس پلٹ جاتا ہے، یہ لفظ معمولی تالے پر بولا جاتا ہے۔

”اقفال“ (جمع کے صیغہ کی صورت میں) کا استعمال شاید اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ دل پر صرف ایک تالہ ہی نہیں پڑتا بلکہ بعض اوقات تو کئی تالے پے در پے اس پر ڈالے جاتے ہیں کہ اگر ان میں سے ایک کو کھولا جائے تو بقیہ تالوں کا وجود دل کے دروازوں کے کھلنے کی اجازت نہیں دیتا اور یہ چیز درک حقائق سے محرومی کا بالاترین مرحلہ ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ ”قلوب“ کو ان کی طرف اضافت نہیں کی گئی بلکہ اسے ”نکوہ“ کی صورت میں لایا گیا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس قسم کے دل، جو کسی کام کے نہ ہوں، گویا وہ ان کے دل نہیں ہیں اور پھر عجیب تر بات یہ ہے کہ ”اقفال“ کو ”قلوب“ کی

[۱] فخر رازی نے بھی اپنی تفسیر میں اسی چیز کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ملاحظہ ہو جلد ۲۸ ص ۶۶

طرف مضاف کیا گیا ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ گویا اس طرح کے دل اسی قسم کے تالوں کے لائق ہوتے ہیں اور یہ تالے انہی کے لیے ہیں اور انہی کے ساتھ مخصوص ہیں۔

تیرھویں آیت میں ایک اور لڑ را دینے والی تعبیر نظر آتی ہے۔ آیت کہتی ہے: ”آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ سینوں میں موجود نابینا ہو جاتے ہیں۔“ یعنی اگر ظاہری آنکھیں اندھی ہو جائیں تو پریشانی کی بات نہیں ہے کیونکہ بیدار عقل اس کے قائم مقام ہو سکتی ہے۔ بدبختی اور بے چارگی تو اس دن ہوگی جب چشم دل نابینا ہو جائے اور یہی کوردلی حقیقت کے ادراک سے بہت بڑی رکاوٹ ہوتی ہے اور یہ ایسی چیز ہے جسے انسان خود ہی اپنے ہاتھوں سے فراہم کرتا ہے، کیونکہ تجربہ گواہ ہے کہ اگر انسان ایک لمبے عرصے تک تاریکی میں رہے، یا آنکھیں کو مضبوطی سے باندھے رکھے تو وہ آہستہ آہستہ اپنی حس بینائی کھودیتا ہے۔ اس طرح جو لوگ اپنی چشم دل کو حقائق کے دیکھنے سے بند کر دیتے ہیں اور ایک مدت مدید تک جہالت، خودخواہی، غرور اور گناہوں کے گڑھے میں پڑے رہتے ہیں، وہ دل کی بنائی کو کھودیتے ہیں۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ جو دل سینے کے اندر ہے وہ روح اور عقل کے معنی میں نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ تو گوشت کا وہی ٹکڑا ہے جو تمام اعضاء بدن تک خون پہنچانے پر مامور ہوتا ہے۔ لیکن ایک نکتے پر غور کیا جائے تو اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ ”صدر کا ایک معنی انسان کی ذات اور سرشت ہے۔ بنا بریں ”اقلوب التی فی الصدور“ اس عقل و ادراک کی طرف اشارہ ہے جو انسان کی سرشت میں ودیعت کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ ”قلب“ انسانی جسم کا سب سے پہلا عضو ہے جس میں تمام عاطفے، ادراکات اور جذبات و احساسات منعکس ہوتے ہیں۔ ایک اہم فیصلہ، سخت غصے کی ایک حالت، قومی محبت اور دوستی کا ایک حساس فوراً دل کی دھڑکنوں کو دگرگوں کر دیتا ہے اور اگر یہی ظاہری دل عقل سے کنایہ ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کا روح اور جان کے ساتھ قریبی رابطہ ہوتا ہے۔ [۱]

زیر بحث سلسلے کی چودھویں اور آخری آیت میں معرفت سے محرومی کا مرحلہ اپنی انتہا کو جا پہنچتا ہے اور عقل و فطرت اور گوش و چشم مکمل طور پر بے کار ہو جاتے ہیں اور وہ بھی اس حد تک کہ انسان چوپایوں بلکہ ان سے بھی پست تر حد تک جا گرتا ہے۔

یہ آیت جہنمیوں کے ایک گروہ کی طرف اشارہ ہے جو گویا جہنم ہی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: ”ان کے لیے دل ہیں لیکن وہ سمجھتے نہیں، وہ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں لیکن ان سے سنتے نہیں“ یقیناً وہ اس کیفیت کے ساتھ اپنا انسانی طرہ امتیاز کھو کر جانوروں کی صف میں داخل ہو چکے ہوتے ہیں۔ لہذا آگے فرماتا ہے ”وہ چوپایوں جیسے ہیں“ اور چونکہ چوپائے انسانی استعداد سے محروم ہوتے ہیں، لیکن یہ گروہ اس چیز کے ہوتے ہوئے بھی اس انجام سے دوچار ہوتا ہے۔ اسی لیے خدا فرماتا ہے ”بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں اور حقیقی معنی میں غافل یہی لوگ ہیں۔“

اس طرح سے وہ اپنی ”انسانی خاصیت“ کو کھو چکے ہوتے ہیں اور واپسی کی راہیں بھی گم کر چکے ہوتے ہیں۔ اوج سعادت سے بدبختی

[۱] مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ جلد اول، سورہ بقرہ کی ساتویں آیت کی تفسیر اور جلد ۱۴ کی طرف رجوع فرمائیں۔

کے گڑھوں اور ذلت و رسوائی کے کھڈوں میں جا گرتے ہیں۔ معارف کے تمام دروازے ان پر بند ہو چکے ہوتے ہیں اور یہ ان لوگوں کا انجام ہے جنہوں نے اپنے اعمال ہی کے ذریعے اور اپنے ہی ہاتھوں سے جس کے اسباب فراہم کیے ہیں۔

## آخری نتیجہ

مندرجہ بالا چودہ آیات کہ جن کے نمونے قرآن مجید میں بہت زیادہ ہیں اور ہم نے ان خصوصیات کے تحت ان آیات کو یہاں پر بحث کے لیے درج کیا ہے، جو ان میں پائی جاتی ہیں، مجموعی طور پر اس حقیقت کو اچھی طرح ثابت کرتی ہیں کہ انسانی معرفت کے ذرائع اور منابع خصوصاً عقل و فطرت اور احساس، ممکن ہے کہ ایسی آفتوں کا شکار ہو جائیں جو بعض اوقات خفیف ہوتی ہیں اور بعض اوقات شدید ہوتی ہیں اور کبھی تو اس قدر غالب آجاتی ہیں کہ انسان کو مکمل ظلمت اور تاریکی میں اس حد تک غرق کر دیتی ہیں کہ وہ واضح ترین حسی حقائق تک کو بھی درک نہیں کر سکتا۔

ہماری کوشش رہی ہے کہ اس تدریجی انحراف کو اس کے ابتدائی مرحلہ سے لے کر آخری مرحلہ تک قرآنی آیات کے ساتھ بیان کریں۔ ہمیں اس بات پر اصرار نہیں ہے کہ اس کی طبعی ترتیب بھی وہی ہے جو مندرجہ بالا آیات کی ترتیب میں بیان ہوئی ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہیں گے کہ یہ آیات مندرجہ بالا آفات کے اثر و رسوخ اور نفوذ کو اس کے تمام مراحل میں بیان کر سکتی ہیں۔ اس بارے میں قرآن مجید کی تعبیریں کس قدر زیبا اور کیسی حساب شدہ ہیں، کبھی تو بیرونی عوامل مثلاً ”شیطانی تزیین“ کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہتی ہیں:

کبھی تو قلب و فکر کے انحراف کی باتیں ہوتی ہیں۔

کبھی زنگ کے مرحلہ تک بات جا پہنچتی ہے۔

کبھی یہ انحراف ایک بیماری اور مرض مزمن کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

کبھی دلوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔

کبھی دل مکمل طور پر پردوں میں لپیٹ دیئے جاتے ہیں۔

کبھی دل پر مہر لگا دی جاتی ہے اور مستقل نقش اس پر قائم کر دیا جاتا ہے۔

کبھی اسے بند کر کے لاکھ کے ذریعہ اس پر مہر لگا دی جاتی ہے۔

کبھی بات اس سے آگے چلی جاتی ہے اور آنکھ اور کان بھی پردوں میں لپیٹ دیئے جاتے ہیں۔

کبھی دلوں پر پختہ تالے ڈال دیئے جاتے ہیں۔

کبھی مطلق نابینائی کی نوبت آ جاتی ہے۔

اور آخر کار اس سے انسانی خصوصیات چھین لی جاتی ہیں اور اسے حیوانوں اور چوپایوں کے مرحلہ تک لے جا کر پھر اسے اس سے بھی

پست درجے میں گرا دیا جاتا ہے۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کے لیے اس قسم کی گونا گوں بد بختیوں اور مختلف الانواع مصائب کا سبب کیا چیز ہے اور کیا چیز انہیں فراہم کرتی ہے، تو یہ بات آئندہ کی بحثوں کا موضوع ہے۔ یہاں پر تو صرف واضح طور پر یہ بیان کرنا تھا کہ معرفت کے یہ منافع کیونکر بے کار ہو جاتے ہیں، تاکہ ہم ان کے مختلف علل اور عوامل تک رسائی حاصل کر لیں۔

پھر اس بیماری کے علاج، ان پردوں کے ہٹانے اور اس زنگ کو دور کرنے اور اس مرحلہ تک پہنچنے کے سدباب کہ جس سے واپسی ناممکن ہوتی ہے کے راستے تلاش کیے جائیں۔

ہم اس بحث کو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے اس فرمان مبارک پر ختم کرتے ہیں کہ:

”ان لك قلباً و مسامع وان الله اذا اراد ان يهدى عبد الفتح مسامع

قلبه واذا اراد به غير ذلك ختم مسامع قلبه فلا يصلح ابداً، وهو قول

الله عز وجل امر على قلوب اقلها“

”تمہارے لیے ایک دل ہے اور کئی کان (تیرے دل تک پہنچانے کے رستے ہیں) اور جب خدا کسی بندہ کو (اس کے جہاد و تقویٰ کی بدولت) ہدایت کرنا چاہتا ہے تو اس کے کانوں کو کھول دیتا ہے اور جب اس کے علاوہ کرنا چاہتا ہے تو اس کے دل کے کانوں پر مہر لگا دیتا ہے، اس طرح کہ اس کی ہرگز اصلاح نہیں ہو سکتی اور یہ ہیں خداوند عزوجل کے اس قول کے معنی ”امر على قلوب اقلها“۔ [۱]

## معرفت کی راہ میں رکاوٹیں اور آفتیں

(تفصیل کے ساتھ)

اشارہ

گزشتہ بحث میں انسان پر شناخت کے دروازے اور معرفت کے راستوں کے بند ہونے کا اجمالی تذکرہ تھا۔ لیکن اب اس دردناک چیز کے ”عوامل اور اسباب“ کی بات ہوگی۔ یہ ایسی دردناک چیز ہے جو انسان کو ایک چوپائے یا اس سے بھی کمتر درجے تک پست کر دیتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سے امور ہیں جو اس بات کا سبب بنتے ہیں کہ انسان کے دل پر زنگ چڑھ جائے، اس کے دل کے کان بہرے ہو جاتے ہیں، اس کی چشم دل اندھی ہو جاتی ہے۔ اس کی عقل کا ترازو اپنا توازن کھودیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حق کو نہیں دیکھ سکتا یا اگر دیکھتا ہے تو الٹا؟

قرآن مجید میں اس اہم مسئلے کے بارے میں بہت سے مقامات پر گفتگو ہوئی ہے اور اس کے اصل عوامل کو بیان کیا گیا ہے۔ ایک سادہ سی گروہ بندی میں اسے تین حصوں میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ روحانی اور اخلاقی صفات جو دل کی آنکھوں کا حجاب بن جاتی ہیں۔

۲۔ وہ اعمال اور کردار جو دل کے آئینہ کو تاریک کر دیتے ہیں۔

۳۔ وہ بیرونی عوامل جو انسان کی فکر، عقل، عواطف اور فطرت پر اثر اور ان پر پردے ڈالتے ہیں۔

ان تینوں عنوانات میں سے ہر ایک پر ہم جداگانہ تفصیلی نگاہ ڈالیں گے اور مفصل بحث کریں گے (ایک بار پھر تاکید کی جاتی ہے کہ ایسے امور کو بیان کیا جائے گا جو قرآنی آیات میں منعکس ہیں اور واضح طور پر ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے)۔

**الف: وہ صفات جو معرفت سے مانع ہیں:**

یہ ایسی صفات ہیں جو کہیں پر تو صریحی طور پر اور کہیں پر اشاروں اشاروں میں قرآنی آیات میں ان پر گفتگو کی گئی ہے اور وہ مندرجہ

ذیل ہیں:

### ۱۔ خواہش پرستی کا حجاب

سب سے پہلے ہم مندرجہ ذیل آیات کو دل کے کانوں کے ساتھ سنتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:



## آیات

(۱) أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَى عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَى سَمْعِهِ  
وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَى بَصَرِهِ غِشَاوَةً فَمَنْ يَهْدِيهِ مِنْ بَعْدِ اللَّهِ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿۲۳﴾  
(جاثیہ ۲۳)

(۲) كُلَّمَا جَاءَهُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَى أَنْفُسُهُمْ فَرِيقًا كَذَّبُوا وَفَرِيقًا  
يَقْتُلُونَ ﴿۲۴﴾ وَحَسِبُوا أَنَّ تَكُونَ فِتْنَةً فَعَمُوا وَصَمُّوا ثُمَّ تَابَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ  
عَمُوا وَصَمُّوا كَثِيرٌ مِنْهُمْ ط وَاللَّهُ بِصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿۲۵﴾ (سورہ مائدہ ۴۱-۴۰)  
(۳) وَمِنْهُمْ مَن يَسْتَبِعُ إِلَيْكَ ۖ حَتَّىٰ إِذَا خَرَجُوا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوا لِلَّذِينَ  
أَوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ آنِفًا أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَاتَّبَعُوا  
أَهْوَاءَهُمْ ﴿۱۶﴾ (سورہ محمد ۱۶)

## ترجمہ

(۱) آیاتوں نے اسے دیکھا ہے جس نے اپنا معبود اپنی نفسانی خواہشات کو قرار دیا ہے اور خداوند عالم نے (یہ) جانتے ہوئے (کہ وہ ثنائیت ہدایت نہیں) اسے گمراہ کیا ہے اور اس کے کان اور آنکھ پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے، تو پھر کون ہے کہ خدا کے علاوہ اسے ہدایت کرے؟ کیا تم نہیں سمجھتے ہو؟  
(۲) جب کوئی بھی پیغمبران کی خواہشات کے خلاف ان کے پاس آیا تو کچھ انبیاء کو تو وہ جھٹلاتے تھے اور کچھ کو وہ قتل کر دیتے تھے، اور گمان کرتے تھے کہ کوئی سزا نہیں ہوگی، لہذا وہ (حق کی بات سننے اور حقائق کو دیکھنے سے) اندھے اور بہرے ہو گئے۔ پھر (وہ بیدار ہو گئے اور) خدا نے ان کی توبہ قبول کی۔ پھر وہ (خواف غفلت میں چلے گئے اور ان میں سے بہت سے لوگ) اندھے اور بہرے ہو گئے اور خداوند عالم ان کاموں سے آگاہ ہے جو وہ انجام دیتے ہیں۔

(۳) ان میں سے کچھ لوگ تو وہ ہیں جو تمہاری باتوں کو کان لگا کر سنتے ہیں، لیکن جب وہ تمہارے پاس سے اٹھ کر جاتے ہیں تو (از روئے تمسخر) ان لوگوں سے کہتے ہیں جنہیں خداوند عالم نے علم و دانش عطا کی ہے کہ اس

شخص (پیغمبر) نے ابھی کیا کہا ہے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر خدا نے مہر لگا دی ہے اور انہوں نے اپنی خواہشات نفسانی کی پیروی کی ہے۔ (لہذا وہ کچھ نہیں سمجھتے)۔

## الفاظ کے معانی اور تشریح

”ہوئی“ کے معنی ہیں نفس کا خواہشات کی طرف میلان اور کہتے ہیں کہ یہ لفظ دراصل ”ہوی“ (بروزن نہی) بمعنی بلندی سے پستی کی طرف گرنا سے لیا گیا ہے کیونکہ یہ سبب ہوتا ہے کہ انسان پستی میں جا گرے اور دنیا میں کئی قسم کی مصیبتوں میں گرفتار ہو اور آخرت میں آتش جہنم میں جلتا رہے۔ جہنم کو ”ہاویہ“ اس لیے کہتے ہیں کہ اس کی گہرائی اس قدر زیادہ ہے کہ اس کی کوئی حد و حساب نہیں ہے۔ بعض ارباب لغت نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں ”اوپر لے جانا“ اور ”اوپر سے نیچے کی طرف گرانا“۔ اور بعض نے ان دونوں معانی کو ملا کر بھی اس کے معنی کیے ہیں۔ یعنی پہلے اوپر لے جا کر نیچے گرانا۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ”ہوی“ (بروزن تہی) کے معنی سقوط (گرنا) اور ہوی (بروزن قوی) کے معنی اوپر جانا ہے۔ [۱]

## آیات کی تفسیر اور ان کی جمع بندی

### ۱۔ ہوی پرستی دل کی آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے

سب سے پہلی آیت ان لوگوں کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے جنہوں نے اپنی نفسانی خواہشات کو اپنا معبود بنایا ہوا ہے اور ان کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اسی معبود کے بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ چونکہ خدا اچھی طرح جانتا ہے کہ کون لوگ ہدایت کے اہل نہیں ہیں، لہذا انہیں گمراہ کر دیا ہے، ان کے دلوں اور آنکھوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے ہیں اور ظاہر ہے کہ ایسے لوگ شائستہ ہدایت نہیں ہیں۔

دوسری آیت میں کچھ یہودیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ جب بھی خدا کی طرف سے انبیاء اور مرسلین ان کی خواہشات نفسانی کے خلاف خدا کا کوئی حکم ان کے پاس لے جاتے تو وہ کچھ انبیاء کی تکذیب کرتے اور کچھ کوموت کے گھاٹ اتار دیتے۔ حق کے مقابلہ میں یہ تعصب اور ڈھٹائی پھر طرہ یہ کہ خود کو عذاب الہی سے محفوظ بھی سمجھتے تھے۔ انجام کار یہ بات سبب ہو گئی کہ وہ حقائق کے سامنے اندھے اور گونگے بن جائیں۔ سب سے پہلے تو خدا نے انہیں اپنی رحمت میں شامل کر لیا اور ان کی توبہ قبول فرمائی، لیکن پھر ان میں سے کچھ لوگوں نے خدا کے ساتھ کیا ہوا عہد و پیمانہ توڑ ڈالا، سرکشی کی راہیں اختیار کر لیں اور ایک بار پھر ان کے دل کے کان اور آنکھ بیکار

[۱] ملاحظہ ہوں مندرجہ ذیل کتب: مفردات راغب، مجمع البحرین، کتاب العین، اقرب المواردا اور المنجد

ہو گئے۔

خواہشات نفسانی کی اتباع منحوس آثار میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کا خون تک بہا دیتے ہیں لیکن انہیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔

”یقنلون“ کو فعل ”مضارع“ کی صورت میں لانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہودیوں کے اس ٹولے کا یہی شیوہ رہا ہے کہ وہ ہر اس نبی کو قتل کر دیتے تھے جو ان کی خواہشات نفسانی کی مخالفت کرتا تھا۔

تیسری آیت کچھ دل کے اندھے منافقین کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر بھی ہوتے، آپ کی باتیں بھی سنتے، لیکن جو نبی آپ کی خدمت سے اٹھ کر باہر جاتے تو سمجھدار مومنین کے سامنے حضور اکرم کا مذاق اڑاتے اور استہزاء کرتے۔ قرآن کہتا ہے: ”خداوند عالم نے اس گروہ کے دلوں پر مہر لگا دی ہے کیونکہ وہ اپنی خواہشات نفسانی کی پیروی کرتے ہیں۔“

یہ اور اوپر کی دو آیتیں بخوبی واضح کر رہی ہیں کہ جب انسان خواہشات نفسانی کی پیروی کر لیتا ہے تو وہ قدرت کی تشخیص کھو دیتا ہے۔ خواہش پرستی، حقیقت کے ادراک سے کیوں مانع نہ ہو، جبکہ انسان کا کسی چیز سے حد سے زیادہ تعلق اس کے تمام وجود کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ وہ صرف اس ہی چیز کو دیکھتا اور اس ہی کے بارے میں سوچتا ہے۔ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث کو کئی بار سنا ہے کہ ”حبك الشیبيء یعمی ویصیم“ یعنی تیرا کسی چیز کو محبوب رکھنا تجھے اندھا اور بہر کر دیتا ہے۔<sup>[۱]</sup>

یہ نورانی فرمان پیغمبر اسلام سے بھی اور امیر المومنین سے بھی منقول ہے اور غالباً ہم میں سے اکثر لوگوں نے سنا ہے کہ ”اما اتباع الہوی فیصد عن الحق“ یعنی خواہشات نفسانی کی پیروی انسان کو حق سے روک دیتی ہے۔<sup>[۲]</sup>

یہ بات اس قدر واضح ہے کہ ضرب المثل کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ چنانچہ عرب کہتے ہیں ”صاحب الحاجة اعمی لا یری الا حاجتہ“ (ضرورت مند اندھا ہوتا ہے اور اپنی ضرورت کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں دیکھتا)۔<sup>[۳]</sup>

جو انسان اپنے دل و جان کو عہدے، منصب، جاہ و مال اور شہوت میں کھو چکا ہو بلکہ ہار چکا ہو اور اپنے تمام وجودی سرمائے کو ان کے حصول کے لیے وقف کر چکا ہو، وہ اس کے علاوہ کچھ اور دیکھ بھی نہیں سکتا اور یہ ہوس آلود عشق اس کی عقل و فکر پر پردے ڈال دیتا ہے۔

کیا خوبصورت فرمان ہے امیر المومنین علیہ السلام کا جو آپ نے اپنے ایک نورانی خطبے میں ارشاد فرمایا ہے کہ: ”من عشق شیئاً اعشى بصره“ یعنی جو شخص کسی چیز سے عشق کرتا ہے وہ اس کی آنکھوں کو کم نور بنا دیتی ہے۔“<sup>[۴]</sup>

[۱] روضۃ المتقین، جلد ۱۳، ص ۲۱

[۲] بحار الانوار، جلد ۷۰، ص ۷۵ و نوح البلاغ، خطبہ ۴۲

[۳] نوح البلاغ، خطبہ ۱۰۹

[۴] تفسیر مراغی، جلد ۲۵، ص ۲۷

سورہ جاثیہ کی ۲۳ ویں آیت جس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے، کی شان نزول میں یوں منقول ہے:

”ایک رات کا قصہ ہے کہ ”ابوجہل“، ”ولید بن مغیرہ“ کے ساتھ خانہ کعبہ کے طواف میں مشغول تھا۔ (زمانہ جاہلیت میں بھی لوگ خانہ کعبہ کا احترام کیا کرتے تھے اور طواف بجایا کرتے تھے) اور طواف کے دوران پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتیں چل نکلیں۔ ”ابوجہل“ نے ”ولید“ کی طرف منہ کر کے کہا ”واللہ انی اعلم انه لصادق“ (خدا کی قسم میں جانتا ہوں کہ وہ (محمدؐ) سچ کہتے ہیں)۔

ولید نے چیخ کر کہا: ”خاموش رہو! یہ باتیں کہاں سے کہہ رہے ہو؟“

ابوجہل نے کہا: ”ولید! ہم انہیں بچپن اور جوانی سے ہی صادق اور امین کہتے آرہے ہیں۔ اب جبکہ ان کی عقل کامل اور پختہ ہو چکی ہے انہیں جھوٹا اور خائن سمجھیں؟ میں پھر بھی کہتا ہوں کہ میں انہیں سچا سمجھتا ہوں۔“

ولید نے (غصے میں آ کر) کہا: ”تو پھر تم ان کی تصدیق کیوں نہیں کرتے اور ان پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟“

ابوجہل نے کہا: ”تم چاہتے ہو کہ قریش کی لڑکیاں بیٹھ کر یہ کہیں کہ میں ابوطالب کے بھتیجے کے خوف سے ان کے سامنے جھک گیا ہوں؟“

”لات“ اور ”عزیٰ“ بتوں کی قسم! میں ان کی پیروی نہیں کروں گا۔“

اسی موقع پر ”وختم علی سمعہ وقلبہ“ (خدا نے اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی) کی آیت نازل ہوئی۔<sup>[۱]</sup>

کیا پیارا فرمان ہے امیرالمومنین علی علیہ السلام کا اس بارے میں کہ ”آفة العقل الهوی“ (انسانی عقل کی آفت ہوا پرستی اور خواہشات نفسانی کی اتباع ہے) اور دوسرے الفاظ میں آنجنابؐ نے یہ بھی فرمایا ہے ”الہوی آفة الالباب“ (خواہش پرستی عقلوں کی آفت ہے)۔<sup>[۲]</sup>

## ۲۔ حب دنیا کا پردہ

اس بارے میں خدا فرماتا ہے:

آیات

(۱) ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ ۗ وَأَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَى قُلُوْبِهِمْ وَسَمِعَهُمْ

[۱] تفسیر مراغی، جلد ۲۵، ص ۲۷

[۲] غرر الحکم

## وَأَبْصَارِهِمْ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ﴿۱۰۸﴾ (سورہ نحل ۱۰۷-۱۰۸)

ترجمہ

(۱) یہ اس لیے ہے کیونکہ انہوں نے دنیاوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی ہے اور خداوند عالم بے ایمان (اور متعصب) لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔ وہ وہی لوگ ہیں، خدا نے (گناہوں کی زیادتی کی وجہ سے) جن کے دل، کان اور آنکھوں پر مہر لگا دی ہے۔ (اسی لیے وہ کچھ نہیں سمجھتے) اور صحیح معنوں میں وہ غافل لوگ ہیں۔

### آیات کی تفسیر اور ان کی جمع بندی

یہ آیت ان لوگوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے جنہوں نے پہلے تو دل و جان سے اسلام کو قبول کیا لیکن بعد میں مرتد ہو گئے۔ ارشاد ہوتا ہے، ان کا یہ ارتداد اس لیے نہیں ہے کہ انہوں نے اسلام میں حق کے خلاف کچھ دیکھا ہے۔ نہیں، بلکہ انہوں نے دنیاوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی ہے۔ اسی لیے انہوں نے اسلام کو الوداع کہہ کر کفر کی وادی میں قدم رکھ لیا ہے اور چونکہ وہ ہدایت کے لائق نہیں ہیں لہذا خدا بھی انہیں ہدایت نہیں کرتا، بلکہ دنیا پرستی کی وجہ سے خدا نے ان کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر مہر لگا دی ہے اور معرفت کے دروازے ان پر بند کر دیئے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ وہ غفلت کا شکار ہو گئے ہیں۔

دنیا کی محبت، خواہ مال و ثروت کے ساتھ عشق کے سلسلے میں ہو، یا جاہ و مقام اور منزلت کے ساتھ عشق کے بارے میں، کئی دوسری شہوات کے ساتھ عشق کے متعلق ایسے طوفان کی مانند ہوتی ہے جو انسان کی جان کے اندر چلتا ہے اور ترازوئے عقل کے توازن کو مکمل طور پر تباہ و برباد کر ڈالتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ دقیق ترین ترازوؤں کو ایسی پناہ گاہ میں محفوظ رکھتے ہیں جہاں معمولی سے معمولی ہوا کا گزرتک نہ ہوتا ہو، حتیٰ کہ وزن کرتے وقت انسان کے منہ سے نکلنے والی سانس کو بھی عارضی طور پر سینوں میں بند کر دیا جاتا ہے مبادا اس کے منہ سے نکلنے والی ہوا کی کوئی موج اس کے توازن پر اثر انداز ہو۔ تو ایسے ترازو کی اس قدر شدید طوفان کے مقابلے میں کوئی حیثیت ہے؟

دنیا پرستی خواہ قارونی شکل میں ہو یا فرعون، سامری یا کسی اور صورت میں، ہر حالت میں انسان کو صحیح و سالم فکر اور صحیح فیصلے کی اجازت نہیں دیتی۔ اگر مندرجہ بالا آیت میں فرماتا ہے کہ خدا نے ان کے دل، کان اور آنکھوں پر مہر لگا دی ہے تو درحقیقت یہ وہی تاثیر ہے جو دنیا پرستی میں اس نے رکھی ہے، اور چونکہ وہ لوگ سب کے پیچھے جا کر مسبب کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اسلامی روایات میں اس بارے میں بہت سی دلکش تعبیریں دیکھنے میں آتی ہیں، مگر ان کے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی ایک حدیث ہے۔ امام فرماتے ہیں:

”مثل الحریص علی الدنیا کمثل دورۃ القز کما ازدادت من القز علی

نفسها لفا کان ابعدها من الخرج حتی تموت غماً“

’دنیا کے حریص کی مثال ایسی ہے جیسے ریشم کے کیڑے کی ہوتی ہے۔ وہ یقیناً جتنا ریشم اپنے اوپر لپیٹتا جاتا ہے اتنا ہی اس میں پھنستا چلا جاتا ہے اور وہاں سے اس کے نکلنے کی تمام راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اور آخر کار ایک دن اس رنج و غم میں مر جاتا ہے۔‘<sup>[۱]</sup>

ایک اور حدیث میں حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام فرماتے ہیں:

”الدنیا تغر تضر تمر“

’دنیا فریب دیتی ہے، نقصان پہنچاتی ہے اور گزر جاتی ہے۔‘<sup>[۲]</sup>

ایک اور حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ حضرت امیر نے اپنے ایک دوست کو خط لکھا جس میں آپ نے اسے نصیحت فرمائی۔ اس کا ایک حصہ یہ بھی ہے:

”فارفض الدنیا فان حب الدنیا یعمی ویصم ویبکم ویذل الرقاب

فتدارک ما بقی من عمرک ولا تقل غدا اوبعد غد فانما هلك من کان

قبلك باقامتهم علی الامانی والتسویف“

’دنیا کو چھوڑ دو کیونکہ دنیا کی محبت آنکھوں کو اندھا، کانوں کو بہرا اور زبان کو گونگا اور گردنوں کو جھکا دیتی ہے۔ اپنی باقی ماندہ عمر کے ذریعہ اپنی گزشتہ کوتاہیوں کا ازالہ کرو اور یہ کہو کہ کل کروں گا یا پرسوں! کیونکہ تم سے پہلے کئی لوگ ایسے تھے جنہوں نے اپنی آرزوؤں پر بھروسہ کیے رکھا اور لیت و لعل سے کام لیتے رہے۔ بالآخر وہ ہلاک ہو گئے۔‘<sup>[۳]</sup>

[۱] بحار الانوار، جلد ۷۰، ص ۲۳، حدیث ۱۳

[۲] منج البلاغہ

[۳] بحار الانوار، جلد ۷۰، ص ۷۵، اصول کافی جلد ۲ باب ”دمر الدنیا و الزهد فیہا“ حدیث ۲۳

## ۳۔ تکبر، غرور اور قدرت کے نشے کا پردہ

ارشاد قدرت ہوتا ہے:

### آیات

(۱) الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ ۖ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ الَّذِينَ آمَنُوا ۖ كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ قَلْبٍ مُّتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴿۳۵﴾  
(سورہ غافر ۳۵)

(۲) وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا مَّجِيدًا لَّفَالُوا لَوَلَا فُضِّلَتْ آيَاتُهُ ۖ أَءِتَيْنَاهُ الْكِتَابَ وَعَرَبِيًّا ۖ قُلْ هُوَ لِلَّذِينَ آمَنُوا هُدًى وَشِفَاءً ۖ وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ فِي آذَانِهِمْ وَقْرٌ وَهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ۖ أُولَٰئِكَ يُنَادَوْنَ مِن مَّكَانٍ بَعِيدٍ ﴿۳۴﴾ (سورہ فصلت ۳۴)

### ترجمہ

(۱) جو لوگ آیات خداوندی میں مجادلہ کرتے ہیں، بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی دلیل آچکی ہو، یہ بے بنیاد جدال خدا اور ان لوگوں کے نزدیک جو ایمان لائے ہیں بہت بڑی ناراضگی کا موجب بن جاتا ہے۔ اس طرح خداوند عالم تکبر اور جبار دل پر مہر لگا دیتا ہے۔

(۲) اگر ہم اسے عجمی قرآن بنا دیتے تو یقیناً وہ کہتے کہ کیوں اس کی آیات واضح طور پر بیان نہیں ہوئیں؟ آیا عجمی قرآن اور عربی پیغمبر؟ (یہ کہاں تک درست ہے؟) آپ کہہ دیں کہ یہ ان لوگوں کے لیے ہدایت اور شفا ہے، لیکن جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں سنگینی ہے، گویا وہ اندھے ہیں اور اسے نہیں دیکھتے گویا وہ ایسے لوگ ہیں جنہیں دور سے بلا یا جاتا ہے۔“



## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### مغرور اور متکبر حق کو نہیں سمجھتے

بیدار دل مومن جو فرعون جیسے طاغوت کے دربار میں تھا اور ”مومن آل فرعون“ کے نام سے مشہور تھا اور مخفی طور پر حضرت موسیٰ بن عمران کی حمایت کرتا تھا، پہلی آیت اس کی گفتگو کے بعد مذکور ہوئی ہے، اور بڑی صراحت سے کہہ رہی ہے کہ ”جو لوگ خدائی آیات کے مقابلے میں غرور، تکبر، خودخواہی اور خود پسندی کی وجہ سے مجادلہ اور مقابلہ پر اتر آتے ہیں، ان کے دل تاریک ہیں اور ان کے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں، انہیں تکبر اور غرور اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ حق کو سمجھ سکیں، لہذا وہ واقعات کے سمجھنے سے محروم ہیں۔

بارے حق کے مقابلے میں تکبر اور تعصب و عناد انسانی افکار پر ظلمانی پردے ڈال دیتے ہیں اور اس سے تشخیص کی حس سلب کر لیتے ہیں۔ نوبت می رسد کہ اس کا دل ایک بند برتن کی مانند ہو جاتا ہے جس سے فاسد اور غلیظ مواد باہر نکل سکتا ہے اور نہ ہی صحیح و سالم اور جان پرور مواد اس کے اندر جا سکتا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ ”متکبر“ اور ”جبار“ کے درمیان فرق یہ ہے کہ ”تکبر“ ”حق کے سامنے خضوع“ کے مقابلے میں ہے اور ”جباریت“ ”مخلوق کے بارے میں محبت اور شفقت“ کے مقابلے میں ہے۔ یعنی مغرور ظالموں کی یہ کیفیت ہے کہ نہ تو وہ اپنے سے بالا دست ہستی کے سامنے خضوع و خشوع کا اظہار کرتے ہیں اور نہ ہی اپنے زیر دستوں پر شفقت اور مہربانی کرتے ہیں۔

دوسری آیت متعصب اور ہٹ دھرم متکبرین کے ایک گروہ کی گفتگو کو نقل کرتے ہوئے کہتی ہے کہ وہ یوں کہتے ہیں: ”قرآن عجمی زبان میں کیوں نازل نہیں ہوا؟ تاکہ ہم اس کی مزید اہمیت کے قائل ہوتے اور غیر عرب قومیں بھی اس سے استفادہ کرتیں!“ (شاید انکا اصل مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے مختلف گروہ اسے نہ سمجھیں اور بے خبر ہی رہیں)۔

قرآن نے ان کے اس اعتراض کا ان لفظوں میں جواب دیا ہے کہ ”اگر قرآن غیر عربی زبان میں نازل ہوتا تو وہ دوسرا اعتراض کرتے اور کہتے کہ اس کی آیات واضح کیوں نہیں؟ اس کے مضامین کیوں پیچیدہ ہیں؟ ہمیں اس کی سمجھ نہیں آتی اور یہ بھی کہتے کہ واقعاً عجیب ہے کہ قرآن عجمی ہے اور پیغمبر عربی ہیں۔“

پھر قرآن مجید پیغمبر سے کہہ رہا ہے کہ آپ ان حیلہ ساز اور بہانہ گیر مغروروں سے کہہ دیجیے: ”یہ قرآن مومنین کے لیے ہدایت اور شفا ہے، اور جو لوگ حق کے آگے سر تسلیم ختم نہیں کرتے ان کے کان اس کے سننے سے عاجز ہیں اور ان کی آنکھیں اس کو دیکھنے سے محروم ہیں، بالکل ان لوگوں کی طرح جنہیں دور سے بلا یا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے دور افتادہ لوگ نہ سنتے ہیں اور نہ ہی دیکھتے ہیں۔

آفتاب قرآن بالکل واضح اور روشن ہے۔ اس کے سامنے کوئی پردہ نہیں ہے۔ یہ لوگ خود آپ نابینہ اور اندھے ہیں۔ یہ کائنات زمزمہ حق سے معمور ہے لیکن یہ لوگ بہرے ہیں۔

## ۴۔ احادیث کی رو سے غرور کے پردے

۱۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں:

”ما دخل قلب امری شیء من الکبر والا نقص من عقله مثل ما دخله

من ذالک قل ذالک او کثر“

”کسی شخص کے دل میں جتنا تکبر داخل ہوگا اتنی مقدار اس کی عقل میں کمی واقع ہو جائے گی، خواہ کم ہو یا زیادہ۔“

[۱]

۲۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے کلمات قصار میں سے ایک مختصر کلمہ میں ارشاد ہوتا ہے:

(اس میں آنجنابؑ نے نگناہ گاروں اور منخرین کے ایک گروہ سے مخاطب ہو کر فرمایا)

”بینکم و بین الموعظة حجاب من العزة“

”تمہارے اور وعظ و نصیحت کے درمیان غرور کا حجاب حائل ہے۔“ [۲]

جب انسان کے اندر جب ذات، ”خود مجوری“ کی صورت میں داخل ہو جاتی ہے تو اس کی کوشش ہوتی ہے کہ تمام اشیاء کو اپنے اندر ہی خلاصہ کی صورت میں موجود پائے۔

اور جب ذات ”خود برتری“ کی صورت میں داخل ہوتی ہے تو وہ خود کو سب سے ”برتر“ اور بڑھ کر“ سمجھتا ہے اور جس دن ”خود پسندی“ کی صورت اختیار کر لیتی ہے تو خوبصورتی اور اعلیٰ اقدار کا معیار صرف اپنی ہی ذات کو سمجھتا ہے اور بس!!

ایسے حالات میں انسان کی عقل پر عجیب پردہ پڑ جاتا ہے اور اس کے اور حقیقت کے درمیان حجاب حائل ہو جاتا ہے اور وہ تمام اقدار کا اپنے اندر خلاصہ سمجھتا ہے اور اپنے سوا باقی تمام دنیا کو بھلا دیتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تہذیب نفس اور حقائق عالم کے ادراک کے لیے سب سے پہلا قدم یہ ہے کہ انسان ”کبر و غرور کی سواری“ سے نیچے اترے۔ اس کے بغیر محال ہے کہ انسان کو خدا کا قرب حاصل ہو اور اس کی مقدس ذات کا جلوہ اس کے دل پر پڑے۔

۳۔ اسی وجہ سے ہم حضرت امیرؑ کے کلام میں پڑھتے ہیں کہ:

”شوافات العقل الکبر“

[۱] بحار الانوار جلد ۵، ص ۱۸۶، باب وصایای امام باقر، حدیث ۲۶

[۲] نہج البلاغہ، کلمات قصار، کلمہ ۲۸۲

”انسانی عقل کی بدترین آفت تکبر ہے۔“ [۱] اور

”العجب آفة“

”خود پسندی عقل کی آفت ہے۔“ [۲]

## ۵۔ جہالت اور غفلت کے پردے

ارشاد ہوتا ہے:

آیات

(۱) كَذٰلِكَ يَطۡبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۵۹﴾ (سورہ روم ۵۹)

(۲) لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّا اُنذِرَ اٰبَاؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوۡنَ ﴿۶۰﴾

وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَیۡنِ اَیۡدِيۡهِمْ سَدًّا وَّ مِنْ خَلۡفِهِمْ سَدًّا فَاَعۡشٰیۡنٰهُمۡ فَهُمْ لَا

یُبۡصِرُوۡنَ ﴿۶۱﴾ وَسَوَآءٌ عَلَیۡهِمْ ءَاۡنذَرۡتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنذِرۡهُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۶۲﴾

(سورہ بقرہ ۱۰، ۹، ۶)

ترجمہ

(۱) اسی طرح خداوند عالم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے جو علم نہیں رکھتے۔

(۲) تاکہ تو ان لوگوں کو ڈرائے جن کے آباء و اجداد کو نہیں ڈرایا گیا اسی لیے وہ غافل ہیں۔ ہم نے ان کے سامنے بھی بند باندھ دیا ہے اور ان کے پیچھے بھی بند باندھ دیا ہے اور ان کی آنکھوں کو ڈھانپ دیا ہے۔ لہذا وہ کسی چیز کو نہیں دیکھتے اور ان کے لیے برابر ہے خواہ تو انہیں ڈرائے یا نہ ڈرائے، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔“

[۱] غرر الحکم

[۲] غرر الحکم

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

زیر بحث آیات کے سلسلہ کی پہلی آیت میں اس بات کی تاکید کے بعد کہ ہم نے اس قرآن میں ہر قسم کی مثالیں بیان کی ہیں اور حقائق کو مختلف لباسوں میں لوگوں کے لیے بیان کیا ہے، کبھی تو آفاق و انفس کے حوالے سے، کبھی وعدہ و وعید کی صورت میں، کہیں پر امر و نہی کے انداز میں، کسی مقام پر بشارت اور انداز کے ذریعہ، کبھی فطری اور عاطفی ہونے کے ناطے سے اور کسی جگہ پر استدلالی انداز میں۔

لیکن کچھ لوگ اس قدر جاہل اور غافل ہیں کہ ان کے سامنے جس قدر بھی آیات اور نشانیاں لے آؤ پھر بھی وہ کہتے ہیں کہ تم اہل

باطل ہو۔

ارشاد ہوتا ہے ”یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ خداوند تعالیٰ ان لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے اور ادراک و تشخیص ان سے سلب کر لیتا ہے، جو علم نہیں رکھتے اور اپنی جہالت پر مصر ہیں اور اس بات کے لیے ہرگز آمادہ نہیں ہیں کہ غیر جانبدار ہو کر حق کو تلاش کریں۔“

درحقیقت یہ آیت جہالت کی ایک بدترین قسم کی طرف اشارہ کر رہی ہے جسے اصطلاح میں ”جہل مرکب“ کہتے ہیں۔ یعنی انسان اپنے جاہل ہونے کے باوجود خود کو عالم سمجھتا ہے اور اگر کوئی شخص اسے اس کی جہالت سے بیدار کرنا بھی چاہے تو اس کے کان اس بات کو سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اسی لیے اس قسم کا شخص اپنے جہل مرکب میں ابدال دہر تک باقی رہتا ہے۔

اگر مخالف ”جاہل بسیط“ ہو، یعنی جو شخص یہ جانتا ہے کہ وہ جاہل ہے اور حق کو قبول کرنے کے لیے تیار بھی ہوتا ہے تو ایسے شخص کی ہدایت

بہت آسان ہوتی ہے۔

جب دلوں پر پردے پڑ جاتے ہیں اور مہر لگ جاتی ہیں تو جہالت مرکب صورت اختیار کر لیتی ہے اور اس کے ساتھ ہی عدم تسلیم

کی روح پیدا ہو جاتی ہے۔

اس مقام پر کسی عرب کا ایک شعر بعض تفسیروں میں نقل کیا گیا ہے:

قال حمار الحکیم یوما  
لو الصفونی لکنت اربک  
لانی جاہل بسیط  
وصاحبی جاہل مرکب

”ایک دن اس (مغرور و متکبر) دانشور کے گدھے نے کہا: اگر میرے حق میں انصاف کریں تو مجھے ہی سوار ہونا

چاہیے، کیونکہ میں جاہل بسیط ہوں اور میرا مالک جاہل مرکب ہے۔“ [۱]

[۱] روح المعانی، جلد ۲۱، ص ۵۵، اسی آیت کے ذیل میں

ان آیات کی دوسری قسم غافلوں کے اس گروہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے جن کی جہالت، غفلت اور ہٹ دھرمی کی بدولت ان کے بارے میں عذاب الہی کا فرمان صادر ہو چکا ہے اور وہ قابل ہدایت نہیں ہیں۔

پھر قرآن مجید نے ان حجابوں کا عجیب نقشہ کھینچا ہے جو ان کی عقول کا احاطہ کر چکے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: ”ہم نے ان کی گردنوں میں طوق و زنجیر ڈال دیئے ہیں جو ان کی ٹھوڈیوں تک گھیرے ہوئے ہیں اور ان کے سروں کو اوپر اٹھائے ہوئے ہیں اور ہم نے ان کے سامنے بند باندھ دیا ہے اور ان کے پیچھے بھی بند باندھ دیا ہے اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے ہیں، لہذا وہ کسی چیز کو نہیں دیکھتے۔“  
ان کے آگے اور پیچھے بند باندھنے سے ان حجابوں کی طرف اشارہ ہے جو انہیں ”آفاقی آیات“ اور کائنات عالم میں خدائی آثار کو دیکھنے سے روکتے ہیں۔

اور گردنوں میں طوق اور زنجیر ہیں اور ان کے سروں کو اوپر اٹھائے ہوئے ہیں۔ شاید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ”نفسی آیات“ اور اپنے وجود میں خدائی نشانیوں کے دیکھنے سے محروم ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ ان کے دلوں پر پردہ پڑ چکے ہیں، جہل و غرور اور غفلت کے پردے۔

ظاہری بات ہے کہ ان پردوں کے ہوتے ہوئے، خواہ انہی کوئی ڈرائے یا نہ ڈرائے، چاہے وہ قرآنی آیات کو محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک لبوں سے سنیں یا نہ سنیں، وہ کبھی ہدایت حاصل نہیں کر پائیں گے۔ وہ ایک زنجیر میں نہیں بلکہ کئی زنجیروں اور کئی زندانوں میں مقید ہیں۔ (یاد رہے کہ ”اغلال“ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو ”غل“ کی جمع ہے)۔

بعض مفسرین ”سامنے کے بند“ سے ان موانع اور رکاوٹوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو انہیں ”نظری یا استدلالی ہدایت“ سے محروم کر دیتی ہیں، اور ”پیچھے کے بند“ سے ان رکاوٹوں اور موانع کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو انہیں ”فطری ہدایت“ کی طرف لوٹ آنے سے روکتے ہیں۔ [۱]

## احادیث اور جہالت کے پردے

۱۔ امیر المؤمنین علی علیہ السلام کی ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں، جو آپ نے جاہل کے بارے میں ارشاد فرمائی ہے:

”الجاهل میت بین الاحیاء“

”جاہل، زندہ لوگوں کے درمیان ایک مردہ ہے۔“ [۲]

۲۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

[۱] تفسیر فخر رازی جلد ۲۶، ص ۴۵

[۲] غرر الحکم، ص ۹۹

### ”الحق من ثمار الجهل“

”جماعت، جہالت کا ثمرہ ہے۔“<sup>[۱]</sup>

ظاہر ہے جس طرح مردہ کسی چیز کا ادراک اور احساس نہیں رکھتا، ہٹ دھرم، بے خبر اور متعصب جاہل سے بھی حقیقی فہم کی امید نہیں کی جاسکتی۔

۳۔ جاہل مرکب اور ہٹ دھرم و متعصب افراد کی حالت تو یہ ہے کہ وہ حقیقی علماء تک کو اپنی نکتہ چینی کا نشانہ بناتے ہیں۔ وہ خود کو ہی گمراہ نہیں سمجھتے، انہیں بھی گمراہ جانتے ہیں۔ لہذا حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی ایک حدیث ہے:

### ”تعجب الجاہل من العاقل اکثر من تعجب العاقل من الجاہل“

”اتنا عقلمند شخص کو جاہل سے تعجب نہیں ہوتا جتنا جاہل کو عاقل سے ہوتا ہے۔“<sup>[۲]</sup>

ہم اپنی اس گفتگو کو حضرت امیر المومنین کے اس فرمانِ ذیشان پر ختم کرتے ہیں۔ امام فرماتے ہیں:

### ”ان قلوب الجہال تستفرها الاطماع و ترتہنها البنی وتستعلغقها

المخدائع“

”جاہل افراد کے دلوں کو لالچ ہی حرکت میں لاتی ہے، آرزوئیں انہیں اپنا مرہون بنا لیتی ہیں اور دھوکہ بازی

اور فریب کاری انہیں اپنے ساتھ ملا لیتی ہے۔“<sup>[۳]</sup>

اور تعجب نہیں کرنا چاہیے اگر اس قسم کا دل درک حقیقی سے خالی ہو۔

## ۶۔ نفاق کے پردے

ارشاد رب العزت ہے:

آیات

(۱) يُخْدَعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا ۚ وَمَا يُخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا

[۱] غرر الحکم، ص ۹۹

[۲] سفینۃ البحار، جلد ۱، ص ۱۹۹

[۳] کافی جلد ۱، ص ۲۳ (کتاب العقل والجهل، حدیث ۱۸)

يَشْعُرُونَ ﴿٩﴾ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ ۖ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا ۗ وَلَهُمْ عَذَابٌ  
 أَلِيمٌ ﴿١٠﴾ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ ﴿سورہ بقرہ ۹-۱۰﴾

(۲) مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۗ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ  
 بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمٍ لَّا يَبْصُرُونَ ﴿١٤﴾ صُمُّ بُكْمٌ عُمٌّ فُهُمْ لَّا  
 يَرِجْعُونَ ﴿١٥﴾ (سورہ بقرہ ۱۴-۱۵)

(۳) اِذْ يَقُولُ الْمُنْفِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ عَرَّ هَؤُلَاءِ دِيْنَهُمْ ۗ وَمَنْ  
 يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٣٩﴾ (سورہ انفال ۳۹)

(۴) وَاِذْ يَقُولُ الْمُنْفِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ  
 اِلَّا غُرُورًا ﴿١٣﴾ (سورہ احزاب ۱۳)

ترجمہ

- (۱) وہ خدا اور مومنین کو فریب دینا چاہتے ہیں، (لیکن اپنے سوا کسی کو فریب نہیں دیتے، (البتہ) وہ سمجھتے نہیں۔ ان کے دل میں ایک طرح کی بیماری ہے، خدا ان کی بیماری کو اور بڑھاتا ہے اور یہ جو جھوٹ بولتے ہیں اس کی وجہ سے دردناک عذاب ان کے انتظار میں ہے۔
- (۲) وہ (منافقین) ایسے شخص کی مانند ہیں جس نے آگ جلائی (تاکہ تاریک بیابان میں اپنی راہ تلاش کرے) لیکن جب آگ نے اپنے چاروں اطراف کو روشن کیا تو خداوند عالم نے (طوفان بھیج دیا جس نے اسے بجھا دیا اور) ایسی وحشت ناک تاریکی میں اسے چھوڑ دیا جہاں آنکھیں کام نہیں کرتیں۔ وہ بہرے ہیں، گونگے ہیں اور اندھے ہیں اور غلط رستوں سے لوٹ کر واپس نہیں آتے۔
- (۳) اور (اس وقت کو یاد کرو) جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دل میں بیماری ہے کہتے تھے: ان (مسلمانوں) کو اپنے دین نے مغرور بنا دیا ہے اور جو شخص خدا پر توکل کرے (وہ کامیاب ہو جاتا ہے کیونکہ) خدا عزیز اور حکیم ہے۔
- (۴) (اس وقت کو یاد کرو) جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دل میں بیماری ہے، کہتے تھے: خدا اور اس کے



رسول نے ہمارے ساتھ سوائے جھوٹے وعدے کے اور کچھ نہیں دیا۔

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### دل کے اندھے منافقین

سورہ بقرہ کے اوائل میں تیرہ آیات ایسی ہیں جو منافقین کے بارے میں بحث کرتی ہیں اور نہایت ہی گویا حالت میں نفاق اور منافقین کی صحیح تصویر کشی کرتی ہیں۔ زیر بحث موضوع کی پہلی آیت میں بھی اسی سلسلے سے تعلق رکھتی ہے۔

قرآن اس بارے میں کہتا ہے کہ ان کی ایک بہت بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ وہ خدا اور اسی طرح مومنین کو فریب دینا چاہتے ہیں، جبکہ وہ صرف اور صرف خود کو ہی فریب دیتے ہیں، لیکن وہ یہ چیز سمجھتے نہیں، کیونکہ روح نفاق نے ان کے فہم و ادراک پر پردے ڈال رکھے ہیں۔ پھر فرماتا ہے ”ان کے دل میں ایک قسم کی بیماری ہے“ اور ان کے اس راہ کے طے کرنے کے اصرار کی وجہ سے خدا ان کی بیماری میں اور بھی اضافہ کر دیتا ہے۔

یقیناً اس بیماری سے مراد وہی ”نفاق کی بیماری“ ہے جو ان کے دل پر مسلط کر دی گئی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ایک بیمار شخص کی نہ تو فکر خوب فیصلہ کر سکتی ہے (کیونکہ عقل سالم، بدن سالم ہی میں پیدا ہوتی ہے) اور نہ ہی ان کے ظاہری حواس۔ یہی وجہ ہے اکثر اوقات بیمار لوگوں کے ذائقہ میں تلخی اور بد مزگی ہوتی ہیں اور بسا اوقات بد مزہ غذائیں ان کے لیے لذیذ ہوتی ہیں۔

دوسری آیت منافقین کو ایسے شخص کے ساتھ تشبیہ دیتی ہے ”جو ایک تاریک اور ظلمانی رات کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں گھر جاتا ہے اور راہ پیدا کرنے کے لیے آگ جلاتا ہے تاکہ اپنی اطراف کو تھوڑا سا دیکھ لے اور پھر قدم اٹھائے لیکن اچانک طوفان اور آندھی اس کے چاروں اطراف کو گھیر لیتی ہے اور اسی مختصر سی آگ کو بجھا کر رکھ دیتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر وہ ماحول تاریکی میں ڈوب جاتا ہے اور وہ کچھ بھی نہیں دیکھ پاتا۔ اسی طرح ان منافقین کی کیفیت ہے جو نہ تو کچھ دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی کچھ سن پاتے ہیں، حتیٰ کہ ان کی زبان تک گنگ ہو جاتی ہے اور وہ واپسی کا راستہ تک کھو بیٹھے ہیں۔

اس نور سے مراد شاید وہ ظاہری ایمان ہے جس کا وہ اظہار کرتے ہیں اور اسی کی پناہ میں اپنے اطراف کو تھوڑا سا روشن کرتے ہیں اور ان کی جان و مال اسلام کی پناہ میں محفوظ رہتے ہیں۔

یابہ کہ روشنائی سے مراد فطرت کا نور ہے جو آغاز فطرت میں ہر ایک کے دل میں موجود ہوتا ہے۔ منافقین بھی آغاز میں اسی نور سے مختصر سی بہرہ اندوزی کرتے ہیں، لیکن زیادہ دیر نہیں گزر پاتی کہ نفاق کے جھکڑ اس کو مٹی کے ڈھیر میں چھپا دیتے ہیں، یا اسے بالکل ہی بجھا دیتے ہیں۔

تیسری اور چوتھی آیت میں پھر بیمار دل منافقین کی بات ہو رہی ہے۔ گزشتہ آیات کے قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ”والذین فی

قلوبہم مرض“ کی تعبیر ”عطف تفسیری“ کے طور پر ہے اور بیمار دل وہی منافق لوگ ہیں اور منافقین وہی بیمار دل ہے۔ [۱] البتہ تیسری آیت جنگ بدر میں ان منافقین کی قلبی نوعیت کو اور چوتھی آیت جنگ احزاب (جنگ خندق) میں ان کی دلی کیفیت کو بیان کر رہی ہے، اس فرق کے ساتھ کہ جنگ بدر میں منافقین شرک کے لشکر میں اسلام کے خلاف صف آراء تھے اور جنگ احزاب (خندق) میں مسلمانوں کی صفوں میں موجود تھے۔

وہ کہتے تھے یہ (مسلمان) اپنے دین پر مغرور ہو گئے ہیں اور اس مختصر سی تعداد اور تھوڑے سے اسلحہ کے ساتھ کامیابی کے گمان سے یا شہادت کے خیال سے، اس خطرناک میدان میں اتر پڑے ہیں جس کا انجام موت ہے۔“  
البتہ وہ لوگ قلبی بیماری کی وجہ سے صحیح ادراک سے قاصر تھے اور فتح و کامرانی کے حقیقی عوامل، یعنی ایمان و استقامت اور جوانمردی، جو ایمان کی پیداوار ہیں، کو نہیں پہچانتے تھے اور یہ بھی نہیں سمجھتے تھے کہ جو خدا پر توکل کرتا ہے خدا اس کا یار و مددگار ہوتا ہے۔  
ہماری اس بات کا گواہ وہ تاریخی واقعہ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ بعض مسلمان اسلام قبول کرنے کے بعد اسی طرح مکہ ہی میں رہ گئے اور ہجرت نہیں کی اور اس سے بڑھ کر تعجب کی بات یہ ہے کہ جب قریش کے لشکر میدان بدر کی طرف حرکت کرنے لگے تو وہ ان کی صفوں میں جا پہنچے اور آپس میں کہنے لگے ”ہم میدان جنگ کی طرف جا رہے ہیں۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لشکر تعداد میں زیادہ ہوا تو اس سے جا ملیں گے، اگر وہ اقلیت میں ہوا اور لشکر قریش اکثریت میں تو انہی میں رہ جائیں گے۔“ [۲]

تو کیا اس سے بڑھ کر منافقت کسی اور چیز کا نام ہے؟ اگر یہ لوگ منافق نہیں تو پھر کون منافق ہے؟  
جنگ احزاب (خندق) کے موقع پر اسلام کی تقویت حاصل ہو چکی تھی اور یہی منافق ٹولہ مسلمانوں کی صفوں میں گھس آیا تھا۔ لیکن جب لشکر احزاب نے مدینہ کا سخت محاصرہ کر لیا اور منافقین نے ان کے ٹڈی دل لشکر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، تو وہ سخت متزلزل ہو گئے اور صاف لفظوں میں کہہ دیا ”خدا اور اس کے رسول نے ہمیں جھوٹے وعدوں کے سوا اور کچھ نہیں دیا۔“ یہ وہی نفاق کا حجاب تھا جو انہیں حق کے ادراک کی اجازت نہیں دے رہا تھا، حالانکہ وہ بارہا آزمائے چکے تھے کہ عدوی قوت پر کامیابی کا دار و مدار نہیں ہے، مگر وہ ایمان اور ایمانی استقامت کے سائے میں ہے۔

[۱] تفسیر المیزان جلد ۱۶، ص ۳۰۲۔ اسی طرح تفسیر فخر رازی، جلد ۱۵، ص ۱۷۶ میں ہے کہ ”الذین فی قلوبہم مرض“ سے مراد ضعیف الایمان افراد ہیں جو منافقین کے علاوہ ہیں۔ حالانکہ ضعیف الایمان ہونے کا دل کی بیماری سے چنداں تعلق نہیں ہے۔ علاوہ ازیں سورہ بقرہ کے اوائل کی پہلی تیرہ آیات ہیں جن میں منافقین کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔ یہ تعبیر انہی کے بارے میں استعمال ہوئی ہے اور بعض لوگ اس بات پر مصر ہیں کہ ”بیماری“ کی تفسیر ”شک اور تردد“ سے کریں۔ یہ بھی کوئی اچھی بات نظر نہیں آتی کیونکہ بیماری ایک قسم کا انحراف ہے اور شک ایک طرح کی گمشدگی اور ضیاع ہے۔

[۲] تفسیر فخر رازی، جلد ۱۵، ص ۱۷۶ (سورہ انفال کی ۳۹ ویں آیت کے ذیل میں)۔

## سوال

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ حقیقت کے ادراک کے لیے نفاق کیونکر حجاب ہو سکتا ہے؟

## جواب

ایک نکتے کی طرف توجہ کے ساتھ ہی اس سوال کا جواب دیا جاسکتا ہے، وہ یہ کہ روح نفاق اس بات کا سبب بن جاتی ہے کہ انسان ہر گروہ اور ٹولے سے ہم صدا ہو جائے، ہر ماحول میں اسی ماحول کے ساتھ رنگ جائے اور ہر رخ کی ہوا کے ساتھ چلنے لگ جائے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اپنی اصلیت اور اپنے روحانی اور فکری استقلال سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور تعجب کی بات نہیں ہے کہ ان حالات میں انسان صحیح فیصلے کی قدرت سے عاری ہو جاتا ہے۔

بعض تفاسیر میں آیا ہے کہ اس قسم کے مقامات پر ”بیماری قلب“ کی تعبیر اس لیے ہے کہ قلب (عقل) کا مخصوص اثر معرفت خدا اور اس کے عبودیت ہے اور جب انسان کے دل میں ایسی صفات پیدا ہو جائیں جو اس آثار سے مانع ہو جائیں تو اس وقت دل کی بیماری شمار ہونے لگتی ہے۔ (کیونکہ ان صفات نے اسے اپنے مخصوص اثر سے روک لیا ہے اور اس کے آگے حجاب بن گئی ہیں)۔ [۱]

اسی لیے سورہ میں آیا ہے کہ فرماتا ہے: ”ولکن المنافقین لا یفقیہون“ لیکن منافقین واقعیت کو درک نہیں کرتے۔ (منافقون ۷)

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

”ان القلوب اربعہ: قلب فیہ نفاق و ایمان و قلب منکوس و قلب

مطبوع و قلب ازہر اجرد“ قلب ”ما الازہر“ قال فیہ کھیئة السراج“

”فاما المطبوع فقلت المنافق، واما الازہر فقلت المؤمن، ان اعطاه

شکر وان ابتلاہ صبر و اما المنکوس فقلت المشرک“

”یعنی دل چار قسموں پر ہیں: ایک دل وہ ہوتا ہے جس میں نفاق اور ایمان ہوتا ہے، ایک دل الٹا ہوتا ہے، ایک دل پر مہر لگی ہوتی ہے اور ایک دل نورانی اور پاک ہوتا ہے۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے پوچھا قلب نورانی کیا ہے؟ تو فرمایا جس میں چراغ کی مانند حقیقت چمکتی ہے۔ رہا وہ دل جس پر مہر لگی ہوتی ہے وہ منافق کا دل ہے۔ نورانی قلب مومن کا ہوتا ہے۔ اگر خدا اسے کوئی نعمت عطا کرتا ہے تو وہ شکر بجالاتا ہے

[۱] تفسیر فخر الدین رازی، جلد ۲، ص ۶۴ (سورہ بقرہ کی دسویں آیت کے ذیل میں)۔

اور اگر کوئی مصیبت اس پر آٹوٹی ہے تو وہ صبر کرتا اور شکلیبائی کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن وہ دل جو الٹا ہوتا ہے وہ مشرک کا دل ہے۔“ [۱]

ہم اس گفتگو کو حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کے فرمان ذیشان پر خاتمہ دیتے ہیں۔ امام فرماتے ہیں:

”والنفاق علی اربع دعائم: علی الهوی والہوینا والحفیضة والطبع“  
”نفاق کا سرچشمہ ان چار چیزوں میں سے ایک ہے: خواہشات پرستی، دینی امور میں سستی اور غفلت، غضب اور طمع۔“ [۲]

اور ہم جانتے ہیں کہ مندرجہ بالا چار امور میں سے ہر ایک بجائے خود عقل انسانی کے سامنے ایک دبیز پردہ ہے۔

## ۱۔ تعصب اور ہٹ دھرمی کے پردے

### آیات

(۱) وَمِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ ۗ وَجَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۗ وَإِنْ يَرَوْا كَلِمًا آيَةً لَا يُؤْمِنُوهَا بِهَا ۗ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوكَ يُجَادِلُونَكَ يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿۲۵﴾ (سورہ انعام ۲۵)

(۲) وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ حِجَابًا مَسْتُورًا ﴿۳۵﴾ وَجَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۗ وَإِذَا ذُكِّرْتُمْ بَكَ فِي الْقُرْآنِ وَحْدَهُ وَلَوْ عَلَىٰ أَدْبَارِهِمْ نُفُورًا ﴿۳۶﴾ (سورہ بنی اسرائیل ۳۵-۳۶)

(۳) فَإِنَّكَ لَا تَسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ ﴿۵۷﴾ وَمَا

[۱] اصول کافی، جلد ۲، صفحہ ۴۴۲، ”فی ظلمة قلب المنافق“

[۲] اصول کافی، جلد ۲، صفحہ ۳۹۳، ”فی ظلمة قلب المنافق“

أَنْتَ بِهَدْيِ الْعُمَى عَنْ ضَلَالَتِهِمْ ۗ إِنَّ نَسِيعَ إِلَّا مَنْ يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ مُسْلِمُونَ ﴿٥٣﴾ (سورہ روم ۵۳-۵۲)

(۳) وَلَقَدْ صَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هَذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۗ وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِآيَةٍ لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا مُبْطِلُونَ ﴿٥٨﴾ كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٥٩﴾ (سورہ روم ۶۹-۵۸)

(۵) وَقَالُوا قُلُوبُنَا فِيْ أَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ وَفِيْ آذَانِنَا وَقْرٌ وَمِنْ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ إِنَّا نَحْمِلُ غَلْمَكُمْ ﴿٥﴾ (سورہ فصلت ۵)

ترجمہ

(۱) ان میں سے کچھ لوگ وہ ہیں جو تیری طرف کان لگا کر بات سنتے ہیں لیکن ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں، تاکہ وہ اسے نہ سمجھ پائیں اور ان کے کانوں میں بہرہ پن قرار دے دیا ہے (وہ اس قدر ہٹ دھرم ہیں کہ) اگر حق کی تمام نشانیوں کو بھی دیکھ لیں پھر بھی ایمان نہ لائیں، حتیٰ کہ جب وہ تیری طرف آتے ہیں تو بھی لڑنا جھگڑنا شروع کر دیتے ہیں اور کافر لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو پہلے لوگوں کے افسانے ہیں۔

(۲) اور جب تو قرآن پڑھتا ہے تو ہم تیرے اور ان لوگوں کے درمیان مخفی حجاب قرار دے دیتے ہیں اور ان کے دلوں پر پردے ڈال دیتے ہیں تاکہ وہ نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں سنگینی اور بہرہ پن ہے اور جب تو اپنے رب کی وحدانیت کا قرآن میں ذکر کرتا ہے تو وہ پیٹھ پھیر لیتے ہیں اور تجھ سے روگردان ہو جاتے ہیں۔

(۳) تو اپنی آواز کو مردوں کے کانوں تک نہیں پہنچا سکتا اور نہ ہی بہرے لوگوں کے کانوں میں جب وہ پیٹھ پھیر کر پلٹ جائیں اور نابیناؤں کو (بھی) ان کی گمراہی سے ہدایت نہیں کر سکتا۔ تو تو فقط اپنی باتوں کو ان لوگوں تک پہنچاتا ہے جو ہماری آیات پر ایمان لاتے اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔

(۴) ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر قسم کی مثالیں اور مطالب بیان کیے ہیں اور اگر کوئی آیت ان کے لیے آئے تو کافر کہتے ہیں کہ تم تو اہل باطل ہو (اور یہ سب سحر اور جادو ہے) اسی طرح خدا ان لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے جو علم نہیں رکھتے۔

(۵) انہوں نے کہا کہ ہمارے دل پردوں میں ہیں اور ہمارے کان بہرے ہیں اور ہمارے اور تمہارے

درمیان حجاب ہے۔ لہذا تم اپنا عمل کرو اور ہم اپنا عمل کرتے ہیں۔

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### چلتے پھرتے مردے

اس سلسلے کی سب سے پہلی آیت کے شان نزول کے بارے میں منقول ہے کہ قریش کے سرداروں میں سے ابو جہل، ولد بن مغیرہ اور ابوسفیان وغیرہ جیسے کچھ لوگ سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کی باتیں سننے لگے۔ ان میں نصر بن کنانہ بھی تھا، جو ایک تاجر آدمی تھا اور تجارت کی غرض سے کئی بار ایران جا چکا تھا اور ایرانیوں کی قدیم کہانیوں سے کافی حد تک مطلع تھا۔ ان سب نے اس کی طرف رخ کر کے کہا: ”محمد (ص) کیا کہتے ہیں؟“ اس نے کہا: ”مجھے معلوم نہیں کہ کیا کہتے ہیں، پس اتنا معلوم ہے کہ اپنے لبوں کو ہلاتے ہیں اور پرانے زمانے کے وہی قصے کہانیاں جو میں تمہیں سناتا ہوں، وہ بھی وہی کچھ سناتے ہیں۔“

پھر ابوسفیان نے کہا: ”میں ان کی بعض باتیں صحیح نہیں سمجھتا،“ ابو جہل نے کہا ”بالکل ایسا ہی ہے!“ اسی موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی [۱] اور صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ ”ان ہٹ دھرم، متعصب اور خود خواہ لوگوں کے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں، ان کے کان بہرے ہیں اور ان کی عقل حقیقت کو درک کرنے کے قابل نہیں ہے۔“ لہذا وہ آپ کے ساتھ مسلسل لڑائی جھگڑا کرتے رہتے ہیں، ہٹ دھرمی، خود خواہی اور غرور کے بول بوتے پر۔

اس آیت کی تفسیر میں بعض مفسرین کہتے ہیں کہ خدا نے یہ جو فرمایا ہے کہ ”ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں“ تو اس سے مراد یہ ہے کہ حق کے بارے میں ان کا کفر و عداوت پر اصرار اور ہٹ دھرمی بذات خود اس پردے کی مانند ہے جو ایمان سے مانع ہوتا ہے۔ [۲] دوسری آیت میں اس پردے کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور کچھ کفار کے درمیان پڑا ہوا تھا جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔

بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد واقعی پردہ ہے جو آنحضرت اور ان لوگوں کے درمیان اس طور سے ایجاد ہو جاتا تھا کہ وہ آپ کو نہیں دیکھ پاتے تھے۔ لیکن اگر ان آیات پر توجہ دی جائے جو اسی سورہ میں اور اسی موضوع کے بارے میں نازل ہوئی ہیں تو یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ حجاب اور پردہ ”ہٹ دھرمی، تعصب، غرور، جہالت اور نادانی“ کے پردوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے جو قرآنی حقائق کو ان کے فکرو عقل کی نگاہوں سے چھپا دیتے تھے اور انہیں حق کے ادراک کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

[۱] تفسیر فخر رازی جلد ۱۲ ص ۱۸۶

[۲] تفسیر فخر رازی جلد ۱۲ ص ۱۸۷

اس بات کا شاہد یہ ہے کہ ہم انہی آیات میں پڑھتے ہیں کہ ”جب تو اپنے پروردگار کی وحدانیت کا ذکر کرتا ہے تو وہ اسے پیٹھ دکھا کر بھاگ جاتے ہیں۔“ اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے تو آنحضرتؐ کی باتوں کو سنتے تھے لیکن جب ہٹ دھرمی ان کے آڑے آجاتی تھی تو وہ پابہ فرار ہو جاتے تھے۔ (ولو اعلیٰ ادبارہم نفورا)۔

اسی سورہ میں اور انہی آیات کے تسلسل میں کچھ اور تعبیریں بھی دیکھنے میں آتی ہیں جو سب کی سب ان کی لجاجت (ہٹ دھرمی) اور عناد پر دلالت کرتی ہیں، تو کیا ایسی حالت میں ممکن ہے کہ کوئی شخص حقیقت کو درک کر سکے؟

تیسری آیت میں پیغمبر اکرمؐ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے: ”تمہاری باتیں نہ تو مردوں تک پہنچتی ہیں، اسی طرح نہ ان بہروں تک پہنچتی ہیں جب وہ فرار کرتے ہیں، اور اندھوں کو بھی تم گمراہی سے نجات نہیں دلا سکتے۔ تمہاری باتوں کو صرف وہی کان ہی سن سکتے ہیں جو حق کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں“ (یعنی ان کے دل و جان حق کے پیاسے ہیں۔ یہ دل ایسی زمین کی مانند مستعد اور آمادہ ہیں جو سورج کی دھوپ اور بارش کے قطرات کے سامنے موجود ہوتی ہے اور معرفت کا بیج جس میں بہت جلد نشوونما پاتا ہے۔ لیکن جن دلوں پر تعصب، جہالت اور ہٹ دھرمی کے پردے پڑے ہوتے ہیں وہ ان حقائق سے محروم ہوتے ہیں۔<sup>[۱]</sup>)

ان آیات کے چوتھے حصے میں بھی ان لوگوں کا تذکرہ ہے جو سختی کے ساتھ پیغمبرؐ کے مقابلہ پر کمر بستہ تھے اور جو کچھ آنحضرتؐ سے سنتے تھے اس کی مخالفت کرتے تھے اور کہتے تھے: ”تم تو صرف اہل باطل ہو اور یہ سب سحر و جادو اور گذشتہ لوگوں کے افسانے ہیں جن میں ذرہ برابر بھی حقیقت نہیں ہے۔“

قرآن کہتا ہے کہ ان جاہلوں کے دل پر مہر لگا دی گئی ہے۔ اسی لیے اس آسمانی کتاب، جو حقائق کا منبع ہے، سے انہیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

اور یہ آیت ضمنی طور پر ”جہالت“ اور ”لجاجت“ کے رابطے کو واضح کرتی ہے۔

اس سلسلے کی پانچویں اور آخری آیت میں مخالفین کی لجاجت اور ہٹ دھرمی کا نمونہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ اب تک جو کچھ بتایا گیا تھا وہ خدا کی طرف سے اس کے پیغمبرؐ کے ساتھ بات چیت تھی۔ لیکن اس آیت میں خود انہی کی طرف سے اعتراف جرم کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ”ہمارے دل غلافوں میں چھپے ہوئے ہیں، ہمارے کان سنگین ہو چکے ہیں اور ہمارے اور تمہارے درمیان حجاب ہیں۔ ہم کبھی آپ کی باتوں کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کریں گے۔ تم اپنا کام کرو، ہم اپنا کام کرتے ہیں۔“

اس قسم کی تعبیروں سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے جبابوں، پردوں اور کانوں کی سنگینی کا اصلی عامل کیا تھا؟ یہ ایسی تعبیرات ہیں جن سے ”تعصب“ اور ”لجاجت“ ٹپکتے ہیں اور ان کی بدبختی کے سرچشمے اور منبع کو واضح کرتے ہیں۔

ضمنی طور پر ہم آپ کو یہ بھی بتاتے چلیں کہ ”تعصب“، ”عصب“ کے مادہ سے ہے جس کے اصلی معنی وہ چربی ہے جو عضلات کو آپس

[۱] اس سے ملتی جلتی آیت البتہ قدرے تفاوت کے ساتھ سورہ نمل آیت ۸۱ میں آئی ہے۔



میں یا انہیں ہڈیوں سے متصل کرتی ہے اور ان تک مغز کے احکام پہنچانے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ چونکہ اس کی ساخت نہایت محکم اور پختہ ہوتی ہے لہذا یہ لفظ شدت اور استحکام کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور ”یوم عصب“ کا معنی سخت اور شدید ہے۔ اسی بنا پر کسی چیز کے ساتھ سخت وابستگی کی حالت پر ”تعصب“ کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور ”عصبہ“ (بروزن اسوہ) (طاقور) مردوں کے اس گروہ کو کہتے ہیں جو دس لوگوں سے کم نہ ہوں اور ”عصبہ“ (بروزن قصبہ) باپ کی طرف سے رشتہ داری کے معنی میں ہے۔ [۱]

”لجابت“، ”لج“ کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے ”کسی چیز کے بارے میں بے جا اصرار اور اس سے روگردانی نہ کرنا“ اور ”لجہ“ (بروزن حجہ) کا معنی ہے۔ ”سمندر کی لہروں کی حرکت“ یا ”رات کی تاریکی کی لہریں“ اور ”بحر لجی“، ”عظیم اور ٹھاٹھیں مارتے سمندر“ کو کہتے ہیں۔ اور ”کلام میں لج“ کا معنی ہے ”زبان میں کثرت“ یا ”کلام کا تکرار“ یا ”آوازوں کا ایک دوسرے کے ساتھ مل جانا۔“ [۲]

## نتیجہ کلام

درحقیقت ”تعصب“ اور ”لجابت“ ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم ہیں۔ کیونکہ کسی چیز سے وابستگی انسان کو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ اس کے بارے میں اصرار کرے، اس پر زور دے اور اس کا غیر مشروط دفاع کرے۔ البتہ کبھی تعصب بمعنی امر حق سے وابستگی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ البتہ عام طور پر باطل کے ساتھ وابستگی کے لیے زیادہ استعمال ہوتا ہے۔

لجابت اور تعصب کا سرچشمہ خواہ کچھ بھی ہو، لیکن عام طور پر جہالت اور کوتاہ اندیشی اس کے ساتھ ضرور ہوتی ہے، کیونکہ ان کے حامل کی سوچ ہمیشہ یہی ہوتی ہے کہ اگر وہ اپنے اس نظریے سے دستبردار ہو جائے تو وہ سب کچھ کھودے گا، یا پھر اس کی شخصیت مجروح ہوگی۔ اور کبھی ان کا سرچشمہ تکبر اور خودخواہی ہوتا ہے یعنی وہ اس بات کے لیے آمادہ نہیں ہوتا کہ حق کے آگے تسلیم خم کرے اور کبھی دوسرے عوامل اور اسباب ہوتے ہیں۔

تعصب اور لجابت، عقل انسانی کے آگے ضخیم پردے ڈال دیتے ہیں اور اسے اجازت نہیں دیتے کہ وہ حقائق اور واقعات کو دیکھے۔ یقیناً بہت سے ایسے افراد ہیں جو کسی قیمت پر بھی اس بات پر راضی نہیں ہوتے کہ وہ اپنے عقیدے یا اپنی بات سے دستبردار ہو جائیں، خواہ ان کے لیے کتنے ہی وزنی دلائل پیش کیے جائیں یا بقول معروف اگر ان کے لیے ایک ہزار ایک دلائل پیش کیے جائیں کہ مرنے کے دو پاؤں ہیں پھر بھی وہ کہیں گے کہ نہیں ایک ہی ہے!! اور اگر ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں سورج کے سامنے لاکھڑا کیا جائے اور کہا جائے کہ یہ سورج ہے! تو بھی وہ آنکھیں بند کر کے کہیں گے کہ نہیں، رات ہے۔

[۱] کتاب ”العین“، ”مفردات“، ”مجمع البحرین“ اور ”لسان العرب“۔

[۲] کتاب ”العین“، ”مفردات“، ”مجمع البحرین“ اور ”لسان العرب“۔

مندرجہ بالا آیات اس حقیقت کو بخوبی منعکس کر رہی ہیں اور اس قسم کے افراد کو اندھا، بہرہ بلکہ بعض اوقات مردہ کہہ کر پکار رہی ہیں۔ اور یہ کبھی کہتی ہیں کہ ان کے دلوں پر مہر لگ چکی ہیں اور وہ کسی محفوظ برتن میں بند کر دیئے گئے ہیں۔ اور روایات میں بھی اس چیز کو زور دے کر بیان کیا گیا ہے، حتیٰ کہ امیر المومنین کا ارشاد ہے کہ:

### ”اللجوج لا رای له“

”ہٹ دھرم افراد صائب الرائے نہیں ہوتے۔“ [۱]

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

### ”اللجاج یفسد الراى“

”ہٹ دھرمی، صحیح رائے کو خراب کر دیتی ہے۔“ [۲]

اور یہ بھی فرمایا کہ:

### ”لیس للجوج تدبیر“

”ہٹ دھرم بے تدبیر ہوتا ہے۔“ [۳]

اور آپؐ نے نبی البلاغہ کے خطبہ ۱۹۲ میں فرمایا ہے جس کا نام ”خطبہ قاصعہ“ ہے:

”فإنه في كبر الحمية ونخر الجاهلية، فإنه ملاحق الشنان ومناخ

الشيطان، التي خدع بها الامم الماضية والقرون الخالية حتى اغلفوا

في حنادس جهالتهم ومهاوى ضلالتهم“

”تمہیں خدا کا واسطہ، زمانہ جاہلیت کے تکبر، نخوت، تعصب اور افتخار سے بچتے رہو، کیونکہ یہ بغض و کینہ کی پرورش

گاہ اور شیطانی وسوسوں کی آماجگاہ ہے، جس سے گذشتہ قومیں اور امتیں بہلائی پھسلانی گئیں، حتیٰ کہ وہ جہالت کی

تاریکیوں میں ڈوب گئیں اور ہلاکت کے گڑھوں میں جا گریں۔“

اس گفتگو کو ہم امام اول کے اس کلام پاک کے ساتھ ختم کرتے ہیں جو آپؐ نے مختلف شہروں کے لوگوں کے نام اپنے مبارک خط میں

صفین کے ماجرا کو بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا:

[۱] غرر الحکم

[۲] غرر الحکم

[۳] غرر الحکم

”من لج و تمادی فهو الراکس الذی ران الله علی قلبه و صارت دائرة“

السوء علی راسه“

”جو شخص باطل کے کاموں میں ہٹ دھرمی کرے اور اپنی بات پر ڈٹا رہے وہ ایسا پیمان شکن ہے جس کے دل کو خدا نے زنگ آلود کر دیا ہے اور خود سر لوگوں کی حکومت اس کے سر پر سایہ فگن ہے۔“ [۱]

البتہ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ حق پر اصرار اور ڈٹ جانا تعصب نہیں ہے اور اگر اسے تعصب کہیں بھی تو ”تعصب ممدوح“ ہوگا، جیسا کہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے عصیت یعنی تعصب کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؑ نے ارشاد فرمایا:

”العصبية التي ياتم عليها صاحبها ان يري الرجل شرار قومه خيرا من

خيار قوم آخرين وليس من العصبية ان يحب الرجل قومه ولكن من

العصبية ان يعين قومه على الظلم“

”یعنی وہ عصیت، یعنی تعصب جس کی وجہ سے انسان گناہگار ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ اپنی قوم کے بدکاروں کو دوسری قوموں کے نیک لوگوں سے بہتر سمجھے، لیکن یہ عصیت نہیں ہے کہ انسان اپنی قوم کو دوست رکھے۔ عصیت تو یہ ہے کہ اس کے ظلم میں اس کی اعانت کرے۔“ [۲]

## ۸۔ اندھی تقلید کے پردے

اس بارے میں سب سے پہلے مندرجہ ذیل آیات کو دل کے کانوں سے سنیے۔

## آیات

(۱) قَالُوا سَوَاءٌ عَلَيْنَا أَوَعَضْتَ أَمْ لَمْ تَكُنْ مِنَ الْوَعِظِينَ ﴿۳۸﴾ إِنَّ هَذَا إِلَّا

خُلُقُ الْأَوَّلِينَ ﴿۳۹﴾ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذِّبِينَ ﴿۴۰﴾ (سورہ شعراء ۱۳۶ تا ۱۳۸)

(۲) وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَإِلَىٰ الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا

[۱] منج البلاغ، خطبہ ۵۸

[۲] بحار الانوار، جلد ۷۳، ص ۲۸۸

وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۖ أَوْلُو كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿٣٦﴾

(سورہ مائدہ ۱۰۴)

(۳) وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا ۖ قُلْ إِنَّ اللَّهَ

لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۖ اتَّقُوا لَوْنِ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٣٧﴾ (سورہ اعراف ۲۸)

(۴) وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ

آبَاءَنَا ۖ أَوْلُو كَانَ الشَّيْطَانُ يَدْعُوهُمْ إِلَىٰ عَذَابِ السَّعِيرِ ﴿٣٨﴾

(سورہ لقمان ۲۱)

(۵) وَكَذَلِكَ مَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا ۙ إِنَّا

وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَرِهِمْ مُّقْتَدُونَ ﴿٣٩﴾ (سورہ زخرف ۲۳)

ترجمہ

(۱) اس (قوم عاد) نے کہا ہمارے لیے کوئی فرق کی بات نہیں ہے خواہ تو ہمیں نصیحت کرے یا نہ کرے، یہ تو بالکل پہلے لوگوں کی عادتیں ہیں اور ہم ہرگز سزا نہیں پائیں گے۔

(۲) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز کی طرف آؤ جسے خدا نے نازل کیا ہے اور اپنے پیغمبر کی طرف تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے آباء کو جو کرتے ہوئے پایا ہے وہی ہمارے لیے کافی ہے، تو کیا ایسا نہیں ہے کہ ان کے آباء کچھ بھی نہیں جانتے تھے اور نہ ہی ہدایت یافتہ تھے؟

(۳) اور جب وہ برے کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے آبا (واجداد) کو ایسا کرتے ہوئے پایا ہے اور خدا نے ہمیں اسی کا حکم دیا ہے۔ آپ کہہ دیں کہ خدا کبھی بھی برے کاموں کا حکم نہیں دیتا تو کیا خدا کے بارے میں وہ باتیں کہتے ہو جو تم نہیں جانتے۔

(۴) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اس چیز کی پیروی کرو جو خدا نے نازل کی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہم تو اس چیز کی پیروی کریں گے جس پر اپنے آبا و اجداد کو پایا ہے، آیا حتیٰ کہ اگر انہیں شیطان بھی جلنے والی آگ کے عذاب کی دعوت کرے (پھر بھی وہ اسی کی اتباع کریں گے؟)۔

(۵) اسی طرح آپ سے پہلے ہم نے کسی شہر و دیار میں کوئی ڈرانے والا پیغمبر نہیں بھیجا مگر یہ کہ مست و مغرور

دولت مندوں نے کہا: ہم نے اپنے آباء و اجداد کو ایک مذہب پر پایا ہے اور انہی کے آثار کی اقتداء کریں گے۔

## الفاظ کے معانی اور تشریح

اگرچہ مندرجہ بالا آیات میں ”تقلید“ کا لفظ استعمال نہیں ہوا بلکہ اس کی جگہ گذشتہ لوگوں کے آثار کی ”اقتداء“ یا ”اصحاء“ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، یا پھر آباء و اجداد کی اتباع وغیرہ کا ذکر ہے، لیکن پھر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ (تقلید) کا مفہوم بھی اچھی طرح واضح کر دیا جائے۔

یہ لفظ ”قلد“ (بروزن قند) کے مادہ سے ہے جس کے اصلی معنی مفردات میں راغب کے بقول ”رسی بائنا“ ہیں اور ”قلادہ“ کو اس لیے قلادہ کہتے ہیں کیونکہ وہ ایک بٹی ہوئی رسی ہوتی ہے جو کسی کے گلے میں ہوتی ہے۔ اور قرآن آیات میں ”قلاند“ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو ”قلادہ“ کی جمع ہے جس کا معنی ایام حج میں وہ جانور ہیں جن کی گردن میں کوئی چیز ڈال دی جاتی ہے تاکہ دوسرے جانوروں سے ان کی پہچان ہو جائے۔ (سورہ مائدہ ۲)

دوسروں کی پیروی کو اسی لیے تقلید کہتے ہیں کہ کیونکہ ان کی باتوں کو وہ قلادہ کی مانند اپنی گردنوں میں ڈال لیتے ہیں یا ذمہ داری کو قلادہ کی مانند اس کے گلے میں ڈال دیتے ہیں جو کسی کی پیروی کرتا ہے۔

لیکن ”مقلید“ کا لفظ، بعض اہل لغات کے نزدیک ”مقلد“ یا ”مقلد“ (بروزن محنت) کی جمع ہے۔ (زمخشری کے بقول اس لفظ یعنی مقالید کا مفرد اپنی جنس سے نہیں ہے)۔

”مقلید“ اور ”اقلید“ دونوں ”کلید“ (چابی) کے معنی میں ہیں۔ حتیٰ کہ ”ابن منظور“ نے ”لسان العرب“ میں اور اس قسم کے دوسرے ارباب لغت نے اپنی اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ اس لفظ کو فارسی کلمہ ”کلید“ سے لیا گیا ہے اور عربی میں بھی اس (چابی) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اور ”مقالید“ (خزانوں) کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، کیونکہ خزانوں کو تالا لگاتے ہیں اور چابی کے بغیر وہاں تک رسائی قطعاً ناممکن ہوتی ہے۔

اسی لیے ”مقالید“ کا ”تقلید“ اور ”قلادہ“ کے مادہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ [۱]

ہاں البتہ ایک احتمال ضرور ملتا ہے کہ دونوں ایک ہی مادہ کی طرف لوٹتے ہیں، کیونکہ کلید یعنی چابی کو بہت سے لوگ دھاگے میں ڈال کر گلے میں ڈال لیتے ہیں۔ [۲]

بہر حال دوسروں سے پیروی جس کا نام ”تقلید“ ہے کبھی تو قابل مذمت و نفرت ہوتی ہے اور کبھی مدوح اور قابل تعریف۔ اس کی مزید

[۱] مفردات راغب، مجمع البحرین، لسان العرب، برہان قاطع اور دیگر کتب

[۲] بعض لوگ ”اقلید“ کو لغت ”بین“ یا لغت ”روم“ سے جانتے ہیں۔ (مجمع البحرین و لسان العرب، مادہ ”قلد“)

تفصیل انشاء اللہ آگے بیان ہوگی۔ یہاں پر جس چیز کے بارے میں بحث کی جا رہی ہے وہ مذموم قسم کی تقلید ہے جسے اندھی تقلید“ کہتے ہیں۔

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### دنیا کو تقلید نے برباد کر دیا

مندرجہ بالا آیات میں سے سب سے پہلی آیت میں ”قوم عاد“ کی کچھ ان باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو انہوں نے اپنے پیغمبر علیہ السلام کے سامنے بیان کیں۔ ان کے اس دسوز اور مہربان نبی کا اسم گرامی حضرت ”ہود“ علیہ السلام تھا۔ حضرت ہود نے انہیں توحید، ظلم و ستم اور تعیش کے ترک کرنے کی دعوت دی تو انہوں نے جواب میں کہا ”ہمارے لیے یہ بات یکساں ہے خواہ آپ ہمیں نصیحت کریں یا نہ کریں۔ ہم ہرگز آپ پر ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ کام جو آپ دیکھ رہے ہیں، یعنی بت پرستی وغیرہ، یہ ہمارے بزرگوں کا شیوہ ہے اور ہم آپ کی باتوں کی وجہ سے اس سے دستبردار نہیں ہوں گے اور آپ کے خیال کے برعکس ہمیں خدا کی طرف سے بھی عذاب نہیں ہوگا۔

اس طرح سے انہوں نے پیغمبر خدا کی منطقی گفتگو کو اپنے لیے مکمل طور پر غیر موثر ہونے کا علی الاعلان اظہار کر دیا، کیونکہ تقلید کا حجاب انہیں حقائق اور واقعات کے دیکھنے کے لیے مانع ہوا۔

دوسری آیت میں مشرکین عرب کی حالت کو بیان کیا گیا ہے کہ جب انہیں کہا جاتا تھا کہ جس چیز کو خدا نے نازل کیا ہے اس کی طرف آؤ اور بتوں اور اپنے بارے میں بہت سے حلال جانوروں کو حرام قرار دینے کی بدعت سے دستبردار کر لو، تو وہ کہتے تھے ”ہمارے بزرگوں کا طریقہ کار ہی ہمارے لیے کافی ہے ہمیں کسی اور ہدایت کی ضرورت نہیں، نہ قرآن کی اور نہ ہی غیر قرآن کی۔

لیکن قرآن نے انہیں اس خواب غفلت سے بیدار کرنے اور تقلید کے حجاب کو پارہ پارہ کرنے کے لیے کہا ہے ”تو کیا ایسا نہیں ہے کہ ان کے آباء و اجداد کچھ بھی نہیں جانتے تھے اور نہ ہی ہدایت یافتہ تھے؟“ آیا جاہل اور گمراہ افراد کی غیر مشروط تقلید اور اتباع جائز ہے؟

تیسری آیت میں مشرکین عرب (یا کچھ شیطان صفت انسانوں) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ جب وہ کوئی برا عمل انجام دیتے ہیں اور کسی برائی کا ارتکاب کرتے ہیں، اگر ان سے اس کی دلیل طلب کی جائے، تو ان کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی جواب نہیں کہ وہ یہ کہیں: ”یہ ہمارے آباء و اجداد کی عادت اور ان کا طریقہ کار ہے“ اور وہ صرف اسی بات پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ کبھی یہ بھی کہہ دیتے ہیں ”خدا نے بھی ہمیں اسی بات کا حکم دیا ہے۔“ (واللہ امرنا بہا)۔

قرآن مجید فوراً اس تہمت کی نفی کرتے ہوئے کہتا ہے: ”خداوند عالم ہرگز برے کاموں کا حکم نہیں دیتا، تو کیوں تم ایسی باتوں کو اس کی طرف منسوب کرتے ہو جو تم خود نہیں جانتے؟“

اس آیت میں ”فحشاء“ (برے کاموں) سے مراد کیا ہے، اس بارے میں بہت سے مفسرین نے یہ کہا ہے کہ یہ کچھ عربوں کی اس رسم کی طرف اشارہ ہے جو زمانہ جاہلیت میں ان کے درمیان رائج تھی اور وہ یہ کہ اس دور میں تمام زن و مرد مادر زاد ننگے ہو کر خانہ کعبہ کا

طواف کرتے تھے۔ اس بارے میں ان کا گمان یہ تھا کہ جس لباس میں ہم گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں وہ اس قابل نہیں ہے کہ اس میں خانہ خدا کا طواف کیا جائے۔

اس طرح سے وہ اس فتنے اور بدترین فعل کا ارتکاب اس اندھی تقلید کی بناء پر کرتے چلے آ رہے تھے جو انہیں نسل در نسل ورثے میں ملی تھی اور تقلید کا حجاب انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ اس عمل کی برائی اور قباحت کا ادراک کر سکیں۔

چوتھی اور پانچویں آیت میں زمانہ سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشرکین کے گروہ یا گزشتہ زمانوں کے بت پرستوں اور گمراہوں کی باتوں کو بیان کیا گیا ہے جو وہ آنحضرتؐ کو یا انبیاء ماسلف کو کہا کرتے تھے کہ ”ہم نے اپنے آداب و رسوم اور عقائد کو اپنے آباء و اجداد سے ورثے میں پایا ہے، لہذا ہم ان کی پیروی کریں گے اور انہی کی اقتدار کریں گے۔“ یعنی ان کی انبیاء سے مخالفت کی واحد دلیل اپنے آباء و اجداد کی اندھی تقلید ہی ہے اور بس!

اس طرح سے کفر، بت پرستی، انواع و اقسام کے گناہ اور عاداتِ قبیحہ انہیں نسل در نسل منتقل ہوتی چلی آئیں اور روح تقلید نے ان کی عقل و فکر پر تقلید کے دیز پر دے اس حد تک ڈال دیئے تھے کہ وہ ہر ایک حقیقت کا انکار کر دیتے تھے۔ قرآن پاک ایسے افراد کو ہی کہتا ہے ”تو کیا تمہارے آباء و اجداد جاہل اور گمراہ نہیں تھے؟“ آیا جاہل کی تقلید صحیح ہے؟ (اولو کان اباءہم لا یعلمون شیئاً ولا یتہدون) (مائئدہ ۱۰۳)

اور کبھی کہتا ”آیا تمہارے آباء و اجداد شیطان کے آلہ کار نہیں تھے؟ اور شیطان انہیں جہنم کی آگ کی طرف نہیں بلاتا؟“ تو پھر تم ان کی کیسے پیروی کرتے ہو؟“ (اولو کان الشیطان یدعوہم الی عذاب السعیر) (لقمان ۲۱)

اور کبھی کہتا ہے: ”جو کچھ پیغمبر علیہ السلام تمہارے پاس لایا ہے وہ تمہارے آباء و اجداد کی راہ و رسم سے زیادہ ہدایت کرتا ہے“ تو پھر تم اس کی پیروی کیوں نہیں کرتے؟ (قال اولو جئتکم باہدی ہما وجدتم علیہ ابائکم)۔ (زخرف ۲۳)

## تشریح

### ۱۔ تقلید کی مختلف قسمیں

دوسروں کی پیروی، خواہ زندہ افراد کی پیروی ہو یا مردوں کی، خواہ ایک فرد کی پیروی ہو، یا ایک جماعت کی، چار صورتوں سے خالی نہیں۔

۱۔ جاہل کی تقلید عالم سے۔ یعنی جو شخص نہیں جانتا وہ اس کی تقلید کرے جو کسی فن کا ماہر اور عالم ہو، جیسے ناسمجھ مریض کا آگاہ، دلسوز اور باسمجھ طبیب کی طرف رجوع کرنا۔

۲۔ عالم کی تقلید عالم سے۔ جیسے اہل فن کا ایک دوسرے کی طرف رجوع کرنا۔



۳۔ عالم کی تقلید جاہل سے۔ جیسے ایک عالم شخص اپنے علم کو خیر باد کہہ کر جاہلوں کے پیچھے لگ جائے۔  
۴۔ جاہل کی تقلید جاہل سے۔ جیسے جہلاء کا ایک گروہ کسی رسم و منت یا عقیدے کو اپنے لیے انتخاب کرے اور بے سمجھ لوگوں کا دوسرا گروہ آنکھ اور کان بند کر کے ان کی اتباع کرے۔ چنانچہ ایک قوم سے دوسری قوم کی غلط رسوم اور فاسد عقائد کے منتقل ہونے کا سب سے زیادہ سبب یہی قسم ہے اور قرآن پاک میں بھی اسی قسم کی تقلید کی شدید مذمت کی گئی ہے۔

ظاہری بات ہے کہ ان چار قسموں میں سے بہترین، منطقی، مرغوب، مدوح اور مطلوب پہلی قسم ہی ہے اور اصولی طور پر ماہرانہ امور میں انسانوں کی زندگی کے محور کو بھی اسی قسم کی عاقلا نہ اور منطقی پیروی ہی تشکیل دیتی ہے، کیونکہ مسلم ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی نابغہ روزگار ہو پھر بھی وہ تمام امور میں مہارت تامہ کا دعویٰ نہیں کر سکتا، خاص کر ایسے دور میں کہ ایک فن میں کئی قسمیں ہیں اور ہر قسم کے کئی سررشتے ہیں۔ مثلاً طب ہی کو لے لیجئے جس کی سینکڑوں قسمیں ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے کئی سررشتے ہیں اور عام طور پر یہ بات محال ہے کہ ایک فرد اسی فن کے تمام سررشتوں میں مہارت تامہ حاصل کر لے، چہ جائیکہ تمام فنون کا کلی طور پر ماہر ہو۔

اس صورت میں جو شخص جس سررشتے میں ماہر ہوگا اسی کے بارے میں اپنے اجتہاد پر عمل کرے گا اور جو لوگ اس بارے میں صاحب نظر اور مجتہد نہیں ہیں ان کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا کہ وہ اس فن کے صاحبان نظر اور ماہرین کی طرف رجوع کریں۔ اگر کوئی تعمیراتی انجینئر بیمار ہوگا تو وہ یقیناً طبیب کی طرف ہی رجوع کرے گا اور اگر وہی طبیب کوئی عمارت بنانا چاہے گا تو اس انجینئر کی طرف رجوع کرے گا۔ یعنی اگر ہر شخص ایک رشتہ میں ”مجتہد“ ہے تو دوسرے رشتہ میں ”مقلد“ ہوگا اور یہ ایک معقول اصول ہے (جاہل کا عالم کی طرف، غیر مجتہد کا مجتہد کی طرف اور غیر ماہر کا ماہر کی طرف رجوع) جواز سے چلا آ رہا ہے۔ بلکہ اصولی طور پر انسانی زندگی کا پہیہ اس اصول سے ہٹ کر گھوم ہی نہیں سکتا۔ البتہ صاحبان نظر اور باب اجتہاد کی کچھ شرائط جن کی طرف بعد میں اشارہ ہوگا۔

یہ وہی چیز ہے جسے بعض اوقات ”اسوۃ حسنہ“ سے تعبیر کیا جاتا ہے، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے ”لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ“ یعنی تمہارے لیے رسول خدا کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔ (احزاب ۲۱) اور سورۃ انعام میں ہم پڑھتے ہیں ”اولئک الذین ہدی اللہ فیہو اھم اقتدا“ یعنی (حضرت اسماعیل، یونس، یحییٰ، یوسف اور موسیٰ علیہم السلام جیسے انبیاء) ایسے لوگ ہیں جنہیں خدا نے ہدایت کی ہے۔ پس تو ان کی ہدایت کی اقتدا کر۔ (انعام ۹۰)

اگرچہ اس آیت میں خطاب پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہے لیکن بعید نہیں ہے کہ اس سے مراد امت ہو۔  
رہ گئیں تقلید کی دوسری تین قسمیں تو وہ سب کی سب باطل، بے بنیاد اور غیر منطقی ہیں۔ کیونکہ:

(الف) جاہل سے عالم کی تقلید اور (ب) جاہل اسے جاہل کی تقلید تو ظاہر ہے کہ یہ دونوں قسمیں باطل ہیں۔ لیکن عالم سے عالم کی تقلید اس لیے صحیح نہیں ہے کہ اسے تقلید نہیں کہا جاتا، ہر گاہ عالم کا عالم کی طرف رجوع کسی مسئلے کے بارے میں مشورے اور مزید معلومات کے حصول کے لیے بھی کیوں نہ ہو۔ اگرچہ یہ صورت حال مذموم اور نامعقول نہیں لیکن یہ ”تقلید“ بھی نہیں ہے، بلکہ اسے ”تحقیق“ کی ایک قسم کہا جائے گا جو اس سررشتہ میں مہارت کی تکمیل کا ایک حصہ ہے۔

تقلید یہ ہوتی ہے کہ انسان کسی رشتے میں اپنے علم و عمل کو نظر انداز کر کے اپنے کان اور آنکھیں بند کرتے ہوئے دوسرے شخص کی پیروی کرے اور یہ بات بھی واضح ہے کہ ایسا شخص جو خود تحقیق اور اجتہاد پر قادر ہے اگر وہ یہ طریقہ کار اختیار کرے گا تو اس کے لیے قابل مذمت ہوگا۔ اسی لیے تو فقہ اسلامی میں مجتہدین کے لیے کسی کی تقلید حرام ہے۔

مندرجہ بالا تصریحات کے پیش نظر تقلید کا فلسفہ واضح ہو جاتا ہے کہ غیر فقہی افراد کو فقہی مسائل میں فقہاء اور مجتہدین کی تقلید کیوں کرنی چاہیے اور یہی فلسفہ تمام علمی رشتوں میں کارفرما ہے۔ چونکہ اسلامی فقہ اس قدر وسیع اور گہری ہے کہ جو شخص اس میں مہارت اور تخصص حاصل کرنا چاہتا ہے اسے اپنی ساری زندگی اس کے حصول اور تحقیق کے لیے وقف کر دینا پڑتی ہے اور یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اسی لیے مجبوراً اس کے لیے ایک خاص گروہ کو کمر ہمت باندھنا پڑتی ہے اور دوسرے لوگوں کو فقہی مسائل میں ان کی تقلید کرنا پڑ جاتی ہے۔ لیکن اسلامی اصولوں (اصول دین) میں تقلید جائز نہیں ہوتی کیونکہ ہر شخص اپنی بساط کے مطابق ان کی تحقیق پر قادر ہوتا ہے۔

## ۲۔ صحیح تقلید کی شرائط

عموماً تقلید کی تعریف میں کہتے ہیں کہ ”کسی دوسرے کی بات کو تفصیل دلیل کے بغیر قبول کرنے کا نام ”تقلید ہے۔ اور بعض لوگوں نے اسے مزید وسعت دی ہے اور قول و گفتار سے ہٹ کر عملی پیروی کو بھی اس کا جزو سمجھتے ہیں۔ بلکہ بعض دوسرے حضرات نے تو تقلید کو اس سے بھی وسیع تر معنی میں بیان کیا ہے اور ”دوسروں کے اعمال، رفتار و گفتار اور صفات جو کسی انسان میں لاشعوری طور پر اثر انداز ہوتے ہیں“ کو بھی تقلید کا حصہ سمجھتے ہیں۔

البتہ تعریف کا یہ آخری حصہ یعنی لاشعوری تاثیر ہماری بحث کے موضوع سے خارج ہے، لیکن اس کا پہلا اور دوسرا حصہ بھی اس وقت قابل ستائش تقلید کہلائیں گے جب اس شخص (مرجع تقلید میں) یہ دو شرائط پائی جائیں۔ (الف) علم (ب) صداقت۔ یعنی وہ صاحب علم و نظر ہو اور اپنی تشخیص کو دوسروں تک پوری صداقت کے ساتھ منتقل کرے اور اگر ان دو میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو جائے تو تقلید نا قابل ستائش قسم میں داخل ہو جائے گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ جس موضوع میں تقلید کی جارہی ہے وہ ان موضوعات میں سے ہو جن کا تعلق تخصص سے ہوتا ہے، تاکہ اس میں تقلید جائز ہو سکے۔ رہے وہ مسائل جو عمومی ہوتے ہیں، یعنی ہر شخص ان کی تحقیق کر سکتا ہے (جیسے اعتقادی اصول سے متعلق مسائل، یا کچھ وہ اخلاقی اور اجتماعی مسائل جن کا تخصص سے تعلق نہیں ہوتا) ہر شخص کو اپنی بساط کے مطابق ان میں تحقیق کرنی چاہیے۔

تیسری بات یہ ہے کہ مقلد خود بھی استنباط پر قادر نہ ہو۔ کیونکہ اگر وہ اس پر قادر ہو اور کسی شخص سے مسئلے کو پوری تحقیق کے ساتھ زیر بحث لاسکتا ہے اور اس سے نتیجہ اخذ کر سکتا ہے تو اس کے لیے تقلید ممنوع ہے۔

یہیں سے تین جہات کے لحاظ سے (مرجع کی شرائط، مقلد کی شرائط اور موضوع کی شرائط) کہ جس میں تقلید کی جاسکتی ہے (قابل ستائش اور نا قابل ستائش تقلید کے درمیان موجود سرحد واضح ہو جاتی ہے۔

اس بحث کو ہم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث کے ساتھ ہی ختم کرتے ہیں:

حضرت امام علیہ السلام کی خدمت میں کسی نے عرض کیا جناب! باوجودیکہ یہودی عوام اپنی آسمانی کتاب کی اطلاع اپنے علماء کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے نہیں رکھتے تھے تو پھر خداوند عالم نے ان کی اس تقلید کی وجہ سے ان کی اس قدر مذمت کیوں فرمائی ہے؟ (اس کا اشارہ سورہ بقرہ کی ۷۸ ویں اور ۷۹ ویں آیات کی طرف تھا یعنی ”وَمِنْهُمْ أُمِّيُونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِي“ اور ”فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُمُونَ الْكِتَابَ بَايِدًا بِهِمْ“ کی طرف)۔

تو کیا یہودی عوام میں اور ہمارے عوام میں اس بارے میں کوئی فرق ہے؟

امام علیہ السلام نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا: ہمارے عوام اور یہودی عوام کے درمیان ایک لحاظ سے فرق ہے اور ایک لحاظ سے برابری ہے۔ جس لحاظ سے برابری ہے وہ یہ کہ خداوند عالم نے ہمارے عوام کی بھی اسی طرح مذمت کی ہے جس طرح یہودی عوام کی مذمت کی ہے۔ لیکن جس لحاظ سے ان کے درمیان فرق ہے وہ یہ کہ یہودی عوام اپنے علماء کی کیفیت سے آگاہ تھے اور اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ مطالب کو بیان کرنے میں جھوٹ سے کام لے رہے ہیں، حرام اور رشوت کھا رہے ہیں اور خدائی احکام کو تبدیل کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی فطرت کے ذریعہ اس حقیقت کو بخوبی دریافت کر لیا تھا کہ اس قسم کے لوگ فاسق ہیں اور خدا اور احکام خدا کے بارے میں ان کی باتوں کو تسلیم کرنا جائز نہیں ہے اور نہ ہی خدا کے رسولوں کے بارے میں ان کی کوئی بات قابل قبول ہے۔ اسی لیے خدا نے ان کی مذمت کی ہے۔

اگر ہمارے عوام بھی اپنے علماء سے آشکارا فتنہ، شدید تعصب اور دنیا اور حرام مال کے لیے ان کی حرص کو دیکھیں اور پھر ان کی اتباع کریں تو ان یہودیوں کی مانند ہیں جن کی خدا نے اپنے فاسق علماء کی پیروی کرنے کی وجہ سے مذمت کی ہے۔

پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا:

”فَا مَا مِنْ كَانٍ مِنَ الْفُقَهَاءِ صَانِئًا لِنَفْسِهِ حَافِظًا لِدِينِهِ مَخَالَفًا عَلِيَّ هُوَاةٌ

مطیعاً لا مراً مولاً فلا لعلوا ما ان يقلدوه“

”یعنی جو فقہاء اپنی حفاظت کرنے والے، دین خدا کو بچانے والے، اپنی نفسانی خواہشات کے مخالف اور اپنے مولا کے فرمان کے مطیع ہوں، تو عوام کو چاہیے کہ وہ ان کی تقلید کریں۔“ [۱]

[۱] وسائل الشیعہ، جلد ۱۸، ص ۹۴، باب ابواب صفات القاضی، حدیث ۲۰۔ البتہ کتاب وسائل الشیعہ میں اس حدیث کا کچھ حصہ بیان ہوا ہے اور مکمل حدیث آپ کو ”احتجاج طبرسی“ اور تفسیر امام حسن عسکری میں ملے گی۔ مرحوم علامہ مجلسی نے بھی اسے اپنی کتاب بحار الانوار، جلد ۲، ص ۸۶ تا ۸۹ میں اسے نقل کیا ہے۔

## ۳۔ اندھی تقلید کے اسباب

اندھی تقلید یا دوسرے لفظوں میں ”جاہل کی جاہل سے تقلید“ اور اس سے بھی بدتر ”جاہل سے عالم کی تقلید“ فکری وابستگی کی علامت ہے اور یہ امر بہت سے اسباب کا حامل ہے جن میں سے چیدہ چیدہ یہ ہیں:

### ۱۔ فکری نابالغی:

ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوں جو جسمانی طور پر تو بالغ ہو چکے ہوں لیکن آخری عمر تک فکری بلوغ اور استقلال کو نہ پہنچ سکیں۔ ایسے لوگ اسی وجہ سے اپنی ساری زندگی ہر کس و ناکس کی پیروی کرنے میں گزار دیتے ہیں اور کسی بھی وقت ذاتی طور پر کسی مسئلے کا تجزیہ و تحلیل نہیں کر سکتے۔ ان کی آنکھیں ہمیشہ دوسروں پر لگی رہتی ہیں۔ جو وہ کہہ دیں اسے دہراتے رہتے ہیں اور اس میں ان کا اپنا کوئی ارادہ اور اختیار نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی تو وہ اپنے ماحول کی تبدیلی سے اپنی راہوں کو مکمل طور پر تبدیل کر لیتے ہیں اور اصطلاح کے مطابق ان کے اندر ۱۸۰ درجے کی تبدیلی آ جاتی ہے۔

اس قسم کی اندھی تقلید کا مقابلہ کرنے اور اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ معاشرے کی تعلیمی سطح کو بلند کیا جائے اور معاشرے میں موجود افراد کے اندر خفیہ صلاحیتوں کو بیدار کیا جائے اور ان کے افکار کو جلا بخشی جائے۔

### ۲۔ شخصیت پرستی:

اس طرح کہ انسان کسی شخص کو بے نظیر اور عدیم المثال ہیرو کے عنوان سے قبول کر لیتا ہے اور اس کے سامنے اسے اپنے نظریہ کو بیان کرنے کی جرات نہیں ہوتی اور وہ آنکھ اور کان بند کر کے اس کے پیچھے لگ جاتا ہے، خواہ وہ شخصیت تقلید اور اتباع کی اہل نہ بھی ہو۔

### ۳۔ آباؤ اجداد سے شدید تعلق:

اور وہ بھی اس حد تک کہ کبھی کبھی تو عظمت اور تقدس کے ہالہ کے اس قدر اندر چلے جاتے ہیں کہ وہ لوگ خواہ کسی قسم کی اہلیت اور لیاقت نہ بھی رکھتے ہوں پھر بھی نسل در نسل ان کے خیالات و افکار ان لوگوں کے لیے قابل عمل ہوتے ہیں اور کانوں اور آنکھوں کو بند کر کے ان کی اتباع کی جاتی ہے اور عام طور پر بھی ہوتا ہے کہ بعد کی نسلیں جو گزشتہ لوگوں کے علوم کی وارث ہوتی ہیں اور جو بھی تازہ اور جدید معلومات کی حامل ہوتی ہیں اور گزشتہ لوگوں سے علم میں بھی زیادہ ہوتی ہیں، لیکن پھر بھی آنکھیں اور کان بند کر کے ان کی تقلید پر اڑی ہوئی ہوتی ہیں۔

### ۴۔ گروہ بندی یا قبائلی تعصبات:

اس قسم کے رجحانات اور تعصبات اس بات کا سبب بن جاتے ہیں کہ کچھ لوگ آنکھیں اور کان بند کر کے اپنے گروہ، پارٹی، قبیلہ اور

جماعت کے پیچھے چل پڑتے ہیں اور وہ جو کچھ بھی کہیں وہ اس کا تکرار کرتے ہیں اور اپنی طرف سے مسائل کے تجزیہ و تحقیق اور فکری استقلال کا کوئی حق نہیں رکھتے۔

یہ چار اور دوسرے کئی عوامل ایسے ہیں جو اس بات کا سبب بن جاتے ہیں کہ بہت سی خرافات، موہومات، باطل عقائد، غلط آداب و مراسم، جاہلانہ رسومات اور بد عملی ایک معاشرے سے دوسرے معاشرے میں اور ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔  
بالفاظ دیگر مندرجہ بالا غلط رجحانات، میلانات اور تعصبات ان کے افکار کے آگے حجاب ہوتے ہیں اور حق کی معرفت سے انہیں باز رکھتے ہیں۔

## ۹۔ عیش پرستی کا پردہ

سب سے پہلے مندرجہ ذیل آیات کو غور سے سنتے ہیں۔

### آیات

(۱) وَإِذَا أَنْزَلَتْ سُورَةٌ أَنْ آمَنُوا بِاللهِ وَجَاهِدُوا مَعَ رَسُولِهِ اسْتَأْذَنَكَ أُولُوا  
الزُّلْمِ مِنْهُمْ وَقَالُوا ذَرْنَا نَكُنْ مَعَ الْقَاعِدِينَ ﴿۳۱﴾ رَضُوا بِأَنْ يَكُونُوا مَعَ  
الْحَوَافِيفِ وَطَبَعَ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ ﴿۳۲﴾ (سورہ توبہ ۸۴-۸۶)  
(۲) إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ وَهُمْ أَغْنِيَاءٌ رَضُوا بِأَنْ يَكُونُوا  
مَعَ الْخَوَافِيفِ وَطَبَعَ اللهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۹۳﴾ (سورہ توبہ ۹۳)

### ترجمہ

(۱) اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے کہ تم خدا پر ایمان لے آؤ اور اس کے پیغمبر کے ساتھ مل کر جہاد کرو، تو ان (منافقین) میں سے کچھ لوگ، جو طاقتور ہیں، آپ سے اجازت مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ ہمیں قاعدین (جن سے جہاد معاف ہے) کے ساتھ رہنے دیں۔ وہ اسی بات پر راضی ہو چکے ہیں کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ رہ جائیں اور ان کے دلوں پر مہر لگائی جا چکی ہے۔ اس لیے وہ نہیں سمجھ پاتے۔  
(۲) مواخذے کی راہ صرف ان لوگوں کے لیے کھلی ہوئی ہے جو آپ سے اجازت طلب کرتے ہیں جبکہ وہ بے

نیاز ہیں (اور کافی امکانات رکھتے ہیں) وہ اس بات پر راضی ہو چکے ہیں کہ پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ رہ جائیں اور خداوند عالم نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ لہذا وہ کچھ نہیں سمجھتے۔

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### بچوں کی طرح ہمیں بھی جہاد سے معاف رکھا جائے

ان آیات کی پہلی قسم ان لوگوں کی حالت بیان کر رہی ہے جو جہاد کے سلسلے میں خدائی احکام پر عملدرآمد کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ حالانکہ وہ جسمانی اور مالی لحاظ سے اس قدر طاقتور تھے کہ وہ میدان جنگ میں حاضر ہو سکتے تھے۔ لیکن ان کی ہر ممکن یہی کوشش رہتی کہ وہ خود کو کمزور و ناتواں افراد کی صف میں شامل رکھیں۔ یعنی ایسے لوگوں کی صف میں جو جسمانی یا مالی لحاظ سے جہاد کی توانائی نہیں رکھتے تھے۔ ان کا اصرار رہتا تھا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں اجازت دے دیں کہ وہ ”قاعدین“ اور ”خوالف“ کی صف میں شامل رہیں۔

”قاعدین“، ”قاعد“ (بیٹھا ہوا) کی جمع ہے جس کے معنی ہیں وہ لوگ جو جہاد سے معذور ہوتے ہیں اور ”خوالف“، ”خالفہ“ کی جمع ہے جو ”خلف“ (بروزن حرف) کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں پچھلا حصہ۔ اسی لیے ان عورتوں کو ”خالفہ“ کہا جاتا ہے جو مردوں کے گھر سے باہر جانے کے بعد گھر میں رہ جاتی ہیں۔ لیکن بعید نہیں ہے کہ یہاں پر اس کا عمومی مفہوم مراد ہو، یعنی جو لوگ بھی کسی نہ کسی قسم کے عذر کی وجہ سے میدان جہاد میں حاضر ہونے سے قاصر ہوتے ہیں، خواہ وہ عورتیں ہوں یا بچے، بوڑھے ہوں یا بیمار۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ”خالف“ اس شخص کو کہتے ہیں جو زیادہ خلاف ورزی کرتا ہے۔<sup>[۱]</sup>

یہ لفظ کبھی ”بدبو“ کے معنی میں بھی آتا ہے کیونکہ بدبو خوشبو کی قائم مقام ہوتی ہے۔

بعض مفسرین نے اس کے معنی انحطاط اور پستی کی طرف رجحان بھی کئے ہیں کیونکہ یہ خلاف ورزی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن پہلا معنی سب معافی سے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

معنی خواہ کچھ بھی ہو اصل مقصد یہ ہے کہ یہ عیش پرست اور رفاہ طلب لوگ جو اس بات کے لیے قطعاً تیار نہیں ہوتے کہ طوفانوں اور اجتماعی بحرانوں میں دوسرے لوگوں کی مانند ایثار کا مظاہرہ کریں، بلکہ وہ اس کے خواہاں ہوتے ہیں کہ خواہ انہیں بچوں اور بیماریوں کی صف میں کیوں نہ کھڑا ہونا پڑے، جہاد سے بچے رہیں۔ اسی لیے آیت کے آخر میں قرآن کہتا ہے ”ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے۔ اسی لیے وہ کچھ نہیں سمجھتے۔“

جی ہاں! راحت طلبی، تن پروری اور عیش و نوش بھری مرفہ زندگی حجاب بن کر ان کی فکر کی آنکھوں پر پڑ چکی ہے۔ انہیں یہ سمجھ نہیں ہے

کہ انسان کی سعادت اور خوش بختی خواب و خوراک میں نہیں بلکہ کبھی تو اس کی سعادت میدان جہاد میں قدم رکھنے اور اپنے پیکر کو خاک و خون میں غلطان دیکھنے میں ہے۔ اس طرح اس کے لیے لقاء اللہ، قرب حق کے جوار اور ضیافت حق کی راہیں کھلتی ہیں۔ لیکن جو شخص ان مسائل کو نہیں سمجھتا ممکن ہے کہ وہ ان کا مذاق اڑائے اور توہین کرے۔

دوسری آیت میں پہلے تو ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جنہیں میدان جہاد میں حاضر ہونے سے معاف قرار دیا گیا ہے، جیسے کمزور، بیمار اور وہ لوگ جو کسی اور وجہ سے میدان جہاد میں شریک ہونے سے قاصر ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا دل عشق جہاد کے شوق میں دھڑکتا رہتا ہے اور اس راستے میں خرچ کرنے کی طاقت نہ رکھنے کی وجہ سے سیل اشک ان کی آنکھوں سے جاری رہتا ہے۔ پھر فرماتا ہے ”ایسے لوگ قابل مواخذہ نہیں ہیں، بلکہ مواخذہ تو ان لوگوں سے کیا جائے گا جو صاحبان ثروت اور طاقت ہیں اور پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ پیچھے رہ جانا چاہتے ہیں۔“

اس مقام پر ہی قرآن کہتا ہے ”خداوند عالم نے ان لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ اسی لیے وہ کچھ نہیں جانتے۔“ کیونکہ عیش و عشرت اور راحت طلبی کا ضخیم حجاب ان کے دل کی آنکھوں پر پڑا ہوا ہے۔ اس طرح سے دونوں آیتیں ایک ہی حقیقت کو بیان کر رہی ہیں اور واضح کر رہی ہیں کہ ”راحت طلبی اور عیش و عشرت کی وجہ سے جہاد سے باز رہنے اور حقیقت کے ادراک سے محروم رہ جانے“ کے درمیان ایک خاص تعلق اور ربط موجود ہے۔

## ۱۰۔ آرزوؤں کا حجاب

آیات

(۱) يُنَادُونَهُمْ أَلَمْ نَكُنْ مَعَكُمْ ؕ قَالُوا بَلَىٰ وَلَكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ أَنْفُسَكُمْ  
وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْأَمَانِيُّ حَتَّىٰ جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ وَغَرَّكُمْ بِاللَّهِ  
الْغُرُورُ ﴿۱۰﴾ (سورہ حدید ۱۴)

ترجمہ

(۱) وہ (منافقین بروز قیامت) مومنین کو آواز دیں گے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے؟ تو وہ کہیں گے کہ ضرور تھے، لیکن تم نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا اور (پیغمبر کی موت کا) انتظار کرتے رہے اور شک و تردد میں پڑے رہے اور لمبی آرزوؤں نے تمہیں فریب میں ڈالے رکھا، یہاں تک کہ خدا کا حکم (یعنی تمہاری موت کا پیغام) آپہنچا اور شیطان نے خدا کے بارے میں تمہیں فریب دیا۔



## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### لمبی آرزوئیں

”امانی“، ”امنیه“ کی جمع ہے جس کے معنی ایسی حالت ہیں جو انسان کے نفس میں کسی چیز کی تمنا سے پیدا ہوتی ہے۔<sup>[۱]</sup> جسے فارسی میں ”آرزو“ کہتے ہیں۔ البتہ چونکہ معقول قسم کی آرزو معیوب ہی نہیں بلکہ مستقبل کے بنانے کے لیے تحرک کا ایک عامل بھی ہے۔ جو چیز معیوب اور قابل اعتراض ہے وہ لمبی لمبی اور غیر منطقی آرزوئیں ہوتی ہیں۔ اسی لیے ”امنیه“ اور ”امانی“ کی ایسے مواقع پر ان لمبی چوڑی اور دور دراز کی آرزوؤں سے تفسیر کی جاتی ہے جو انسان کو ہر چیز سے غافل کر دیتی ہیں اور اس کی عقل و فکر پر پردہ ڈال دیتی ہیں۔

”ابن اثیر“ کہتے ہیں ”تمنی“ کا معنی کسی مطلوب امر کے حصول سے تعلق ہے اور اسی طرح ان حوادث کے بارے میں دل میں پیدا ہونے والی باتیں بھی ”تمنی“ کہلاتی ہیں جو حوادث مستقبل میں رونما ہوتے ہیں یا رونما نہیں ہوتے اور ”منیہ“ (بروزن کنیہ) اور ”امنیه“ کا ایک معنی ہے<sup>[۲]</sup> اور بعض لوگوں نے ”امنیه“ کو جھوٹ کے معنی میں ذکر کیا ہے، کیونکہ دروغ گو انسان کسی بات کو اپنے دل میں پروان چڑھا رہا ہوتا ہے۔<sup>[۳]</sup>

راغب کہتے ہیں کہ چونکہ جھوٹ ایسی چیز کا تصور ہوتا ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی، آرزوئیں بھی جھوٹ اور دروغ گوئی کا سرچشمہ سمجھی جاتی ہیں۔ لہذا اگر جھوٹ کو ”امنیه“ کہا جاتا ہے تو اسی وجہ سے ہوتا ہے۔

بعض حضرات نے اس کلمہ کی اصل کسی چیز کا تصور میں لانا، فرض کرنا اور اندازہ لگانا، بتایا ہے<sup>[۴]</sup> اور آرزوؤں کو اس لیے ”امانی“ کہتے ہیں کیونکہ انسان اپنے دل میں انہیں فرض کرتا، تصور میں لاتا اور ان کا اندازہ لگاتا ہے۔

بہر حال جب مومنین قیامت کے دن نور ایمان کی روشنی میں عرصہ محشر کو جلدی جلدی طے کر کے بہشت کی طرف جا رہے ہوں گے تو منافقین پکار کر کہیں گے ”ایک نظر ہم پر بھی ڈالتے جائیے تاکہ ہم آپ کے نور سے کچھ روشنی حاصل کر سکیں۔ تو وہ جواب میں کہیں گے تم (دنیا میں) واپس لوٹ جاؤ اور وہاں سے جا کر نور حاصل کرو۔ اس موقع پر ایک دیوار اٹنے درمیان حائل ہو جائے گی جس کا ایک دروازہ ہوگا جس کے اندر کی طرف رحمت اور باہر کی طرف عذاب ہوگا۔“

[۱] مفردات راغب۔ تو ج رہے کہ ”امانی“، ”امنیه“ کی جمع ہے اور ”منی“ (بروزن ثما) ”منیہ“ (بروزن کنیہ) کی جمع ہے۔

[۲] لسان العرب

[۳] المنجد، مادہ ”منی“

[۴] مجمع البحرین طریحی

یہی موقعہ ہوگا کہ منافقین کی آواز بلند ہوگی اور وہ کہیں گے کہ کیا ہم آپ کے ساتھ نہیں تھے؟ کیا ہم دنیا میں ایک معاشرے میں نہیں رہ رہے تھے اور یہاں پر بھی کچھ دیر کے لیے ہم آپ کے ہمسفر رہے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ آپ ہم سے اچانک جدا ہو گئے، آپ تو رحمت الہی کی طرف چلے گئے اور ہمیں عذاب کے چنگل میں ڈال گئے؟

اس مقام پر وہ انہیں جواب دیں گے ”ٹھیک ہے کہ ہم اکٹھے رہے ہیں، کوچہ و بازار میں، حتیٰ کہ بعض اوقات سفر و حضر میں بھی ساتھ رہے ہیں، ایک دوسرے کے ہمسائے بھی رہے ہیں، حتیٰ کہ بعض مواقع پر تو ایک گھر میں بھی رہے ہیں، لیکن تم نے پانچ عظیم غلطیوں کا ارتکاب کیا۔ پہلی تو یہ کہ تم نے کفر و نفاق کی راہوں پر چل کر خود کو ہلاکت میں ڈال دیا اور فتنہ پردازی کی۔ (ولکنکم فتنتم انفسکم) دوسری یہ کہ تم ہمیشہ مسلمانوں کی شکست، حتیٰ کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موت کے منتظر رہے اور ہر کام میں لیت و لعل سے کام لیتے رہے۔ (وتربصتم)

تیسری یہ کہ تم ہر چیز میں شک اور تردد کا اظہار کرتے تھے، خصوصاً معاد اور اسلام کی حقانیت کے معاملے میں۔ (وارتبتہم) چوتھی یہ کہ لمبی چوڑی اور طولانی امیدوں نے تمہیں فریب دیا اور تمہاری عقل و فکر پر پردہ ڈال دیا، حتیٰ کہ تمہاری موت کا وقت آن پہنچا۔ (وغرتکم الامانی حتیٰ جاء امر اللہ)۔

پانچویں ان سب کے علاوہ فریب کار شیطان نے بھی تمہیں خدا کے بارے میں فریب دیا اور تمہیں کہا خدا کی عفو و بخشش کے ساتھ دل لگائے رکھو، وہ تمہیں ہرگز سزا نہیں دے گا۔ (وغرتکم باللہ الغرور)۔

جی ہاں! یہی عوامل تھے جو ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلے اور وہ منظر تشکیل دیا جو تم دیکھ رہے ہو اور یہ دیوار جو تمہیں نظر آ رہی ہے انہی عوامل نے ایجاد کی ہے۔

ہماری بات کا شاہد جو تھا جملہ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ لمبی چوڑی اور طولانی امیدوں نے تمہیں فریب دیا۔ جی ہاں! بسا اوقات انسانی آرزوؤں کا سلسلہ اس قدر وسیع ہو جاتا ہے کہ انسان کے تمام افکار کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے اور اسے ہر چیز سے غافل اور بے خبر کر دیتا ہے اور خیالوں اور سوچوں کی ایک دنیا میں لے جاتا ہے، آنکھوں اور کانوں کو اندھا اور بہرا کر دیتا ہے اور دانا اور ہوشیار لوگوں کو ہر طرف سے بے خبر کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ بسا اوقات اپنی زندگی کے لیے ایسے ایسے منصوبے تیار کرتے ہیں جو عمر نوح میں بھی قابل عمل نہیں ہوتے اور بعض اوقات اپنے مادی مقصد تک پہنچنے کے لیے ایسی مقدمہ سازی کرتے ہیں کہ ہر شخص ایک سادہ سے اندازے سے ہی بتا دیتا ہے کہ اس تک صدیوں میں بھی رسائی ناممکن ہے اور اسی کا نام حجاب معرفت ہے۔

کچھ اور مفسرین نے ”امانی“ کی تفسیر میں مذکورہ پانچ چیزوں کے علاوہ پانچ اور چیزیں بھی بتائی ہیں اور وہ یہ ہیں: ”مؤمنین کی شکست و کمزوری کی آرزو، شیطانی فریب کاری، دنیا، اپنے لیے پیغمبر کے استغفار کی انتظار اور نیکیوں کو یاد رکھنا اور برائیوں کو فراموش کر دینا، [۱] جبکہ بعض

دوسرے مفسرین نے انہیں ”باطیل“ سے تفسیر کیا ہے۔

لیکن بغیر بتائے یہ بات واضح ہے کہ یہ سب کچھ لمبی چوڑی آرزوؤں کے جامع مفہوم میں آجاتا ہے۔

## مزید تشریح

### آرزوؤں کا حجاب روایات کی رو سے

یہ ایک حقیقت ہے کہ خیال باقی پر مبنی اور واقعیت سے دور آرزوئیں انسانی عقل و شعور پر پردہ ڈال دیتی ہیں اور اس واقعیت کا تذکرہ صرف قرآن مجید ہی میں نہیں بلکہ روایات اور تاریخ میں بھی اس کے کافی حد تک شواہد ملتے ہیں۔ چنانچہ امیر المؤمنین علی علیہ السلام کی ایک معروف حدیث میں ہے:

”ان اخوف ما اف علیکم اثنان، اتباع الهوی و طول الامل، فاما

اتباع الهوی فیصد عن الحق و اما طول الامل فینسی الاخرة“

”سب سے زیادہ خطرناک چیزیں جن سے مجھے تمہارے بارے میں خوف ہے، دو ہیں۔ ایک تو خواہشات

نفسانی کی پیروی اور دوسرے لمبی آرزوئیں۔ کیونکہ خواہشات نفسانی کی پیروی حق سے مانع ہو جاتی ہے اور لمبی

آرزوئیں آخرت کو بھلا دیتی ہیں۔“ [۱]

حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام ہی سے ایک اور حدیث کلمات قصار میں موجود ہے۔ آپؑ نے فرمایا:

”الامانی تعبی اعین البصائر“

”لمبی آرزوئیں بصیرت کی آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہیں۔“ [۲]

ایک اور حدیث میں آپؑ ہی فرماتے ہیں:

”جماع الشر فی الاغترار بالمہل والاتکال علی الامل“

”شر اور فساد جمع کر دیئے گئے ہیں، خدا کی طرف سے دی گئی مہلتوں اور لمبی آرزوؤں پر بھروسہ کرنے میں۔“ [۳]

[۱] نوح البلاغ، خطبہ ۴۲

[۲] نوح البلاغ، کلمات قصار، جملہ ۲۷۵

[۳] غرر الحکم (حرف ج نمبر ۵۵)

اسی طرح اسی سلسلے میں آپؐ ہی فرماتے ہیں:

### ”غرور الامل یفسد العمل“

”آرزوؤں کا دھوکا اعمال کو برباد کر دیتا ہے۔“<sup>[۱]</sup>

قصہ مختصر وہی شخص حقیقت کے زیبا چہرے کو جیسا کہ وہ ہے دیکھ سکتا ہے اور معرفت کے چشمہ رلال تک رسائی حاصل کر سکتا ہے جو اپنی عقل کی آنکھوں پر آرزوؤں کا پردہ نہ ڈالے اور اس تیز و تار یک بادل کے درمیان نہ پھنس جائے۔

اس بحث کو حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام ہی کے فرمان ذیشان پر ختم کرتے ہیں۔ آپؐ فرماتے ہیں،  
 ”واعلموا ان الامل یسھی العقل وینسی الذکر فاکنذ بوا الامل فانہ غرور و صاحبہ مغرور“ ”تمہیں معلوم ہونا چاہیے لمبی آرزوئیں عقل کو گمراہ اور یادِ خدا کو فراموشی کے سپرد کر دیتی ہیں۔ اسی لیے تم آرزوؤں کی پروا نہ کرو کیونکہ یہ دھوکہ باز ہیں اور اپنے صاحب کو فریب میں ڈال دیتی ہے۔“<sup>[۲]</sup>

[۱] غرر الحکم

[۲] نیج البلاغہ، خطبہ ۸۶

دوسرا حصہ

## وہ اعمال جو معرفت کے لیے حجاب بن جاتے ہیں

## ۱۱۔ گناہوں کا حجاب

سب سے پہلے مندرجہ ذیل آیات کی تلاوت کا شرف حاصل کرتے ہیں:

## آیات

(۱) الَّذِينَ يَكْذِبُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ ۗ وَمَا يَكْذِبُ بِهِ إِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ۖ  
 إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۗ كَلَّا بَلْ سَوَّيْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ  
 مَاءً كَاثِرًا يَكْسِبُونَ ۗ (سورہ مطففین ۱۱ تا ۱۴)

(۲) فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا  
 أَرْحَامَكُمْ ۗ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعَمَّىٰ أَبْصَارَهُمْ ۗ  
 (سورہ محمد ۲۳-۲۲)

(۳) أَوْلَمْ يَهْدِ لِلَّذِينَ يَرِثُونَ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ أَهْلِهَا أَنْ لَوْ نَشَاءُ أَصْبِنَهُمْ  
 بِذُنُوبِهِمْ ۗ وَنَطْبَعُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ۗ (سورہ اعراف ۱۰۰)  
 (۴) ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِينَ أَسَاءُوا السُّؤَىٰ أَنْ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ وَكَانُوا بِهَا  
 يَسْتَهْزِءُونَ ۗ (سورہ روم ۱۰)

## ترجمہ

(۱) جو لوگ کہ قیامت کا انتظار کرتے ہیں اور اس کا صرف وہی لوگ انکار کرتے ہیں جو حد سے تجاوز کرنے والے اور گناہگار ہوتے ہیں۔ وہی لوگ کہ جب ان پر ہماری آیات کو تلاوت کیا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ تو

گذشتہ لوگوں کے افسانے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے جس کا وہ گمان کرتے ہیں بلکہ ان کے اعمال اس زنگ کی مانند ہیں جو ان کے دل پر چڑھ چکا ہے۔

(۲) اگر تم روگردانی کرو تو کیا اس کے علاوہ کسی اور بات کی توقع رکھی جاسکتی ہے کہ تم زمین میں فساد برپا کرو اور قطع رحمی کرو؟ وہ ایسے لوگ ہیں جنہیں خدا نے اپنی رحمت سے دور کر رکھا ہے۔ ان کے کانوں کو بہرا اور آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔

(۳) کیا وہ لوگ عبرت حاصل نہیں کرتے جو گذشتہ لوگوں کے وارث ہوتے ہیں کہ اگر ہم چاہیں تو انہیں بھی ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیں اور ان کے دلوں پر مہر لگا دیں تاکہ (حق کی آواز کو) نہ سن سکیں۔

(۴) جن لوگوں نے گناہ کیے ہیں ان کا انجام کار یہ ہوا کہ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا (اور راہ ہدایت کو گم کر دیا)۔

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### گناہ انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتے ہیں

زیر بحث آیات میں سب سے پہلی آیت میں قرآن مجید نے ان لوگوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو مکمل طور پر قیامت کا انکار کرتے ہیں۔ پھر فرمایا ہے کہ قیامت کے دلائل واضح ہیں۔ صرف وہ لوگ ہی اس کے انکار پر اصرار کرتے ہیں جو حد سے تجاوز کرنے والے اور گناہگار ہوتے۔ وہ کسی بھی صورت میں خدائی آیات کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے۔ اسی لیے جب ان کے سامنے خدائی آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ اس کا انکار کرنے کے لیے کہہ دیتے ہیں ”یہ سب کچھ گذشتہ لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں۔“

قرآن نے واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے جس کا وہ گمان کرتے ہیں۔ ان کی طرف سے اس قسم کی باتیں اس لیے ہیں کہ ان کے برے اعمال اور گناہ زنگ بن کر ان کے دلوں پر چڑھ چکے ہیں۔

یہاں پر قرآن پاک نے لفظ ”رین“ کو استعمال کیا ہے اور جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ ارباب لغت کی طرف سے اس لفظ کی تین تفسیریں کی گئی ہیں۔ (۱) وہ زنگ جو قیمتی اشیاء پر چڑھ جاتا ہے۔ (۲) وہ زنگ جو دھاتوں پر چڑھ جاتا ہے اور ان کے گل سڑ جانے کی علامت ہوتا ہے۔ (۳) ہر وہ چیز جو کسی دوسری چیز پر تسلط اور غلبہ حاصل کر لیتی ہے۔ لہذا عقل پر شراب کے غلبے، زندہ انسانوں پر موت کے غلبے اور آنکھوں پر نیند کے غلبے پر اسی لفظ کا استعمال ہوتا ہے۔ [۱]

[۱] تفسیر فخر رازی، جلد ۳۱، ص ۹۴ و روح المعانی، جلد ۳۰، ص ۷۲

البتہ یہ سب معانی ایک جامع مفہوم میں جمع ہیں اور وہ ”زنگ“ ہے جو چیزوں پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔ پھر اس کا اطلاق عمومی طور پر ایک چیز کے دوسری چیز پر غلبہ پانے پر ہونے لگا۔

اس آیت سے یہ بات بخوبی سمجھی جاتی ہے کہ گناہ دل کی شفافیت کو اس طرح ختم کر دیتا ہے کہ اس آئینہ الہی میں حقائق منعکس نہیں ہو پاتے، جبکہ مبداء و معاد کے سلسلے میں حق کی آیات بے حد و حساب اور واضح و آشکار ہیں۔

لہذا بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ سب سے پہلے مرحلے میں برے اعمال انسان کے نفس میں نقش اور صورتیں ایجاد کرتے ہیں، دوسرے مرحلے پر یہ نقش اور صورتیں حق کے ادراک سے مانع ہو جاتے ہیں، تیسرے مرحلے پر انسانی روح اپنی اصل طبیعت کے پیش نظر، جو کہ صفا اور جلا کی حامل ہوتی ہے، حقیقت کو جیسا کہ ہے، اسی طرح درک کرتی ہے اور حق و باطل کے درمیان جدائی ڈالتی ہے اور تقویٰ کو فوج اور بے تقویٰ سے جدا کرتی ہے۔ جیسا کہ سورہ شمس کی ساتویں اور آٹھویں آیت میں مذکور ہے کہ: ”ونفس و ما سواها فالہمها فجورھا و تقواھا“ یعنی قسم ہے انسانی روح کی اور اس کی جس نے اسے پیدا کیا ہے اور پھر اسے فوج اور تقویٰ کا الہام کیا ہے۔ [۱]

بعض دوسرے مفسرین نے اس بارے میں ایک اور تحلیل پیش کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

”جب انسان کچھ اعمال کا تکرار کرتا ہے تو بالترتیب اس کے اندر ملکہ نفسانی پیدا ہو جاتا ہے جیسے لکھنا، پڑھنا وغیرہ کیونکہ ابتداء میں تو انسان بڑی مشکل سے اسے انجام دیتا ہے لیکن تکرار اور مشق کرنے سے اس پر یوں مسلط ہو جاتا ہے جیسے کسی قسم کے مطالعہ اور غور و فکر کی ضرورت محسوس کیے بغیر اسے انجام دیتا ہے۔“

”گناہوں کی بھی یہی صورت حال ہے۔ جب پے در پے انسان گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے دل میں گناہ کا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے اور سب کو معلوم ہے کہ گناہ کی حقیقت اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ وہ اسے غیر اللہ کے ساتھ مشغول کر دیتا ہے جبکہ غیر اللہ کی طرف توجہ ظلمت اور تاریکی ہے اور جب اس قسم کی ظلمتیں یکے بعد دیگرے دل پر غالب آ جاتی ہیں تو اس سے پہلی شفافیت کو سلب کر لیتی ہیں۔ ان ظلمتوں کے کئی مراتب و مراحل ہیں۔ پہلے مرحلے میں ”رین“ یا زنگ ہے، دوسرے میں ”طبع“ (مہر لگانا) ہے اور ان سے بالاتر مرحلہ ”اقفال“ (تالوں) کا ہے۔“

آیات کی دوسری قسم ان منافقین کی کیفیت بیان کر رہی ہے جو ایمان کے جھوٹے دعوے کرتے تھے اور جب جہاد کی آیات نازل ہوتی تھیں تو وہ بیمار دل لوگ ایسی حالت اختیار کر لیتے جیسے انہیں ابھی موت آیا ہی چاہتی ہے اور ان کی روح ابھی قبض ہو ہی چاہتی ہے۔ قرآن مجید انہیں کہتا ہے ”اگر تم نے اپنی مخالفت جاری رکھی، خدا کے فرمان اور اس کی کتاب پر عمل درآمد سے روگردانی کرتے رہے، تو تم سے اس کے سوا اور کوئی توقع نہیں کی جائے گی کہ تم زمین میں فساد برپا کرو، حتیٰ کہ تم قریب ترین رشتہ داروں پر رحم نہ کرو۔ پھر فرماتا ہے: ”خدا نے ایسے لوگوں پر (ان کے اپنے گناہوں کے جرم میں) لعنت کی ہے اور ان کی دیکھنے اور سننے کی طاقت سلب کر لی ہے، ان کی آنکھیں اندھی اور کان بہرے ہیں،



وہ حق کے چہرے کو دیکھ نہیں سکتے اور حق کی آواز کو سن نہیں سکتے۔“

یہ آیات بھی جہاں ایک طرف یہ بتا رہی ہیں کہ نفاق دل و جان پر ایک حجاب ہے تو وہاں دوسری طرف پر بھی بتا رہی ہیں کہ گناہ، خاص کر ”فساد فی الارض“، ”قطع رحمی“ اور ”ظلم و ستم“ بھی انسان کے ادراک اور تشخیص پر ضرور اثر ڈالتے ہیں۔

”ان تولیتہم“ کے جملہ کی بعض مفسرین نے ”روگردانی“ کے معنی میں تفسیر کی ہے اور بعض دوسرے حضرات نے ولایت اور حکومت حاصل کرنے کے معنی میں۔ یعنی اگر کسی دن حکومت تمہارے ہاتھ آجائے تو تم زمین میں فساد برپا کر دو، لوگوں کا خون بہا دو اور قطع رحمی سے کام لینے لگو۔<sup>[۱]</sup> اسی لیے حضرت علی علیہ السلام سے ایک روایت میں آیا ہے کہ ”یہ آیت بنی امیہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے“<sup>[۲]</sup> جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب انہوں نے حکومت کی باگ دوڑ سنبھالی، نہ تو چھوٹوں پر رحم کیا اور نہ ہی بڑوں پر۔ حتیٰ کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو بھی خاک و خون میں غلطاں کر دیا۔

لیکن ”تولی“ خواہ جہاد سے روگردانی کے معنی میں ہو خواہ منصب حکومت کو پانے اور ظلم و فساد کے ارتکاب کے معنی میں، ہماری بحث پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ دونوں حالتوں میں ثابت ہوتا ہے کہ ”گناہ، دلوں کے پردے ہیں۔“

تیسری آیت میں ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو گذشتہ لوگوں کے وارث ٹھہرے ہیں لیکن ان کے انجام سے کوئی عبرت حاصل نہیں کی۔ ارشاد ہوتا ہے ”اگر ہم چاہیں تو انہیں ان کے گناہوں کی بدولت سزا دیں اور عذاب میں مبتلا کر دیں، ان کے دلوں پر مہر لگا دیں اور انکے سننے والے کان ان سے لے لیں۔“

گناہوں کی سزا کے ساتھ دلوں اور کانوں پر مہر لگانے کا تذکرہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان گہرا رابطہ ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر ہم چاہیں تو انہیں ان دو عذابوں میں سے کسی ایک میں مبتلا کر دیں گے۔ گناہوں کی وجہ سے ہم یا تو انہیں تباہ و برباد کر دیں گے یا پھر انہیں زندہ رکھ کر ان کے حق و باطل کی تشخیص کی حس سلب کر لیں گے اور یہ ایسی سزا ہے جو تباہی و بربادی اور خدا کے دوسرے عذابوں سے زیادہ دردناک ہے۔

لیکن اگر ”اصبناھم“ جو کہ فعل ماضی کی صورت میں ہے اور ”نطبع علی قلوبہم“ جو فعل مضارع کی صورت میں ہے، پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دوسرا جملہ ایک مستقبل حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا پہلا جملہ پر عطف نہیں ہے۔ تو پھر ایسی صورت آیت کا معنی یہ ہوگا ”ہم

[۱] تفسیر روح المعانی، تفسیر مجمع البیان اور تفسیر المیزان، انہی آیات کی بحث میں دونوں تفسیریں بیان ہوئی ہیں۔

[۲] تفسیر نور الثقلین، جلد ۵، ص ۴۰ حدیث ۵۹

ہر حالت میں ان کے دلوں پر مہر لگا دیں گے اور ان پر حجاب ڈال دیں گے، (خواہ ان کو عذاب دینے میں جلدی کریں یا نہ کریں)۔ [۱]

اسی سلسلے کی چوتھی اور آخری آیت میں ان لوگوں کے انجام کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جو برے اعمال کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے ”آخر کار انہوں نے آیات الہی کو جھٹلایا اور ان کا مذاق اڑایا“ جو کہ کفر کا بالاترین مرحلہ ہے۔

ایسا کیوں نہ ہو جبکہ گناہ کوڑھ کی بیماری کی طرح انسان کی جان لے لیتا ہے اور اس کے ایمان کو بالترتیب برباد کر دیتا ہے، اس کے دل و جان پر پردے ڈال دیتا ہے اور اسے اندھا اور بہرا بنا دیتا ہے، وہ صرف ایمان ہی نہیں لاتا بلکہ اپنے کفر پر فخر بھی کرتا ہے۔ تاریخ اس قسم کے لوگوں سے بھری پڑی ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ قرآن مجید کی مختلف آیات گناہوں اور معاصی کو معرفت کا ایک بڑا مانع بتلاتی ہیں۔ یہ ایسی حقیقت ہے جو درک کی جاسکتی ہے اور بہت سے لوگوں کے لیے قابل لمس ہے اور وہ اس کا تجربہ بھی کر چکے ہیں۔ کیونکہ جب کوئی گناہ ان سے سرزد ہوتا ہے تو ان کے دل میں ایک خاص قسم کی تاریکی پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے برعکس نیکی اور تقویٰ کی طرف رجحان کے وقت وہ ایک قسم کی روشنی اور معرفت کے لیے بہتر آمادگی محسوس کرتے ہیں۔

## تشریح

### روایات کی رو سے گناہ کا حجاب ہونا

یہ حقیقت وسیع طور پر اسلامی روایات میں توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے جن میں سے چند ایک روایات کو بطور نمونہ ہم پیش کر رہے ہیں:

۱۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں آیا ہے:

”ان العبد اذا اخطأ خطیئة نکتت فی قلبه نکتة سوداء فاذا هو نزع و استغفر الله و تاب صقل قلبه فان اعاد زید فیها حتی تعلق علی قلبه، و هو الران (الرين) الذی ذکر الله فی کتابہ، کلا بل ران علی قلوبہم ما کانوا یکسبون“

”جب انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نقطہ ظاہر ہو جاتا ہے، اگر تو اس نے اس گناہ سے

[۱] یہ تفسیر ایک احتمال کی صورت میں انہی آیات کی تفسیر کے ضمن میں فخر الدین رازی کی تفسیر کبیر میں بیان ہوئی ہے، جبکہ تفسیر المیزان میں اس جملہ کو ”اصبنا“ پر عطف کیا گیا ہے جس کا مستقبل کا معنی کیا گیا ہے۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

رکنے کا قصد کر لیا اور توبہ کر لی تو اس کا دل صیقل ہو جاتا ہے اور نقطہ مٹ جاتا ہے۔ لیکن اگر اس نے پھر اس کا ارتکاب کیا تو وہ سیاہ نقطہ بڑھ جاتا ہے اور بار بار کے گناہوں سے اس کا تمام دل سیاہ ہو جاتا ہے اور یہ وہی زنگ ہے جس کے متعلق خداوند عالم نے اپنی کتاب میں یہ فرمایا ہے: ”کلاب ران علی قلوبہم ما کانوا یکسبون۔“ [۱]

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ:

”کان ابی یقول ما من شیء افسد للقلب من خطیئة ان القلب لیواقع

الخطیئة فما تزال بہ حتی تغلب علیہ فیصیر اعلاہ اسفلہ“

”میرے والد گرامی فرمایا کرتے تھے کہ گناہوں سے بڑھ کر کوئی چیز ایسی نہیں جو دل کو فاسد کر دیتی ہو۔ دل گناہوں کا اثر قبول کرتا ہے اور گناہ اس میں تدریجی طور پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں اور ایک نہ ایک دن اس پر

غالب آجاتے ہیں۔ اس وقت دل الٹا ہو جاتا ہے اور اس کے اوپر کا حصہ نیچے آ جاتا ہے۔“ [۲]

ظاہری بات ہے کہ قلب کے الٹا ہونے سے مراد انسان کی حس تشخیص کی دگرگونی ہے، یعنی انسان گناہوں سے اس قدر مانوس ہو جاتا ہے کہ اس کے نزدیک اچھائیاں برائیاں بن جاتی ہیں اور برائیاں اچھائیوں میں تبدیل ہو جاتی ہے اور یہ انسانی زندگی کا زبردست خطرناک مرحلہ ہے۔

۳۔ ایک اور حدیث میں آپ ہی سے روایت ہے:

”اذا اذنب الرجل خرج فی قلبہ نکتۃ سوداء فان تاب انمحت، وان زاد

زادت حتی تغلب علی قلبہ فلا یفلح بعدها ابدا“

”جب انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو ایک سیاہ نقطہ اس کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر توبہ کر لے تو وہ نقطہ مٹ جاتا ہے اور اگر گناہ میں اضافہ کرتا ہے تو اس کے تمام دل کو گھیر لیتا ہے اور اس کے بعد وہ ہرگز نجات نہیں پاسکتا۔“ [۳]

واضح ہے کہ نجات اور فلاح کی سب سے پہلی شرط حقائق کا ادراک ہے۔ جس شخص کا قلب یعنی اس کی عقل بیکار ہو جائے تو وہ کیونکر

[۱] تفسیر قرطبی، جلد ۱۰، ص ۱۰۵۰۔ روح المعانی، جلد ۳۰، ص ۷۳۔ تفسیر فخر رازی جلد ۳۱، ص ۹۴

[۲] اصول کافی، جلد ۲، باب الذنوب، حدیث ۱

[۳] اصول کافی، جلد ۲، باب الذنوب، حدیث ۱۳

سعادت مند اور کامیاب ہو سکتا ہے؟

یہی مفہوم حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے بھی بیان ہوا ہے جو آنجناب سے ”کلاب ران علی قلوبہم...“ کی تفسیر کے سلسلے میں منقول ہے۔ اس میں دو نقطوں کا ذکر ایک سفید نقطہ اور ایک سیاہ نقطہ، یعنی گناہ کی وجہ سے سیاہ نقطہ، سفید نقطہ پر غالب آجاتا ہے اور اسے ڈھانپ دیتا ہے۔ [۱]

۴۔ ایک اور حدیث میں سرکاری رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

”کثیرۃ الذنوب مفسدۃ للقلب“

”گناہوں کی کثرت انسان کے قلب (عقل) کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔“ [۲]

۵۔ کتاب الخصال میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ہے:

”اربع خصال یمتن اقلب، الذنب علی الذنب.....“

”چار ایسی خصلتیں ہیں جو دل کو مردہ کر دیتی ہیں: ایک گناہ کے بعد دوسرا گناہ.....“ [۳]

اسی لیے دل پر چھا جانے والے گناہوں کے آثار کو دور کرنے کے لیے توبہ کے علاوہ یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ دینی راہنماؤں کے فرامین کا مطالعہ کیا جائے جیسا کہ تفسیر نور الثقلین میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

”تذاکروا وتلاقوا وتحدوا فان الحدیث جلاء للقلوب، ان القلوب

لترین کمایرین السیف، وجلائه الحدیث“

”ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو کیا کرو، اپنے دینی بھائیوں سے ملاقات کیا کرو اور (دینی راہنماؤں کی) حدیثوں

کو بیان کیا کرو، کیونکہ حدیث دلوں کو جلا عطا کرتی ہے، اس لیے کہ جس طرح تلوار پر زنگ چڑھ جاتا ہے اسی

طرح دلوں پر زنگ بیٹھ جاتا ہے، جس کو حدیث ہی صیقل کرتی ہے۔“ [۴]

۶۔ حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام ایک خطبے کے ضمن میں ان لوگوں کی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو دل کے مریض ہیں، ارشاد فرماتے ہیں:

[۱] ایضاً۔ حدیث ۲۰۔ مجمع البحرین میں ”رین“ کا مادہ بھی اسی چیز کو بیان کر رہا ہے

[۲] تفسیر درمنثور، جلد ۶ ص ۳۲۶

[۳] الخصال جلد ۱ ص ۲۵۲ حدیث ۱۶۵ سی سے ملتی جلتی روایت درمنثور جلد ۶ ص ۳۲۶ میں بھی ہے۔

[۴] نور الثقلین جلد ۵ ص ۵۳۱ حدیث ۲۳۔ نوح البلاغہ خطبہ ۱۰۳

”قد خرقت الشهوات عقله و امانت الدنيا قلبه و ولهت عليها نفسه

فهو عبد لها“

”خواہشات نفسانی نے اس کی عقل کو پھاڑ دیا ہے، دنیا نے اس کے دل کو مردہ کر دیا ہے اور اس کا نفس

والہانہ طور پر دنیا کا دلدادہ ہو گیا ہے اور وہ اس (دنیا) کا غلام بن چکا ہے۔“<sup>[۱]</sup>

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

”اذا اظهر العلم و احترز العمل و ائتلفت الالسن و اختلف القلوب و

تقاطعت الاحرام هنالك لعنهم الله فاصمهم و اعمى ابصارهم“

”جب علم واضح طور پر آشکار ہو جائے گا اور عمل سے کنارہ کشی کی جائے گی، زبانیں متحد لیکن دلوں میں اختلاف

ہوگا، رشتہ داروں سے قطع رحمی کی جائے گی، تو اس وقت خداوند عالم انہیں لعنت کرے گا اور اندھا اور بہرا بنا دے

گا۔“<sup>[۲]</sup>

۸ اس چیز کی بعض گناہوں کے بارے میں مزید وضاحت کی گئی ہے جیسا کہ حضرت علیٰ ان لوگوں کے بارے میں فرماتے ہیں جو جہاد کو

ترک کرتے ہیں:

”البسه الله ثوب الذل... و ضرب على قلبه بالاسهاب و ادليل الحق منه

تبضيع الجهاد“

”خداوند عالم ان کے بدن پر ذلت کا لباس پہنائے گا اور ان کی عقل و فہم تباہ ہو جائے گی اور جہاد کو ضائع کر دینے

کے سبب ان کا حق پامال کر دیا جائے گا۔“<sup>[۳]</sup>

[۱] نوح البلاغہ، خطبہ ۱۰۳

[۲] نور الثقلین، جلد ۵ ص ۴۱ حدیث ۶۳

[۳] نوح البلاغہ، خطبہ ۲۷

## ۱۲۔ کفر اور روگردانی کا حجاب

سب سے پہلے ان آیات کی تلاوت کا شرف حاصل کرتے ہیں۔

### آیات

(۱) تِلْكَ الْقُرَى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِهَا ۖ وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ ۖ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا مِنْ قَبْلُ ۖ كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِ الْكَافِرِينَ ﴿۱۰۱﴾ (سورہ اعراف ۱۰۱)

(۲) فَبِمَا نَقُضِهِمْ مِيثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِآيَاتِ اللَّهِ وَقَتْلِهِمُ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَقَوْلِهِمْ قُلُوبُنَا غُلْفٌ ۖ بَلْ طَبَعَ اللَّهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿۱۵۵﴾ (سورہ نساء ۱۵۵)

(۳) وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ فَأَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدُهُ ۖ إِنَّا جَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۖ وَإِنْ تَدْعُهُمْ إِلَى الْهُدَى فَلَنْ يَهْتَدُوا إِذًا أَبَدًا ﴿۵۴﴾ (سورہ کہف ۵۴)

(۴) ..... وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ فِي آذَانِهِمْ وَقْرٌ وَهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ۖ أُولَٰئِكَ يُعَادُونَ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ ﴿۳۳﴾ (سورہ فصلت ۳۳)

### ترجمہ

(۱) یہ ایسی آبادیاں ہیں جن کی خبریں ہم آپ سے بیان کرتے ہیں وہ (اس قدر ہٹ دھرم تھے کہ) ان کے پاس خدا کے رسول واضح نشانیاں لے کر آئے لیکن جن چیزوں کی وہ پہلے سے تکذیب کر چکے تھے وہ ان پر ایمان نہیں لائے، خداوند عالم اسی طرح کافروں کے دلوں پر مہریں لگا دیتا ہے (اور ہٹ دھرمی اور گناہ سے اصرار ان سے تشخیص کی حس سلب کر لیتے ہیں۔

(۲) چونکہ انہوں نے اپنے عہد و پیمان کو توڑ دیا اور خدائی آیات کا انکار کیا اور انبیاء کو ناحق قتل کیا اور مذاق کے طور پر کہا کہ ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں (اور ہم انبیاء کی بات کو درک نہیں کر سکتے، اسی لیے درگاہ الہی سے دھتکارے گئے ہیں)۔ جی ہاں! خدا نے ان کے کفر ہی کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ اسی لیے چند ایک لوگوں کے سوا کوئی بھی ایمان نہیں لاتے۔

(۳) اس سے بڑھ کر اور کون ظالم ہو سکتا ہے جو پروردگار کی آیات کی یاد دہانی کے وقت ان سے روگردانی کرتا ہے اور جو گناہ انجام دے چکا ہے، انہیں فراموش کر چکا ہے۔ ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں تاکہ وہ کچھ سمجھ ہی نہ سکیں اور ان کے کانوں میں سنگینی ڈال دی ہے (تاکہ حق کی آواز کو نہ سن سکیں) لہذا اگر تم انہیں ہدایت کی طرف بلاؤ تب بھی وہ ہرگز ہدایت نہیں پائیں گے۔

(۴)..... لیکن جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں سنگینی ہے اور وہ اس حد تک غلطی پر ہیں گویا وہ اندھے ہو چکے ہیں، (حق کی بات کو نہیں سنتے) ان لوگوں کی مانند ہیں جنہیں دور سے بلا یا جائے۔

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### گناہ کیونکر حجاب بن جاتا ہے؟

سب سے پہلی آیت میں پہلے تو گذشتہ اقوام کے پانچ گروہوں (قوم نوح، قوم ہود، قوم صالح، قوم لوط اور قوم شعیب) کی سرگزشت کی طرف اشارہ کرنے کے بعد بتایا کہ یہ قومیں آیات الہی کی تکذیب کی وجہ سے خدائی عذابوں میں گرفتار ہوئیں۔ پھر فرماتا ہے کہ ”یہ وہ قومیں ہیں جن کی خبریں ہم آپ کو بتا رہے ہیں۔ یہ ایسی قومیں نہیں تھیں کہ جن پر اتمام حجت نہ ہو چکی ہو، بلکہ انبیاء الہی روشن دلائل لے کر ان کے پاس آئے لیکن انہوں نے اپنی ہٹ دھرمی کی بنا پر اپنے کفر اور تکذیب پر اصرار جاری رکھا اور کفر پر ان کا یہ اصرار اس بات کا سبب بن گیا کہ خدا ان کے دلوں پر مہر لگا دے اور تشخیص کی حس ان سے سلب کر لے۔“

”و کذالک یطبع اللہ علی قلوب الکافرین“ (اسی طرح خدا کافروں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے) کا جملہ ہر کافر کی طرف اشارہ نہیں ہے کیونکہ بہت سے حق طلب افراد ایسے ہیں جو انبیاء کرام کی دعوت کو سننے سے پہلے کافر تھے، بعد میں مومنین کی صفوں سے آئے۔ لہذا اس سے مراد ایسے کافر ہیں جو اپنے کفر پر اصرار کرتے ہیں اور اپنی ہٹ دھرمی پر قائم ہیں اور یہی کفران کے درک و دید سے مانع ہوتا ہے۔ اس بات کی دلیل یہ جملہ ہے ”فما کانوا لیئومنوا بما کذبوا بہ من قبل“ کیونکہ یہ جملہ بتا رہا ہے کہ ”جن چیزوں کی یہ پہلے تکذیب کر چکے ہیں اس پر ایمان نہیں لائیں گے“، یعنی وہ اس قدر متعصب ہیں کہ قطعاً اپنی روش کو تبدیل کرنے پر آمادہ نہیں اور نہ ہی باطل کو چھوڑ کر حق کی طرف



پلٹنے کے لیے تیار ہیں۔ تفسیر المیزان میں اور فخر رازی کی تفسیر میں ہر ایک نے اس کے پانچ پانچ معانی ذکر کیے ہیں۔<sup>[۱]</sup> لیکن بظاہر اس کا مفہوم وہی ہے جو اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

دوسری آیت میں کچھ یہودیوں کی خلاف ورزیوں اور خدا کے پیغمبروں کے ساتھ ان کی دشمنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ”ہم نے بوجہ ان کی پیمان شکنی، خدائی آیات سے انکار اور انبیاء کے قتل کے ان پر لعنت کی ہے اور ان سے اپنی رحمت کو دور رکھا ہے۔ اسی طرح ان کے آیات الہی کے مذاق اڑانے کی وجہ سے بھی جب وہ کہتے تھے کہ ہمارے دل غلافوں میں ہیں اور (اے موسیٰ) ہم تمہاری کوئی بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔“

قرآن کہتا ہے یہ ٹھیک ہے کہ وہ کسی چیز کو درک نہیں کرتے اور یہ اس لیے ہے کہ خدا نے ان کے کفر کے سبب ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہاں پر کفر سے مراد وہ کفر ہے جس کے ساتھ ہٹ دھرمی ملی ہوتی ہے، وہ کفر ہے جس کے ساتھ انبیاء کے بارے میں دشمنی اور عناد ملا ہوتا ہے، وہ کفر ہے جس کے ساتھ مسلسل عہد شکنی اور آیات الہی کا مذاق ملا ہوتا ہے۔ مسلم بات ہے کہ ایسا کفر ہی حجاب ہوتا ہے اور حجاب بھی ایسا سخت جو انسان کو حقائق کے درک کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور یہ وہ چیز ہے جسے خود ان لوگوں نے اپنے لیے پسند کیا ہے اور جس کا اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

ظاہر یہ ہے کہ ”قلوبنا غلف“ (ہمارے دل غلاف میں ہیں) کے جملہ سے ان کی مراد آیات الہی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا استہزاء اور مذاق اڑانا ہے، نہ یہ کہ وہ اپنے لیے واقعی اسی طرح کا عقیدہ رکھتے تھے، نہ ہی اس بات کا اقرار کرتے تھے کہ ہم اس طرح پیدا کیے گئے ہیں کہ کسی حقیقت کو درک نہ کریں۔ (جیسا کہ بعض مفسروں نے یہی کچھ لکھا ہے)۔<sup>[۲]</sup> لیکن خدا نے ان کی ان باتوں کو حقیقت کے طور پر بیان کیا ہے اور انہیں کہا ہے: ”جی ہاں! خدا نے تمہارے دلوں پر تمہارے کفر و ہٹ دھرمی کی وجہ سے مہر لگا دی ہے اور تم کچھ نہیں سمجھتے۔“

یہ احتمال بھی ملتا ہے کہ اس جملہ سے مراد یہ ہے کہ ہمارے دل ایسے ظروف ہیں جو علم و دانش سے لبریز ہیں۔ جس طرح تلوار نیام میں ہوتی ہے اسی طرح ہم بھی علم و دانش سے سیر ہو چکے ہیں۔ اب ہمیں کسی اور علم و دانش کی ضرورت نہیں ہے۔<sup>[۳]</sup> لیکن یہ احتمال بھی بہت ہی بعید معلوم ہوتا ہے۔

اس طرح سے آیت کی تفسیر میں تین احتمال مذکور ہیں جن میں سے زیادہ مناسب وہی پہلا معنی ہے۔ بعض تفاسیر میں اس موقع پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک روایت نقل کی گئی ہے جو نہایت ہی بامقصد اور پر معنی ہے۔ فرماتے ہیں:

[۱] تفسیر المیزان، جلد ۸ ص ۲۱۵ و تفسیر فخر رازی، جلد ۱۳ ص ۱۸۶

[۲] تفسیر المیزان، جلد ۵ ص ۱۳۸ اور تفسیر قرطبی، جلد ۳ ص ۲۰۰۴

[۳] یہ احتمال تفسیر فخر الدین رازی، جلد ۱۱ ص ۸۷، تفسیر قرطبی، جلد ۳ ص ۲۰۰۴ اور تفسیر روح المعانی، جلد ۶ ص ۸ میں ذکر ہوا ہے۔

«الطباع معلق بقائمة العرش فاذا انتهكت الحرمة و عمل بالمعاصی و

اجتری علی اللہ تعالیٰ بعث اللہ تعالیٰ الطابع فطبع علی قلبه فلا یعقل

بعد ذالک شیاء»

”خداوند عالم کی مہرستون عرش کے ساتھ لٹکی ہوئی ہے۔ جب کسی قسم کی ہتک حرمت ہوتی ہے، یا گناہوں پر عمل ہوتا ہے، یا خدا کے مقابلے میں جرأت اور دیدہ دلیری سے کام لیا جاتا ہے تو خداوند عالم مہر لگانے والے کو بھیج دیتے ہیں کہ وہ اس مہر کے ساتھ اس شخص کے دل پر مہر لگا دیتا ہے اور وہ اس کے بعد کسی چیز کا ادراک نہیں کر

پاتا۔“ [۱]

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ”طابع“ (بروزن قابل) کے معنی ہیں مہر لگانے والا اور ”طالع“ (بروزن آمد) کے معنی ہیں خود مہر اور معلوم ہوتا ہے کہ حدیث بالا میں پہلا لفظ ”باء کی زیر“ اور دوسرا لفظ ”باء کی زیر“ کے ساتھ ہے۔ یہ حدیث ایک بار پھر اس حقیقت کو واضح طور پر ثابت کر رہی ہے کہ اس موضوع میں ”جبر“ کا کسی قسم کا تعلق نہیں ہے بلکہ دل کے حجاب، خود انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

اسی سلسلے کی تیسری آیت میں تقریری استفہام کی صورت میں فرماتا ہے ”آیا اس شخص سے بڑھ کر کوئی اور بھی ظالم ہو سکتا ہے جو خدا کی آیات کو سن کر روگردانی کرتا ہے اور اپنے گناہوں کو فراموش کر دیتا ہے؟ ایسے فراموش کرنے والے ہٹ دھرم قسم کے لوگ جو اپنے کفر، انکار اور تکذیب پر اصرار کرتے ہیں، ہم ان کے دلوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں تاکہ وہ کچھ نہ سمجھیں اور ایمان کے فیض و سعادت سے محروم ہو جائیں۔ ہم ان کے کانوں کو حق کی آواز سننے سے محروم کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جس طرف کو بھی بلائے جائیں ہرگز ہدایت نہیں پائیں گے۔“ اور یہ کہ قرآن نے ایسے لوگوں کو ظالم ترین لوگ کہا ہے، جس کی دلیل واضح ہے، کیونکہ ایسے لوگ خود پر بھی ظلم کرتے ہیں اور دوسرے افراد پر بھی اور ساتھ ہی وہ خداوند متعال اور اس کے دین کے معاملے میں بھی ظالم ہیں۔ بنا بریں مذکورہ آیت نہ صرف جبر پر ہی دلالت نہیں کرتی بلکہ اختیار پر بھی دلالت کر رہی ہے۔

ایک اور دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ فخر رازی جو خود بھی مسلک جبر کے حامی ہیں، جب اس آیت پر پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں ”اس آیت کی انتہا ”جبر“ کے حامیوں کے لیے دلیل ہے جبکہ اس کی ابتداء اختیار کے حامیوں کے لیے“ پھر کہتے ہیں ”ہمیں قرآن میں بہت کم ہی کوئی ایسی آیت ملے گی جو ان دونوں گروہوں میں سے کسی ایک کے حق میں ہو مگر یہ کہ اس کے ساتھ ہی ایک اور آیت ہے جو دوسرے گروہ کے حق میں ہے اور تجربہ ہماری گفتار کی صداقت کا گواہ ہے اور خدا کی طرف سے یہ بندوں کے لیے ایک بہت بڑا امتحان ہے تاکہ خداوند عالم اس طرح سے علمائے

راستخون فی العلم کو مقلدین سے ممتاز کرے۔“ [۱] کیسا عجیب اعتراف ہے۔

ہمیں فخر رازی صاحب کی گفتگو پر جس چیز کا اضافہ کرنا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی آیات کو ایک دوسری سے جدا کر کے قطعاً زیر توجہ نہیں لانا چاہئے، چہ جائیکہ ایک آیت کے ابتدائی حصے کو اس کے انتہائی حصے سے جدا کر کے!! اور اگر ہم اس آیت کی ابتدا اور انتہا کو باہم ملا کر توجہ کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ مجموعی طور پر تاکید ہے ”اختیار“ کے مسئلہ کی۔ کیونکہ آیت کا آغاز کہتا ہے کہ آیات الہی سے روگردانی اور گناہوں کی بجا آوری خود انسان کا فعل ہے اور انسان ہی اپنے افعال کا باختیار فاعل ہے، جبکہ آیت کی انتہا کہتی ہے کہ خداوند عالم ان لوگوں کو سزا دیتا ہے جو اسی موقف پر ڈٹے ہوئے ہیں اور خدا کی سزا ان کے دلوں پر پردہ ڈالنا ہے۔

بالفاظ دیگر خداوند عالم نے ان گناہوں میں ایسا اثر پیدا کر دیا ہے کہ وہ دل کی شفافیت اور تصفہ کو ختم کر دیتے ہیں اور انسان سے تشخص کی قدرت سلب کر لیتے ہیں۔ تو یہ چیز جبر کی دلیل کہاں سے بن گئی؟ یعنی اگر ہر ایک قاتل چیز ہے اور انسان جان بوجھ کر اسے استعمال کرتا ہے تو وہ جو اثر دکھائے گی کیا اس کے اثر کو جبر سے موسوم کریں گے؟

زیر بحث آیات میں سے آخری آیت میں بہانہ جو اور ہٹ دھرم قسم کے لوگوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو کبھی کبھی یہ کہہ دیتے تھے کہ قرآن عجمی زبان میں نازل کیوں نہیں ہوتا کہ ہمیں اس سے زیادہ سے زیادہ کا قائل ہونا پڑے اور اس کا فائدہ صرف عربوں ہی کے لیے نہ ہو۔ (شاید ان کی غرض یہ ہو کہ عوام الناس اس سے کچھ نہ سمجھ سکیں اور اس کی طرف رغبت نہ کر سکیں)۔

قرآن مجید آیت کے آغاز میں ان کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے ”ولو جعلناہ قرآنا عجمیا لقالوا لولا فصلت آیات“ یعنی اگر ہم قرآن کو عجمی بنا دیتے تو یقیناً وہ لوگ کہتے کہ اس کی آیات واضح کیوں نہیں ہیں؟ اور پھر کہتے ”اعجمی و عربی“ یعنی آیا عجمی قرآن عربی پیغمبر (سے ٹھیک بات ہے)؟!؟

پھر خداوند عالم اپنے پیغمبر کو حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے ”کہہ دیجئے کہ یہ ان لوگوں کے لیے شفا اور ہدایت کا موجب ہے جو ایمان لاتے ہیں، لیکن ہٹ دھرم افراد جو ایمان نہ لانے پر اصرار کرتے ہیں ان کے کانوں میں سنگینی ہے اور وہ حق کو نہیں سنتے، گویا انہی دور دراز سے پکارا جاتا ہے لیکن وہ صرف آواز کے زمرے کو ہی سنتے ہیں اور کوئی مطلب انہیں حاصل نہیں ہوتا۔“

یہ آیت بھی بخوبی واضح کر رہی ہے کہ بہانہ تراشی، ہٹ دھرمی اور کفر پر اصرار انسان کے دل کے کانوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں اور اس

[۱] تفسیر فخر رازی، جلد ۲۱، ص ۱۴۲۔ عجیب بات یہ ہے کہ جب ”آلوسی“ نے اپنی تفسیر ”روح المعانی“ میں اس جملے کو نقل کیا ہے تو لکھا ہے کہ فخر رازی کہتے ہیں یہ آیت عقیدہ جبر کے قائل لوگوں کے دلائل میں سے ایک دلیل ہے اور اس سے پہلی آیت عقیدہ اختیار کے قائل حضرات کے لیے دلیل ہے۔ تفسیر المیزان میں بھی یہی چیز تفسیر روح المعانی سے نقل کی گئی ہے جبکہ خود فخر رازی کہتے ہیں کہ ایک آیت کی ابتداء اور انتہا۔ (خوب غور کیجیے گا)۔

سے دل کی بینائی کو سلب کر لیتے ہیں۔ [۱]

## ۱۳۔ تجاوز اور سرکشی کا پردہ

ارشاد ہوتا ہے:

### آیات

(۱) ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِ رُسُلًا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ فَجَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا بِهِ مِنْ قَبْلُ ۗ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلَىٰ قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۴۳﴾  
(یونس ۴۳)

### ترجمہ

(۱) پھر ہم نے اس کے (نوحؑ کے) بعد کچھ رسولوں کو ان کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ واضح دلائل لے کر ان کے پاس آ گئے، لیکن وہ جس چیز کی اس سے پہلے تکذیب کر چکے تھے اس پر ایمان نہ لائے، ہم اسی طرح حد سے تجاوز کرنے والے لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں۔

## آیت کی تفسیر اور اس کا نتیجہ

سورہ یونس میں اس آیت سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی سرگزشت کو بیان کیا گیا ہے کہ وہ اپنی قوم میں تبلیغ و ہدایت کے لیے مبعوث کیے گئے، لیکن اس قوم نے ان کو جھٹلایا اور خداوند قدیر نے اس سرکش قوم کو طوفان کے ذریعہ ہلاک کر دیا اور جو مومنین جناب نوح علیہ السلام کے ساتھ تھے، انہیں کشتی کے ذریعہ نجات دی اور زمین کا وارث ٹھہرایا۔

اس کے بعد فرماتا ہے ”نوحؑ کے بعد ہم نے کچھ رسولوں کو ان کی قوم کی طرف بھیجا، ہر رسول اپنی قوم کی طرف آیا اور معجزات،

[۱] ”وہو علیہم عمی“ کے بعض مفسرین نے یہ معنی کیے ہیں کہ ”قرآن اس گروہ کی نایبنائی کا سبب بن جاتا ہے“ جبکہ ”لسان العرب“ میں ”ابن منظور“ نے اور ”مفردات“ میں ”راغب“ نے اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ ”عمی علیہ“ کا معنی ”اشتبہ علیہ حتی صاء کالاعمی“ ہے یعنی مطلب ان پر اس طرح مشتبہ ہو چکا ہے گویا وہ اندھے ہو چکے ہیں۔ (غور کیجیے گا)۔

روشن اور منطقی دلائل اور وہ دین جو سراسر حقیقت پر مبنی ہے، اس کے پاس لایا۔ لیکن قوم نے سر تسلیم خم نہ کیا اور اسی طرح اپنی سابقہ تکذیب پر بھی ڈٹے رہے۔“

آیت کے آخر میں جو ہماری بات کا شاہد ہے فرماتا ہے ”اسی طرح ہم حد سے تجاوز کرنے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں“ (کذالک نطبع علی قلوب المعتدین)۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حد سے تجاوز اور سرکشی دل پر پردے ڈال دیتی ہے اور ساتھ ہی مہر بھی لگا دیتی ہے۔ یعنی انسان جس قدر بھی آیات الہی کو دیکھتا ہے حق کو باطل سے جدا نہیں کر سکتا۔

خدا کی یہ مہر جو اس سرکش قوم کے دلوں پر لگتی ہے ممکن ہے خدائی سزا کی حامل بھی ہو اور تجاوز کے آثار میں سے کسی ایک اثر کی حامل بھی اور یہاں پر تجاوز سے مراد حق سے سرکشی اور عصیان و گناہ اور رسولوں سے دشمنی کا تسلسل ہے۔

”فما كانوا ليومنوا بما كذبوا“ (وہ لوگ اس سے پہلے جس چیز کو جھٹلا چکے تھے اس پر ایمان نہیں لائیں گے) کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سب سے پہلے کچھ انبیاء ان لوگوں کے پاس آئے، لیکن ان لوگوں نے انہیں جھٹلایا۔ پھر کچھ اور انبیاء ان کے پاس آئے اور واضح دلائل بھی اپنے ساتھ لائے، پھر بھی ان پر ایمان نہ لائے اور یہ اس لیے ہے کیونکہ عناد اور ہٹ دھرمی نے ان کی عقلوں پر پردے ڈال دیئے تھے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ جھٹلانے والوں سے مراد وہی قوم نوح ہی ہے جو طوفان میں ہلاک ہو گئی تھی اور ان لوگوں سے مراد جو ایمان نہیں لائے وہ لوگ ہیں جو اس ہلاک شدہ قوم کے بعد پیدا ہوئے لیکن نوح علیہ السلام کی سرکش قوم کے نقش قدم پر چلے۔<sup>[۱]</sup> (لیکن اس تفسیر سے یہ لازم آتا ہے کہ ”کذبوا“ اور ”لیومنونوا“ میں ضمیر کے مرجع مختلف ہوں اور یہ بعید معلوم ہوتا ہے۔ بنا بریں بہتر تفسیر وہی پہلی تفسیر ہی ہے)۔

یہ احتمال بھی ملتا ہے کہ اس سے مراد وہ قومیں ہیں جو نوح علیہ السلام کے بعد پیدا ہوئیں اور ان کے سامنے گزشتہ انبیاء کی دعوت کے حقائق بیان کیے گئے لیکن انہوں نے ان حقائق کو جھٹلا دیا، پھر انبیاء کرام علیہم السلام واضح معجزے اور دلائل لے کر آئے۔ پھر بھی انہوں نے انہیں جھٹلایا تو گویا پہلی تکذیب کا تعلق ان چیزوں کے ساتھ ہے جو بیان کی صورت میں ان تک پہنچیں اور دوسری تکذیب کا تعلق ان چیزوں سے ہے جو انہوں نے بذات خود انبیاء علیہم السلام سے دیکھیں۔<sup>[۲]</sup>

یہ تفسیر بھی مناسب معلوم ہوتی ہے اور دونوں تفسیروں کو جمع کرنا بھی بعید نہیں ہے۔

[۱] تفسیر مجمع البیان، جلد ۵ ص ۱۲۵

[۲] تفسیر روح المعانی، جلد ۱۱، ص ۱۴۳

## ۱۴۔ سطحی نگاہ اور تدبر سے کام نہ لینے کا پردہ

ارشاد ہوتا ہے:

آیات

(۱) وَيَدْعُ الْإِنْسَانَ بِالذِّمِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ ط وَكَانَ الْإِنْسَانُ حَسْبُولًا ۝ (سورہ

بنی اسرائیل ۱۱)

(۲) أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا ۝ (سورہ محمد ۲۴)

ترجمہ

(۱) اور انسان (اپنی جلد بازی کی وجہ سے) برائیوں کی طرف جاتا ہے جبکہ وہ نیکیوں کو طلب کر رہا ہوتا ہے۔

(۲) آیا وہ لوگ قرآن میں غور و فکر سے کام نہیں لیتے یا ان کے دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں؟

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

سب سے پہلی آیت میں کافروں کی بے ایمانی کی اہم علتوں میں سے ایک علت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو امور میں اچھی طرح مطالعہ نہ کرنے اور پوری طرح غور و فکر اور سوچ بچار سے کام نہ لینے کی وجہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ”وہ لوگ جلد بازی اور عجلت کے ساتھ سوچے سمجھے اور معاملات میں غور و فکر کیے بغیر برائیوں کے پیچھے ایسے دوڑتے رہتے جیسے اچھائیوں اور سعادتوں کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ وہ ہلاکتوں اور تباہیوں کی جانب ایسے لپکتے ہیں جیسے کسی امن و امان کی جگہ جارہے ہوں، ننگ اور ذلت کے مقامات کی جانب یوں پیش قدمی کرتے ہیں جیسے قابل فخر جگہ کی طرف جارہے ہوں۔“

یعنی جلد بازی، سطحی مطالعہ اور غور و فکر سے کام نہ لینے نے ان کے دلوں اور ادراک و بصیرت پر ایسے پردے ڈال دیئے ہیں کہ وہ بدی کو نیکی اور شقاوت کو سعادت اور گمراہی کو صراطِ مستقیم سمجھنے لگے ہیں۔

تفسیر المیزان میں ہے کہ انسان کے جلد باز ہونے سے یہ مراد ہے کہ جب بھی وہ کسی چیز کو طلب کرتا ہے تو وہ اس کے پیچھے آرام اور سکون کے ساتھ نہیں جاتا اور اس کے نفع و نقصان کے پہلوؤں پر اچھی طرح غور و فکر نہیں کرتا تا کہ خیر کے تمام پہلو اس کے سامنے آجائیں اور وہ اسے حاصل کرے۔ بلکہ جو نہی کسی چیز نے اس کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کیا، بغیر سوچے سمجھے، اس کے پیچھے لگ گیا اور اکثر اوقات ایسا ہوتا

ہے کہ وہ چیز اس کے لیے شر ہی شر ہوتی ہے اور اس سے اس کو نقصان پہنچتا ہے۔ جلد باز انسان خیر اور شر کے درمیان فرق پیدا نہیں کر سکتا اور باطل کے پیچھے ایسے دوڑتا جیسے وہ حق کے پیچھے دوڑ رہا ہو۔<sup>[۱]</sup>

یہاں پر ”یدع“ (پکارتا ہے) سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہر قسم کی طلب ہے، خواہ دعا کے لفظ کے ساتھ ہو یعنی خدا سے طلب کرے یا عملی طور پر اس کے پیچھے جائے کیونکہ ان سب کو دعا کہا جاتا ہے۔<sup>[۲]</sup>

لیکن بعض تفسیروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہی مشہور معنی دعا کرنا اور خدا سے درخواست کرنا ہے۔ اسی لیے تو اس آیت کی شان نزول کے بارے میں بھی یہی کہتے ہیں کہ یہ آیت عرب کے مشہور مشرکین میں سے ایک مشرک ”نضر بن حارث“ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جب اس نے یہ کہا تھا ”اللھم ان کان هذا هو الحق فامطر علینا حجارة من السماء“ (بارا لہا! محمدؐ جو کچھ کہتا ہے اگر ہو حق ہے اور تیری ہی طرف سے ہے تو آسمان سے ہمارے سروں پر پتھر برسائے) (انفال ۳۲)۔ چنانچہ اس کی یہ دعا قبول ہوئی اور وہ ہلاک ہو گیا۔<sup>[۳]</sup> مرحوم طبرسی نے بھی مجمع البیان میں دونوں تفسیروں کو ذکر کیا ہے اور ظاہری طور پر آیت کا مفہوم وسیع ہے اور دونوں تفسیروں کو شامل ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

”واعرف طریق نجاتك و هلاکك، کیلاتدعوا اللہ بشی فیہ هلاکک وان

تظن ان فیہ نجاتك، قال اللہ تعالیٰ و یدع الانسان بالشر دعائہ بالخیر و

کان الانسان عجولاً“

”تو اپنی نجات اور ہلاکت کو (اچھی طرح اور مکمل طور پر) جان لے، کہیں ایسا نہ ہو کہ خدا سے ایسی چیز طلب

کرے جس میں تیری ہلاکت ہو، جبکہ تو یہ سمجھتا ہوگا کہ وہ تیری نجات کا ذریعہ ہے۔ خداوند متعال فرماتا ہے:

انسان شر کو بھی اسی طرح مانگتا ہے جس طرح خیر کو طلب کرتا ہے اور انسان جلد باز ہی ہے۔“<sup>[۴]</sup>

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو اس طرح نصیحت کی:

[۱] المیزان جلد ۱۳، ص ۵۱ (اختصار کے ساتھ)

[۲] المیزان، جلد ۱۳، ص ۵۰ (چونکہ ”بالشر“ اور ”بالخیر“ میں ”باء“ صلہ کی ہے لہذا اس کا معنی یہ ہوگا ”یدع الشر کہ عائذ الخیر“ یعنی وہ شر بھی خیر کی طرح طلب کرتا ہے)۔

[۳] تفسیر قرطبی، جلد ۶، ص ۸۴۱ اور تفسیر رازی، جلد ۲۰، ص ۱۶۲

[۴] نور الثقلین، جلد ۳، ص ۱۴۱



”کل عمل تریدن ان تعملوا فقفوا له ساعة فانی لو قفت ساعة لم یکن

اصابنی ما اصابنی“

”جس کام کو تم انجام دینا چاہو تو ایک ساعت اس کے بارے میں سوچ بچار سے کام لے لیا کرو، کیونکہ اگر میں

ایک ساعت غور و تامل سے کام لیتا تو جس مصیبت میں گرفتار ہوا، گرفتار نہ ہوتا۔“ [۱]

اسی لیے عربوں میں مشہور ہے ”العجلة امر الندامات“ (جلد بازی تمام پشیمانیوں کی ماں (جڑ) ہے)۔

نیز یہ بھی کہا جاتا ہے:

”جلد بازی شیطان کی طرف سے ہے مگر چھ امور میں ۱۔ نماز کی ادائیگی میں جب اس کا وقت داخل ہو جائے۔ ۲۔ میت کی تدفین

میں جب سب لوگ پہنچ جائیں۔ ۳۔ دو شیزہ کی ترویج میں جب وہ بالغ ہو جائے۔ ۴۔ قرض کی ادائیگی میں جب اس کا وقت آن پہنچے۔ ۵۔ مہمان کو

کھانا کھلانا جب وہ گھر آجائے اور ۶۔ توبہ میں جلدی جب گناہ سرزد ہو جائے۔“ [۲]

اس آیت کا ایک جملہ ہے ”وکان الانسان عجولا“ اور اسی طرح قرآن پاک کی دوسری آیات میں جن سے انسان کے نہایت

ہی کمزور نقاط کی نشاندہی کی گئی ہے، سے کیا مراد ہے اور کون لوگ؟ ہم تفسیر نمونہ میں بتا چکے ہیں کہ اس سے مراد ایسے انسان ہیں جو خدائی تربیت

کرنے والوں کی تربیت سے بے بہرہ ہوتے ہیں اور خود ر و صورت میں سر نکالے ہوتے ہیں، نہ کہ وہ انسان جو مہذب اور تربیت یافتہ ہیں۔

اسی سلسلے کی دوسری آیت میں ہٹ دھرم منافقین کے اس گروہ کا تذکرہ ہے جنہیں اس سے پہلی آیات میں دل کے اندھے اور نابینا

افراد کے عنوان سے متعارف کرایا گیا ہے کہ اگر ایسے لوگ حکومت تک رسائی حاصل کر لیں تو کسی رحم نہ کریں اور یہی لوگ راندہ درگاہ الہی ہیں۔

پھر اس آیت میں فرماتا ہے ”آیا ایسے لوگ قرآنی آیات میں غور و فکر سے کام نہیں لیتے تاکہ حقیقت کو دریافت کر لیں؟ یا ان کے دلوں پر قفل

لگائے جا چکے ہیں؟ ایک نہیں کئی تالے! اور ایسے تالوں کے ہوتے ہوئے وہ حقیقت کا ادراک کیسے کر سکتے ہیں؟“

اس مقام پر ”امر“ متصل ہے یا منقطع، اس بارے میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں۔ [۳] اگر متصل ہو تو آیت کا یہ معنی ہوگا ”آیا وہ قرآنی

آیات میں غور و فکر نہیں کر پاتے یا ان کے دلوں پر تالے (پڑے ہوئے) ہیں“ اور اگر منقطع ہو تو آیت کا یہ معنی ہوگا ”آیا وہ قرآن میں غور و فکر

نہیں کرتے، نہ بلکہ ان کے دلوں پر تالے (پڑے ہوئے) ہیں۔“

اور ہر صورت میں اس بات پر دلیل ہے کہ ”تدبر“ (غور و فکر کرنے) اور ”دلوں پر حجاب“ کے درمیان ایک تضاد موجود ہے اور اسے

[۱] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۱۴۱

[۲] تفسیر روح البیان، جلد ۵ ص ۱۳

[۳] آلوسی روح المعانی میں سیبویہ سے نقل کرتے ہیں کہ ”ام“ متصل ہے اور ”ابو حیان“ اور دوسرے اہل علم سے منقول ہے کہ منقطع ہے۔ جلد

”غور و فکر کے ترک کرنے کے حجاب“ کی طرف اشارہ سمجھا جاتا ہے۔

تفسیر ”فی ظلال القرآن“ میں مذکور ہے کہ اس آیت کے مطابق قرآن مجید میں غور و فکر سے کام لینے سے دلوں پر سے پردے اٹھ جاتے ہیں، دل کے درتپے باز ہوتے ہیں، نور معرفت دل پر جاری ہوتا ہے، افکار حرکت میں آجاتے ہیں، عقول میں جوش و خروش پیدا ہوتا ہے، باطن میں خلوص آجاتا ہے اور روح زندہ، روشن اور منور ہو جاتی ہے۔ [۱]

اس آیت میں ”قلوب“ کو نکرہ کی صورت میں کیوں ذکر کیا گیا ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں اس کی دودلیلیں ہو سکتی ہیں۔

پہلی یہ کہ ان کے دلوں کی وحشتناک کیفیت کو واضح طور پر بیان کرے کہ وہ غیر معروف، ان جانے، شقاوت بھرے اور تاریک و ظلمانی ہیں۔

دوسری یہ کہ اس سے ان میں سے کچھ لوگ کے دل مراد ہیں نہ کہ سب لوگوں کے، کیونکہ ان سب کے قلوب ابھی تک ایسے مرحلے تک نہیں پہنچے کہ ان کا ادراک اور بصارت مکمل طور پر ختم ہو چکے ہوں اور ان کے دلوں پر تالے پڑ چکے ہوں۔

”اقفال“ کو جمع کی صورت میں ذکر کرنے سے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ گونا گوں حجاب ہیں جو ان کے دلوں پر پڑ چکے ہیں، مثلاً نفاق، عناد، ہٹ دھرمی، خودخواہی اور غرور وغیرہ۔

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ ”غور و فکر کا ترک کرنا“ اور ”دلوں کا حجاب“ ایک دوسرے پر تقابلی اثر ڈالتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کی نسبت ایک مرحلہ پر علت اور دوسرے مرحلہ پر معلول واقع ہو سکتے ہیں۔ کبھی ترک تدریجاً دلوں کی تاریکی کا سبب بن جاتا ہے اور کبھی دلوں کی تاریکی ترک تدریجاً سبب بن جاتی ہے۔

ہم اپنی اس گفتگو کو حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی ایک حدیث کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ امام فرماتے ہیں:

”قرآن کے قاری تین طرح کے ہیں۔ ایک تو وہ جو اسے پڑھتے ہیں اور اپنا سرمایہ قرار دے کر اس کے ذریعہ سے بادشاہوں کو دوپتے (یعنی ان سے دولت اٹھانے کی تگ و دو میں لگے رہتے) ہیں، اور اسے لوگوں پر اپنی برتری کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

دوسرے وہ ہیں جو قرآن کو پڑھتے ہیں اور صرف اس کے الفاظ کو یاد کرتے ہیں اور اس کی حدود و کوضائع کر دیتے ہیں اور اس طرح سے وہ کبھی بھی اپنے مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ خداوند عالم حاملین قرآن میں ایسے لوگوں کو کبھی زیادہ نہ کرے۔

تیسرے وہ ہیں جو قرآن مجید کو پڑھتے ہیں اور اس کی دوا کو اپنے دلوں کے درد پر رکھتے ہیں۔ اسی کے ذریعہ شب بیداری کرتے ہیں (عبادت میں مصروف رہتے ہیں)، دن کو پیا سے رہتے ہیں (روزہ رکھتے ہیں)، اسی کے ذریعہ اپنی مسجدوں میں قیام کرتے ہیں اور اپنے بستروں سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ خداوند عزیز و جبار ایسے لوگوں کے ذریعہ بلاؤں کو دور کرتا ہے اور انہی کے ذریعہ اپنے دشمنوں پر حملے کرتا

ہے، انہی کی وجہ سے آسمان سے بارش نازل کرتا ہے۔ لیکن ”فو اللہ لہولاء فی قراء القرآن اعز من الکبریت الاحم“ خدا کی قسم! اس قسم کے قاری قرآن کبریت امر (سرخ گندھک) سے بھی زیادہ کمیاب ہیں۔“ [۱]

## ۱۵۔ ارتداد کا پردہ

سب سے پہلے مندرجہ ذیل آیات کو دل و جان سے سماعت فرمائیں۔

### آیات

(۱) اِتَّخَذُوا اٰیْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ اِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوْا

يَعْمَلُوْنَ ﴿۱﴾ (سورہ منافقوں ۲)

(۲) ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿۲﴾ (سورہ

منافقوں ۳)

### ترجمہ

(۱) ان (منافق) لوگوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا لیا ہے تاکہ لوگوں کو خدا کی راہ سے روکے رکھیں۔ یہ بہت ہی برا کام کرتے ہیں۔

(۲) یہ اس لیے ہے کہ وہ پہلے ایمان لائے پھر کافر ہو گئے۔ اسی لیے ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے۔ اسی وجہ سے وہ کچھ نہیں سمجھتے۔

## آیات کی تفسیر اور تشریح

یہ آیات منافقین کے حالات کو بیان کر رہی ہیں۔ اگرچہ نفاق بذات خود معرفت کے پردوں میں سے ایک حجاب ہے لیکن اس مقام پر قرآن مجید نے ایک اور چیز پر زور دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ”وہ پہلے ایمان لے آئے، پھر کفر کی راہ کو اختیار کیا۔ اسی لیے ان کے دلوں پر اس طرح مہر لگا دی گئی ہے کہ وہ کسی حقیقت کے ادراک پر نہیں ہیں۔“

[۱] اصول کافی، جلد ۲، ص ۶۲۷۔ کتاب فضل القرآن باب النوادر، حدیث نمبر ۱

وہ لوگ کون تھے؟ اس بارے میں مفسرین کے ایک گروہ کا نظریہ ہے کہ وہ ایسے لوگ تھے جو بظاہر تو ایمان لائے تھے لیکن باطن میں کفر پر قائم تھے۔

حالانکہ آیت کا ظاہر بتاتا ہے کہ وہ آغاز میں حقیقی طور پر مومن تھے، بعد میں کفر کے رستے کو اختیار کیا اور کفر بھی وہ جس کے ساتھ نفاق بھی تھا۔ کیونکہ ”ثم“ کی تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا کفر ان کے ایمان کے بعد رونما ہوا نہ کہ ایمان کے ساتھ، کہ ایک ظاہری ہو اور ایک باطنی تو اس طرح سے آیت ہذا میں ارتداد کے حجاب کا ذکر کیا گیا ہے۔

اور تعجب بھی نہیں کرنا چاہیے کیونکہ جب انسان ایمان کے ذائقے کو چکھ لیتا ہے اور دین خدا کی حقانیت کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیتا ہے، پھر کفر کا راستہ اختیار کر لے اور کفر بھی وہ جس کے ساتھ نفاق ہوتا ہے اور خداوند عالم اس کی عقل و فکر پر پردہ ڈال دے اور اس کے دل پر مہر لگا دے، تو باعث تعجب نہیں ہے۔

اگر کوئی شخص پہلے ہی سے حق کو نہ پہچان سکے تو ممکن ہے اس کا عذر قابل قبول ہو۔ لیکن جب حق کو پہچان لیا جائے اور معرفت کے بعد ایمان لایا جائے، پھر اسے ٹھوکر ماری جائے، تو غالباً یہی سمجھا جائے گا کہ یہ اس کے بغض و عناد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہے اور خداوند عالم ایسے شخص سے معرفت کی نعمت سلب کر کے اس کے دل پر حجاب ڈال دیتا ہے۔

البتہ ہمارے پاس کوئی ایسی دلیل موجود نہیں ہے جس سے ہمیں یہ معلوم ہو کہ تمام منافقین آغاز کار ہی سے بے ایمان ہوں۔ بلکہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو آغاز کار میں واقعاً ایمان لے آتے ہیں، جیسا کہ سورہ توبہ کی ۴۷ ویں آیت میں بھی مذکور ہے کہ ”و کفروا بعد اسلامہم“ (وہ اسلام لانے کے بعد کافر ہو گئے) اور ہٹ دھرمی پر مبنی یہ ارتداد دلوں پر حجاب ہے۔

ایک بار اور بتاتے چلیں کہ یہ چیز ”جبر“ پر ہرگز دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ مشاہدہ حق کی اس محرومیت کے مقدمات انہوں نے خود ہی فراہم کیے ہیں۔

## ۱۶۔ جھوٹ اور افترا پر دازی کا پردہ

پہلے تو اس بارے میں مندرجہ ذیل آیات کی تلاوت کا شرف حاصل کرتے ہیں۔

آیات

(۱) اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلَى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰوْا فَرِيقًا مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۳۴﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۚ وَغَرَّهُمْ فِى دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا

يَفْتَرُونَ ﴿٢٣﴾ (سورہ آل عمران ۲۳-۲۴)

(۲) وَلَقَدْ مَكَّنَّهُمْ فِيهَا إِنَّ مَكَّنَّاكُمْ فِيهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَأَبْصَارًا  
وَأَفْئِدَةً فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا أَبْصَارُهُمْ وَلَا أَفْئِدَتُهُمْ مِنْ شَيْءٍ إِذْ  
كَانُوا يُجْحَدُونَ ﴿٢٣﴾ بِآيَاتِ اللَّهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿٢٤﴾

(سورہ اتحاف ۲۶)

ترجمہ

(۱) آیات نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں (آسانی) کتاب سے حصہ عطا کیا گیا ہے اور انہیں کتاب الہی کی دعوت دی جاتی ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کریں۔ (لیکن انہوں نے جان بوجھ کر) اس کی طرف پشت کر لی جبکہ انہوں نے (حق کو قبول کرنے سے) روگردانی کر لی۔ یہ عمل اس لیے ہے کہ وہ کہتے تھے چند دنوں کے سوا (جہنم کی) آگ ہم تک نہیں پہنچے گی (اور ہماری سزا دوسری اقوام پر امتیاز رکھنے کی وجہ سے نہایت محدود ہے) اور اس افتراء (اور دروغ نے جو خدا پر باندھتے ہیں) انہیں دین میں مغرور کر دیا تھا۔

(۲) ہم نے ان (قوم عاد کے لوگوں) کو وہ قدرت عطا فرمائی جو تمہیں نہیں دی اور ان کے لیے کان، آنکھ اور دل بنائے۔ لیکن (عذاب نازل ہونے کے وقت) نہ تو ان کے کانوں اور آنکھوں نے اور نہ ہی ان کے دلوں نے انہیں کوئی فائدہ پہنچایا، کیونکہ وہ مسلسل خدائی آیات کا انکار کرتے تھے اور آخر کار وہ جس چیز کا مذاق اڑایا کرتے تھے ان پر آٹوٹا۔

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### جھوٹ کی فریب کاری

بعض مفسرین پہلی آیت کے شان نزول کے بارے میں کہتے ہیں:

یہودیوں میں سے ایک مروزن نے زنائے محصنہ کا ارتکاب کیا۔ اگرچہ تورات میں اس قسم کے لوگوں کی سزا ”رجم“ کی صورت میں مقرر تھی لیکن انہوں نے اس حکم کے اجراء کو قبول نہیں کیا۔ کیونکہ وہ معاشرے کے اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ کسی نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اس بارے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع کر لیں۔ ممکن ہے کہ اس سلسلے میں ان کی سزا میں تخفیف ہو جائے۔

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی وہی حکم دیا۔ لیکن جب انہوں نے اس پر اعتراض کیا تو آپؐ نے فرمایا ”میں تمہاری موجودہ تورات سے ہی فیصلہ لوں گا“ انہوں نے اس بات کو قبول کر لیا اور ”ابن صوریہ“ جو ایک یہودی دانشمند تھا، کو اس مقصد کے لیے بلا یا گیا۔ لیکن تورات کی تلاوت کے وقت اس نے اس حصے کو نہ پڑھا اور وہاں پر موجود عبد اللہ بن سلام نے جو پہلے یہودی تھے، پھر مسلمان ہو گئے تھے، اس راز سے پردہ اٹھایا۔

اسی سلسلے میں قرآن کہتا ہے ”کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا حصہ عطا کیا گیا ہے۔ جب انہیں اس کتاب کے ذریعہ فیصلہ کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ سرتابی اور سرپیچی کرتے ہیں۔“

بعد میں فرماتا ہے ”یہ اس لیے ہے کہ وہ خود کو عذاب الہی سے امان میں سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جہنم کی آگ چند گنتی کے دنوں کے سوا ہم تک نہیں پہنچے گی۔ آخر کار جھوٹ، دروغ گوئی اور افتراء پر دازی نے انہیں فریب میں مبتلا کر دیا اور انہیں معرفت سے روک دیا۔“

”یفترون“، ”افتراء“ کے مادہ سے ہے جس کی اصل ”فری“ (بروزن نہی) ہے جس کے معنی ”اصلاح کی غرض سے چڑے کو کاٹنا“ ہے۔ لیکن جب ”افرا“ (باب افعال کا مصدر) ہو کر آئے تو اس وقت اس کے معنی ”چڑے کو بگاڑنے کی غرض سے کاٹنا“ ہو جائیں گے اور ”افتراء“ کا معنی چڑے کو کاٹنا ہے خواہ اصلاح کی غرض سے ہو خواہ بگاڑ کے مقصد کے لیے ہر چند کہ ”بگاڑ“ اور تخریب کاری کے معنی میں ہے، زیادہ استعمال ہوتا ہے اور یہ مادہ جھوٹ، شرک اور ظلم کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔<sup>[۱]</sup>

”غرہم“، ”غرور“ کے مادہ سے ہے جو اصل میں ”غر“ (بروزن حر) ہے اور اس کے معنی ہیں کسی چیز کا واضح اور آشکار نشان و اثر۔ اسی لیے گھوڑے کی پیشانی پر جو نشان ہوتا ہے اسے ”غرہ“ کہتے ہیں اور جب کسی کپڑے کو پلٹتے ہیں تو اس میں لپٹنے کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں۔ وہاں پر بھی یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔ پھر یہ لفظ فریب دینے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے، گویا فریب دینے والا فریق ثانی کو کپڑے کی مانند پلٹ رہا ہوتا ہے۔<sup>[۲]</sup>

اور ”غرور“، ”غرور“ ہر اس شخص یا چیز کے معنی میں ہوتا ہے جو انسان کو فریب دے اور فریب کار شیطان کو بھی ”غرور“ کہتے ہیں۔<sup>[۳]</sup>

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جھوٹ اور افتراء انسان کو کس طرح فریب دیتے ہیں اور معرفت کے حقائق سے کیونکر باز رکھتے ہیں؟ بعض مفسرین نے اس کا یہ جواب دیا ہے:

”انسان اپنے افعال و اعمال میں نفسانی حالات اور ملکات اور ان ذہنی صورتوں کی بنیاد پر کہ اس کے نفس نے جنہیں مزین کیا ہوا

[۱] مفردات راغب، مادہ ”فری“

[۲] مفردات راغب، مادہ ”غرور“

[۳] مفردات راغب، مادہ ”غرور“

ہے، قدم اٹھاتا ہے، نہ کہ اپنے علم اور ادراک کی بنیاد پر، جیسا کہ بہت سے ایسے لوگ جو نشے کے رسیا ہوتے ہیں وہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ منشیات ضرر رسان ہیں اور ایسے مواد کا استعمال انسان کے شایان شان نہیں۔ پھر بھی وہ اس کا استعمال جاری رکھتے ہیں، کیونکہ نفسانی ملکہ اور حالت نے ایسے مواد کو لذت بخش بنا کر ان کے پیش کیا ہے اور ان کے لیے جاذبیت پیدا کر دی ہے اور وہ بھی اس انداز میں کہ ان کی سوچ و بچار اور اس سے اجتناب کی کوئی مجال باقی نہیں چھوڑی۔“

بالفاظ دیگر اس قسم کے لوگ کبھی تو اس قدر جھوٹ کا تکرار کرتے ہیں اور خود کو تلقین کرتے ہیں اور سمجھاتے ہیں، پھر بالآخر اس کا باور کر لیتے ہیں اور اس پر مطمئن ہو جاتے ہیں، جیسا کہ ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تلقین اور سمجھانا بھی علم اور یقین کا اثر رکھتا ہے۔ لہذا دینی امور میں بار بار دروغ گوئی کی تلقین نے انہیں فریفتہ کر لیا ہے اور خداوند عالم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے اور حق کے آگے سر جھکانے سے باز رکھا ہے۔ [۱]

یہ بات تجربہ میں آچکی ہے کہ بعض اوقات کچھ لوگ کوئی جھوٹ بولتے ہیں اور پہلے پہل وہ بھی جانتے ہیں کہ یہ جھوٹ یا افترا ہے، لیکن اس عمل کو بار بار دہرانے سے وہ آہستہ آہستہ اس شک میں پڑ جاتے ہیں کہ شاید یہ سچ ہو اور پھر اس کے تکرار سے وہ تدریجی طور پر اس بات کو باور کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ ایک خبر ہے۔ پس اس طرح سے جھوٹ کا تکرار اور تسلسل غیر واقعی امور پر عقیدہ رکھنے، انسان کو فریب دینے اور اس کی آنکھوں کے سامنے پروہ ڈالنے کا سبب بن جاتا ہے۔

اسی لیے نوبت اس حد تک نہیں پہنچتی جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ جھوٹ بولنے والے یہودی تھے اور دھوکہ کھانے والے دوسرے لوگ۔

دوسری آیت ”قوم عاد“ کی طرف اشارہ ہے، ایسی قوم جو سرزمین ”احقاف“ میں رہتی تھی۔ (احقاف جزیرۃ العرب کے جنوب کی طرف ہے اور بعض کہتے ہیں جزیرۃ العرب کے شمال کا علاقہ ہے)۔ انہوں نے اپنے پیغمبر جناب ”ہود“ علیہ السلام کی تکذیب کی اور حد سے بڑھ کر ظلم اور فساد کا ارتکاب کیا جس کے نتیجے میں وہ مہلک آندھیوں کے ذریعے تباہ و برباد ہو گئے۔

یہ آیت بتا رہی ہے کہ ”ہم نے انہیں تم سے زیادہ طاقت عطا کی تھی، ان کی آنکھیں، کان اور عقلیں بھی تھیں لیکن آیات الہی کے انکار اور انبیاء کرام کی تکذیب نے ان کی آنکھوں، کانوں اور عقلوں پر پردے ڈال دیئے اور معرفت کے یہ ذرائع ان کے لیے مفید واقع نہ ہو سکے۔ آخر کار اسی عذاب میں مبتلا ہو گئے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔

یہ آیت بھی اس بات پر زور دے رہی ہے کہ آیات الہی کی تکذیب اور ان کا مسلسل انکار اس بات کا سبب بن گیا کہ یہ قوم ادراک اور معرفت کھو بیٹھی۔ ظاہری طور پر ان کی آنکھیں دیکھتی تھیں، کان سنتے تھے اور فکری طور پر بظاہر وہ عقلمند بھی تھے لیکن حقیقت میں ان پر پردے پڑے ہوئے تھے اور معرفت کے یہ وسائل اور ہتھیار انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے اور عذاب الہی نے ان کی خوب سرکوبی کی اور ہمیشہ کے لیے



انہیں تباہ و برباد کر دیا۔

”بیچدون“، ”حجود“ کے مادہ سے ہے جس کے اصلی معنی کسی ایسی چیز کی نفی کرنا ہوتے ہیں جس پر انسان کو یقین ہوتا ہے۔ یا کسی ایسی چیز کا اثبات ہوتا ہے جس کی نفی پر انسان کا ایمان ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر جان بوجھ کر پوری معرفت کے ساتھ حقائق کا انکار، جحد کہلاتا ہے۔ [۱] تجربہ شاہد ہے کہ اگر انسان اس طرح کے کام کو جاری رکھے تو آہستہ آہستہ ان مسائل کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیتا ہے جن کے متعلق اسے یقین ہوتا ہے اور اگر یہی سلسلہ مزید آگے بڑھے تو اس کی تشخیص بالکل الٹ ہو جاتی ہے اور باطل کو حقیقت سمجھنے لگ جاتا ہے۔ اس کام، یعنی حقائق کے انکار کے ممکن ہے کہ کئی اور مختلف سرچشمے بھی ہوں، یعنی کبھی تو وہ ہٹ دھرمی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، کبھی تعصب، تکبر، غرور اور کبھی کوئی مادی منفعت ہوتی ہے کہ حقیقت کے آشکار ہو جانے سے اس کے ضائع ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے اور کبھی دوسری نفسانی خواہشات کی وجہ ہوتی ہے۔ لیکن ہر حالت میں اس کا اثر ضرور ہوتا ہے اور یہ کہ اس کی وجہ سے انسان کی عقل و فطرت پر پردے پڑ جاتے ہیں اور تشخیص کے سلسلے میں الٹا نتیجہ نکلتا ہے۔

## ۱۔ گمان کا ضخیم پردہ

بے بنیاد گمانوں، باطل اوہام اور تخیلات کی پیروی بھی تدریجی طور پر انسانی عقل کو دگرگون کر دیتی ہے۔ اسے خالص، صاف ستھرے معارف سے منحرف کر دیتی ہے اور اس کی آنکھوں اور کانوں پر پردے ڈال دیتی ہے۔ اس بارے میں مندرجہ ذیل آیت مجیدہ پر غور کی دعوت دی جاتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

آیات

(۱) وَحَسِبُوا أَلَّا تَكُونَ فِئْتَنَةً فَعَمُوا وَصَمُّوا ثُمَّ تَابَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوا وَصَمُّوا كَثِيرٌ مِنْهُمْ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿۴۱﴾ (سورہ مائدہ ۴۱)

ترجمہ

(۱) اور انہوں نے گمان کر لیا کہ سزا وغیرہ نہیں ہوگی، لہذا وہ (حقائق کے دیکھنے اور حق بات سننے سے) اندھے اور بہرے ہو چکے ہیں۔ پھر (وہ بیدار ہوئے، خدا سے توبہ کی اور) خدا نے ان کی توبہ قبول کر لی، لیکن پھر (دوسری مرتبہ خواب غفلت میں چلے گئے اور ان میں سے بہت سے لوگ اندھے اور بہرے ہو گئے اور جو کچھ وہ

[۱] مفردات راغب مادہ ”جحد“ جو ہری بھی کہتے ہیں ”الجود“ الانکار مع العلم۔ مجمع البحرین نے بھی جحد کے یہی معنی کیے ہیں۔

انجام دیتے ہیں خداوند عالم اس سے باخبر ہے۔

## آیت کی تفسیر اور جمع بندی

یہ آیت یہودیوں کے اس گروہ کی کیفیت بیان کر رہی ہے جس نے خدا سے یہ پختہ عہد کیا تھا کہ وہ خدا کے رسولوں کی دعوت کے آگے سر تسلیم خم کریں گے اور خدا کے فرمان کی بجا آوری کریں گے۔ لیکن جب بھی کسی زمانے میں کوئی پیغمبران کی نفسانی خواہشات کے خلاف کوئی بات کرتے تو ان کے مقابلے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے، حتیٰ کہ انہوں نے انبیاء کی ایک بہت بڑی تعداد کو تیغ کر دیا۔

اس بحث کے سلسلے میں آیت کہتی ہے ”انہوں نے گمان کیا کہ سزا وغیرہ کچھ نہیں ہے ان کا یہ گمان باطل جو حسب ذات، تکبر اور غرور کی وجہ سے ان کے دل میں پیدا ہوا، ایسا باطل گمان جسے شیطان اور خواہشات نفسانی نے پروان چڑھایا اور اس باطل گمان اور خیال خام نے ان کی آنکھوں اور کانوں پر پردے ڈال دیئے، لہذا انہوں نے نہ تو دوسری اقوام کے دردناک انجام کے آثار کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور نہ ہی اس چیز کو کانوں سے سنا جو ان کے بارے میں تاریخ میں نقل ہوا۔ اس طرح معرفت کے ان دواہم ذرائع یعنی آنکھ اور کان کو انہوں نے عملاً ضائع کر دیا اور خود کو عذاب الہی سے امان میں سمجھنے لگے۔ لیکن ایک عرصہ کے بعد اپنی غلطیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور توبہ کا راستہ اختیار کیا۔ چونکہ خدا کی رحمت بے حد و حساب ہے لہذا ان کی توبہ قبول ہو گئی۔

ایک بار پھر انہی غلط سوچوں، باطل گمانوں، خام خیالوں اور بے دلیل امتیازات نے ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے (اور توبہ بائیں سید کہ وہ خود کو خدا کی اولاد سمجھنے لگ گئے) اور ان کے کانوں کو ایسا بند کر دیا کہ وہ اندھے اور بہرے ہو کر راندہ درگاہ الہی ہوئے۔ یہ آیت صاف طور پر کہہ رہی ہے کہ باطل گمان، خاص طور پر عذاب الہی سے محفوظ ہوجانے کا گمان، انسان کی آنکھ اور کان پر ایک ضخیم پردہ ہے۔ بنا بریں ”فعموا و صموا“ (پس وہ اندھے اور بہرے ہو گئے) کے جملہ سے مراد یہ ہے کہ ان کی آنکھوں نے آیات الہی اور گذشتہ اقوام کے باقی رہ جانے والے آثار کو نہیں دیکھا اور ان کے کانوں نے اس بارے میں کسی قسم کے وعظ و نصیحت کو قبول نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ صرف ایک یا چند مرتبہ کی باطل اور بے بنیاد گمانوں اور خیالات کی اطاعت و پیروی سے اس قسم کی حالت پیدا نہیں ہوتی بلکہ تکرار اور تسلسل کی وجہ سے ہی یہ دردناک انجام دیکھنا پڑتا ہے۔

اس جملے کے تکرار اور وہ بھی ”ثمر“ (پھر) کے لفظ کے ساتھ، جو عام طور پر زمانی فاصلے پر دلالت کرتا ہے، سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے اس بارے میں مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ بنی اسرائیل کو درپیش آنے والی دو مختلف سرگزشتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک تو اس کی طرف جب اہل باطل نے ان پر حملہ کر دیا تھا اور دوسری اس طرف جب ایرانیوں اور رومیوں نے ان پر حملہ کیا تھا اور ان کی حکومت کو تہس نہس کر دیا تھا۔ [۱] اس کی

تفصیل ہم نے تفسیر نمونہ میں سورہ بنی اسرائیل کے آغاز میں بیان کر دی ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ پہلا جملہ جناب زکریا، جناب یحییٰ اور جناب عیسیٰ علیہم السلام کے زمانے کی طرف اشارہ ہے۔ جب بنی اسرائیل ان انبیاء کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے تھے اور دوسرا جملہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی اور ان کی نبوت و رسالت کے انکار کی طرف اشارہ ہے۔ [۱]

جبکہ بعض اور مفسرین نے کہا ہے کہ پہلا جملہ یہ بتا رہا ہے کہ خداوند متعال نے انہیں اس گمان کی وجہ سے اپنی رحمت سے دور کر دیا اور انہیں اندھا اور بہرا کر دیا کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ خدا کی برگزیدہ ملت ہیں اور جو کام بھی وہ انجام دیں انہیں سزا نہیں ہوگی۔ لیکن ایک بار پھر خداوند عالم نے اپنا لطف اور اپنی رحمت ان کے شامل حال فرمائی، باطل گمان ان کے دل سے نکال دیا اور ان کے آنکھ اور کان کو دیکھنے اور سننے والا بنا دیا، لہذا انہوں نے اس حقیقت کی طرف توجہ کی کہ وہ بھی خدا کے دوسرے بندوں کی طرح کے بندے ہیں اور تقویٰ کے سوا کسی کو کسی پر کوئی امتیاز اور فضیلت حاصل نہیں۔

لیکن بیداری کی یہ حالت اور کیفیت مستقل نہ تھی۔ پھر ان کا ایک گروہ اسی غلط گمان کا شکار ہو گیا اور نسلی امتیاز ان کے خیالات اور اوہام پر چھا گیا اور خدا نے ایک بار پھر ان کی آنکھوں اور کانوں پر پردے ڈال دیئے۔ [۲]

ان تمام تفاسیر کو آپس میں جمع کرنا بعید نہیں ہے اور ان سب کا نتیجہ ایک ہے اور وہ یہ کہ باطل گمان اور فاسد خیالات (جیسا کہ یہودی لوگ اپنے لیے جھوٹے امتیازات کے قائل تھے) تدریجی طور پر انسان کے عقل و شعور اور ادراک و انظار پر اثر ڈالتے رہتے ہیں اور منحرف کرتے رہتے ہیں، اگرچہ آغاز میں وہ زیادہ پروان نہیں چڑھے ہوتے۔ اگر انسان بیدار ہو جائے تو ممکن ہے کہ راہ راست پر آجائے، لیکن جب وہ انسانی روح میں اچھی طرح رنج بس جاتے ہیں اور پھل پھول جاتے ہیں تو پھر انسان کے لیے بازگشت کی راہ ناممکن ہو جاتی ہے۔

[۱] تفسیر فخر رازی، جلد ۱۲ ص ۵۷ تفسیر روح المعانی جلد ۶ ص ۱۸۴ یہ تفسیر ایک احتمال کی حیثیت سے مذکور ہوئی ہے۔

[۲] تفسیر المیزان، جلد ۶ ص ۷۱

## بیرونی حجاب

### ۱۸۔ فاسد اور گمراہ رہنماؤں کا پردہ

اشارہ

بیرونی حجابوں سے مراد ایسے حجاب ہیں جو انسان کے اپنے صفات و اعمال کے علاوہ ہیں جو کہ اس کے عقل و ادراک اور حس تشخیص پر اثر ڈالتے ہیں اور حقیقتوں کی شناخت اور معرفت سے مانع ہوتے ہیں اور وہ بھی کافی تعداد میں ہیں اور ایک وسیع حلقہ کے حامل ہیں۔ قرآن مجید نے مختلف آیات میں نہایت ہی دلکش طریقہ سے ان کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

آیات

- (۱) وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَّرَاءَنَا فَاضَلُّونَا السَّبِيلًا ﴿٦٤﴾ رَبَّنَا  
 أَنَّهُمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنَاهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا ﴿٦٥﴾ (سورہ احزاب ۶۴-۶۵)
- (۲) وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ نُؤْمِنَ بِهَذَا الْقُرْآنِ وَلَا بِالَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ ۗ وَلَوْ  
 تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ مَوْقُوفُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖ يُرْجَعُ بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضِ الْقَوْلِ ۗ  
 يَقُولُ الَّذِينَ اسْتَضَعَفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لَوْلَا أَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِينَ ﴿٣١﴾  
 قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لِلَّذِينَ اسْتَضَعَفُوا أَنَحْنُ صَدَدْنَاكُمْ عَنِ الْهُدَىٰ  
 بَعْدَ إِذْ جَاءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُجْرِمِينَ ﴿٣٢﴾ (سورہ سبأ ۳۱-۳۲)
- (۳) قَالَ ادْخُلُوا فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ فِي النَّارِ ۗ  
 كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَعَنَتْ أُخْتَهَا ۗ حَتَّىٰ إِذَا ادَّارَكُوا فِيهَا جَمِيعًا ۗ قَالَتْ  
 أُخْرَبُهُمْ لِأَوْلَاهُمْ رَبَّنَا هَؤُلَاءِ أَضَلُّونَا فَأْتِيهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِنَ النَّارِ ۗ  
 قَالَ لِكُلِّ ضِعْفٍ وَلَكِنْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٣٨﴾ (سورہ اعراف ۳۸)

## ترجمہ

(۱) اور وہ کہتے ہیں، پروردگار! ہم نے اپنے روسا اور بزرگوں کی اطاعت کی ہے اور انہوں نے ہمیں گمراہ کیا ہے۔ پروردگار! تو انہیں دو گنا عذاب دے اور ان پر بہت بڑی لعنت فرما۔

(۲) اور اگر کسی وقت ظالم و ستمگر لوگ (حساب و کتاب اور سزا و جزا کے لیے) اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے کیے گئے تو تو دیکھے گا کہ ان میں سے ہر ایک اپنا گناہ دوسرے کی گردن پر ڈالے گا، اور تو تعجب کرے گا تو اس وقت مستضعفین مستکبرین سے کہیں گے اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے۔ لیکن مستکبرین مستضعفین کو جواب دیں گے آیا ہم نے تمہیں ہدایت سے روک رکھا۔ جبکہ ہدایت تمہارے پاس آچکی تھی (اور تم نے اسے اچھی طرح پا بھی لیا تھا) بلکہ تم خود ہی مجرم تھے۔

(۳) (خداوند عالم انہیں) فرمائے گا، تم اپنے جیسے جنوں اور انسانوں کی صف میں جہنم میں داخل ہو جاؤ اور جب بھی اس میں کوئی گروہ داخل ہوگا تو وہ دوسرے پر لعنت کرے گا، تاکہ وہ سارے کے سارے ذلت اور رسوائی کے ساتھ اس میں رہیں۔ (تو اس وقت) پیروکاروں کا ایک گروہ اپنے پیشواؤں کے بارے میں کہے گا: خداوند! یہی تو وہ لوگ تھے جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا، لہذا انہیں تو آتش جہنم کا دو گنا عذاب دے۔ خدا فرمائے گا تم میں سے ہر ایک کے لیے دو گنا عذاب ہے، لیکن تم نہیں جانتے۔

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

## اہل جہنم کا باہمی جھگڑا

مندرجہ بالا آیات کا پہلا حصہ جہنمی کفار کے ایک گروہ کی حالت کو بیان کر رہا ہے کہ جب وہ اپنے کام کے نتیجے کو دیکھیں گے تو بارگاہ رب العزت میں عرض کریں گے ”اس برے انجام کا سبب ہم خود بنے ہیں کیونکہ ہم نے اپنے روسا اور بزرگوں کی پیروی کی ہے، وہ ہم پر مسلط تھے اور ہماری فکری قیادت ان کے ہاتھ میں تھی اور ہم ان پر تکیہ کرتے رہے اور گمراہ ہو گئے۔ پروردگار! ان کے عذاب کو دو گنا کر دے، (ایک تو ان کے اپنے کفر کا عذاب اور دوسرے ان کا ہمیں گمراہ کرنے کا عذاب) اور ان پر بڑی لعنت بھیج۔“

وہ اس طرح سے اپنی جان چھڑانا چاہیں گے اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ گمراہ سرداروں نے بھی ان کے انحراف و کج روی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ وہ اس طرح سے بری الذمہ ہو جائیں گے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ان فاسد رہنماؤں کے وسوسے اور ضلال و مضل (خود گمراہ اور گمراہ کن) رہنماؤں کی قیادت نے ان کے عقل و فکر پر

پردے ڈال دیئے تھے، لیکن اس کام کے مقدمات تو انہوں نے خود فراہم کیے تھے، کیونکہ وہ مکمل طور پر ان کے سامنے سر تسلیم خم کر چکے تھے اور یہ نہیں دیکھا تھا کہ یہ لوگ قیادت اور رہبری کے اہل ہیں یا نہیں!

لفظ ”سادتاً“ اور ”کبر ائناً“ آیا دو مختلف مفہوموں کے حامل ہیں یا ان دونوں کا مفہوم ایک ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ چنانچہ کچھ لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ ”سادتاً“ کا اشارہ ان بادشاہوں اور سلطانوں کے بارے میں ہے جو شہروں اور ملکوں پر مسلط رہ چکے ہوں گے اور ”کبر ائناً“ کا اشارہ مقامی اور علاقائی رئیسوں اور سرداروں کی طرف ہے، کیونکہ وہ پہلے گروہ کی اطاعت کو خدا کی اطاعت کی بجائے بجالاتے تھے اور دوسرے گروہ کی اطاعت کو سولہ کی اطاعت کی بجائے۔ اسی لیے قدرت اور طاقت کے لحاظ سے پہلا گروہ زیادہ ہوگا اور اسی وجہ سے عبارت میں بھی اس کا ذکر پہلے کیا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے پہلے کو بادشاہوں اور صاحبان اقتدار کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور دوسرے کو ان لوگوں کی طرف جو سن کے لحاظ سے بڑے ہیں اور اسی بزرگی کی وجہ سے ان لوگوں نے ان کی اطاعت کی ہوگی۔

بعض کا احتمال ہے کہ دونوں الفاظ کے ایک ہی معنی ہیں اور تاکید ہے۔<sup>[۱]</sup>

اور یہی آخری معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ”سادۃ“، ”سید“ کی جمع اور سید اسے کہتے ہیں کہ جس کے پاس ”سواد“ کی سرپرستی ہو۔ (سواد یعنی انبوه کثیر۔ اور انبوه کثیر کی تعداد کو ”سواد“ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ کثرت کی وجہ سے سیاہ معلوم ہوتی ہے) پھر ہر بزرگ کو ”سید“ کہا جانے لگا۔

دوسری آیت میں بھی ظالم کفار کا ذکر ہے جو بروز قیامت خدا کی عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہوں گے اور ہر ایک اپنا گناہ دوسروں پر ڈالنے کی کوشش کرے گا۔ اسی اثناء میں مستضعفین یعنی وہ بے خبر افراد جو آنکھ اور کان بند کر کے دوسروں کے پیچھے لگے ہوئے تھے، ”مستکبرین“ یعنی ایسے ظالم تسلط گرد و دوسروں کو فکری طور پر گمراہ کرتے رہے، کی طرف منہ کر کے کہیں گے ”اگر تمہارے شیطننت آمیز گمراہ کن وسوسے نہ ہوتے یقیناً ہم مومنین کی صفوں میں ہوتے۔ تم ہماری ذہنی صفائی کرتے رہے اور غیر شعوری طور پر تم ہمیں اپنے پیچھے لگائے رہے اور اپنا آلہ کار بنائے رکھا جس سے اپنی شیطانی آرزوؤں کی تکمیل کرتے رہے۔ اب ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ہم کس قدر غلطی پر تھے۔“

البتہ مستکبرین بھی خاموش نہیں رہیں گے اور وہ جواب میں کہیں گے ”ہم نے تمہیں کیسے ہدایت سے روکے رکھا حالانکہ انبیاء نے وہ سب کچھ بتا دیا تھا جو بتانا ضروری تھا اور کافی حد تک اتمام حجت کیا تم خود غلط رہے ہو۔ ہم تمہاری گمراہی کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ تم خود ہی گمراہ گار تھے اور اپنے ارادہ اور اختیار کے باوجود انبیاء کے منطقی کلام کو نہیں مانا اور ہماری بے بنیاد باتوں میں آگئے۔“

تیسری آیت میں بھی جہنم میں گمراہ ”پیشواؤں“ اور ”پیر و کاروں“ کی چپقلش کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ جب کوئی گروہ جہنم میں داخل ہوگا تو دوسرے گروہ پر لعنت اور نفرین کرے گا اور اسے ہی اپنی شقاوت و بدبختی کا ذمہ دار ٹھہرائے گا۔ گمراہ پیر و کار خدا کی بارگاہ میں عرض

[۱] دیکھیے تفسیر روح المعانی، جلد ۲۲، ص ۸۷۔ تفسیر المیزان، جلد ۱۶، ص ۳۶۹ اور تفسیر فخر رازی، جلد ۲۵، ص ۲۳۲

کریں گے ”یہ گمراہ کن لوگ ہی تھے جنہوں نے ہمیں راہ راست سے بھٹکا دیا تھا۔ تو ان کے عذاب کو دوچند کر دے، ایک عذاب خود ان کی اپنی گمراہی کی وجہ سے دوسرا ہمیں گمراہ کرنے کی بنا پر۔

لیکن خداوند عالم ارشاد فرمائے گا ”تم سب لوگوں کے لیے دو گنا عذاب ہے لیکن تم نہیں جانتے۔“ (قال لكل ضعف ولكن لا تعلمون)۔

باطل کے گمراہ کن سرداروں کو دو گنا عذاب ملنا ہی چاہیے لیکن گمراہ ہونے والے پیروکاروں کو دو گنا عذاب ظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے۔ ہر چند کہ اچھی طرح غور و فکر سے معلوم ہو جاتا ہے کہ انہیں بھی ایسی ہی سزا ملنا چاہیے، کیونکہ ایک تو خود ان کی اپنی گمراہی کی وجہ سے اور دوسرے کا فر سرداروں کی ظلم کی چکی میں دانے ڈالنے اور ان کے تنور ظلم کو گرم رکھنے، یعنی ان کے آلہ کار بننے کی وجہ سے۔ جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے بنی امیہ کے ایک کارندے سے ارشاد فرمایا جو آپ کے ایک صحابی کے ہمراہ توبہ کی غرض سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا:

”لولا ان بنی امیة وجدوا من یکتب لہم ویجیبی لہم ایفی ولقاتل عنہم

ویشہد جما عنہم لہا سلبرنا حقاً“

”اگر بنی امیہ ایسے افراد کو حاصل نہ کرتے جو ان کے لیے لکھنے پڑھنے کا کام انجام دیتے تھے، خراج وصول کرتے تھے، ان کی طرف سے جنگ کرتے تھے، ان کی جماعت میں حاضر ہوتے تھے، تو وہ ہرگز ہمارا حق ہم سے نہ چھین پاتے۔“ □

## تشریح

### ”مستضعفین“ اور ”مستکبرین“ قرآن کی نگاہ میں

قرآنی آیات میں کئی مرتبہ ”مستکبرین“ اور ”مستضعفین“ کا ذکر آیا ہے اور یہ ایک اہم اور قابل غور موضوع ہے جو تفسیر موضوعی کی آئندہ بحثوں میں ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے جالب توجہ ہو سکتا ہے، لیکن اس مقام پر اس بارے میں آیات بالا کی وضاحت کے لیے ہم اس پر ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہیں۔

”راغب“، ”مفردات“ میں کہتے ہیں کہ ”کبر، تکبر اور استکبار“ ایسے الفاظ ہیں جن کے معانی تقریباً ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ ”پھر کہتے ہیں کہ ”استکبار“ کے دو معانی ہیں، ایک تو یہ کہ انسان سعی و کوشش کرے کہ وہ بڑا بن جائے، گویا وہ بزرگی کے تمام ضروری شرائط کو ملحوظ سے پورا کرنے کی کوشش کرے اور بڑا بن جائے۔ یہ استکبار قابل ستائش ہے۔ دوسرے یہ کہ بزرگی کے شرائط کا حامل نہ ہو

□ بحار الانوار جلد ۲ (جلد ۷۵) ص ۷۵، سفینۃ البحار، جلد ۲، ص ۱۰۷، مادہ ظلم



اور نہ ہی اس کے لائق ہو، لیکن بڑائی کو اپنے ساتھ چسپاں کر دے۔ ایسا استکبار قابل نفرت اور باعث مذمت ہے اور قرآن مجید میں اس کی زبردست مذمت کی گئی ہے۔ جیسا کہ ہم شیطان کے بارے میں پڑھتے ہیں: ”ابی واستکبر“ (اس نے آدم کا سجدہ کرنے سے انکار کیا اور بڑا بنا۔ سورہ بقرہ ۳۴)

راغب کہتے ہیں ”قرآن مجید نے کہیں پر ”مستکبرین“ کو ”ضعفا“ کے مقابلے میں قرار دیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی برتری طبعی یا جسمانی طاقت کی وجہ سے ہے یا پھر مال و دولت کے بل بوتے پر۔“ [۱]

”استکبار“ کا نقطہ مقابل ”استضعاف“ ہے جس کے معنی ہیں ”کمزوری اور ناتوانی کو طلب کرنا“، لیکن چونکہ یہ کلمہ قرآن مجید میں ”فعل مجہول“ یا ”اسم مفعول“ کی صورت میں استعمال ہوا ہے، لہذا اس کے معنی یہ ہوں گے ”ایسا ضعف (کمزوری) جو مستکبرین کی طرف سے کسی گروہ پر مسلط کر دیا جائے اور انہیں ناتوان سمجھا جائے“۔ البتہ کہیں پر فعل معلوم کی صورت میں بھی استعمال ہوا ہے، اور وہ فرعون کے ماجرے میں ہے جس نے بنی اسرائیل کو کمزور اور ناتوان بنایا ہوا تھا اور انہیں اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ ارشاد ہوتا ہے:

**إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ**

”فرعون زمین پر بڑا بن بیٹھا اور لوگوں کو گروہوں میں بانٹ دیا اور ان میں سے ایک گروہ کو کمزور و ناتوان بنائے رکھا۔“ (القصص ۴)

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ”مستضعف“ کا لفظ قرآن مجید میں دو معانی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ایک تو وہ مظلوم افراد جو ناحق طور پر کسی کے ظلم تلے دبے ہوئے ہوتے ہیں اور خداوند عالم کا لطف و کرم انکے شامل حال ہوتا ہے، جیسا کہ بنی اسرائیل کے ستم رسیدہ افراد کے بارے میں ارشاد الہی ہے:

**وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتَضَعَفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ آيَةً وَأَجْعَلَهُمُ**

**الْوَارِثِينَ ۝۵**

”ہم ارادہ کر چکے ہیں کہ زمین میں موجود مستضعف افراد پر احسان کریں اور انہیں پیشوا بنائیں اور حکومت کے وارث قرار دیں۔“ (القصص ۵)

اور دوسرا معنی جو قرآن میں بھی عام طور پر استعمال ہوا ہے اس سے مراد ایسے لوگ ہیں جو اپنی جہالت، نادانی، بے سمجھی، کم عقلی، اندھی تقلید اور تعصب کی وجہ سے ذہنی اور فکری کمزوری کا شکار بنا دیئے گئے ہیں اور آنکھیں اور کان بند کر کے ظالم اور گمراہ قائدین کے پیچھے پیچھے حرکت کرتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جن ک بارے میں مندرجہ بالا آیات گفتگو کر رہی ہیں کہ وہ بروز قیامت مستکبرین کے ساتھ جھگڑا کریں

[۱] مفردات راغب، مادہ ”کبر“

گے اور ساتھ ہی یہ بھی تصریح کر رہی ہیں کہ انہیں بھی مستکبرین کی مانند دواہر اعذاب ہوگا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ وہ گمراہ ہیں اور دوسرا اس لیے کہ وہ مستکبرین کے تنور کو گرم رکھتے ہیں اور ظالم و جاہر مستکبرین کی حکمت کی بنیادوں کو محکم بنائے ہوئے ہیں۔

## قائدین کا مقام اسلامی روایات میں

حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

«الناس بامراء ہم اشبه منهم بأبائهم»

”لوگ اپنے آباؤ اجداد کی نسبت اپنے امراء اور حکمرانوں سے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں۔“ [۱]

ممکن ہے یہ شبہت اس لحاظ سے ہو کہ کچھ لوگ آنکھ اور کان بند کر کے اپنے امراء اور حکمرانوں کے پیچھے حرکت کرنے لگتے ہیں اور اپنا دین اور اپنا دل سب کچھ ان کے فرمان پر قربان کرنے کو تیار ہوتے ہیں، یہاں تک کہ ضرب المثل مشہور ہو گئی ہے کہ «العاس علی دین ملو کھہ» (لوگ اپنے حکام اور بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں)۔

حکمران اور بادشاہ قسم کے لوگ بعض لوگوں کی نگاہ میں ہیرو، نمونہ اور اسوہ ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض کم عقل لوگ انہیں اس بات سے بھی بالاتر سمجھتے ہیں کہ ان کے اعمال و کردار کا محاسبہ کیا جائے، یا ان پر کسی قسم کی نکتہ چینی کی جائے اور کبھی تو ایسا ہوتا ہے بعض مطلق العنان حکمران اپنے آپ کو ”مقدس“ کے ہالہ میں قرار دے کر سادہ لوح لوگوں کے ذہن میں یہ بات بٹھادیتے ہیں کہ وہ خدا کی مقدس مخلوق ہیں اور ہر قسم کے محاسبہ سے ماوراء۔ اس طرح سے وہ سیدھے سادے اور بھولے بھالے عوام کے افکار و عقول پر پردے ڈال دیتے ہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ بعض لوگ ”طاقت“ کو ”حق“ سمجھتے ہیں اور ہر کامیاب اور فاتح فرد یا گروہ کو برحق جانتے ہیں اور یہی طرزِ تفکر اس بات کا باعث بن جاتا ہے کہ وہ اجتماعی اور معاشرتی حساب و کتاب میں زبردست غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔

ظالم اور جاہر بادشاہ اور حکمران لوگوں کی اس فکری ناتوانی اور کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جہاں پر بھی وہ قدم رکھتے ہیں وہاں پر ہی فساد برپا کر دیتے ہیں، لوگوں کو بے راہروی میں مبتلا کر دیتے ہیں اور وہاں کی سر زمین کو تہہ و بالا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں ملکہ سبا کی زبانی یہ بات نقل ہوئی ہے کہ:

قَالَتْ إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعْرَظَ أَهْلِهَا آذِلَّةً ۗ

وَكَذَلِكَ يَفْعَلُونَ

”جب بادشاہ کسی آباد علاقے میں داخل ہوتے ہیں اسے تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں اور وہاں کے معزز لوگوں

کو ذلیل کر دیتے ہیں اور ان کا کام ہی یہی ہے۔“ (نمل ۴۴)

[۱] بحار الانوار، جلد ۷۵، ص ۴۶۔ کتاب الروضہ کلمات الروضہ حضرت علیؑ، حدیث ۵۷

اگرچہ یہ گفتگو بھی خود ایک ظالم بادشاہ کی زبانی نقل ہوئی ہے لیکن قرآن مجید میں اس کا ذکر بغیر کسی تنقید اور نکتہ چینی کے اور دوسرے کسی ظالم بادشاہ کی اپنے جیسے لوگوں کی معرفت اور شناخت اس کے حقیقت ہونے کے اعتراف کی دلیل ہے۔

اسی لیے ملکہ سب نے کہا: ”میں سلیمان کی آزمائش کرنا چاہتی ہوں اور دیکھنا چاہتی ہوں کہ آیا وہ واقعاً پیغمبر ہیں یا عام دنیاوی بادشاہ؟ میں ان کے لیے کچھ تحفے روانہ کر کے معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ اس بارے میں ان کا کیا رد عمل ہوتا ہے کیونکہ دنیاوی بادشاہوں کے دل و دماغ ہمیشہ مقام و منصب، تحفے تحائف اور زریزوریات کے گروہی ہوتے ہیں، جبکہ انبیاء کو صرف امتوں کی اصلاح مقصود ہوتی ہے۔“

## ۱۹۔ گمراہ دوستوں کا حجاب

ارشاد ہوتا ہے:

آیات

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلَى يَدَيْهِ يَقُولُ يَلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُولِ سَبِيلًا ﴿٢٤﴾ يُؤْيَلِي لِيَتَّبِعُنِي لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا ﴿٢٥﴾ لَقَدْ أَضَلَّنِي عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ إِذْ جَاءَنِي ۗ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِلْإِنْسَانِ خَذُولًا ﴿٢٦﴾ (سورہ فرقان ۲۴ تا ۲۹)

ترجمہ

اس دن کو خاطر میں لاؤ جب ظالم شدید حسرت کی وجہ سے اپنے ہاتھوں کو دانتوں سے کاٹے گا اور کہے گا کاش میں نے رسول خدا کے ساتھ کاراستہ اختیار کیا ہوتا۔ ہائے افسوس! کاش کہ میں نے فلاں (منحرف شخص) کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا۔ اس نے تو مجھے حق کی یاد سے گمراہ کیا ہے جبکہ معرفت و آگاہی میرے پاس آچکی تھی اور شیطان تو ہمیشہ انسان کو چھوڑتا چلا آ رہا ہے۔

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

یہ آیات قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر کی جھلک کو پیش کر رہی ہیں، ایسا منظر کہ جس میں ظالم لوگ اپنی کارستانیوں کی وجہ سے سخت حسرت اور افسوس کا اظہار کریں گے اور وہ بھی اس حد تک کہ اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے دانتوں سے کاٹیں گے۔

”یعض“، ”عض“ (بروزن حظ) کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں دانتوں سے کاٹنا اور یہ تعبیر عربی اور فارسی (نیز اردو) میں سخت

افسوس اور پشیمانی سے کننا یہ ہے کیونکہ عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی سخت مشکل میں پھنس جاتا ہے (اور مشکل بھی وہ جو اس کی اپنی غلطی کی وجہ سے پیش آ جاتی ہے) تو وہ یا تو اپنی انگلیوں کو کاٹتا ہے یا پھر ہتھیلی کی پشت کو۔ شاید یہ اس لیے کرتا ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں کو تنبیہ کرے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟

ہاں البتہ اگر وہ مشکل زیادہ سخت نہ ہو تو ممکن ہے کہ صرف ہاتھ کی انگلیوں کے سرے کو ہی کاٹے جیسا کہ سورہ آل عمران کی ۱۱۹ آیت میں بعض کفار کے بارے میں مذکور ہے کہ:

**وَإِذَا خَلَوْا عَصَوْا عَالِيَكُمْ مِنَ الْعَبِيْطِ ط**

”جب وہ خلوت میں جاتے ہیں تو تمہارے اوپر سخت غصے کی وجہ سے وہ اپنی انگلیوں کے سروں کو دانتوں سے کاٹتے ہیں۔“

یا ایک ہتھیلی کی پشت کو کاٹتے ہیں اور اگر مصیبت بہت ہی زیادہ ہو تو کبھی اس ہتھیلی کو اور کبھی اس ہتھیلی کو کاٹتے ہیں اور زیر بحث آیت میں ”بیڈیہ“ (دونوں ہاتھ) کا لفظ آیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بروز قیامت ان کی مصیبت نہایت درجہ شدید ہوگی۔ عام طور پر اس کام کے ساتھ ایسے جملے استعمال ہوتے ہیں جن کا مفہوم اپنی سرزنش ہوتا ہے اور تعصب کے وسائل و ذرائع سے گفتار اور عمل ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی قیامت میں ایسا ہی کہیں گے ”اے کاش کہ ہم نے پیغمبر کے ساتھ کاراستہ اختیار کیا ہوتا اور اے کاش کہ فلاں شخص کا اپنے دوست کے لیے انتخاب نہ کیا ہوتا، حالانکہ خدا کی آیات بھی ہمارے پاس پہنچ چکی تھیں جو ہماری سعادت اور خوش قسمتی اور خوش بختی کی ضامن تھیں۔ لیکن اس گمراہ دوست نے ہمیں بیداری کی اجازت نہیں دی۔“

اس طرح سے وہ اپنی بدبختی اور شقاوت کا اصل عامل اپنے گمراہ کن دوست کو ہی سمجھیں گے جس نے ان کی آنکھوں کے آگے پردہ ایجاد کر دیا تھا اور وہ جمال حق کے مشاہدہ سے محروم رہے۔

اس آیت میں ”فلاں“ سے کون مراد ہے، اس بارے میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں۔

ایک قول تو یہ ہے کہ اس سے مراد شیطان ہے جسے انسان نے بطور دوست کے انتخاب کیا ہوا تھا کیونکہ اسی آیت کے آخر میں ہم پڑھتے ہیں ”وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِلْإِنْسَانِ خَذُولًا“ یعنی شیطان انسان کو مشکلات میں چھوڑ ہی دیتا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہی شخص ہے جو آیت کے شان نزول میں بیان ہوا ہے۔ (یعنی ”عقبہ“ جو ایک مشہور کافر تھا اور اس نے اسلام قبول کر لیا، لیکن اپنے دوست ”ابی“ کی خاطر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دامان شفقت کو چھوڑ کر مرتد ہو گیا اور جنگ بدر میں مارا گیا، جبکہ اس کا دوست ”ابی“ بھی جنگ احد میں قتل کر دیا گیا)۔ [۱]

[۱] تفسیر مجمع البیان (انہی آیات کے ذیل میں)۔ بعض مورخین کے مطابق ”ابی“ وہ تھا شخص ہے جسے پیغمبر اسلام نے اپنی پوری زندگی میں

اپنے ہی ہاتھوں سے قتل کیا تھا۔ ملاحظہ ہو تفسیر روح البیان، جلد ۶، ص ۲۰۵

لیکن جیسا کہ بہت سے مفسرین کا قول ہے۔ آیت کا بظاہر مفہوم کلی ہے اور تمام گمراہ کن اور دل میں وسوسہ پیدا کرنے والے دوستوں کو بھی شامل ہے اور شان نزول کسی بھی صورت میں آیت کو خاص نہیں کرتا، خصوصاً جبکہ ”شیطان“ کا معنی وسیع اور عمومی ہے جو تمام انسانی اور جناتی شیطانوں کو شامل ہے اور پھر کلمہ ”فلان“ پر زور دیا گیا ہے جو نکرہ کی صورت میں آیا ہے اور آیت کے مفہوم کے عام ہونے پر ایک واضح قرینہ ہے۔<sup>[۱]</sup>

سورہ انعام کی ۱۳۷ آیت میں ہم پڑھتے ہیں:

**وَكَذَلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ أَوْلَادِهِمْ شُرَكَاؤُهُمْ لِيَبْزُدُوهُمْ**

**وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ط**

”اسی طرح مشرکین کے شریک کاروں نے ان کی اولاد کے قتل کو ان کی آنکھوں میں مزین کر دیا ہے تاکہ وہ

انہیں ہلاک کر ڈالیں اور ان کا دین ان پر مشتبہ کر دیں۔“

اس آیت کی تفسیر میں بتایا گیا ہے کہ مشرکین کے شریک کار لوگوں سے مراد بت خانوں اور بتکدوں کے متولی ہیں جو انہیں راہ راست سے بھٹکاتے اور گمراہ کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی اولاد کو بتوں کی بھینٹ چڑھائیں اور اس طرح سے وہ ان پر راہ حق کو مشتبہ کر دیں اور ان کی عقل و فکر پر پردے ڈال دیں۔

اس تفسیر کے مطابق آیت مذکورہ بھی ہمارے مدعا کا بہترین شاہد ہے، یعنی گمراہ دوست بھی حجاب بن جاتے ہیں۔

## تشریح

### ہمارے طرز فکر میں دوستوں کا کردار

اس بارے میں اسلامی روایات میں کئی تعبیرات ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ منحرف دوست اور گمراہ مشیر انسان کی فکر پر کیونکر ڈاکے ڈالتے ہیں، اس کی تشخیص کو کیسے دگرگوں کر دیتے ہیں اور انجام کار حق تک پہنچنے کی راہیں اس پر کیسے بند کر دیتے ہیں۔ چنانچہ چند ایک روایات کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

۱۔ حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام اپنے فرزند جناب حسن مجتبیٰؑ سے فرماتے ہیں:

**”یا بنی ایاک ومصادقة الاحمق فانه یرید ان ینفک فیضک... و ایاک**

## ومصادقة الكذاب فانه كالسواب يقرب عليك البعيد ويبعد عليك

### القريب

”میرے پیارے فرزند! احمق کی دوستی سے بچے رہو کیونکہ وہ تجھے نفع پہنچانا چاہے گا لیکن نقصان پہنچائے گا..... اور دروغ گو کی دوستی سے بھی بچتے رہو، کیونکہ وہ سراب کی مانند ہے اور دور کی چیز تمہیں نزدیک اور نزدیک کی چیز دور کر کے دکھائے گا۔“ [۱]

۲۔ آپ ہی نے مالک اشتر کے نام تاریخی فرمان میں ”مشیروں“ کے بارے میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، ہمارے مدعا کی بہترین دلیل ہے:

## ”ولا تدخلن في مشورتك بخيلا يعدل بك عن الفضل ويبعدك الفقر،

### ولا جباناً يضعفك عن الامور ولا حريصاً يزين لك الشر بالجهور“

”بخیل کو اپنے مشوروں میں کبھی داخل نہ کرو کیونکہ وہ تمہیں احسان اور نیکی سے باز رکھے گا اور فقر و فاقہ سے ڈرائے گا۔ ڈرپوک آدمی سے بھی مشورہ نہ کرو کیونکہ وہ اہم کاموں میں تمہارے حوصلے پست کر دے گا اور حریص اور لالچی شخص سے بھی مشورہ نہ کرو کیونکہ وہ ظلم و ستم سے ملے ہوئے حرص کو تمہاری نگاہوں میں مزین کر دے گا۔“ [۲]

اس تعبیر سے بخوبی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ غلط اور منحرف قسم کے مشیر انسانی فکر پر کیونکر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور انسان کی معرفت کے لیے کیسے پردے بن سکتے ہیں۔

۳۔ ایک اور حدیث میں آپ ہی فرماتے ہیں:

## ”مجالسة الاشرار تورث سوء الظن بالاخيار“

”غلط اور شریر قسم کے لوگوں کے ساتھ ہم نشینی انسان کو شریف اور نیک لوگوں سے بدظن کر دیتی ہے۔“ [۳]

۴۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

[۱] نوح البلاغ، کلمات قصار، جملہ ۳۸

[۲] نوح البلاغ

[۳] سفینۃ البحار، جلد ۱، ص ۱۶۸

«المرء علی دین خلیلہ وقرینہ»

”انسان اپنے دوست اور ساتھی کے دین پر ہے۔“ [۱]

اس طرح سے کسی صالح یا غیر صالح دوست کی دوستی کے اچھے یا برے اثرات جو انسان کے طرزِ فکر اور اس کی شناخت و معرفت پر اثر انداز ہو سکتے ہیں بخوبی واضح ہو جاتے ہیں۔

## پروپیگنڈے اور ماحول کا پردہ

پہلے تو مندرجہ ذیل آیات کو گوش جان سے سماعت کرتے ہیں:

### آیات

(۱) قَالَ فَإِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْ بَعْدِكَ وَأَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿۸۵﴾ -----  
فَأَخْرَجَ لَهُمْ عَجَلًا جَسَدًا لَّهُ خَوَارٍ فَقَالُوا هَذَا إِلَهُكُمْ وَإِلَهُ مُوسَىٰ ۗ  
فَنَسِيٓءٌ ﴿۸۶﴾ (سورہ طہ ۸۵ تا ۸۸)

(۲) فَخَرَجَ عَلَىٰ قَوْمِهِ فِي زِينَتِهِ ۖ قَالَ الَّذِينَ يُرِيدُونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يَلِيتَ  
لَنَا مِثْلَ مَا أُوتِيَ قَارُونُ ۖ إِنَّهُ لَذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ﴿۴۹﴾ (سورہ قصص ۴۹)  
(۳) فَلَبَّآ أَلْقَوْا سِحْرًا وَاعْيَنَ النَّاسِ وَأَسْتَرْهَبُوهُمْ وَجَاءُوا بِسِحْرٍ عَظِيمٍ ﴿۱۱۶﴾  
(سورہ اعراف ۱۱۶)

(۴) وَقَالَتْ طَّٰفِثَةُ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمَنُوا بِالَّذِي أُنزِلَ عَلَيَّا الَّذِينَ آمَنُوا  
وَجَهَّ النَّهَارِ وَكَفَرُوا وَآخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۴۲﴾ (سورہ آل عمران ۴۲)  
(۵) أَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِي هُوَ مَهِينٌ ۗ وَلَا يَكَاذِبِينَ ﴿۵۲﴾ فَلَوْلَا أُلْقِيَ عَلَيْهِ  
أَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ أَوْ جَاءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِينَ ﴿۵۳﴾ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهُ

[۱] اصول کافی، جلد ۲، ص ۵۷۳-۳۔ باب مجالسہ اہل المعاصی، حدیث ۳



فَاطَا عَوْكَاهُ اِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَسِقِيْنٌ ﴿٥٢﴾ (سورہ زخرف ٥٢ تا ٥٢)

ترجمہ

(1) فرمایا ہم نے تیرے بعد تیری قوم کی آزمائش کی اور سامری نے انہیں گمراہ کیا اور ان کے لیے ایک گوسالے کا مجسمہ تیار کیا کہ جس کی آواز گوسالے جیسی آواز تھی۔ اور ان لوگوں سے کہا یہ تمہارا اور موسیٰ کا خدا ہے اور اس نے (جو پیمان خدا سے باندھا ہوا تھا) فراموش کر دیا۔

(2) (قارون) اپنی تمام زینت کے ساتھ اپنی قوم کے سامنے ظاہر ہوا جو لوگ دنیاوی زندگی کے طالب تھے انہوں نے کہا اے کاش! جس طرح قارون کو عطا ہوئی ہے، ہمیں بھی عطا ہو جاتی، یقیناً اس کا اس دنیا میں بہت بڑا حصہ ہے۔

(3) (موسیٰ نے) کہا تم ڈالو۔ جب انہوں نے اپنے جادو کے ساز و سامان کو زمین پر ڈالا، لوگوں کی آنکھیں بند کر دیں اور انہیں ڈرایا اور ایک عظیم سحر کو وجود میں لائے۔

(4) اہل کتاب میں سے (یہودیوں کے) ایک گروہ نے کہا (جاؤ اور بظاہر) دن کے اول حصے میں ایمان لے آؤ اس چیز پر جو مونثین پر نازل ہوئی ہے اور دن کے آخری حصے میں کافر ہو جاؤ شاید کہ وہ (اپنے دین سے) پلٹ جائیں۔

(5) (فرعون نے) کہا میں اس شخص سے برتر ہوں جو پست خاندان اور طبقہ سے ہے اور فصیح طریقے پر بھی گفتگو نہیں کر سکتا۔ اگر وہ سچ کہتا ہے تو اس پر سونے کے ننگن کیوں نہیں اترے یا اس کے ساتھ فرشتے کیوں نہیں آئے۔ اس (فرعون) نے اپنی قوم کو احمق بنایا اور قوم نے اس کی اطاعت کی، کیونکہ وہ فاسق قوم تھی۔

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

زہریلا پروپیگنڈا

پہلی آیت سامری کی داستان کی طرف اشارہ کر رہی ہے، وہی جاہ طلب اور خود غرض انسان، جس نے موسیٰ علیہ السلام کی چالیس شبانہ روز غیبت سے ناجائز فائدہ اٹھایا جب وہ معیاد گاہ الہی یعنی کوہ طور پر اپنے رب سے ملنے گئے ہوئے تھے۔ چنانچہ اس نے اس فرصت سے فائدہ اٹھا کر بنی اسرائیل کے تمام زروز یورات کو جمع کر کے گوسالے (بچھڑے) کی شکل کا ایک بت بنایا۔ وہ اسے مخصوص حالت میں ہوا کے رخ پر

کھڑا کر دیتا تھا جس سے بچھڑے سے ملتی جلتی آواز نکلتی تھی۔ قرآن نے اس آواز کو ”خوار“ (بروزن غبار) کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جس کا معنی ہے ”گائے کی آہستہ آواز“۔

اس نے اپنے کام کے لیے خاص قسم کی فرصت سے فائدہ اٹھایا۔ جب جناب موسیٰ علیہ السلام کی غیبت کو پینتیس (۳۵) دن گزر گئے اور موسیٰ علیہ السلام کی توحیدی تبلیغات کے اثرات بنی اسرائیل کے دلوں سے کم ہونے لگے تو اس نے یہ اقدام کیا، خصوصاً جبکہ پہلے یہ طے پا چکا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی کوہ طور پر قیام کی مدت تیس دن سے زائد نہ ہو لیکن خدا نے بنی اسرائیل کی آزمائش کے لیے دس راتوں کا اضافہ کر دیا اور چالیس راتیں مکمل ہوئیں۔

قرآن مجید کہتا ہے: ”خداوند عالم نے موسیٰ سے فرمایا: ہم نے تیرے بعد تیری قوم کی آزمائش کی اور اسے سامری نے گمراہ کیا۔“ بہر حال ایک عظیم گروہ کو بے راہروی کا شکار کر دینا اور اسے راہ راست سے گمراہ کر دینا کوئی آسان بات نہیں (اور بعض روایات کی رو سے گمراہ ہونے والوں کی تعداد چھ لاکھ تھی) اور انہیں خالص توحید کی راہ سے ہٹا کر خالص شرک کی راہوں پر ڈال دینا کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ اس ماجرے سے متعلق جو آیات سورہ طہ اور دوسری سورتوں میں بیان ہوئی ہیں اور تاریخوں اور تفسیروں میں اس کا ذکر آیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے لوگوں کے افکار پر ڈاکہ ڈالنے اور ان کی دماغی صفائی کے لیے ایک خاص قسم کے پروپیگنڈے سے کام لیا جس سے لوگوں کی عقل پر پردے پڑ گئے اور وہ آہستہ آہستہ باور کرنے لگے کہ یہ بچھڑا ہی موسیٰ علیہ السلام کا خدا ہے۔

اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ ہم مندرجہ بالا آیت میں پڑھتے ہیں کہ ایسا صرف سامری ہی نے نہیں کیا، بلکہ بنی اسرائیل بھی اس کے ہم آواز ہو کر کہنے لگے ”یہ بنی اسرائیل اور موسیٰ کا خدا ہے۔“ (”قالوا“ کا لفظ اس بات کا گواہ ہے)۔

یہ تعبیر سامری کے پروپیگنڈے کی تاثیر کی واضح دلیل ہے۔ اس نے مندرجہ ذیل وجوہات سے خوب فائدہ اٹھایا:

۱۔ موسیٰ علیہ السلام کی غیبت سے استفادہ۔ ۲۔ ان کی مدت قیام کا چالیس راتوں تک طویل ہو جانا۔ ۳۔ زور زور سے استفادہ کرنا جو کہ عوام الناس اور خاص کر بنی اسرائیل کے نزدیک زبردست اہمیت کے حامل تھے اور ان کی آنکھوں اور دلوں میں سمائے ہوئے تھے۔ ۴۔ گمراہی کے لیے مناسب موقع کی تلاش، چنانچہ جب بنی اسرائیل نے دریائے نیل سے نجات پائی اور ان کا ایک ایسی قوم کے پاس سے گزر ہوا جو بتوں کی پرستش کر رہی تھی تو انہوں نے بھی موسیٰ سے بتوں کے بنانے کا تقاضا کیا۔ سورہ اعراف کی ۱۳۸ آیات میں ہے:

”قالوا یا موسی اجعل لنا الہا کم لہم الہة“

”اے موسیٰ! ہمارے لیے بھی ایسا خدا بناؤ جیسے ان کے لیے خدا ہیں۔“

۵۔ سامری کا بنی اسرائیل میں مقام و منزلت اور اس پر ان کا اس قدر اعتماد کہ وہ اس کے لیے کسی حد تک تقدس مآبی کے بھی قائل تھے

اور اسے جبرائیل علیہ السلام کا پرورش یافتہ بھی جانتے تھے۔ [۱]

[۱] تفسیر ابوالفتوح رازی، جلد ۷، ص ۸۲، تفسیر روح البیان، جلد ۵، ص ۱۴۲۔ دائرۃ المعارف، دہجد مادہ سامری

۶۔ ضعیف العقیدہ لوگوں کا ”محسوس خدا“ سے انس و تعلق اور ایسے خدا سے بے توجہی جو جسمانی صفات سے مکمل طور پر منزہ اور مبرا ہے۔ اسی لیے تو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ تقاضا کر ڈالا کہ وہ انہیں خدا کا دیدار کرائیں تاکہ وہ خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ (بقرہ ۵۵)

یہ اور اس طرح کی کئی دوسری وجوہات تھیں جن کے ذریعہ سے وہ لوگ کلی طور پر خدائے واحد و یکتا سے منحرف ہو گئے اور سامری کے مسموم پروپیگنڈے کا شکار ہو گئے اور بت پرستی کو اپنالیا۔

بہی وجہ ہے کہ جب جناب موسیٰ واپس لوٹے اور ان کی برائیوں اور کجروی کو دیکھ کر تڑپ اٹھے اور انہیں ان کی سخت نازیبا حرکت کی طرف متوجہ کیا تو وہ یوں متنبہ ہوئے گویا نیند سے بیدار ہو گئے اور پکار پکار کر اپنی ندامت اور پشیمانی کا اظہار کیا، بلکہ اس حد تک راضی ہو گئے کہ توبہ کی قبولیت اور گناہوں کے کفارہ کے طور پر آپس میں ایک دوسرے کے خلاف تلوار چلائیں اور مرتدین کے ایک گروہ کا خون زمین پر بہا ڈالیں۔ (سورہ بقرہ ۵۵)

بہر حال یہ آیت غلط پروپیگنڈہ کے حجاب ہونے پر روشن دلیل ہے۔

اسی سلسلے کی دوسری آیت میں بنی اسرائیل کے مشہور دو متمند قارون کی بات ہو رہی ہے جو ایک دن بنی اسرائیل کے سامنے اپنی دولت و ثروت کی نمائش کے لیے کمر بستہ ہوا۔

تاریخوں میں اس بارے میں کئی داستانیں اور افسانے منقول ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے جسے بعض مورخین نے لکھا ہے کہ: ”قارون ایک دن اپنے چار ہزار دوستوں اور نوکروں چاکروں سمیت بنی اسرائیل کے درمیان ظاہر ہوا، جبکہ ان میں سے ہر ایک قیمتی گھوڑے پر سوار سرخ لباس پہنے ہوئے تھا۔ ان کے ساتھ کنیزوں کا بھی ایک جھرمٹ تھا، جو سفید رنگ کے خچروں پر سوار تھیں، جن کی زمینیں سونے کی تھیں اور مختلف قسم کے طلا و جواہرات کے زیوروں سے مزین تھیں۔“ [۱]

بعض مورخین نے ان افراد کی تعداد ستر ہزار بھی لکھی ہے اور اگر ہم اس تعداد کو صحیح نہ بھی مانیں تب بھی قرآنی تعبیر ”فخر ج علی قومہ فی زینتہ“ (وہ اپنی تمام قسم کی زینت کے ساتھ اپنی قوم میں ظاہر ہوا) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منظر عام اور معمولی قسم کا نہیں تھا۔ اس نے ایسا شاید اس لیے کیا تاکہ موسیٰ علیہ السلام کی غربت کا مذاق اڑائے، یا بنی اسرائیل میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کر کے اپنی پوزیشن کو مستحکم کرے، یا پھر قدرت و طاقت اور ثروت و دولت کی نمائش کا جنون تھا جو عام طور پر صاحبان قدرت و ثروت میں پایا جاتا ہے۔ صورت حال خواہ کچھ بھی ہو اور مقصد خواہ کوئی بھی ہو، مذکورہ منظر اور اس کے ساتھ اس حد تک پروپیگنڈہ ہم آہنگ تھا کہ اس نے بنی اسرائیل کے بہت سے لوگوں کی عقلوں کو چرا لیا اور ان کی روح و فکر پر اس حد تک پردے ڈال دیئے کہ وہ اسے ”ذو حظ عظیم“ (بڑی قسمت والا) خوش قسمت، خوش بخت اور سعادت مند سمجھنے لگ گئے اور اس آرزو کی خواہش کرنے لگے کہ اے کاش! وہ بھی اس کی جگہ پر ہوتے۔

[۱] تفسیر فخر رازی، قرطبی اور روح المعانی کا سورہ قصص کی آیات کی تفسیر کا مطالعہ فرمائیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب اس کے دوسرے دن خداوند عالم نے جرائم کے ارتکاب اور خلاف ورزیوں کی وجہ سے قارون کو اس کے خزانے سمیت زمین کی گہرائیوں میں بھیج دیا تو سب لوگ خواب غفلت سے بیدار ہوئے اور اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ وہ اس کی جگہ پر نہیں تھے۔ اس طرح کے پروپیگنڈے کی تاثیر کا نہ تو اس زمانے میں انکار کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی کسی اور دور میں اور ماضی میں بھی اور حال میں بھی بہت کچھ ایسے ظالم و جابر لوگ ہیں جو لوگوں کے ذہنوں کو خراب کرنے اور انہیں احق اور بے وقوف بنانے کے لیے اس قسم کی نمائش کے ذریعہ پروپیگنڈے کا اہتمام کرتے ہیں۔ صرف زبردست مفکرین اور دانشور افراد ہی اس قسم کے عجایب کو اپنے اور دوسرے لوگوں کے اذہان و افکار پر نہیں پڑنے دیتے اور اس طرح کے مناظر کے پس پردہ اس قسم کے لوگوں کے اصلی چہرے کو دیکھ سکتے ہیں۔

تیسری آیت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جادو گروں کے ساتھ جنگ کے منظر کو بیان کر رہی ہے، ایسے جادوگر جنہیں موسیٰ کے ساتھ نمٹنے کے لیے فرعون نے کئی قسم کے لالچ دے کر ملک کے دور دراز حصوں سے بلا یا تھا۔ بعض روایات کی رو سے ان کی تعداد کئی ہزار تھی، اور ایک روایت کے مطابق ان کی تعداد پندرہ ہزار سے بھی اوپر تھی۔ (ممکن ہے کہ یہ تعداد خود جادو گروں، ان کے معاونوں اور ان کے ساتھ کام کرنے والوں کی ہو۔ اس بات کی طرف بھی توجہ رہنی چاہیے کہ اس زمانے میں جادو اور جادوگری کا رواج عروج پر تھا)۔

لوگوں کی ایک بڑی تعداد ایک عید کے دن، جبکہ سورج کافی بلند ہو چکا تھا، اس جنگ کو دیکھنے کے لیے میدان میں آچکی تھی۔ (جیسا کہ سورہ طہ کی ۵۹ ویں آیت میں ”یوم الزینۃ“ کی اور ”ضحیٰ“ کی تعبیر میں اس بات کو گواہ ہیں)۔ قرآن سے پتہ چلتا ہے کہ فرعون کو اطمینان تھا کہ وہ لڑائی میں کامیاب ہو جائے گا کیونکہ اس نے لوگوں پر اثر انداز ہونے کے لیے پروپیگنڈا کے تمام وسائل فراہم کیے ہوئے تھے۔ مندرجہ بالا آیت کہتی ہے ”جب جادو گروں نے اپنے فراہم کردہ جادو کے تمام ساز و سامان کو پھینکا لوگوں کی آنکھوں پر جادو چلایا، انہیں وحشت زدہ کر کے عظیم جادو کا مظاہرہ کیا۔“

آیت کے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے ”سحر“ اور ”استرہاب“ کے لفظوں کی اچھی طرح وضاحت ہونا ضروری ہے۔ لغوی طور پر ”سحر“ دو معنوں کے لیے آتا ہے، ایک تو دھوکا دینا اور دوسرا وہ جس کے وجود کے اسباب و عوامل غیر مرئی (نا قابل دید) اور رموز و مخفی ہوتے ہیں اور بعض ارباب لغت نے دونوں معانی کو ایک ہی اصل کی طرف لوٹایا ہے اور کہا ہے: ”جادو کی حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کی حقیقت کو دگرگوں کر دیا جائے اور اسے دوسری صورت میں پیش کیا جائے۔“ [۱]

جیسا کہ ہم تفسیر نمونہ کی پہلی جلد میں سورہ بقرہ کی آیت ۱۰۲ میں بیان کر چکے ہیں کہ جادو عام طور پر اجسام کے ناشاختہ فزیکل اور کیمیکل آثار اور خواص سے مل کر معرض وجود میں آتا ہے اور جادو گروہ لوگ تھے جو ان خاصیتوں اور اثرات سے مخربی واقف تھے اور اس سے خوب فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔ اندر سے خالی لکڑیوں اور چمڑے کی رسیوں کو فراہم کیا اور ان میں پارہ بھر دیا، چنانچہ پارہ نہایت ہی فرار کرنے والا مادہ ہوتا ہے۔ جب ان چیزوں پر دھوپ پڑی، یا شاید میدان مقابلہ میں گرم کرنے والی چیزیں بچھائی گئیں تھیں، اسی لیے وہ چیزیں متحرک

[۱] قاموس اللغۃ مفردات راغب، التحقیق فی کلمات القرآن الکریم اور تاج العروس کا مطالعہ فرمائیں۔

ہو کر ادھر ادھر دوڑنے لگیں۔ [۱]

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جادوگر لوگ اپنے ہاتھوں کی صفائی اور پھرتی سے ایسے مناظر دکھاتے ہیں جن میں ذرہ بھر بھی حقیقت نہیں ہوتی۔ ہم میں سے اکثر لوگوں نے ایسے مناظر دیکھے ہوں گے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عطریات کے ذریعہ یا مخصوص نباتات کی دھونی کے ذریعہ سے مخصوص کیمیکل مواد پھیلا دیا جاتا ہے جس سے حاضرین کی قوت بینائی، قوت سامعہ، بلکہ ان کے اعصاب پر تصرف کر لیا جاتا ہے اور انہیں غیر واقعی مناظر دکھائے جاتے ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ آنکھ کی مقناطیسیت اور ہنپاٹزم کے ذریعہ حاضرین کے دل میں کچھ چیزیں ڈالی جاتی ہیں جو ایسی حالت میں بہت ہی موثر ہوتی ہیں اور انہیں ایسے مناظر دکھائے جاتے ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

البتہ جادو کی ایک اور قسم بھی ہے جو شاید جنات یا بعض روحوں کے ذریعہ انجام پاتی ہے۔ (جادوگروں کے جادو کے یہ پانچ عمدہ طریقے ہیں)۔

کبھی ”سحر“ کا لفظ ان تمام معانی سے وسیع تر معنی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً جو شخص بہترین تقریر کرتا ہے اسے ”جادو بیان مقرر“ کہا جاتا ہے اور حدیث میں وارد ہوا ہے کہ ”چغل خوری“، ”جادو“ کی ایک قسم ہے، کیونکہ دوستوں کے درمیان جدائی ڈالتی ہے۔ لیکن جو چیز اس آیت میں بیان کی گئی ہے وہ ”سحر و اعدین الناس“ (لوگوں کی آنکھوں پر جادو کیا) وہی قوت باصرہ (حس بینائی) میں تصرف اور لوگوں کی آنکھوں میں حقیقی مناظر کو تبدیل کرنا ہے۔ نہ کہ انہوں نے واقعاً کوئی سانپ یا اثر دہا پیدا کر لیا تھا۔ ہماری اس بات کی شاہد سورہ طہ کی ۶۶ ویں آیت ہے، ارشاد ہوتا ہے:

**”فاذا حبالہم وعصیہم یخیل الیہ من سحرہم انہا تسعی“**

”تو اس وقت ان کی رسیاں اور ڈنڈے ان کے جادو کی وجہ سے ایسے معلوم ہوتے تھے کہ تیزی سے دوڑ رہے

ہیں۔ (حالانکہ وہ چل نہیں رہے تھے۔ اس پارے وغیرہ کے اثر کی وجہ سے حرکت کر رہے تھے)۔“

”استرہبوا“ ”رہب“ (بروزن عہد یا بروزن قح) کے مادہ سے ہے، جس کے معنی ہیں ایسا خوف جس میں پرہیز اور اضطراب ملا ہوا ہو۔ (جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے) اور بہت سے مفسروں نے ”استرہاب“ کو ”ارہاب“ کے معنی میں لیا ہے، یعنی خوف اور اضطراب پیدا کرنے کے معنی میں۔ اس تعبیر سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے سحر و جادو کے علاوہ جیسا کہ اوپر اشارہ ہو چکا ہے، نہایت ہی وسیع پیمانے پر پروپیگنڈے سے بھی کام لیا ہے (اور اکثر طور پر جادوگر ایسا ہی کرتے ہیں اور ان کی کامیابی کا اکثر و بیشتر دار و مدار اسی قسم کے پروپیگنڈے پر ہوتا ہے)۔

[۱] روح المعانی، جلد ۹، ص ۲۲۔ تفسیر فخر رازی جلد ۱۴، ص ۲۰۳۔ روح البیان جلد ۳، ص ۲۱۳ اور تفسیر المنار جلد ۹، ص ۶۶ اور کئی دوسری

بعض کتابوں میں ملتا ہے کہ جس میدان کا انتخاب کیا گیا تھا وہ ایک مربع میل پر مشتمل تھا۔ (ایک میل لمبا اور ایک میل چوڑا)۔ [۱] اسی طرح بعض اور کتابوں میں ملتا ہے کہ جادو کے لیے جمع شدہ لکڑیاں اور رسیاں جو سانپ اور اژدھا کی شکل میں تھیں ان کا ایک پہاڑ بن چکا تھا۔ [۲] پھر مندرجہ ذیل قسم کی گفتگو سے لوگوں کو حد سے زیادہ اپنے زیر اثر کر لیا اور ان کی عقول و افکار کو گمراہ کرنے اور ان پر پردہ ڈالنے کی پوری پوری کوشش کی تاکہ واقعات اور حقائق کی معرفت کی قدرت اور طاقت بھی ان سے سلب کر لی جائے۔

”لوگو! میدان سے دور رہو! کہیں سانپ اور اژدھے تم پر حملہ نہ کر دیں کیونکہ وہ نہایت ہی خطرناک اور وحشت ناک ہیں.....“

یہ اور اس قسم کی دوسری باتیں جن کی طرف بعض تفسیروں میں مختلف اشارے کیے گئے ہیں۔ [۳]

چوتھی آیت اسلام کے مقابلے میں یہودیوں کے اس پروپیگنڈا کی قلعی کھول رہی ہے جس کے لیے انہوں نے لوگوں کو متزلزل کرنے کے لیے ایسا کر لیا تھا۔ انہوں نے یہ سازش کی کہ علی الصبح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جا کر ظاہری طور پر اسلام لے آئیں لیکن اسی دن کے آخر میں اسلام سے برگشتہ ہو جائیں۔ جب ان سے پوچھا جائے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا، تو وہ جواب دیں کہ ہم نے محمد (ص) کی صفات کو نزدیک سے دیکھا ہے لیکن وہ ہماری دینی کتابوں اور ہمارے دانشوروں کے اقوال سے مطابقت نہیں کرتی تھیں، لہذا ہم واپس آ گئے۔

پروپیگنڈے کا یہ انداز اس بات کا موجب بنے گا کہ لوگ یہ کہیں گے: ”جو لوگ اہل کتاب اور پڑھے لکھے تھے اور ہم سے بہتر سمجھتے تھے انہوں نے اس دین کو باطل پایا، لہذا اس کی کوئی محکم بنیاد نہیں ہے۔“

اس طرح سے سادہ لوح افراد کے افکار کو گمراہ کر کے ان کی عقل اور ان کی قوت تشخیص پر پردے ڈال دیئے جاتے ہیں۔

”وقالت طائفة“ کے جملے میں لفظ ”طائفة“ ”طواف“ کے مادہ سے ہے۔ جس کے معنی ہیں ایسا گروہ جو ایک حلقہ کی صورت میں ہوتا ہے، گویا کسی بات کے گرد طواف کر رہا ہوتا ہے۔ بعض مفسرین کے مطابق یہاں پر طائفہ سے مراد خیمہ کے یہودیوں کا ایک بارہ نفری گروہ تھا، یا مدینہ کے یہودیوں کا گروہ تھا، یا پھر نجران کے یہودیوں کا گروہ تھا جنہیں بیت المقدس سے خانہ کعبہ کی طرف قبلہ کی تبدیلی پر سخت دکھ ہوا اور انہوں نے ایسی سازش تیار کی۔ [۴]

”وجہ النهار“ (دن کا چہرہ) کی تعبیر سے دن کے آغاز کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ چہرہ ہی وہ پہلی چیز ہوتا ہے جس سے انسان روبرو ہوتا ہے اور نہایت ہی باعزت عضو ہے۔ البتہ آیت اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بتاتی کہ انہوں نے ایک دوسرے سے اس طرح کی پیشکش کی، لیکن قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پیشکش پر عملدرآمد کیا گیا، وگرنہ بعید معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں اس اہمیت سے بیان ہو اور بعد کی

[۱] تفسیر روح المعانی، جلد ۹، ص ۲۲

[۲] تفسیر المنار، جلد ۹، ص ۶۶، ان باتوں کو ابن اسحاق نامی ایک مفسر نے نقل کیا ہے۔

[۳] تفسیر فخر رازی، جلد ۱۴، ص ۲۰۳

[۴] تفسیر فخر رازی جلد ۸، ص ۸۵، روح المعانی، جلد ۳، ص ۶۷، تفسیر قرطبی، جلد ۲، ص ۵۴، ۱۳



آیات اس بات کو بیان کر رہی ہیں۔

لیکن ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ اس قسم کے پروپیگنڈے کا کوئی شایانِ شان اثر نہیں ہوا اور صدر اسلام کے پاک دل اور پاکباز مومنین پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

اس سلسلہ کی پانچویں اور آخری آیت ایک بار پھر فرعون کی موسیٰ علیہ السلام سے جنگ کا ایک اور گوشہ بیان کر رہی ہے۔ یعنی جب لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دین کو قبول کر رہے تھے اور یہ بات فرعون کے لیے ناگوار تھی اور اس نے اپنے پروپیگنڈے کے ذریعہ لوگوں کے افکار کو منحرف کرنے کی کوشش کی تھی اور اس نے مختلف قسم کے پروپیگنڈوں کو آزما دیا، جن میں ایک یہ ہے جسے درج ذیل آیات میں بیان کیا گیا ہے۔

اس نے پہلے تو اپنی نام نہاد خاندانی شرافت کو پیش کیا اور کہا: ”اس میں تو شک ہی نہیں کہ میں اس شخص (موسیٰ) سے کئی درجے زیادہ برتری رکھتا ہوں، کیونکہ اس کا تعلق ایک پست (بنی اسرائیل کے غلام اور چرواہے) خاندان سے ہے۔“

”اور یہ بھی ہے کہ وہ کھل کر اور پوری وضاحت سے بھی نہیں بول سکتا اور میں اس سے زیادہ فصیح ہوں۔“

”اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے پاس سونے کے کنگن کیوں نہیں ہیں جو اس کی شخصیت کی علامت ہوتے؟“

”اور ان سب سے بالاتر یہ کہ اگر وہ سچ کہتا ہے کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا رسول ہے تو اس کے ساتھ فرشتے کیوں نہیں آئے تاکہ وہ اس کی باتوں کی تصدیق کرتے۔“

گویا وہ اس طرح کے چار نام نہاد دلائل کے ذریعے موسیٰ کے دعوائے نبوت کو جھوٹا ثابت کر رہا تھا۔

قرآن مجید انہی آیات میں کہتا ہے کہ ”اس نے اپنی قوم کا استخفاف کیا، لہذا قوم نے اس کی اطاعت کی۔“

”استخفاف“، ”خفیف“ کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں سبک یعنی ہلکا۔ اور یہاں پر یہ مراد ہے کہ فرعون کی کوشش یہ تھی کہ وہ قوم کے افراد کو سبک سر (اتحق) بنا دے۔ اسی لیے تفسیر مجمع البیان میں پڑھتے ہیں کہ اس جملہ کے یہ معنی ہیں کہ ”فرعون نے افراد قوم کی عقلوں کو سبک (ہلکا) سمجھا، یا ہلکا کر دیا، تاکہ وہ اس کی اطاعت کریں۔“<sup>[۱]</sup>

تفسیر ”فی ظلال القرآن“ میں ہے کہ ظالم اور جابر حکمرانوں کی طرف سے عوام الناس کو بے قوف بنانے کا شیوہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ ان کا پہلا کام تو یہ ہوتا ہے کہ وہ عوام کو معرفت کے تمام طریقوں سے باز رکھتے ہیں اور حقائق کے درمیان پردے حائل کر دیتے ہیں تاکہ لوگ سب کچھ فراموش کر دیں اور ان کے بارے میں کوئی بات نہ کریں۔ پھر وہ اپنی مرضی کے مسائل عوام میں پیش کرتے ہیں اور انہیں لوگوں کے ذہن میں بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کے افکار اسی کے مطابق ڈھل جائیں۔ اس کے بعد لوگوں کو سبک سر اور بے قوف بنانا آسان ہو

[۱] تفسیر مجمع البیان، جلد ۹، ص ۵۱



جاتا ہے اور ان پر حکومت کرنا کوئی مشکل نہیں ہوتا اور جدھر کو چاہیں ان کا رخ پھیر دیا جاتا ہے۔<sup>[۱]</sup>

لیکن مزے کی بات ہے کہ قرآن آیت کے آخر میں کہتا ہے کہ: ”اگر قوم فرعون نے اس کے اس قسم کے پروپیگنڈے کو قبول کر لیا تھا اور اس کی اطاعت کرنے لگ گئی تھی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ گناہ گار اور فاسق قوم تھی۔“

اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مومن، با مقصد اور با معرفت افراد اس قسم کے پروپیگنڈے کا ہرگز شکار نہیں ہوتے۔ یہ فسق اور گناہ ہی ہیں جو اس قسم کے بے بنیاد پروپیگنڈے کی راہیں ہموار کرتے ہیں۔

بالفاظ دیگر جب ”نفس امارہ“ انسان کے اندر سے اور ”شیطانی وسوسے“ جیسے فرعون وغیرہ ہیں، اس کے باہر سے مل جاتے ہیں، تو حقیقت کے چہرے کو چھپا دیتے ہیں۔

## مزید تشریح

### حقائق کو چھپانے میں پروپیگنڈے کا اثر

پروپیگنڈے کے اثرات ہمارے زمانے میں اس قدر واضح ہیں کہ اس پر کسی بحث کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور ماضی میں بھی یہ مخفی نہیں تھے۔

جو ظالم اور جاہر حکمران اپنی حکومت کے لوگوں پر مسلط رکھنا چاہتے ہیں وہ کئی طرح کے پروپیگنڈوں سے کام لیتے ہیں تاکہ وہ لوگوں کے افکار اور اذہان کو گمراہ کریں؟ قدیمی مکتب خانوں سے لے کر محراب و منبر تک اور قہوہ خانوں میں قصہ کوؤں کی داستانوں سے لے کر علمی کتابوں تک۔

غرضیکہ تاریخ کی تحریف، ثناء خوان اور مداح، شعراء کے اشعار، لوگوں کے مقدس مقام اور عقیدت کے مراکز، جھوٹے اور خود ساختہ قصے کہانیاں، کرامات اور غیر حقیقی اقدار اور ہر طرح کے دوسرے ذریعوں سے اپنے مقصد کے حصول کے لیے تگ و دو کرتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ایک دیو کو پروپیگنڈا کی عظیم موجدوں سے فرشتہ کی صورت میں پیش کر دیا جاتا اور شیطان کو ایک مقدس انسان کے لبادے میں سجا کر لوگوں کے سامنے لے آتے۔

بعض مشہور اسلامی تاریخوں میں ملتا ہے کہ شام کے لوگ معاویہ کے اس قدر اطاعت گزار ہو چکے تھے کہ جب وہ صفین کی طرف جانے لگا تو ”وقت کی تنگی“ کے پیش نظر اس نے نماز جمعہ بدھ کے دن پڑھا دی (اور لوگوں نے بھی اس ”نماز جمعہ“ میں شرکت کی)۔ مروج الذہب میں مسعودی کی عبارت کے الفاظ درج ذیل ہیں:

[۱] تفسیر فی ظلال القرآن، جلد ۷ ص ۳۴۰

”ولقد بلغ من امرهم في اطاعتهم له انه صلى بهم عند ميسرهم الى

صفين الجمعة في يوم الاربعاء“

”لوگوں کی بنی امیہ سے اطاعت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ جب معاویہ صفین کی طرف جانے لگا تو اس نے لوگوں کو جمعہ کی نماز بدھ کے دن پڑھادی۔“ [۱]

اور یہ واقعہ بھی مشہور ہے، (اگر یہ مشہور تاریخی کتابوں میں نہ ہوتا تو اس کا ماننا مشکل تھا)۔

”کوئی ایک شخص اونٹ پر سوار ہو کر دمشق پہنچا اور لوگ اس وقت صفین سے واپس آرہے تھے۔ اچانک ایک شامی نے اس کا دامن پکڑ لیا اور کہا کہ ”یہ ناقہ (اونٹنی) میری ہے جو تو نے صفین میں مجھ سے لی تھی۔“ جھگڑا طویل ہو گیا اور معاملہ معاویہ تک جا پہنچا (شاید اس لیے کہ جھگڑے نے سیاسی رخ اختیار کر لیا تھا)۔ شامی شخص نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پچاس گواہ پیش کر دیئے جنہوں نے کہا کہ یہ اونٹنی اس (شامی) کی ہے اور معاویہ نے ان (پچاس) لوگوں کی شہادت کی بناء پر اس کا فیصلہ شامی کے حق میں دے دیا۔

کوئی نے پکار کر کہا ”معاویہ! یہ اونٹنی نہیں، اونٹ ہے اور تم خود اسے چل کر دیکھ لو۔ معاویہ سمجھ گیا کہ یہ شخص سچ کہتا ہے۔ لہذا اس نے کہا ”جو فیصلہ میں نے کرنا تھا کر دیا اور بات ختم ہو گئی۔“

جب لوگ منتشر ہو گئے تو معاویہ نے کسی کو بھیج کر اسے اپنے پاس بلایا اور اونٹ کی قیمت سے دو گنی رقم اسے دے کر کہا:

”اببلغ عليا اني اقا باه بماة الف ما فيهم من يفرق بين الناقة والنجمل“

”علیٰ کو میری طرف سے یہ کہہ دینا کہ میرے پاس تمہارے خلاف لڑنے کے لیے ایک لاکھ ایسے افراد موجود ہیں

جو اونٹ اور اونٹنی میں فرق نہیں کر سکتے۔“ [۲]

قصہ مختصر، گزشتہ تاریخ میں ہمیں بہت سے ایسے شواہد اور نمونے ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی لیڈر ایک عظیم ملت کے افکار اور اذہان کو کیونکر گمراہ کرتے رہے اور کس طرح انہیں سالہا سال تک گمراہیوں اور تاریکیوں میں سرگردان رکھے رہے، جس سے افراد ملت زبردست مصائب کا شکار رہے لیکن جب سیاسی حالات تبدیل ہوئے اور وہ جاہل شخص اقتدار سے جدا ہوا اور پروپیگنڈے کے پردے ہٹے تو ایسا معلوم ہوا کہ یہ افراد ملت خواب سے بیدار ہوئے ہوں اور جب ان کی نگاہ اپنے ماضی پر پڑی تو اس پر زبردست افسوس کا اظہار کیا اور سخت نادام اور پشیمان ہوئے۔

دور حاضر میں پروپیگنڈا مشینری اس قدر طاقتور ہے کہ بعض نام نہاد ترقی یافتہ ممالک میں ذرائع ابلاغ عامہ کچھ پڑھے لکھے اور

[۱] مروج الذهب مسعودی، جلد ۲، ص ۷۲، مطبوعہ مصر ۳۴۶

[۲] مروج الذهب جلد ۲ ص ۷۲۔ الامام علی صوت العدالة الانسانية جلد ۴، ص ۹۵۶

کسی حد تک باخبر افراد کو ایسے افراد کے انتخاب کے لیے، جو ذرائع کے مالک لوگوں کے منظور نظر ہوتے ہیں، ووٹوں کے صندوقوں تک لے جاتے ہیں، تاکہ وہ ان کے منظور نظر اور پسند کے افراد کو ووٹ دیں، حالانکہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ مکمل طور پر آزاد ہیں، جبکہ اس بارے میں قطعاً بے اختیار ہوتے ہیں۔

سمعی و بصری وسائل کی وسعت اور پیشرفت، نفسیات کے لیے فنون لطیفہ اور ظریفہ سے استفادہ نے پروپیگنڈے کے اثرات کو اس قدر وسعت دی ہے کہ باہر کے لوگ جو غیر جانبدارانہ رائے قائم کرنا چاہیں حیران اور پریشان ہو جاتے ہیں۔

یہ بات سیاسی مسائل کی حد تک محدود نہیں ہے، اقتصادی اور معاشی مسائل میں بھی اس نے اس قدر وسعت پیدا کر لی ہے کہ اچانک اور کسی قسم کی سوچ اور غور و فکر کی فرصت دینے بغیر پروپیگنڈے کی لہر معاشرے کو ایسی غیر پیداواری اشیاء کے مصرف کی ترغیب دلاتی ہیں جو بسا اوقات معاشرے کے لیے بے سود، بلکہ مضر اور نقصان دہ ہوتی ہیں اور اس طرح سے معاشرے پر غیر صحیح اور ناقص اقتصاد مسلط کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

”جھوٹی اقدار“ (مثلاً ”فیشن“ وغیرہ) کے عنوانات سے معاشرے کو غلط اور غیر مشروع مقاصد کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔ اسی طرح مختلف فکری مذاہب کے بارے میں پروپیگنڈے کا حال ہے کہ ان کو لوگوں پر مسلط کرنے کے لیے ذرائع ابلاغ اپنے طور پر اس قدر پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ ایک مکمل بے سرو پا مکتب کو منطقی، فلسفی اور انسانی مکتب ثابت کر دیتے ہیں۔

لیکن بہر صورت اس بات میں شک نہیں ہے کہ کسی معاشرے کی معرفت کے ستونوں کو مستحکم کرنے اور افراد کی معرفت کے راستوں کو ہر قسم کی کجروی سے محفوظ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس قسم کے پردے ہٹائے جائیں جو وسیع ذرائع ابلاغ سوچتے اور فیصلہ کرتے ہیں اور اس سوچ کو دوسروں کے افکار پر مسلط کرتے ہیں۔ ان کی بجائے افراد سوچیں اور غور و فکر کریں۔ ذرائع ابلاغ کا کام صرف یہ ہونا چاہیے کہ لوگوں کی معرفت کو زیادہ سے زیادہ کریں اور صحیح فیصلہ کرنے کے لیے انسانی ذہن کو ہر طرح سے آمادہ کریں اور بس!

ذرائع ابلاغ کا کام ہرگز یہ نہیں ہونا چاہیے کہ لوگوں کے افکار پر پردے ڈالیں بلکہ جہالت، تعصب، کوتاہ اندیشی، اندھی تقلید اور اس قسم کے دوسرے حجابوں کی دھجیاں بکھیرنی چاہئیں اور کسی باوقار، باشعور اور ترقی یافتہ معاشرے کے ذرائع ابلاغ کے ترقی یافتہ پروگراموں کو ایک نمونہ ہونا چاہیے۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج کی دنیا میں اس قسم کا معاشرہ کہیں خال خال ہی ملتا ہے۔

اصل عیب یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ غالباً سیاستدان کے آلہ کار ہیں، بلکہ اس سے بدتر اقتصادی ڈانٹوں کے قبضہ میں ہیں اور مختلف معاشروں کے گلے میں رسی ڈال کر انہیں ایسی ایسی جگہوں میں لیے پھرتے ہیں جہاں ان کا جی چاہتا ہے۔

## ۲۰۔ شیطانی وسوسوں کا حجاب

سب سے پہلے مندرجہ ذیل آیات کی سماعت کا شرف حاصل کرتے ہیں۔

## آیات

(۱) فَلَوْلَا إِذْ جَاءَهُمْ بِأَسْنَا تَصَرَّعُوا وَلَكِنْ قَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۳۳﴾ (سورہ انعام ۳۳)

(۲) وَجَدْتُمْهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُونَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُونَ ﴿۳۴﴾ (سورہ نمل ۳۴)

(۳) وَعَادًا وَثَمُودًا وَقَدْ تَبَيَّنَ لَكُمْ مِنْ مَسْكِتِهِمْ تَزْيِينُ الشَّيْطَانِ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ ﴿۳۸﴾

(سورہ عنکبوت ۳۸)

(۴) وَمَنْ يَعِشْ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمَنِ نَقِيضٌ لَهُ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهُ قَرِينٌ ﴿۳۶﴾ وَإِنَّهُمْ لَيَصُدُّوهُمْ عَنِ السَّبِيلِ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ مُهْتَدُونَ ﴿۳۷﴾

سورہ زخرف (۳۶-۳۷)

(۵) وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَاطِئِينَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ زُخْرَفَ الْقَوْلِ غُرُورًا ﴿۱۱۲﴾ (سورہ انعام ۱۱۲)

(۶) إِنَّ الَّذِينَ ارْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَىٰ ۗ الشَّيْطَانُ سَوَّلَ لَهُمْ ۗ وَأَمْلَىٰ لَهُمْ ﴿۳۵﴾ (سورہ محمد ۳۵)

(۷) يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا ۗ وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِاللَّهِ الْغُرُورُ ﴿۵﴾ (سورہ فاطر ۵)

## ترجمہ

(۱) جب ہماری سزا ان کے پاس آپہنچی تو انہوں نے (خضوع کیوں نہیں کیا اور) کیوں سر تسلیم خم نہیں کیا؟ لیکن ان کے دل قساوت پیدا کر چکے تھے اور جو کام وہ کرتے تھے شیطان انہیں انکی نظروں میں

مزین کر دیتا تھا۔

(۲) (لیکن) میں نے اس (ملکہ سبا) کو اور اس کی قوم کو دیکھا کہ غیر اللہ، سورج کو سجدہ کر رہے ہیں اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کی نگاہوں میں مزین کیا ہوا ہے اور انہیں راستے سے باز رکھا ہوا ہے اور وہ ہدایت نہیں پائیں گے۔

(۳) ہم نے عاد اور ثمود کو بھی ہلاک کر دیا اور ان کے (ویران شدہ) ٹھکانے تمہارے لیے آشکار ہیں۔ شیطان نے ان کے اعمال کو زینت دی ہوئی تھی۔ لہذا انہیں راہ (راست) سے باز رکھا، حالانکہ وہ دیکھتے تھے (لیکن تشخیص نہیں کرتے تھے)۔

(۴) جو شخص خدا کی یاد سے روگردانی کرتا ہے تو ہم شیطان کو اس کے لیے بھیج دیتے ہیں اور وہ ہمیشہ اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے اور وہ (شیاطین) اس ٹولے کو یاد خدا سے روکتے ہیں، جبکہ وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ وہی حقیقی ہدایت یافتہ ہیں۔

(۵) اسی طرح ہم نے ہرنی کے لیے انسان اور جن کے شیطانوں سے ایک دشمن بنایا ہے جو فریب دینے والی اور بے بنیاد باتیں (لوگوں کو خواب غفلت میں ڈالنے کے لیے) راز کے طور پر (اور کانوں میں) ایک دوسرے کو بتاتے ہیں اور اگر تمہارا رب چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے (لیکن انہیں آزمائش کے لیے آزاد چھوڑ دیا ہے)۔

(۶) جن لوگوں نے حق کے روشن ہو جانے کے بعد اس کی طرف پشت کی شیطان نے ان کے برے اعمال کو ان کی نگاہوں میں مزین کر دیا اور انہیں لمبی آرزوؤں کے ذریعہ فریب میں مبتلا کر دیا۔

(۷) اے لوگو! خدا کا وعدہ حق ہے۔ مبادا دنیاوی زندگی تمہیں فریب میں مبتلا کر دے اور کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں شیطان خداوند کریم سے مغرور کر دے۔

## الفاظ کے معانی اور تشریح

”شیطان“، ابلیس کا خاص نام نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ اس کا مفہوم عام ہے اور نحوی اصطلاح کے لحاظ سے ”اسم جنس“ ہے جو ہر سرکش، متمرّد اور تخریب کار کو شامل ہے، خواہ وہ جن ہو یا انسان، یا کوئی اور چیز اور اس لفظ کی بنیاد اقوال پر استوار ہے۔ پہلی یہ کہ اس کا مادہ ”شطون“ (بروزن ستون) ہے جس کے معنی بعد اور دوری ہیں۔ لہذا وہ گہرا کنواں جس کی تہہ انسانی دسترس سے دور ہو، اسے ”شطون“ (بروزن زکون) کہتے ہیں اور خلیل بن احمد نحوی نے بھی ”شطن“ (بروزن وطن) کو لمبی رسی کے معنی سے تفسیر کیا ہے اور چونکہ شیطان حق اور رحمت سے دور ہوتا ہے لہذا یہ کلمہ اس کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

دوسری یہ کہ یہ کلمہ ”شیط“ (بروزن بیت) کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں ”غیظ و غضب کی وجہ سے آگ جیسی صورت اختیار کر لینا اور برا فروختہ ہو جانا۔ چونکہ شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور حضرت آدم علیہ السلام کے سجدے کے سلسلے میں آگ جیسے غصے میں مبتلا ہو گیا تھا، اسی لیے اسے شیطان کہا جاتا ہے اور لفظ ”ابلیس“ اور ابلیس جیسی دوسری مخلوقات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ [۱]

”غرور“ (بروزن شہور) یہ کلمہ ”شور“ (بروزن شعور) کے مادہ سے ہے جس کے اصل معنی دھوکا، فریب اور بیداری کی حالت میں غفلت ہیں اور شیطان کو اس لیے ”غرور“ کہتے ہیں کہ وہ انسان کو اپنے دھوکے اور فریب کے ذریعہ راہ سے باہر نکال لے جاتا ہے اور اس کی نگاہوں میں حق اور باطل کو دگرگوں کر دیتا ہے۔

ویسے اصولی طور پر ”غرور“ ہر فریب دینے والی چیز کو کہتے ہیں خواہ وہ جاہ و مال ہی یا مقام و منصب، خواہش و شہوت ہو یا شیطان وغیرہ اور اگر کہیں پر اس کی شیطان سے تفسیر کی جاتی ہے تو اس لیے کہ وہ تمام فریب دینے والی چیزوں سے زیادہ خمیٹ ہوتا ہے۔

”تسویل“، ”سول“ (بروزن قرب) کے مادہ سے ہے جس کے اصلی معنی ایسی حاجت اور آرزو ہیں جو انسان کو اپنی طرف شوق دلاتی ہے اور ”تسویل“ کے معنی ہیں ”کسی چیز کو ایسا مزین کرنا کہ نفس اس کی طرف رغبت کرنے لگ جائے۔“ اور ”خوبصورت چہرے پر موجود برائیوں کے دکھانے“ کے معنی میں بھی آیا ہے۔

یہ وہ تفسیر ہے جسے راغب نے بھی مفردات میں بیان کیا ہے، جبکہ ”صحاح اللغۃ“ اور ”خلیل بن احمد“ کی کتاب ”العین“ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اصلی معنی ”غرور و غفلت سے ملی ہوئی سستی“ ہیں۔ اسی لیے امور کو مزین کرنا، کسی چیز کو برعکس دکھانا، ناپسندیدہ چیز کو ایسی پسندیدہ صورت میں پیش کرنا کہ انسان اس پر فریفتہ ہو کر سست ہو جائے۔ ان سب پر اس لفظ کا اطلاق ہوا ہے۔

بہر حال آیات مذکورہ میں ”شیطانی تسویلیت“ سے مراد یہ ہے کہ وہ برائیوں کو انسان کی نظر میں اچھائیاں بنا کر پیش کرتا ہے اور فریب دیتا اور منحرف کرتا ہے۔

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### باطل کو کیسے زینت دیتے ہیں؟

اسی سلسلے کی سب سے پہلی آیت گزشتہ اقوام کے ایک گروہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے جس کے پاس خدا کے نبی آئے لیکن ان لوگوں نے حق کے آگے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیا۔ خداوند عالم نے ان کو بیداری اور سخت مشکلات و حوادث سے باخبر ہونے کے لیے فقر وفاقہ، بیماری، خشک سالی، قحط سالی، درد و الم اور رنج و غم سے دوچار کر دیا۔ لیکن وہ بیداری، توبہ اور راہ حق کی طرف پلٹنے کے بجائے اسی طرح اپنی گمراہی

[۱] کتاب التحقیق فی کلمات القرآن الحکیم۔ کتاب مفردات راغب۔ کتاب لسان العرب اور کتاب مجمع البحرین (مادہ شیطان)

اور انحراف پر قائم رہے اور اسی راہ پر چلتے رہے۔

قرآن مجید اسی آیت میں کہتا ہے: جب ہماری ’بیدار کرنے والی سزائیں‘ ان کے پاس پہنچیں تو انہوں نے کیوں نہ ہمارے سامنے خضوع و خشوع کیا اور کیوں نہ تسلیم خم کیا؟“

پھر اس کے اسباب خود ہی بتائے اور وہ دو چیزیں ہیں پہلی چیز یہ کہ ان کے دل تیرہ دو تار یک، سخت اور ناقابل اطاعت ہو چکے تھے۔“  
(ولکن قست قلوبہم)۔

دوسری یہ کہ ”شیطان نے ان کے اعمال کو ان کی نگاہوں میں مزین کیا ہوا تھا کہ وہ غلط کاموں کو صحیح اور برائیوں کو اچھائیاں سمجھتے تھے اور شیطان کو ان میں اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے کا موقع اس لیے ملا کہ ان پر خواہشات نفسانی کی پرستش حکم فرماتھی“ (وزین لہم الشیطان کاکانوا یعملون)

بالفاظ دیگر نہ تو خدا کے رسولوں کی زبانی نصیحتوں نے ان پر کوئی اثر کیا اور نہ ہی خداوند عالم کی عملی اور تکنیکی نصیحتیں ان کے لیے کارگر ہوئیں اور اس کا عامل دو چیزیں تھیں، ایک تو قساوت اور سنگدلی اور دوسرے شیطانی زینتیں۔ ان دونوں نے مل کر ان سے خضوع و خشوع اور تضرع و زاری کی روح کو سلب کر لیا۔

اس مقام پر ”شیطانی زینتوں“ سے کیا مراد ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

کچھ مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد شیطانی وسوسے ہیں جو برائیوں کو اچھائیاں میں تبدیل کر کے ان کی نگاہوں کے سامنے لاتے ہیں، یا مختلف خارجی برے اعمال کو شیطان مزین کر کے پیش کرتا ہے، جیسا کہ بعض اوقات سم قاتل اور زہر ہلاہل کو بیٹھے کپسول میں رکھ کر کھلایا جاتا ہے اور عظیم انحراف اور گمراہیوں کو مختلف ناموں مثلاً تمدن، روشن فکری، آزادی فکر وغیرہ کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

بعد کی آیت ”ہد ہد“ پرندے کی زبانی ہے جب وہ ملکہ سبا کی سرزمین گیا اور ان کے عظیم اور روشن تمدن اور ان پر ایک عورت (بلقیس) کو حکمت کرتے دیکھا اور واپس آ کر تمام ماجرا جناب سلیمانؑ سے بیان کرنے کے بعد کہا: ”میں نے اسے اور اس کی قوم کو دیکھا کہ وہ آفتاب کے سامنے سجدہ کر رہے ہیں اور شیطان نے ان کے اعمال کو مزین کر کے ان کے سامنے پیش کیا ہوا ہے۔ اسی لیے وہ انہیں راہ سے روکے ہوئے ہے اور ہدایت کے دروازوں کو ان پر مکمل بند کیا ہوا ہے۔“

اس تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ”ہد ہد“ پرندہ بھی جو اپنے عالم میں عقل و ہوش کا حامل ہے، معرفت اور آشنائی کے حجابوں سے بھی اجالی طور پر واقف تھا اور جانتا تھا کہ شیطانی زینتیں انسانی فکر کی پردہ پوشی کر دیتی ہیں، اسے حقیقت تک پہنچنے سے باز رکھتی ہیں، ہدایت کے دروازے اس پر بند کر دیتی ہیں اور منزل مقصود تک پہنچنے سے مانع ہوتی ہیں۔

آیا جانور بھی صحیح طریقے پر ان مسائل سے آشنا ہو سکتے ہیں جو عالم انسانی پر گزرتے ہیں اور اگر ایسا ہے تو پھر ان کی معرفت اور آگاہی کس حد تک ہے؟ اس بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد ۱۵ سورہ نمل کی ۱۸ ویں آیت اور جلد ۵ سورہ انعام کی ۳۸ ویں آیت میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔



نیز یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ ہد ہد نے شام اور یمن کے درمیانی راستے کو طے کیا ہو اور ملکہ سبا کی سرزمین میں جا پہنچا ہو؟ اس بارے میں بھی تفسیر نمونہ کی ۱۹ ویں جلد میں اسی آیت کے ضمن میں گفتگو کر چکے ہیں۔

تیسری آیت میں عاد و ثمود اور ان کی سرکشیوں اور بغاوتوں کا ذکر ہے اور پھر ان کی تباہی کا تذکرہ ہے اور ضمنی طور پر ان کے ویران شہروں اور نیست و نابود ہو جانے والے ٹھکانوں کا تذکرہ ہے جہاں سے عموماً حجاز کے باشندے یمن اور شام کی طرف جاتے ہوئے گزرتے تھے۔ (ایک قوم عادی سرزمین تھی اور دوسری قوم ثمود کی)۔ ان شہروں اور ٹھکانوں کو آئینہ عبرت کے طور پر دکھا رہا ہے، پھر ان کی ہلاکت و تباہی کے اصل اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ”شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے لیے مزین کیا ہوا تھا۔ باوجودیکہ ان کی ظاہری آنکھیں اور عقل و خرد بھی تھے، لیکن شیطان نے ان کی آنکھوں اور ادراک پر پردے ڈال دیئے تھے اور راہ حق سے انہیں گمراہ کر دیا تھا۔“ (وزین لهم الشیطان اعمالهم فصدھم عن السبیل وکانوا مستبصرین)۔

”وکانوا مستبصرین“ (وہ بینا اور آگاہ تھے) کا جملہ بہت سے مفسرین کے بقول اس معنی میں ہے کہ وہ صاحبان عقل و شعور اور حاملان قدرت استدلال تھے اور حق و باطل کی پہچان بھی اچھی طرح رکھتے تھے۔ لیکن (شیطانی وسوسوں کی وجہ سے) غفلت کا شکار ہو گئے اور حقائق میں غور و فکر سے کام نہ لیا۔<sup>[۱]</sup>

تفسیر المیزان میں بھی آیا ہے کہ وہ لوگ فطرت کے الہام کی وجہ سے حق کے رستوں کو جانتے تھے، لیکن شیطان نے ان کے اعمال کو مزین کر کے ان کے سامنے پیش کیا اور انہیں راہ حق سے بھٹکا دیا۔<sup>[۲]</sup>

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد انبیاء علیہم السلام کی دعوت اور تعلیمات کے ذریعہ حق کی معرفت ہے۔<sup>[۳]</sup> ان تینوں تفسیروں میں سے جو بھی قابل قبول ہو (یا وہ ساری کی ساری قابل قبول ہوں، کیونکہ ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے) ہمارے مقصود کی گواہ ہے، کیونکہ شیطانی زینتیں انسانی عقل و فکر کے لیے حجاب بن جاتی ہے۔

چوتھی آیت میں ایک کلی حکم کی صورت میں اس شخص کی سرنوشہ کو بیان کیا ہے جو خدا کی یاد سے روگردان ہو جاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ”ہم اس پر شیطان کو مسلط کر دیتے ہیں جو ہمیشہ اس کا ہم نشین ہوتا ہے اور شیطانوں کا کام ہمیشہ لوگوں کو غفلت میں ڈالنا اور گمراہ کرنا ہوتا ہے اور انسان اپنے گمراہ ہونے کے باوجود یہ سمجھتا ہے کہ وہ ہدایت کی راہوں پر گامزن ہے، تو اس طرح شیطان ہدایت کی راہیں اس پر بند کر دیتا ہے۔“ مفسرین اور ارباب لغت نے لفظ ”یعیش“ کے دو معانی ذکر کیے ہیں:

بعض مفسرین تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ”عشی“ کے مادہ سے ہے جس کے معنی ایک خاص تاریکی ہیں، جو آنکھ میں پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ

[۱] تفسیر مجمع البیان، جلد ۷، ص ۲۸۳۔ تفسیر روح البیان، جلد ۶، ص ۱۲۶۸ اور تفسیر قرطبی میں بھی یہ معنی بعض مفسرین سے نقل ہوئے ہیں۔

[۲] تفسیر المیزان، جلد ۱۶، ص ۱۳۱

[۳] تفسیر فخر رازی، جلد ۲۵، ص ۶۶

سے آنکھ بینائی سے محروم ہو جاتی ہے، یا شب کو رہ جاتی ہے (انسان رات کو اندھا ہو جاتا ہے)۔ اسی لیے ”عشو“ اس اونٹ کو کہتے ہیں جو اپنے سامنے کی چیزوں کو نہیں دیکھ سکتا اور راہ چلتے ہوئے اکثر بھٹک جاتا ہے۔ (خطب عشوا بھی اسی چیز کی طرف اشارہ ہے) اور ”اعشی“ اس شخص کو کہتے ہیں جو نابینا ہوتا ہے یا رات کو اندھا ہوتا ہے۔

اس تعبیر کی رو سے آیت کے معنی یہ ہوں گے ”جو شخص آیات الہی کو اس کائنات میں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھے اور خدا کے انبیاء کی زبان سے نہ سنے، وہ شیطانی پھندوں اور اس کے جال میں پھنس جاتا ہے۔“

بعض دوسرے مفسرین نے اسے ”عشو“ (بروزن نشو) کے مادہ سے لیا ہے کہ جب وہ لفظ ”الی“ کے ساتھ ذکر ہو تو اس کا معنی ضعیف اور کمزور آنکھوں سے ہدایت پانا ہوتا ہے اور جب ”عن“ کے ساتھ ذکر ہو تو اس کے معنی اعراض کرنا اور منہ پھیرنا ہوتے ہیں۔<sup>[۱]</sup>

اس تفسیر سے آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ ”جو لوگ یاد خدا سے روگردان ہوں گے ہم شیطان کو ان پر مسلط کر دیں گے۔“<sup>[۲]</sup> باقی رہا جملہ ”نقیض“ جو ”قیض“ (بروزن فیض) کے مادہ سے ہے جس کے اصل معنی ”انڈے کا چھلکا“ ہیں، تو یہ مسلط کرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ آیت میں اس لفظ کا استعمال نہایت ہی قابل توجہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان ان پر اس قدر مسلط ہو جاتا ہے کہ ان کا ہر طرف سے احاطہ کر لیتا ہے اور ان کا رابطہ باہر کی دنیا سے مکمل طور پر منقطع کر دیتا ہے اور کسی انسان کی معرفت کے لیے یہ بدترین حجاب ہوتا ہے اور یہ تعبیر کلمات عرب میں بھی ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتی ہے کہ وہ کہتے ہیں ”استیلا القیض علی البض“ (انڈے پر چھلکے کا تسلط)

اس سے بدتر یہ کہ شیطان کا یہ تسلط اور گھیرا برا بر جاری رہتا ہے اور وہ ہمیشہ اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے اور اس کی نوبت اس حد تک جا پہنچتی ہے کہ وہ اپنی گمراہی پر ناز کرنے لگتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ راہ ہدایت پر ہے۔ (و یحسبون انہم مہتدون)۔ پانچویں آیت میں ان جنوں اور انسانوں کے شیاطین کا ذکر ہے جنہوں نے انبیاء کی دشمنی پر کمر باندھ رکھی ہے اور ان کی تعلیمات اور تبلیغات کو بے اثر کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ وہ فریب دینے والی اور بے بنیاد باتیں اشاروں اشاروں میں ایک دوسرے سے کہتے ہیں تاکہ اس طرح سے لوگوں کو خواب غفلت میں پڑا رہنے دیں اور حقائق کو ان سے چھپائے رکھیں اور شیاطین ایک دوسرے کو فریب اور نیرنگ کے طریقے سکھاتے ہیں تاکہ حقیقتوں کے چہرہ پر پردہ ڈال لے رکھیں اور لوگوں کو انبیاء کی تعلیمات سے دور رکھیں۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس آیت میں ”شیاطین“ جمع کی صورت میں ذکر ہوا ہے جبکہ ”عدو“ مفرد کی صورت میں ہو سکتا ہے کہ یہ

[۱] بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اگر یہ لفظ ”عشایعشو“ کے مادہ سے ہو تو اس کے معنی ہوں گے آنکھ میں کسی بیماری کے بغیر خود کو اندھا بنا لینا اور اگر عشی یعشی کے مادہ سے ہو تو اس کے معنی ہوں گے وہ آفت جو آنکھ میں ہوتی ہے۔ (تفسیر روح البیان جلد ۸ ص ۳۶۸) لیکن یاد رہے کہ زیر بحث آیت میں یہ ”عشایعشو“ کے مادہ سے ہے۔

[۲] لسان العرب، مفردات راغب، تفسیر قرطبی، تفسیر روح البیان اور تفسیر المیزان کی طرف رجوع فرمائیں۔

تعبیر اس لیے ہو کہ تمام شیاطین لوگوں کے اغواء اور گمراہ کرنے کے سلسلے میں متحدر، متفق اور ایک دشمن کی مانند عمل کرتے ہیں۔

بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں پر ”عدو“، ”اعداء“ کے معنی میں ہے۔ (یعنی مفرد کا صیغہ جمع کے معنی دے رہا ہے)۔<sup>[۱]</sup>

جبکہ بعض دوسرے حضرات نے تصریح کی ہے کہ ”عدو“ کا اطلاق، مفرد، تشبیہ اور جمع تینوں پر ہوتا ہے۔<sup>[۲]</sup>

چھٹی آیت کا تعلق سورہ محمد سے ہے اور اس سورت میں معرفت کے بہت سے حجابوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کبھی تو فساد فی الارض اور قطع رحمی کو باطنی اور بیانی اور بہرے پن کا سبب بتایا گیا ہے (آیت ۲۳) اور کبھی قرآن میں غور و فکر نہ کرنے کو دلوں پر قفل پڑنے کے ہم ردیف قرار دیا گیا ہے۔

زیر بحث آیت میں بھی شیطان و سوسوں اور ابلیسی زینٹوں اور آرزوؤں کو گمراہ لوگوں کے مرتد ہو جانے کا سبب بتایا گیا ہے اور وہ اس طرح کہ جو لوگ پہلے تو راہ حق کو پالیتے ہیں لیکن پھر شیطانی آرزوؤں کی بنا پر منحرف ہو جاتے ہیں اور نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ اپنے اس انحراف کو قابل فخر کارنامہ سمجھتے ہیں۔

اس آیت کے بارے میں مفسرین کے مختلف اقوال ملتے ہیں اور وہ یہ کہ آیا یہ آیت اس یہودی قوم کی طرف اشارہ ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے تھی اور وہ لوگ جو نشانیاں اپنی کتابوں میں دیکھ چکے تھے ان کی بناء پر آنحضرتؐ پر ایمان لے آئے لیکن جب ظہور رسالت ہوا تو مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے جو بذات خود ایک طرف کا ارتداد ہے۔

یا ان منافقین کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے پہلے تو حق کو قبول کر لیا اور بعد میں منحرف ہو گئے۔

یا ظاہر میں تو مان لیا لیکن باطن میں مخالف ہو گئے۔

لیکن اگر آیات کے سیاق و سباق کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اکثر کا تعلق منافقین سے ہے۔ اسی لیے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت بھی منافقین کی طرف اشارہ ہو، ایسے منافقین جنہوں نے ابتداء میں تو حق کو پہچان لیا لیکن بعد میں اس سے روگردان ہو گئے۔

”املی لہم“ کا جملہ ”املاء“ سے ہے جس کے معنی لمبا کرنا اور مہلت دینا ہیں۔<sup>[۳]</sup> اور یہاں پر مراد شیطان کی طرف سے لمبی چوڑی اور در دراز کی آرزوؤں کا ایجاد کرنا ہے، ایسی آرزوئیں جو انسان کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں اور اس کی نگاہوں میں باطل کو مزین کر دیتی ہیں اور اسے حق سے باز رکھتی ہیں۔

اسی سلسلے میں ساتویں اور آخری آیت با آواز بلند اور بنا گ دہل لوگوں کو خبردار کر رہی ہے کہ خدا کا وعدہ برحق ہے۔ اس کے بعد حق سے انحراف، دھوکہ کھانے اور معرفت سے باز رہنے کے دو عوامل کا ذکر کرتا ہے۔ پہلا عامل دنیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ”مبادا دنیاوی زندگی

[۱] روح المعانی جلد ۸ ص ۴

[۲] المنار، جلد ۸، ص ۵

[۳] یاد رہے کہ یہ لفظ دراصل ”ملو“ (بروزن سرو) کے مادہ سے ہے نہ کہ ”ملای“ ہمزہ کے ساتھ۔

تمہیں فریب دے“ اور دوسرا عامل شیطان ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے ”کہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں خدا کے بارے میں دھوکہ دے دے۔“ کبھی تو وہ تمہیں اس کے رحم و کرم کا امیدوار بنا کر اس کے عذاب سے بے خبر کر دیتا ہے اور کبھی تمہیں اس قدر سرگرم کر دیتا ہے کہ بالکل ہی خدا اور اس کے فرمان کے بارے میں تو سوچتے ہی نہیں، یا پھر اس کے احکام و فرامین کو برعکس کر کے تمہارے سامنے پیش کرتا ہے۔

”غرور“ (بروزن شرور) جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، ہر دھوکا دینے والی چیز کو کہتے ہیں، خواہ وہ جاہ و مال ہو یا مقام و منصب، خواہ خواہشات نفسانی ہوں یا شہوات شیطانی اور خواہ فریب کار انسان ہو یا شیطان۔ لیکن چونکہ واضح ترین اور خمیٹ ترین فرد شیطان ہے لہذا عام طور پر اسے شیطان سے ہی تفسیر کرتے ہیں۔<sup>[۱]</sup>

”لایغر نکھ بالذہ الغرور“ کی تعبیر بہت سے مفسرین کے عقیدہ کے مطابق شیطان کے انسان کو خدا کے فضل اور رحم و کرم کے ذریعہ دھوکہ دینے کی طرف اشارہ ہے اور وہ اسے اس قدر فریب میں ڈال دیتا ہے کہ وہ ہر گناہ سے آلودہ ہو جاتا ہے اور پھر تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا یہ اقدام اس کے ایمان و معرفت کے کمال کی دلیل ہے کہ اس نے خدا کو ان (رحمان و کرم اور فضل کی) صفات کے ساتھ پہچانا ہے!!

اس کی مثال ایسے ہے جیسے کسی شخص کو دھوکہ دے کر اس عنوان سے زہر کھلا دیں کہ وہ طاقتور ہے اور زہر کے اثرات کا اچھی طرح مقابلہ کر سکتا ہے، یا اس کے پاس زہر کا تریاق ہے۔ اس طرح سے تو وہ ہلاک ہو جائے گا۔

## مزید تشریح

### شیطان کون ہے؟

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں شیطان ایک فرد کا نام نہیں ہے، بلکہ ”بلیس“ جس نے جناب حضرت آدمؑ کو سجدہ نہیں کیا تھا، شیاطین میں سے ایک تھا۔

اس کے پاس اپنی جنس کے بھی بہت سے فوجی سپاہی ہیں اور انسانوں سے بھی۔ اور شیطان کا نام سب پر بولا جاتا ہے۔ اسی لیے کفر، ظلم، شرک، فساد فی الارض کرنے والوں کے سرغننے اور گمراہ کرنے والے تمام کارندے، غرض سب کے سب شیطان کے فوجی ہیں بلکہ ایک روایت کی رو سے تو انسانی شیطانوں کے درمیان ایسے لوگ بھی ہیں جو جنات شیطانوں سے بدتر ہیں، جیسا کہ ہم حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں پڑھتے ہیں کہ آپؐ نے ابوذرؓ سے فرمایا:

”هل تعوذت بالله من شر شياطين الجن والانس“

[۱] ”غرور“ مبالغہ کا صیغہ ہے۔

”یعنی آیا تو نے جن وانس کے شیطانوں کے شر سے خدا کی پناہ طلب کر لی ہے؟“

تو انہوں نے عرض کی:

”آیا انسانوں میں بھی شیطان ہیں؟“

تو رسالت مآب نے فرمایا:

”نعم هم شر من شياطين الجن“

”جی ہاں! بلکہ وہ تو جنات کے شیطانوں سے بھی بدتر ہیں۔“<sup>[۱]</sup>

قرآنی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کے پاس باقاعدہ منظم لشکر ہیں جن میں سے کچھ سوار ہیں اور کچھ پیدل۔ کیونکہ خدا

فرماتا ہے:

”واجلب علیہم بخيلك ورجلك“

”بے شک تو اپنے سوار اور پیدل، غرض سب کو انسانوں کے لیے ایک جگہ پر اکٹھا کرے۔“ (بنی اسرائیل ۶۴)

”اجلب“، ”اجلاب“ کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں فوری جمع آوری، یا کسی جماعت اور گروہ کو چلنے کے لیے نعرے لگانا۔

شیطان کے سوار اور پیدل لشکر سے کیا مراد ہے؟ بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ جو شخص بھی خدا کی نافرمانی کے لیے سوار ہو کر یا پیدل

چل کر جاتا ہے یا اس راستے میں جنگ کرتا ہے، وہ شیطان کا سوار اور پیدل لشکر ہے۔<sup>[۲]</sup>

بعض نے کہا ہے کہ اس کا صحیح معنوں میں سوار لشکر بھی ہے اور پیدل فوج بھی، جو اس کے یار و مددگار ہیں۔

بعض نے اسے کنایہ کے معنی پر حمل کیا ہے اور کہا ہے کہ مقصد یہ ہے کہ اس نے مقابلے کے تمام وسائل فراہم کیے ہوئے ہیں اور

پوری قوت کے ساتھ انسان کے مقابلہ کے لیے آتا ہے۔<sup>[۳]</sup>

یہ احتمال بھی ملتا ہے کہ شیطان کا سوار لشکر کفر، ظلم اور فساد کے سرغنہ ہیں اور اس کی پیدل نچلے یا متوسط قسم کے لوگ ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ احتمال بھی ملتا ہے کہ شیطان کے سوار لشکر سے انسان کی شہوات اور صفات رذیلہ کی طرف اشارہ ہے جو انسان

کے قلب و روح پر مسلط ہو جاتی ہیں اور اس کی پیدل فوج سے مراد وہ عوامل ہیں جو باہر سے آکر انسان کو منحرف کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

[۱] تفسیر فخر رازی، جلد ۱۳، ص ۱۵۴

[۲] قرطبی نے اس تفسیر کو اکثر مفسرین سے نقل کیا ہے۔

[۳] فخر رازی نے اس تفسیر کو ایک احتمال کے عنوان سے ذکر کیا ہے، (جلد ۲۱، ص ۶) اور تفسیر فی ظلال القرآن میں بھی اسی طرح کی بات ہوئی

ہے۔ (جلد ۵، ص ۳۴۳)

## ۲۔ ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ خداوند عالم ہمیں ایسے طاقتور لیکن بے رحم لشکر کے سامنے تنہا اور بے یارو مددگار چھوڑ دے اور کیا یہ چیز اس کی حکمت اور اس کے عدل سے ہم آہنگ ہے؟

اس سوال کا جواب ایک نکتے پر توجہ کرنے سے مل جاتا ہے اور وہ یہ کہ جس طرح قرآن مجید میں آیا ہے کہ خداوند عالم مومنین کو فرشتوں کے ذریعہ منظم کرتا ہے اور اپنی نبی اور معنوی طاقتیں ان لوگوں کے ہمراہ کر دیتا ہے جو جہاد نفس اور جہاد دشمن میں بھرپور حصہ لیتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ﴿۳۰﴾ نَحْنُ أَوْلِيُّكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۗ

’بے شک جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر وہ اس پر ڈٹ گئے، ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں کہ نہ تو ڈرو اور نہ ہی غم کھاؤ اور تمہیں اس بہشت کی خوشخبری ہو جس کا تمہارے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا اور ہم تمہارے اس دنیاوی زندگی میں بھی یارو مددگار تھے اور آخرت میں بھی۔‘ (سورہ فصلت ۳۰-۳۱)

## ۳۔ ایک اور اہم نکتہ

ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ شیطان کبھی بھی ہمارے دل کے گھروں میں بغیر اجازت کے داخل نہیں ہوتا اور ہماری روح کے ملک میں پاسپورٹ کے بغیر قدم نہیں رکھتا اور نہ ہی وہ غافل گیر کر کے حملہ کرتا ہے۔ بلکہ وہ خود ہماری ہی اجازت سے اندر داخل ہوتا ہے۔ جی ہاں! وہ دروازے سے اندر آتا ہے روشن دان یا کھڑکی سے نہیں۔ ہم خود ہی اس کے لیے اپنے دل کے دروازے کھولتے ہیں۔ جس طرح قرآن کہتا ہے:

إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَنٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿۹۹﴾ إِنَّمَا سُلْطَنُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ وَالَّذِينَ هُمْ بِهِ مُشْرِكُونَ ﴿۱۰۰﴾

’اس کا تسلط ان لوگوں پر نہیں ہے جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔ (بلکہ) اس کا تسلط تو صرف ان لوگوں پر ہے جو اس سے دوستی کرتے ہیں اور اسے اپنی سرپرستی کے لیے انتخاب کرتے ہیں اور اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں (یعنی اس کے فرمان کو بھی خدا کے فرمان کے برابر سمجھتے ہیں۔‘ (سورہ نحل ۹۹-۱۰۰)

اصولی طور پر یہ انسان کے اعمال ہی ہیں جو شیطان کے اثر و رسوخ کی راہیں ہموار کرتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

إِنَّ الْمُبَدِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيْطَانِ ط

”فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔ (بنی اسرائیل ۲۷)“

لیکن ہر حالت میں اس کے اور اس کے مختلف لشکریوں کے رنگ برنگے داموں سے جو شہوات کی مختلف صورتوں یعنی بدکاری کے اڈوں کی شکل میں، استعماری سیاست کے روپ میں، اخرائی مکاتب فکر کے انداز میں، فاسد اور مفسد ثقافت کی صورت میں قدم قدم پر موجود ہیں، نجات حاصل کرنے کے لیے ایمان، تقویٰ، سایہ لطف و رحمت پروردگار اور اپنے آپ کو اس کی ذات کے حوالے کر دینے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ جیسا کہ خود قرآن کہتا ہے:

وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿۸۳﴾

”اگر خدا کا فضل و کرم اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تھوڑے سے لوگوں کے علاوہ تم سب اس شیطان کی پیروی

کرتے۔“ (نساء ۸۳)

یہاں پر معرفت کے بیس حجابوں کا تفصیلی تذکرہ اختتام کو پہنچتا ہے۔ اب ہم معرفت کے ذرائع کا پتہ چلاتے ہیں۔



## ۵۔ معرفت کے ذرائع

### اشارہ

جس طرح بیج آمادہ زمین میں اگتے ہیں اور شورہ زار زمین میں کبھی پھول نہیں کھلتے، خواہ وہاں پر بہترین بیج کاشت کیا جائے اور آب باران سے اس کی آبیاری کی جائے، اسی طرح معرفت کا بیج بھی فقط آمادہ دلوں میں نشوونما پاتا ہے اور معرفت کے پھول پاک و پاکیزہ روحوں میں کھلتے ہیں۔

اسی وجہ سے ان صفات، روحیات اور اعمال سے آگاہی جو معرفت کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ ”شناخت و معرفت“ سے متعلق اہم ترین مباحث میں سے ہیں۔ اس بارے میں قرآن مجید نے نہایت ہی بامعنی تعبیرات اور بہت ہی لطیف و زیبا اشاروں سے کام لیا ہے۔ اگرچہ معرفت کے ذرائع بہت ہیں لیکن زیادہ اہم اصول کہ جن کی طرف قرآن مجید کی مختلف آیات میں اشارہ کیا گیا ہے۔ مندرجہ ذیل ہیں۔

- ۱۔ تقویٰ
- ۲۔ ایمان
- ۳۔ خوف اور احساس ذمہ داری
- ۴۔ تزکیہ نفس
- ۵۔ ہوشیاری
- ۶۔ آگاہی

ان میں سے ہر ایک امر کو جدا گانہ فصل میں بیان کیا جائے گا۔ پہلے اس موضوع سے متعلق آیات کو بیان کیا جائے گا، پھر اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو ہوگی اور اس بارے میں اسلامی روایات سے بہرہ برداری کی جائے گی تاکہ موضوع کی اچھی طرح وضاحت ہو جائے۔

### ۱۔ تقویٰ اور معرفت کا رابطہ

اس بارے میں سب سے پہلے مندرجہ ذیل آیات کو گوش جان سے سماعت کرتے ہیں:

### آیات

(۱) اللَّهُ ذَلِكِ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ ۗ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ﴿۱﴾ (سورہ بقرہ ۲-۱)

(۲) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا (سورہ انفال ۲۹)

(۳) وَاتَّقُوا اللَّهَ ط وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ ط وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۳۷﴾

(سورہ بقرہ ۲۸۲)

(۴) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَآمِنُوا بِرَسُولِهِ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَحْمَتِهِ

وَيَجْعَلْ لَكُمْ نُورًا تَمْشُونَ بِهِ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ط وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۳۸﴾

۱ (سورہ حدید ۲۸)

ترجمہ

- (۱) یہ با عظمت کتاب ہے جس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں اور پرہیزگاروں کے لیے سبب ہدایت ہے۔  
 (۲) اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم خدا (کے فرمان) کی مخالفت سے پرہیز کرو تو وہ تمہارے لیے ”فرقان“ (باطل سے حق کی جدائی کا ذریعہ) قرار دے گا۔  
 (۳) اور خدا سے ڈرو اور خدا تمہیں تعلیم دے گا اور خداوند عالم ہر چیز کو جانتا ہے۔  
 (۴) اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! خدا سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ تاکہ وہ تمہیں اپنی رحمت کے دو حصے عطا کر دے اور تمہارے لیے ایسا نور قرار دے جس کے ذریعہ سے تم اپنی راہ کو پیدا کرو اور تمہارے گناہوں کو بخش دے اور خداوند عالم غفور اور رحیم ہے۔

## الفاظ کے معانی اور تشریح

”تقویٰ“ دراصل ”وقایہ“ (بروزن درایہ) کے مادہ سے ہے، جیسا کہ راغب مفردات میں کہتے ہیں کہ اس کے معنی ہیں ”کسی چیز کو آفات سے بچانا۔“ پھر وہ کہتے ہیں کہ ”تقویٰ کے معنی ہیں روح اور نفس کو ان چیزوں سے بچانا جن سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ پھر ڈر، خوف (اور پرہیز) کو بھی تقویٰ کہا جانے لگا اور زبان شرع میں گناہوں اور حرام کاموں سے اپنے آپ کو بچانے کا نام تقویٰ ہے اور کمال تقویٰ یہ ہے کہ بعض مشکوک مباح چیزوں کو ترک کر دیا جائے۔“ [۱]

[۱] مفردات راغب مادہ ”وقی“

دوسرے ارباب لغت نے بھی مندرجہ بالا مفہوم سے ملتا جلتا مفہوم بیان کیا ہے۔ بعض نے اس کے معنی ”صانت“<sup>[۱]</sup> (بچاؤ) اور بعض نے ”انقاء“ کے معنی ”برائیوں اور ہوا و ہوس سے رکنا“ بیان کیے ہیں۔<sup>[۲]</sup>

بعض مفسرین نے بعض صحابہ کرامؓ سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث نقل کی ہے کہ جب آنحضرتؐ سے تقویٰ کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا:

”آیاتم کسی پر خار رستے سے گزرے ہو؟ جب مثبت جواب سنا تو فرمایا، تو اس وقت کیا کرتے تھے؟ آیا اپنے کپڑوں کو سمیٹ کر اور کانٹوں سے بچ کر نکلنے کی کوشش نہیں کی تھی؟ اسی کا نام تقویٰ ہے۔“

جی ہاں! زندگی کی راہیں طے کر کے خدا تک پہنچنے کے رستے میں کئی قسم کے کانٹے بچھے ہوئے ہیں۔ خواہشات نفسانی، ہوا و ہوس، جھوٹی امیدوں، لمبی آرزوؤں اور لغزشوں کے کانٹے قدم قدم پر انسان کے مزاحم ہوتے ہیں۔ اسی لیے انسان کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ ہوشیار اور خبردار رہے مبادا اس کی روح کا دامن ان کانٹوں سے الجھ پڑے اور تارتار ہو جائے، مبادا کسی کانٹے کی ٹوک اس کی جان کے پاؤں میں چھب جائے اور اسے زخمی کر ڈالے، مبادا کوئی کانٹا اسے اس راستے کے طے کرنے سے باز رکھے اور اپنی جانب متوجہ کر لے۔

اور یہ اس وقت ہوگا جب انسان ہمیشہ بیدار، خبردار، آگاہ اور ہر طرح سے ہوشیار رہے۔

سادہ ترین الفاظ میں تقویٰ روح کے ارتقاء کو درپیش آنے والی آفات سے پرہیز اور گناہوں اور شہات سے بچنے کا نام ہے۔ بعض مفسرین نے تقویٰ کے متعدد معانی ذکر کیے ہیں اور ان معانی کے لیے قرآنی آیات سے شواہد اور دلائل بھی پیش کیے ہیں، حقیقت میں جن میں سے ہر ایک معنی تقویٰ کے مصداقوں میں سے ایک مصداق ہے، مثلاً توبہ، اطاعت، اخلاص، ایمان (پرستش اور توحید)۔<sup>[۳]</sup>

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ”تقویٰ کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کسی آفت کے مقابلے میں کسی چیز کو ڈھال قرار دے۔ جس طرح انسان ڈھال کے ذریعہ اپنے دشمن کے وار کو روکتا ہے اسی طرح پرہیزگار افراد بھی فرمانِ الہی کی اطاعت کے سپر کے ذریعہ اپنے آپ کو عذابِ خداوندی سے بچا لیتے ہیں۔“<sup>[۴]</sup>

بعض لوگوں نے تقویٰ کو تین مراحل میں تقسیم کیا ہے: کفر کے مقابلے میں تقویٰ، گناہ کے مقابلے میں تقویٰ اور ان چیزوں کے مقابلے

[۱] لسان العرب، وہی مادہ

[۲] مجمع البحرین، وہی مادہ۔ (توجہ رہے کہ ”تقویٰ“ کا اصل لفظ ”قوی“ تھا بعد میں ”واو“ کو ”تا“ میں تبدیل کر دیا گیا، جیسا کہ خلیل بن احمد نے کتاب العین میں لکھا ہے۔

[۳] وجوہ القرآن، ص ۵۵ اور تفسیر فخر رازی، جلد ۲، ص ۲۰

[۴] روح البیان، جلد ۱، ص ۳۰

میں تقویٰ جو انسان کو یاد خدا سے غافل کر دیتی ہیں۔ [۱]

لیکن ظاہر ہے کہ یہ سب معانی اس اصل کی طرف لوٹ جاتے ہیں جس کا آغاز میں ذکر ہوا ہے۔

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### تقویٰ اختیار کرو تا کہ نور علم تمہارے دلوں میں روشن ہو

سب سے پہلی آیت میں قرآن مجید بڑی صراحت کے ساتھ کہہ رہا ہے ”یہ آسمانی کتاب صاحبان تقویٰ اور پرہیزگاروں کے لیے موجب ہدایت ہے۔“ اس تعبیر سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ تقویٰ ہدایت کی راہیں ہموار کرنے کے لیے کس قدر موثر ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ جب تک انسانی وجود میں ایک مرحلے کی حد تک تقویٰ موجود نہ ہو، قطعاً ناممکن ہے کہ وہ آسمانی کتابوں اور ہدایت کے سرچشموں سے بہرہ ور ہو۔ تقویٰ کی کم سے کم حد یہ ہے کہ انسان حق کے سامنے سر تسلیم خم کر لے اور ہٹ دھری، عناد اور دشمنی کا مظاہرہ نہ کرے۔ جو لوگ تقویٰ کے اس مرحلے سے بھی محروم ہیں یقیناً وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے اور نہ ہی کسی ہدایت کو قبول کر سکتے ہیں۔ یہ ایک فطری امر ہے کہ انسان میں تقویٰ اور حق کے آگے سر تسلیم خم کرنے اور حقائق کو قبول کرنے کی روح جس قدر طاقتور ہوگی منافع ہدایت سے بھی وہ اتنا زیادہ بہرہ ور ہوگا۔

ہدایت کے منافع کہ جن میں قرآن مجید سرفہرست ہے، کی مثال ایسی ہے جیسے زندگی عطا کرنے والی بارش ہوتی ہے جو صرف آمادہ اور شیریں زمینوں میں معرفت کے مختلف النوع پھول اگاتی ہے کیونکہ شورہ زار اور کلراٹھی زمین میں تو صرف خس و خاشاک ہی اگتے ہیں۔ ”ہدی“ (ہدایت کو مصدر کی صورت میں لایا گیا ہے جو اس حقیقت کی تاکید کر رہا ہے کہ اگر انسان میں تقویٰ کی روح زندہ ہو جائے تو قرآن اس کے لیے مجسم ہدایت ہوتا ہے۔ (غور کیجیے گا)

بعض بزرگ مفسرین نے کہا ہے کہ اس عبارت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرہیزگار لوگ دو طرح کی ہدایت کے حامل ہیں جیسا کہ کفار و منافقین دو طرح کی ضلالت (گمراہی) کے حامل ہوتے ہیں۔ ایک ہدایت تو انہیں فطرت کی سلامتی کی جانب سے حاصل ہوتی ہے اور اس وقت انسان محسوس کرتا ہے کہ اسے ایک ایسی حقیقت کی ضرورت ہے جو اس کے وجود سے باہر ہے۔ ایسی صورت میں وہ حس سے مخفی ایک مبدء کے وجود پر ایمان پیدا کرتا ہے کیونکہ اس ضرورت کو وہ دوسری مخلوق میں بھی دیکھتا ہے اور وہ اس حقیقت پر بھی پہنچتا ہے کہ جس طرح تخلیقی امور میں اس کی کسی بھی ضرورت کے پورا کرنے سے چشم پوشی نہیں کی گئی ہے، اس چیز کی ہدایت جو اعمال اور اخلاق کی تباہیوں سے اسے بچاتی ہے کا

مسئلہ بھی اس کے بارے میں انجام پاتا ہے اور یہی چیز درحقیقت توحید، نبوت اور معاد پر ایمان ہے، جو دین کے اصلی اصول ہیں۔<sup>[۱]</sup> بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ قرآنی ہدایت کو پرہیزگاروں کے ساتھ اس لیے مخصوص کیا گیا ہے کہ صرف وہی لوگ قرآنی ہدایت سے فائدہ حاصل کر سکتے ہیں اور چونکہ دوسرے لوگ اس سے کسی قسم کا فائدہ نہیں اٹھاتے، لہذا قرآن کی ہدایت ان سے منطقی ہے۔<sup>[۲]</sup> فخر الدین رازی اپنی ایک تعبیر میں اس طرح کا نتیجہ نکالتے ہیں کہ اگر متقین کے لیے اس آیت کے علاوہ کوئی اور فضیلت نہ بھی ہو، پھر بھی کافی ہے اور یہ فضیلت دوسری تمام فضیلتوں پر بھاری ہے۔ ادھر دوسری طرف قرآن مجید کی سورہ بقرہ کی ۱۸۵ ویں آیت میں بتایا گیا ہے کہ قرآن ”ہدی للناس“ (تمام لوگوں کے لیے ہدایت ہے)۔ اگر اس آیت کو اور مذکورہ آیت کو ملا کر دیکھا جائے تو یہ نتیجہ نکلے گا کہ ”جو لوگ قرآنی ہدایت سے فائدہ نہیں اٹھاتے، درحقیقت انسان کے زمرے ہی میں ان کا شمار نہیں ہے۔“<sup>[۳]</sup> اگرچہ ان تمام تفسیروں میں کسی قسم کی منافات نہیں ہے لیکن جو تفسیر ہم نے آغاز میں بیان کی ہے وہ سب سے زیادہ روشن معلوم ہوتی ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ یہ چاہتے ہیں کہ لفظ ”متقین“ کو مجاز پر حمل کریں اور کہیں کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ تقویٰ کی راہ پر چلیں تاکہ تحصیل حاصل (حاصل شدہ چیز کو حاصل کرنا) کا اشکال پیش نہ آئے۔ لیکن یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوئی، کیونکہ جس طرح ہم پہلے بتا چکے ہیں تقویٰ کے کئی مراحل ہیں۔ اس کا ایک مرحلہ تو قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کی راہ ہموار کرتا ہے جبکہ اس کے بالاترین مراحل قرآنی ہدایت کا موصول ہوتے ہیں۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید ”ہدی للمتقین“ کے بعد والی آیات میں پرہیزگاروں کا اس عنوان سے تعارف کراتا ہے کہ وہ مبداء و معاد پر ایمان رکھتے ہیں، نماز برپا کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ تو کیا قرآن ہدایت ان کے لیے تحصیل حاصل نہیں ہے؟ لیکن ایک نکتہ پر توجہ دینے سے اس سوال کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ ایمان اور عمل کے اس مرحلہ تک پہنچ جانا آخری مرحلہ نہیں ہوتا۔ ابھی انسان کے شایان شان ارتقائی مراحل تک پہنچنے کے لیے کئی اور مراحل درمیان میں ہیں کہ جنہیں طے کیا جانا ضروری ہے اور متقین اور پرہیزگار افراد تقویٰ کے اس مرحلہ تک پہنچنے کے بعد قرآن ہدایت کی روشنی میں اس سے بالائی مراحل کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں اس قسم کی دوسری تعبیریں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً سورہ حاقہ کی ۴۸ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے ”وانہ لتذکرۃ للمتقین“ یقیناً قرآن مجید پرہیزگاروں کے لیے یادآوری کا ذریعہ ہے۔

سورہ بقرہ کی دوسری آیت قرآن کو ”پرہیزگاروں کے لیے ذریعہ ہدایت“ بیان کرتی ہے اور یہاں پر ذریعہ تذکرہ یادآوری تو معلوم ہے کہ ”تذکرہ“، ”ہدایت“ کے مقدمات میں سے ہے۔ اسی لیے کچھ مفسرین ایسے ہیں کہ جب وہ آیت پر پہنچتے ہیں تو کہا ہے کہ اس آیت میں بھی

[۱] تفسیر المیزان، جلد ۱، ص ۴۲

[۲] تفسیر فخر الدین رازی، جلد ۲، ص ۲۰

[۳] تفسیر فخر الدین رازی، جلد ۲، ص ۲۱

وہی بات ہے جو سورہ بقرہ میں ہے۔

بہر حال ان آیات کی حالت اس بات کی شاہد ناطق ہے کہ تقویٰ کی تاثیر ہدایت اور معرفت کی راہیں ہموار کرتی ہے۔ اسی سلسلے کی دوسری آیت تقویٰ اور معرفت کے رابطے کو پہلے سے زیادہ طور پر واضح کرتی ہے۔ روئے سخن مومنین کی طرف ہے اور ارشاد ہورہا ہے ”اے مومنین! اگر تم تقویٰ اختیار کرو تو خداوند عالم تمہارے لیے فرقان قرار دے گا۔“ بعض ارباب لغت کی تصریحات بتاتی ہیں کہ لفظ ”فرقان“، ”اسم مصدر“ ہے اور بعض کے نزدیک ”مصدر“ ہے۔ لیکن اکثر مفسرین کی تصریح کے مطابق اس قسم کے مقامات پر فاعل کے معنی میں ہے اور ساتھ ہی تاکید بھی پائی جاتی ہے، (صیغہ مبالغہ کے مفہوم کے مشابہ) اور اس کے معنی ہیں وہ چیز کہ جس کے ذریعہ حق کو باطل سے جدا کیا جائے۔ اس کا وسیع مفہوم ہے جو کہ قرآن مجید، معجزات انبیاء، عقلی روشن دلائل، شرح صدر، باطنی اور معنوی توفیق اور نورانیت وغیرہ سب کو شامل ہے۔<sup>[۱]</sup> اس طرح سے قرآن مجید کہتا ہے کہ ”تقویٰ“ معرفت کی راہیں ہموار کرتا ہے، جو بعض مراحل میں مکمل طور پر قابل استدلال ہوتا ہے اور بعض دوسرے مراحل میں خداوند عالم کی فیہی امدادوں کی اسے ضرورت ہوتی ہے۔

قرآن مجید نے جنگ بدر کے دن کو ”یوم الفرقان“ سے موسوم کیا ہے کیونکہ اس دن خداوند عالم کی طرف سے لشکر کفر کے مقابلے میں لشکر ایمان کو واضح تائید حاصل ہوئی تھی۔ دشمنان اسلام ساز و سامان اور افرادی قوت کے لحاظ سے تین گنا زیادہ تھے لیکن سپاہ اسلام سے وہ شکست فاش کھائی کہ کوئی اس کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور چونکہ جنگ بدر مسلمانوں اور مشرکوں میں پہلی مسلح جنگ تھی، لہذا اہل حق کی صفیں اہل باطل سے جدا ہو گئیں۔ اسی لیے اسے ”یوم الفرقان“ لکھا ہے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس آیت میں ”فرقان“ کو نکرہ اور مطلق صورت میں بیان کیا گیا ہے جو ایک طرف تو اس کی عظمت کی دلیل ہے اور دوسری طرف اس کی وسعت کی اور وہ اعتقادی، عملی اور زندگی کے ہر قسم کے اہم امور کے بارے میں ہر قسم کی اظہار رائے کو شامل ہے۔ اس طرح سے درخت تقویٰ کا پھل ہر خیر و برکت کی شناخت تک رسائی اور ہر طرح کے شر و فساد سے دوری کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں فخر رازی کہتے ہیں کہ یہ لفظ مطلق ہے۔ لہذا اسے کفار اور مومنین کے درمیان ہر قسم کے فرق اور جدائی پر حمل کرنا چاہیے اور یہ فرقان یا تو دنیاوی احوال کے بارے میں ہے یا اخروی احوال کے یا قلب و باطن سے متعلق ہے یا ظاہر سے۔ قلب اور باطن کے سلسلے میں یہ ہے کہ خداوند عالم مومنین کو ہدایت اور معرفت عطا کرتا ہے اور انہیں شرح صدر کی نعمت سے نوازتا ہے، حسد، کینہ اور دشمنی کو ان کے دلوں سے اکھاڑ پھینکتا ہے، جبکہ کفار اور منافقین کے دل اس قسم کی بری عادات سے معمور ہوتے ہیں۔ کیونکہ جب دل، اطاعتِ الہی سے منور ہوتا ہے تو اس سے یہ تمام تاریکیاں کا فور ہو جاتی ہیں اور ظاہری لحاظ سے بھی خداوند عالم مسلمانوں کو برتری،

[۱] مفردات راغب، کتاب العین، لسان العرب، مجمع البحرین، المیزان اور کشف کا مطالعہ فرمائیں۔ (زیر بحث آیت کے ذیل میں)۔

کا میابی، نصرت اور ظفر عطا فرماتا ہے۔ [۱]

اسی سلسلے کی تیسری آیت جو قرآن کی سب سے لمبی آیت (بقرہ ۲۸۲) کا چھوٹا سا حصہ ہے، جس میں مختلف ہدایات اور فرامین کے بعد فرماتا ہے ”خدا کا تقویٰ اختیار کرو اور خداوند عالم تمہیں تعلیم دیتا ہے۔“

”قرطبی“ اپنی تفسیر میں کہتے ہیں ”یہ خدا کا ایک وعدہ ہے کہ جو شخص تقویٰ اختیار کرے گا خدا اسے تعلیم دے گا یعنی اس کے دل میں ایک نور قرار دے گا کہ اس کے ذریعہ سے وہ ہر اس چیز کا ادراک کرے گا جو اس کی طرف القاء کی جائے۔“ [۲]

اس کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہم علم و دانش کے حصول سے دستبردار ہو جائیں اور یہ کہنا شروع کر دیں کہ تقویٰ اور تہذیب نفس ہی کافی ہے جیسا کہ بعض صوفیاء اور دیگر منحرف قسم کے لوگ کہتے ہیں۔ بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ تقویٰ صحیح معنوں میں علم و دانش کے حصول کے لیے راہ ہموار کرتا ہے، بالکل ویسے ہی جیسے تیار شدہ اور اچھی زمین ہر قسم کی تخم ریزی کے لیے آمادہ ہوتی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ”اتقوا اللہ“ اور ”یعلبکم اللہ“ کے دونوں جملے شرط اور جزاء کی صورت میں ذکر نہیں ہوئے اور یہی بات سبب بن گئی ہے کہ بعض مفسرین نے اس آیت سے علم و تقویٰ کے رابطے کا انکار کیا ہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ ان دونوں کا ایک دوسرے کے پہلو میں واقع ہونا بھی بے حساب نہیں ہے اور ان کے آپس میں رابطے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اس کے بغیر آیت کے جملوں کا باہمی رابطہ زیر سوال آجائے گا۔

چوتھی اور آخری آیت میں تقویٰ اور معرفت کے درمیان باہمی رابطے کی ایک بار پھر بخوبی وضاحت کی گئی ہے، کیونکہ جو لوگ خدا کا تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور رسول پاک پر ایمان لے آتے ہیں ان کو تین قسم کی جزا ملتی ہے۔

ایک تو یہ کہ خداوند عالم ایسے لوگوں کو اپنی رحمت سے دو حصے عطا فرمائے گا، ایک بوجہ ایمان کے اور دوسرا بوجہ تقویٰ کے، یا ایک حصہ بوجہ گزشتہ انبیاء پر ایمان لانے اور دوسرا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کے، کیونکہ باوجودیکہ آیت میں مخاطب مومنین ہیں اور انہیں حکم دیا جا رہا ہے کہ خدا کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آئیں اور آیت کا شان نزول بھی بتا رہا ہے کہ یہ حبشہ کے ان اہل کتاب اور عیسائیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے قرآن کو سنا اور آنحضرت پر ایمان لے آئے۔ [۳]

دوسری یہ کہ خداوند عالم ان کے ایمان اور تقویٰ کی وجہ سے ان کے لیے ایک نور قرار دے گا جس کے ذریعہ وہ اپنے رستہ پر چلیں گے۔ (ویجعل لکم نوراً تمشون بہ)۔

[۱] تفسیر فخر رازی، جلد ۱۵، ص ۱۵۳ (قدرے تلخیص کے ساتھ)

[۲] تفسیر قرطبی، جلد ۲ ص ۱۲۱۳

[۳] کفل (بروزن طفل) کے معنی ایسا فائدہ ہیں جس سے انسان کی ضروریات پوری ہوتی ہیں اور بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ یہ درحقیقت ایک حبشی لفظ ہے جو لغت عرب میں وارد ہوا ہے۔



اگرچہ بعض مفسرین نے آیت کے مفہوم کو مقید کرنے کی کوشش کی ہے اور اس سے اس نور کی طرف اشارہ جانا ہے کہ جو بروز قیامت مومنین کے آگے آگے اور دائیں طرف میں حرکت کرے گا، جیسا کہ سورہ حدید کی ۱۲ ویں آیت میں مذکور ہے کہ ”یومہ تری المومنین والمومنات یسعی نورہم بین ایدیہم و بایمنہم“۔ لیکن ہماری زیر بحث آیت میں قید کی کوئی دلیل نہیں ملتی۔ لیکن اس کا مفہوم عام ہے جیسا کہ تفسیر المیزان میں بھی آیا ہے اور یہ دنیا اور آخرت دونوں کو شامل ہے۔ تو گویا اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ”تقویٰ“ اور ”روشن بینی“ کے درمیان ایک قوی رابطہ ہے۔

تیسری یہ کہ ان کے ایمان اور تقویٰ کی وجہ سے ان کے گناہوں کو معاف کر دے گا اور وہ اس کی رحمت خاص میں شامل ہو جائیں گے۔ (ویغفر لکم واللہ غفور رحیم)

## مزید تشریح

### ۱۔ احادیث میں علم اور تقویٰ کا رابطہ

اسلامی روایات میں بھی علم پر تقویٰ کی تاثیر کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان روایات سے بخوبی واضح ہو گیا ہے کہ تقویٰ کے ذریعہ قلب اور روح کی طہارت معارف الہیہ کی راہیں ہموار کرتی ہے۔ نمونہ کے طور پر مندرجہ ذیل احادیث پر توجہ فرمائیں:

۱۱۔ امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی ایک حدیث ہے:

”من غرس اشجار التقی جز ثمار الہدی“  
 ”جو تقویٰ کے درخت کاشت کرتا ہے وہ ہدایت کے پھل چنتا ہے۔“ [۱]

۲۔ امیر المومنین علی علیہ السلام ہی کے ایک خطبہ میں آیا ہے:

”اما بعد فانی اوصیکم بتقوی اللہ..... فان تقوی اللہ دواء قلوبکم و  
 بصر عمی افتدتکم و شفاء مرض احبادکم و صلاح فساد صدورکم  
 و طهور و نس انفسکم و جلاء عشاء ابصارکم“ اما بعد  
 ”میں تمہیں خدا کے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں..... کیونکہ خدا کا تقویٰ تمہارے بیمار دلوں کی دوا، تمہارے  
 دلوں کی بینائی کا سبب ہے، تمہارے جسموں کے دردوں کی دوا ہے، تمہاری جانوں کے زخموں کی مرہم ہے،

تمہاری آلودہ روحوں کی طہارت ہے اور تمہاری آنکھوں کی نابینائی کی جلا ہے۔“ [۱]

۳۔ ایک اور روایت میں آنجنابؐ ہی سے منقول ہے:

”للمتقی ہدی فی رشاد و تخرج عن فساد“

”متقی کے لیے سوجھ بوجھ پر مبنی ہدایت ہے اور فساد سے پرہیز ہے۔“ [۲]

۴۔ نوح البلاغہ میں امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

”این العقول المستصبحة بمصابیح الهدی والابصار اللاہیة الی

منار التقوی“

”کہاں ہیں چراغ ہدایت سے روشن ہونے والی عقلیں اور کہاں ہیں نور تقویٰ سے دیکھنے والی آنکھیں؟“ [۳]

۵۔ اپنی اس گفتگو کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان ذیشان پر ختم کرتے ہیں، آپ فرماتے ہیں:

”حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ وصیت کی کہ: ”یا موسیٰ و ظن نفسک علی

البصر تخلص من الذنب“ اے موسیٰ اپنی جان کو صبر کے لیے آمادہ کر لو تا کہ حلم اور بردباری تک رسائی

حاصل کرو، تقویٰ کو اپنے دل میں جگہ دو تا کہ علم و معرفت تک جا پہنچو اور اپنے نفس کو صبر کے ساتھ ریاضت دو تا کہ

گناہوں سے بچ جاؤ۔“ [۴]

## ۲۔ علم اور تقویٰ کا باہمی رابطہ

تقویٰ اور گناہوں اور آلودگیوں سے اجتناب کا آگاہی اور معرفت پر کیا اثر پڑتا ہے؟ بالفاظ دیگر علم اور اخلاق کا منطقی رابطہ کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں کا آپس میں نزدیکی رابطہ ہے اور اس سے بڑھ کر اور کیا قرب ہوگا کہ وہ ایک دوسرے پر برابر کے گہرے

نقوش اور اثرات مرتب کرتے ہیں۔ تقویٰ علم کا سرچشمہ ہے اور علم تقویٰ کا اور یہ صرف عجیب ہی نہیں بلکہ معرفت کی راہیں طے کرنے کے لیے

ایک بنیادی اصل بھی ہے۔

[۱] نوح البلاغہ، خطبہ ۱۹۸

[۲] غرر الحکم

[۳] نوح البلاغہ، خطبہ ۱۴۴

[۴] منیۃ المرید، شہید ثانی (منقول از بحار الانوار، جلد ۱، ص ۲۲۷)

تقویٰ، علم و معرفت پر مندرجہ ذیل دلائل کے ساتھ اثر ڈالتا ہے:

الف۔ ہم جنس اور ہم آہنگ ہونا ہمیشہ باہمی جاذبیت اور رابطے کا سبب ہوتا ہے۔

جب انسانی روح تقویٰ کی وجہ سے پاک و پاکیزہ ہو جاتی ہے اور اس کے اور حقیقی علوم و معارف کے درمیان ایک قوی جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے، کیونکہ کند جنس باہم جنس پر واز۔

ب۔ تقویٰ کی درانتی انسانی روح کی کھیتی سے تمام خار و خس کو کاٹ ڈالتی ہے جو اس کے لیے پریشان کن ہوتے ہیں اور دل کو علم و دانش کے بیج کے نشوونما پانے اور پروان چڑھنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ بلکہ اگر خوب غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آفریدگار کے ہاتھ سے علوم کے تمام بیج آغاز ہی سے اس کھیتی میں بوئے جاچکے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ نشوونما اور پروان چڑھنے سے روکنے والی چیزوں کی بیج کئی کر کے صحیح آبیاری کی جائے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ایک حدیث میں پڑھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے دوستوں سے ارشاد فرمایا:

”ليس العلم في السماء فينزل اليكم ولا في تخوم الارض

فيصعد عليكم ولكن العلم مجبرل في قلوبكم مركزوز في طبائعكم،

تخلقوا باخلاق الروحانيين يظهر لكم“

”علم نہ آسمان پر ہے کہ تم پر نازل ہو، نہ زمین کی گہرائیوں میں ہے کہ تمہارے لیے باہر نکل آئے، بلکہ علم خود

تمہارے دلوں کی گہرائیوں اور تمہاری سرشت اور طبیعت میں مخفی ہے۔ فرشتوں اور پاک دل لوگوں کے اخلاق

اپناؤ تا کہ علم تم پر ظاہر ہو جائے۔“ [۱]

ج۔ ہم جانتے ہیں کہ بخل اور حسد عالم ہستی (کائنات) کے مبدا میں نہیں ہیں اور ”وان من شی الا عند ناخذائنه و ما تنزله الا بقدر معلوم“ یعنی ہر چیز کے منالغ اور خزانے ہمارے پاس ہیں اور ہم ان سے صرف معلوم مقدار کے مطابق ہی نازل کرتے ہیں۔ سورہ حجر ۲۱ کے مطابق تمام نعمتوں کے ختم نہ ہونے والے خزانے خداوند عالم کے پاس ہیں اور وہ جواد ہے اور بہت بڑا سخی ہے۔ وہ جس قدر بھی زیادہ فرمائے اس کے خزانوں میں کمی واقع نہیں ہوئی، بلکہ اس کی سخاوت اور کرم مزید آشکار ہوتا ہے کیونکہ ”ولا یزیدہ کثرة العطا الوجود او کرم“ اسی لیے اگر کوئی اس سے محروم ہو جاتا ہے تو اس کی اپنی بے لیاقتی اور عدم استعداد ہوتی ہے اور تقویٰ انسان کو خدائی فیض کے لائق بناتا ہے اور معارف الہیہ اور معرفت بھرے علوم سے بڑھ کر اور کیا فیض الہی ہو سکتا ہے۔

یہ دل بیمانوں اور ظروف کی مانند ہیں جیسا کہ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

”ان هذه القلوب اوعية فخيرها اور عينها“

”بہترین دل وہ ہیں جن کی ظرفیت اور گنجائش زیادہ ہو۔“ [۱]

اہم بات یہ ہے کہ ہمارے وجود کی ظرفیت اور گنجائش زیادہ ہونی چاہیے اور ہمارے دلوں کو اٹے برتنوں کی مانند نہیں ہونا چاہیے کہ جن میں ایک قطرہ بھی نہ ٹھہر سکے اور یہ امر تقویٰ کے بغیر ناممکن ہے۔

## ۳۔ علم اور تقویٰ کی باہمی تاثیر

حقیقی علم، اخلاقی رذالتوں اور گناہ کے سرچشموں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے اور ان امور کے نتائج انسان کو دکھا دیتا ہے اور یہ آگاہی، تقویٰ اور گناہوں سے پرہیز کی پیدائش میں موثر معاون ثابت ہوتی ہے اور ہمیں سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں علم، تقویٰ کا سرچشمہ ہوتا ہے وہاں تقویٰ علم کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ البتہ تقویٰ کا ہر ایک مرحلہ علم کے مرحلہ کا سبب بنتا ہے اور علم کا وہ مرحلہ تقویٰ کے ایک بالاترین مرحلے کا سبب بنتا ہے۔ اس طرح سے یہ دونوں ہمیشہ ایک دوسرے میں اثر کرتے رہتے ہیں اور شاید سورہ اعراف کی آیت ۱۲۰ اسی برابر کی تاثیر کی طرف لطیف اشارہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

”ان الذين اتقوا اذا مسهم طائف من الشيطان تذكروا فاذا هم

مبصرون“

”پرہیزگار لوگ جب شیطانی وسوسوں کا شکار ہوتے ہیں تو یادِ خدا میں لگ جاتے ہیں اور بالبصیرت ہو

جاتے ہیں۔“

یعنی پہلے نمبر پر تقویٰ، پھر تذکر اور یادِ آوری۔ اس کے بعد بصیرت ہے اور ان سب کا نتیجہ شیطانی وسوسوں سے نجات کا حصول ہے۔

## ۴۔ علم اور تقویٰ کے باہمی رابطہ سے ناجائز مفاد اٹھانا

جیسا کہ تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے، تقویٰ اور معرفت کے درمیان ایسا رابطہ ہے جس کا انکار ممکن نہیں، قرآن و حدیث کی رو سے بھی اور دلائل اور عقل کے لحاظ سے بھی۔ لیکن اس کے باوجود یہ تصور نہیں کرنا چاہیے کہ اس بات کا مقصد یہ ہے کہ ہم معمول کے طریقہ کے مطابق تحصیل حصول علم کے طریقوں کو ترک کر دیں اور یہ کہنا شروع کر دیں کہ ”صرف اپنے باطن کی ہی اصلاح کرنا چاہیے تاکہ تمام علم و دانش ہمارے دل کی طرف اٹھ کر آجائیں۔“ جیسا کہ اکثر صوفیاء کا عقیدہ ہے، یہ کہہ کر انہوں نے مروجہ علوم سے نبرد آزمائی اور دانش کے حصول کے ساتھ محاذ آرائی کا بہانہ تراشا ہے اور ہمیشہ کے لیے جہالت اور لاعلمی کے بوجھ تلے دب چکے ہیں۔

اسلام نے ایک طرف تو حصول علم کو واجب قرار دیا ہے۔ حتیٰ کہ کسی علمی محفل کو بہشت کے باغوں میں سے ایک باغ کے ہم پلہ قرار دیا ہے (مجلس العلم روضۃ من ریاض الجنۃ) اور عالم کے چہرے کو دیکھنا عبادت قرار دیا ہے (النظر الی وجہ العالم عبادۃ) [۱] طلب علم اور حصول علم کے لیے قدم اٹھانے کو بہشت کی طرف قدم اٹھانا قرار دیا ہے۔ [۲] قلم علماء کی سیاہی کو خون شہداء سے افضل قرار دیا ہے [۳] اور حدیث کے یاد کرنے اور اسے قلمبند کرنے کو بہت بڑی فضیلت قرار دیا ہے۔ [۴]

اور دوسری طرف تقویٰ اور تہذیب نفس کی دعوت دی ہے تاکہ روح اور جان معارف الہیہ کے قبول کرنے کے لیے مکمل طور پر آمادہ ہوں۔

اس طرح سے ایک طرف تو وہ لوگ زبردست غلطی پر ہیں جو خود بھی حصول علم کی راہوں کو چھوڑ چکے ہیں اور اپنے دوسرے ہمدرد ساتھیوں کو بھی بار بار یہی کہتے ہیں کہ ”دھوڑا لو اور اراق کو کیونکہ عشق کا علم کتابوں میں نہیں ہوتا۔“ اور صرف باطن کے تصفیہ کے قائل ہیں جبکہ یہ تصفیہ، باطن بھی غالباً بوجہ بے علمی اور نا آگاہی کے انحرافی راہوں پر چل نکلتا ہے۔

اسی طرح وہ لوگ بھی غلطی پر ہے اور گمراہ ہیں جو صرف رسمی علوم کے حصول کو ہی کافی سمجھتے ہیں اور تقویٰ اور تہذیب نفس کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور حقیقت یہ ہے کہ حق تک پہنچنے کے لیے دونوں ضروری ہیں۔

## ۲۔ ایمان اور معرفت

### اشارہ

ایمان کی روح یہی ہے کہ حق کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے اور حقائق اور واقعات کو بلا چون و چرا تسلیم کر لیا جائے اور چونکہ اس کائنات میں سب سے اعلیٰ اور سب سے عظیم حقیقت اور واقعیت خداوند ذوالجلال کی ذات پاک ہے اسی لیے ایمان کی روح اسی محور کے گرد گھومتی ہے۔

ایمان انسان کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ واقعات اور حقائق کو اسی طرح پہچاننے کی کوشش کرے جس طرح کہ وہ ہیں، خواہ وہ حقائق تلخ ہوں یا شیریں، اس کی طبیعت کے مطابق ہوں یا خلاف۔

[۱] غرر الحکم

[۲] بحار الانوار، جلد ۱، ص ۱۶۴

[۳] بحار الانوار، جلد ۲، ص ۱۴

[۴] محیۃ البیضاء، جلد ۱، ص ۱۵

جو لوگ حق کے آگے نہیں جھکے ہیں ان کی معلومات درحقیقت خواہشاتِ نفسانی اور ہوا و ہوس کا مجسمہ ہیں، نہ کہ اس خارجی دنیا میں موجود حقائق کا۔ وہ دنیا کو اسی رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں جو وہ خود چاہتے ہیں، نہ کہ اس کے اپنے اصل رنگ اور کیفیت میں۔ پس اس اشارے کے ساتھ ہی اجمالی طور پر پتہ چل گیا کہ ایمان اور معرفت کے درمیان کیسا رابطہ ہے؟ اب ہم قرآن کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور مندرجہ ذیل آیات کو دل کی گہرائیوں سے سنتے ہیں۔

## آیات

- (۱) **أَوْ مَنْ كَانَ مَيِّتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا** ط (سورہ انعام ۱۲۲)
- (۲) **أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّعْغِشُهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهِ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهِ سَحَابٌ ط ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ط إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكِدْ يَرِهَا ط وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُورًا فَمَا لَهُ مِن نُّورٍ** ط (سورہ نور ۴۰)
- (۳) **وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ط وَالشُّهَدَاءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ط لَهُمْ أَجْرُهُمْ وَنُورُهُمْ** ط (سورہ حدید ۱۹)
- (۴) **أَمَّنْ شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَى نُورٍ مِّنْ رَبِّهِ ط فَوَيْلٌ لِلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللَّهِ ط أُولَٰئِكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ** ط (سورہ زمر ۲۲)

## ترجمہ

- (۱) آیا وہ شخص جو مر چکا ہو، پھر ہم نے اسے زندہ کیا ہو، اس شخص کی مانند ہو سکتا ہے جسے ہم نے زندہ کیا اور اس کے لیے نور قرار دیا کہ جس کے ذریعہ وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے، اس شخص کی مانند ہو سکتا ہے جو ظلمتوں میں گھر چکا ہو اور ان سے باہر نہ آئے؟
- (۲) یا ظلمتوں کی مانند ہے ایک بیکراں سمندر میں کہ جسے موج نے ڈھانپ رکھا ہے، تاریکیاں ہیں ایک دوسرے کے اوپر، اس طرح کہ جب کوئی اپنا ہاتھ باہر نکلتا ہے تو اسے نہیں دیکھ سکتا۔ جس کے لیے خدا نے نور نہیں بنایا اس کے لیے کوئی نور نہیں۔

(۳) جو لوگ خدا اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں، وہی صدیق بھی ہیں اور شہداء اپنے رب کے پاس ہیں۔ ان کے لیے اعمال کا اجر اور نور (ایمان) ہے۔

(۴) آیا وہ شخص کہ جس کا سینہ خدا نے اسلام کے لیے کشادہ کر دیا ہے اور وہ اپنے رب کے نور کی سواری پر ہے (ایسے لوگوں کی مانند ہو سکتا ہے جو دل کے اندھے ہیں اور نور ہدایت ان کے دل میں داخل نہیں ہوا؟) پس عذاب ہے ان لوگوں کے لیے جن کے دل ذکر خدا کے سامنے سخت ہیں۔ وہی لوگ تو واضح گمراہی میں ہیں۔

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### ایمان کی تاثیر

اس سلسلے کی سب سے پہلی آیت ان لوگوں کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے جو پہلے مردہ تھے پھر خدا نے انہیں زندہ کر دیا اور پھر ان کے لیے ایک نور قرار دیا جس کے ذریعہ وہ اپنی راہ دیکھتے ہیں۔

مرنے اور زندہ ہونے سے مراد وہی بعد از کفر ہے، جیسا کہ سورہ انفال کی ۲۴ ویں آیت میں ہم پڑھتے ہیں:

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ“  
”اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو خدا اور اس کے رسول کی دعوت کا جواب دو جب وہ تمہیں بلائے تاکہ تمہیں زندہ کرے۔“

پس معلوم ہوا کہ زندگی وہی ایمان حقیقی کی زندگی ہے جس میں معرفت کا نور ملا ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں ان لوگوں کا گروہ ہے جو کفر کی تاریکی میں پڑے ہوئے ہیں اور ہرگز اس سے خارج نہیں ہوئے (کہن مثلہ فی الظلمات لیس بخارج منها) بہت سے مفسرین نے تو یہ کہا ہے کہ اس نور سے مراد قرآن مجید ہے۔ بعض نے دین کا نور مراد لیا ہے اور دوسرے کئی مفسرین نے نور حکمت سمجھا ہے۔ [۱] بعض نے نور اطاعت بھی مراد لیا ہے۔ [۲] لیکن اس بات میں شک نہیں کہ اس نور کا مفہوم وسیع ہے جو ہر قسم کی شناخت اور معرفت کو شامل ہے اور صاف بات ہے کہ قرآن پاک بھی اس کے مصداقوں میں سے ایک اتم و اکمل مصداق ہے۔

”بمشی بہ فی الناس“ (اس کے ساتھ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے) کی تعبیر دنیا کی اجتماعی زندگی کے ساتھ بہت ہی مناسبت رکھتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ”ایمان“ انسان کے دل میں ”معرفت“ کی راہیں ہموار کرتا ہے اور دنیاوی زندگی میں غلطیوں سے بھی باز

[۱] تفسیر فخر رازی، جلد ۱۳، ص ۲۷۲، تفسیر قرطبی، جلد ۴، ص ۲۵۱۴، تفسیر المنار، جلد ۸، ص ۳۰

[۲] تفسیر ابوالفتوح، جلد ۵، ص ۵۰



رکھتا ہے۔

زیر بحث سلسلے کی دوسری آیت بے ایمان افراد (یا ان کے اعمال) کو ایسی ظلمتوں سے تشبیہ دے رہی ہے جو عمیق سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں پڑے ہوئے ہوں، جن کے اوپر موجیں ہی موجیں ہوتی ہیں اور موجوں کے اوپر اور فضاؤں میں تاریک بادل چھائے ہوئے ہوتے ہیں، اس طرح کہ اگر کوئی وہاں پر موجود ہو اور اپنا ہاتھ باہر نکالے تو اسے نہ دیکھ سکے۔ (اذا اخرج یسکالہم یسکالہم) اور آخر میں تاکید کے ساتھ کہتا ہے، جس کے لیے خدا نے نور قرار نہ دیا ہو اس کے لیے کوئی نور نہیں ہے۔ (من لہم یجعل اللہ لہ نوراً فمالہ من نور)۔ اس آیت کی عبارت سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ بے ایمانی اور کفر ظلمت ایجاد کرتے ہیں، جبکہ ایمان اور اسلام نور آفرین ہوتے ہیں۔ بے ایمان اور منحرف لوگوں سے وہ وہ غلطیاں سرزد ہوتی ہیں اور اس حد تک زیادہ ہوتی ہیں کہ انسان کبھی کبھی حیرت کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے کہ وہ اپنے سامنے کی نزدیکی چیز کو بھی نہیں دیکھ سکتے اور اپنے نفع نقصان کو بھی نہیں سمجھ سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ ظلمت کے بارے میں جو مندرجہ بالا آیت میں نقشہ کشی کی گئی ہے اس سے بڑھ کر کوئی ظلمت زیادہ گہری اور ظلمانی نہیں ہوتی۔ سمندر کی گہرائی ویسے بھی قدرتی طور پر تاریک ہوتی ہے، کیونکہ سورج کی روشنی پانی میں زیادہ سے زیادہ سات سو میٹر کی گہرائیوں تک ہی پہنچ سکتی ہے۔ اس کے بعد ظلمت ہی ظلمت اور تاریکی ہی تاریکی ہوتی ہے اور نور آفتاب اس حد تک اس وقت پہنچتا ہے جب سمندر میں ٹھہراؤ ہو اور اس میں پیچ و تاب کھاتی موجیں اپنے زوروں پر نہ ہوں جن سے نور کی شعاعیں اپنا اثر کھودیتی ہے، نیز تاریک اور سیاہ بادل بھی ان شعاعوں کا راستہ نہ روکیں۔

بعض کہتے ہیں کہ ان تاریکیوں سے مراد کافروں میں تین قسم کی تاریکیاں ہیں: اعتقاد کی تاریکی، گفتار کی تاریکی اور کردار و عمل کی تاریکی۔

جبکہ بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد دل کی تاریکی، آنکھ کی تاریکی اور کان کی تاریکی ہے۔ مگر کچھ اور حضرات نے کہا ہے یہ تین طرح کی ظلمت اس بات سے عبارت ہے کہ: ۱۔ وہ نہیں جانتے ۲۔ اس بات کو بھی نہیں جانتے کہ وہ نہیں جانتے۔ ۳۔ یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں۔ لیکن ان تفسیروں میں آپس میں کوئی منافات نہیں بلکہ ممکن ہے کہ یہ سب آیت کے مفہوم میں جمع ہوں۔ تیسری آیت میں پہلے تو مومنین کو ”صدیق“ اور ”شہید“ کے ساتھ موصوف کیا جاتا ہے، پھر فرماتا ہے کہ: ”ان کے لیے ان کے اعمال کی جزاء اور ان کے ایمان کا نور ہے۔“ (لہم اجرہم و نورہم)۔

”صدیق“ مبالغہ کا صیغہ ہے، جس کے معنی ہیں بہت سچ بولنے والا اور بعض نے کہا ہے کہ جس نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو، بلکہ بعض اور حضرات نے اس سے بھی بالاتر معنی ذکر کیے ہیں اور وہ یہ کہ اس کے معنی ہیں ایسا شخص جس نے سچائی کی عادت کو اس طرح اپنالیا ہو کہ جھوٹ بولنا اس کے لیے ناممکن ہو۔ بالفاظ دیگر سچ اس کی عادت ثانوی بن چکا ہو۔

بعض اور حضرات نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں وہ شخص جو عقیدے اور گفتگو کے لحاظ سے سچا ہو اور اعمال اس کی گفتار اور عقائد کی

تصدیق کریں۔ [۱]

چونکہ ان معانی کے درمیان کوئی منافات نہیں ہے اور سب معانی مبالغہ کے مفہوم کی طرف لوٹتے ہیں لہذا ان کی ایک جگہ پر اکٹھا کیا جا سکتا ہے اور وہ یوں کہ یقیناً آیت کی مراد تمام مومنین نہیں ہیں بلکہ وہ مومنین ہیں جو ایمان کے بالائی مراتب پر فائز ہیں۔ اور ممکن ہے کہ ”شہدا“ سے مراد یہ ہو کہ سچے مومنین شہیدوں کے ثواب کے حامل ہوتے ہیں، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ایک شخص حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا، دعا فرمائیے خدا مجھے شہادت عطا فرمائے، تو امام علیہ السلام نے فرمایا ”ان المومن شہید“ مومن تو شہید ہوتا ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی ”والذین امنوا باللہ ورسولہ...“ (یہی زیر بحث آیت)۔ [۲]

یہ احتمال بھی ملتا ہے کہ شہید سے مراد، اعمال کا گواہ ہے، کیونکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مومنین کا ایک گروہ (انبیاء اور آئمہ) امتوں کے اعمال کے گواہ ہیں۔

ان دونوں معانی کو اکٹھا کرنا بھی بعید نہیں ہے۔ [۳]

”لہم اجرھم و نورھم“ میں ”اجر“ کے معنی ان کے اعمال کی جزا ہے اور ”نور“ کو بعض مفسرین نے قیامت کے دن مومنین کا نور مراد لیا ہے جو بہشت کی راہیں کھولے گا۔ لیکن اس محدودیت پر ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، بلکہ اس جگہ پر نور مطلق صورت میں بیان ہوا ہے جو دنیا میں معرفت اور آگاہی کے نور کو بھی شامل ہے اور آخرت میں میدان قیامت کے نور کو بھی۔

اسی سلسلے کی چوتھی اور آخری آیت ایک تقریری استفہام کی صورت میں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ”آیا خدا نے جس شخص کا سینہ اسلام کے لیے کشادہ کر دیا ہے اور اس کے پاس نور الہی کی سواری ہے، ان لوگوں کے برابر ہو سکتا ہے جو دل کے اندھے ہیں اور نور معرفت کو ان کے دلوں تک رسائی حاصل نہیں ہو سکتی؟ (افمن شرح اللہ صدرہ لاسلام فہو علی نور من ربہ) اور یہ بات بذات خود اس چیز کی روشن دلیل ہے کہ ایمان کی قبولیت شرح صدر کے ساتھ ملی ہوئی ہے اور شرح صدر خدائی نور کی راہ ہموار کرتا ہے۔ وہ خدائی نور جو دنیا کو مومن کی آنکھوں کے سامنے روشن کر دیتا ہے اور وہ حقائق کو اسی طرح درک کرتا ہے کہ جس طرح کہ وہ ہیں۔

”شرح صدر“ سے مراد یہ ہے کہ انسان کی روح اس قدر وسعت اختیار کر لیتی ہے کہ بہت سے حقائق کو قبول کرنے کے لیے مکمل طور پر تیار ہو جاتی ہے۔ اس کا مقابل نقطہ ”ضیق صدر“ ہے، جسے تنگی سینہ کہتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی روح اس قدر تنگ اور چھوٹی ہو

[۱] مفردات راغب، مادہ صدق۔ مجمع البحرین، مادہ صدق۔ تفسیر المیزان، جلد ۱۹، ص ۱۸۶۔ تفسیر مراغی، جلد ۲، ص ۱۷۴۔ تفسیر مجمع البیان،

جلد ۶، ص ۲۳۸

[۲] تفسیر مجمع البیان، جلد ۹، ص ۲۳۸

[۳] بحار الانوار، جلد ۴۶، ص ۷۴، حدیث ۲

جاتی ہے کہ وہ کسی چیز کو اپنے اندر محفوظ رکھنے پر بھی قادر نہیں ہوتا۔ بالفاظ دیگر شرح صدر وہی روح کی عظمت اور بزرگی ہے کہ جن میں سے ایک اہم عامل خدا کی غیر متناہی ذات کے ساتھ رابطہ ہے۔ جی ہاں! جو روح رنگ الہی اور صبغۃ اللہ میں رنگ جائے وہ کشادہ ہو جاتے ہے اور زیادہ سے زیادہ علوم کے قبول کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔

نہ صرف یہ کہ کشادہ نہیں ہوتی بلکہ نرم بھی ہوتی ہے اور حقائق و معارف کی تخم پاشی کے لیے بھی تیار ہوتی ہے۔ اسی لیے آیت کے آخر میں فرماتا ہے ”عذاب ہے ایسے سنگدل لوگوں پر جن کے دل ذکر خدا قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔“ (فویل للقاسیۃ قلوبہم من ذکر اللہ)۔

## مزید تشریح

### احادیث کی رو سے علم اور ایمان کا رابطہ

۱۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث ہے:

”ان المؤمنین نظر بنور اللہ“

”مومن خدا کے نور سے دیکھتا ہے۔“ [۱]

امام علیہ السلام کے ایک دوست نے آپ سے اس کی وضاحت چاہی تو آپ نے فرمایا:

”خدا نے مومن کو اپنے نور سے خلق فرمایا ہے اور اسے اپنی رحمت کے رنگ میں رنگ دیا ہے۔“

۲۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث شریف ہے:

”اتقوا فراسة المؤمن فانہ ينظر بنور اللہ، ثم تلا، ان فی ذالک لآیات

للمتوسمین“

”مومن کی فراست سے بچتے رہو کیونکہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے پھر آپ نے اس آیت کو تلاوت فرمایا جس

کے معنی ہیں اس (قوم لوط جیسی قوموں کے افسوسناک انجام) میں صاحبان ہوش کے لیے نشانیاں ہیں۔“ [۲]

۳۔ ایک اور روایت بھی ہے جو حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے ہے۔ انہوں نے اپنے آباؤ اجداد سے اور انہوں نے سرور رسالت

[۱] بحار الانوار، جلد ۶۴، ص ۷۴، حدیث ۲

[۲] بحار الانوار، جلد ۶۴، ص ۷۴، حدیث ۴

آب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اسی بات کو دوسرے لفظوں میں بیان فرمایا:

”ایاکم و فراسة المومن فانه ينظر بنور الله تعالى“

”تم مومن کی فراست سے بچتے رہو، کیونکہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے۔“ [۱]

۴۔ بعض روایات میں تو بات اور بھی آگے بڑھی ہوئی نظر آتی ہے جیسا کہ حضرت امیر نوح البلاغہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

”اتقوا ظنون المومنین فان الله سبحانه جعل الحق على السنتهم“

”تم مومنین کے تخمین و گمان سے بچو، کیونکہ خداوند عالم حق کو ان کی زبان پر جاری کر دیتا ہے۔“ [۲]

۵۔ نوح البلاغہ ہی میں آنجناب کا فرمان ہے:

”و بالصالح يستدل على الايمان وبالايمان يعبر العلم“

”عمل صالح کے ذریعہ ایمان کا پتہ چلایا جاسکتا ہے اور ایمان کے ذریعہ علم کا محل آباد ہوتا ہے۔“ [۳]

۶۔ ہم اپنی اس بحث کو حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے فرمان پر ختم کرتے ہیں:

”ما من مومن الا وله فراسة فانه ينظر بنور الله على قدر ايمانه“

”کوئی مومن ایسا نہیں ہے مگر یہ کہ اس کے خاص ہوشمندی اور ہوشیاری ہوتی ہے اور وہ اپنے ایمان کی مقدار کے

مطابق نور خدا سے دیکھتا ہے۔“ [۴]

جیسا کہ ہم اس بحث کے آغاز میں بتا چکے ہیں سچا ایمان انسان کو حق اور حقیقت کا عاشق بنا دیتا ہے اور انسان کے اندر واقعات اور حقائق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی روح پھونک دیتا ہے اور اس طرح سے اس کی روح اور جان ہر قسم کی حدود و قیود سے آزاد ہو کر ہر قسم کی معرفت قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتی ہے۔

### ۳۔ صبر و شکر اور معرفت کا رابطہ

اس بارے میں سب سے پہلے مندرجہ ذیل آیات کو پڑھتے ہیں:

[۱] بحار الانوار، جلد ۶۴، ص ۷۵، حدیث ۸

[۲] نوح البلاغہ، کلمات قصار، جملہ ۳۰۹

[۳] نوح البلاغہ، خطبہ ۱۵۶

[۴] عیون الاخبار، جلد ۲، ص ۲۰۰ (منقول از الحیاء جلد ۱ ص ۹۲)

## آیات

(۱) وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۖ  
وَذَكِّرْهُمْ بِأَيْمِ اللَّهِ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ﴿۵﴾

(سورہ ابراہیم ۵)

(۲) أَلَمْ تَرَ أَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللَّهِ لِيُرِيَكُمْ مِنْ آيَاتِهِ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ﴿۳۱﴾ (سورہ لقمان ۳۱)

(۳) فَقَالُوا رَبَّنَا بَعْدَ بَيْنِ أَسْفَارِنَا وَظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ  
وَمَزَقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ﴿۱۹﴾

(سورہ سبأ ۱۹)

(۴) وَمِنْ آيَاتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ ﴿۳۲﴾ إِنَّ يَشَأْ يُسْكِنِ الرِّيحَ فَيَظْلَلْنَ  
رَوَاكِدَ عَلَى ظَهْرِهِ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ﴿۳۳﴾

(سورہ شوریٰ ۳۲-۳۳)

## ترجمہ

(۱) ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات کے ساتھ بھیجا (اور حکم دیا) کہ اپنی قوم کو ظلمات سے نور کی طرف نکال اور انہیں ایام اللہ کی یاد دلا، اس میں صبر اور شکر کرنے والے کے لیے نشانیاں ہیں۔  
(۲) کیا تو نے نہیں دیکھا کشتیوں کی طرف جو سطح سمندر پر خدا کے حکم اور اس کی نعمت کے ساتھ چلتی ہیں تاکہ وہ اپنی بعض نشانیاں تمہیں دکھائے۔ اس میں ان لوگوں کے لیے آیات اور نشانیاں ہیں جو صبر اور شکر کرتے ہیں۔  
(۳) لیکن ان (بے شکرے) لوگوں نے کہا پروردگار! ہمارے سفروں کے درمیان دوری پیدا کر دے (تاکہ بے نوالوگ امیر لوگوں کے دوش بدوش سفر نہ کر سکیں، تو اس طرح سے) انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور ہم نے انہیں (دوسروں کے لیے) خبریں اور داستانیں قرار دے دیا اور ان کی جماعتوں کو منتشر کر دیا۔ اس ماجرے میں عبرت کی آیات اور نشانیاں ہیں ہر صابر اور شاکر کے لیے۔

(۴) (اس کی نشانیوں میں سے کشتیاں ہیں جو پہاڑوں کی مانند سمندر میں چلتی رہتی ہیں، اگر وہ چاہے تو ہوا کو روک دے تو وہ بھی پشت سمندر پر رک جائیں گی، اس بات میں ہر صبر اور شکر کرنے والے کے لیے نشانیاں ہیں۔

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### ”آفاق“ اور ”انفس“ کی سیر اور صابر و شاکر، ہم سفر

سب سے پہلی آیت میں ”بنی اسرائیل“ کا تذکرہ ہے اور یہ اس وقت کی بات ہے جب ان کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی ہدایت کا فریضہ سونپا گیا اور وہ خدائی آیات اور معجزات لے کر ان کے پاس آگئے۔ موسیٰ علیہ السلام کو حکم ملا تھا کہ وہ ان لوگوں کو کفر و شرک اور فساد کی ظلمتوں سے نکال کر توحید کے نور کی طرف لے جائیں جو تمام برکتوں کا منبع اور سرچشمہ ہے اور انہیں خدائی ایام کی یاد دلائیں اور آیت کے آخر میں فرماتا ہے ”اس ماجرے میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں اور عبرت کے اہم درس پوشیدہ ہیں جو صبر اور شکر کرتے ہیں“ (ان فی ذالک لآیات لکل صبار شکور)۔

اس آیت میں ”ایام اللہ“ سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان مختلف اقوال ہیں: بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد خدا کی نعمتوں اور آزمائشات کے دن ہیں۔<sup>[۱]</sup> بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد انبیاء کرام اور خدا کی نیک امتوں کا میابی کے دن ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ سرکش اقوام کے عذاب کے دنوں کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن بظاہر ان تمام تفسیروں کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے اور یہ سب ”ایام اللہ“ ہیں۔

اصولی طور پر ”ایام“ (دنوں) کے معنی میں ہے اور اس لفظ کی طرف خدا کی طرف اضافت اصطلاحی طور پر ”اضافہ تشریفی“ ہے اور اس سے مراد ہر وہ دن ہے جس کی حد سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے اور وہ اس طرح سے کہ یا تو اس کا تعلق خدا کی عظیم نعمتوں سے ہوتا ہے جو کسی قوم کے شامل حال ہوتی ہے، مثلاً ظلم اور شرک و کفر کے لشکروں پر عظیم فتح و کامرانی، ظالموں اور طاغوتوں کے چنگل سے نجات، جہاد یا کسی اور فریضہ کی ادائیگی کے موقع پر کامیابی کا حصول۔ یا پھر ان کا تعلق خدائی عذاب سے ہوتا ہے جس نے کسی سرکش قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور انہیں تباہ و برباد کر دیا تھا، یا عبرت کے ان تازیانوں سے ہوتا ہے جو امتوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے ان کی جانوں پر پڑتے ہیں۔ غرض یہ سب ”ایام اللہ“ ہیں اور ان کا وسیع مفہوم ہے۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے ان آیات الہی اور عبرت کے دروس سے استفادہ کو صابروں اور شاکروں کے ساتھ

[۱] یہ تفسیر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چند روایات میں سے نقل ہوئی ہے، ملاحظہ ہو تفسیر المیزان، جلد ۵، ص ۱۵-۱۶ اور تفسیر نور الثقلین،

کیوں مخصوص کیا ہے؟ (تو جہر ہے کہ ”صبار“ اور ”شکور“ دونوں مبالغے کے صیغے ہیں، ایک میں صبر و استقامت کے اضافے کے معنی پائے جاتے ہیں اور دوسرے میں شکرگزاری کے اضافے کے تو اس کا جواب یہ ہے چونکہ اس قسم کے حوادث اور واقعات کی صحیح معنی میں تحقیق اور ان پر غور و فکر اور ان کے آغاز و انجام پر پوری طرح غور و خوض کے لیے صبر و شکیبائی اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اور پھر ان حوادث کے نتائج سے وہی لوگ بہرہ ور ہو سکتے ہیں جو ان کی نعمتوں کی قدر جانتے اور ان پر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔

اس طرح سے ”صبر“ اور ”شکر“ معرفت آگاہی کی راہ ہموار کرنے کے دو بہترین ذرائع ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس آیت میں صبر اور شکر کا ایک دوسرے کے ساتھ ذکر ہونا اس وجہ سے ہے کہ ایسے افراد مصائب اور آلام کے مقابلے کے لیے صبر و شکیبائی کے ہتھیار سے مسلح ہو جاتے ہیں اور نعمتوں کے موقع پر شکر کے اسلحہ سے، گویا وہ نہ تو مصیبت کے آگے گھٹنے ٹکاتے ہیں اور نہ ہی نعمتوں کے موقع پر مغرور ہو جاتے ہیں اور کسی بھی حالت میں خود کو گم نہیں کر پاتے۔ اسی وجہ سے وہ ان حوادث سے معرفت کو حاصل کرنے اور عبرت کا سبق لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

دوسری اور چوتھی آیت میں ”ان فی ذالک لآیات لکل صابر شکور“ کا جملہ سطح سمندر پر کشتیوں کے چلنے کے بعد کہتا ہے کہ وہ کشتیاں خدا کے حکم اور ہواؤں کی منظم حرکت کے نتیجے میں تیزی سے چلتی رہتی ہیں اور درواز کا سفر طے کر کے منزل مقصود تک جا پہنچتی ہیں۔

مسلم ہے کہ یہ موضوع تکوینی آیات میں سے ایک ہے اور اس کائنات میں خداوند عالم کی قدرت اور تخلیقی نظام کی ایک نشانی ہے۔

لیکن آیا خدائی نشانوں سے بہرہ گیری اور استفادہ ہر شخص کے لیے ممکن ہے جو کہ کائنات کے نظام حتی کہ ہواؤں کے چلنے تک میں موجود ہے، یا صرف ان لوگوں سے مخصوص ہے جو غور و خوض اور صبر و شکیبائی کے ساتھ اس عجیب نظام کی انسانی عقل و دانش کی حد تک ریزہ کاری کے ساتھ زیر تحقیق لاتے ہیں اور پھر یہ کہ ”شکر منعم“ بھی ان کی شناخت اور معرفت کے سلسلے میں ان کی تلاش اور ان کے تحرک کا سبب بنتے ہیں۔ ”قرطبی“ اپنی تفسیر میں کہتے ہیں ”یہاں پر آیات بمعنی علامات کے ہیں اور یہ علامات اور نشانیاں ہر ایک شخص کے دل میں ظاہر نہیں ہوتیں، بلکہ ان لوگوں سے مخصوص ہیں جو اس کی بلاؤں کے سامنے صابر اور نعمتوں کے لیے شاکر ہوتے ہیں۔“<sup>[۱]</sup>

تفسیر روح البیان میں منقول ہے کہ ”صبار“ کے معنی ہیں وہ شخص جو سخت مشکلات اور مصائب کے مقابلے میں پائیداری کا مظاہرہ کرتا ہے اور خود کو آفاق و انفس کی آیات میں سوچ و بچار اور غور و فکر کے لیے تکلیفوں میں ڈالتا ہے۔“<sup>[۲]</sup>

کس قدر قابل غور بات ہے کہ جس ہوانے گرہ زمین کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا ہے کائنات کی لطیف ترین چیز ہے۔ لیکن جب اس لطیف جسم میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ نہ صرف یہ کہ عظیم اور غول پیکر کشتیوں کو سطح سمندر پر متحرک کیے رکھتی ہے بلکہ ان بادلوں کو بھی خشک اور مردہ زمینوں کی طرف لے جاتی ہے جو زندگی عطا کرنے والی بارش کے حامل ہوتے ہیں۔ وہاں پر بارش ہوتی ہے اور خنجر زمینیں آباد ہو

[۱] تفسیر قرطبی، جلد ۸، ص ۵۱۶۱

[۲] روح البیان، جلد ۷، ص ۹۸



جاتے ہیں۔ سرد ہواؤں کو گرم علاقوں میں اور گرم ہواؤں کو سرد علاقوں میں منتقل کرتی رہتی ہیں۔ جس سے کہہ ارضی انسانی زندگی کے قابل رہتا ہے۔ اس کے علاوہ نباتات کے بیجوں اور دانوں کو اپنے ساتھ حمل کر کے ادھر ادھر پہنچا دیتی ہیں، پھولوں کے اندر کے سفوف کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی ہیں تاکہ اس طرح سے درختوں کا تخم گابھ میں تبدیل ہو۔ تو کیا یہ سب خدائی نشانیاں نہیں ہیں؟ اور صابر و شاکر لوگوں کے علاوہ اور کون اس سے استفادہ کر سکتا ہے؟

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ہے:

”الایمان نصفان نصف صبر و نصف، شکر“

”ایمان کے دو حصے ہیں: ایک کا نام صبر ہے اور دوسرے کا نام شکر ہے۔“ [۱]

اور یہ حدیث آیات بالا کے مفہوم پر تاکید ہے۔

بالآخر تیسری آیت میں قوم سبا کی داستان کی طرف اشارہ ہے کہ جب توفیق الہی ان کے شامل حال ہوئی اور وہ سر زمین یمن میں پہاڑوں کے درمیان ایک عظیم ”سد“ (ڈیم) ایجاد کر کے پانی کا ایک بہت بڑا ذخیرہ اکٹھا کرنے میں کامیاب ہو گئے اور پھر اس ذخیرہ شدہ پانی سے بہت سے سرسبز اور شاداب باغات کی آپاشی کرتے تھے، ان کی زندگی خوشی اور نعمت سے معمور تھی۔ لیکن انہوں نے ناشکری کا راستہ اختیار کیا۔ خوش حال لوگوں نے مظلوم و مستضعف عوام پر ظلم و ستم ڈھانا شروع کر دیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ عظیم سد ٹوٹ گئی، باغات ویران ہو گئے اور وہ خود اس طرح تتر بتر اور منتشر ہو گئے کہ قرآن پاک نے ان کی اس طرح نقشہ کشی کی ہے کہ ”ہم نے انہیں دوسروں کے لیے خبریں اور داستانیں بنا دیا“ (فجعلنہم احادیث) اور ہم نے ان کی اجتماعیت کو مکمل طور پر منتشر اور تتر بتر کر دیا“ (ومزقناہم کل ممزق)۔ پھر فرماتا ہے ”اس داستان میں آیات اور نشانیاں اور عبرت کے درس ہیں، ان سب لوگوں کے لیے جو صبر کرنے والے اور شکر گزار ہیں“ (ان فی ذالک لآیات لکل صبار شکور)۔

کیونکہ وہ اس ماجرے میں غور و فکر کر کے بہت سے نکات حاصل کرتے ہیں۔

ایک طرف تو یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ انسان کی زندگی اور موت کا فاصلہ بہت کم ہوتا ہے، اس قدر کم کہ موت خود اس کی زندگی میں ہی پوشیدہ ہوتی ہے۔ وہی وافر مقدار کا پانی جو قوم سبا کی آبادی، تہذیب اور تمدن کا ذریعہ تھا ایک دن اسی کی تباہی اور بربادی کا سبب بن گیا۔

ادھر دوسری طرف سے اس مغرور انسان کی انتہائی کمزوری اور عاجزی کا بھی پتہ چلتا ہے، کیونکہ کہتے ہیں کہ قوم سبا کی عظیم سد جسے ”سد مارب“ کہتے ہیں، کو جنگلی چوہوں نے سوراخ کر دیا، جس سے پانی نے آہستہ آہستہ باہر نکلنا شروع کر دیا اور وہ سوراخ بالترتیب وسیع ہوتا گیا۔ انجام کار سد مارب ٹوٹ پھوٹ گئی۔ تو اس طرح سے چند جنگلی چوہوں نے ایک عظیم تمدن کو کیونکر ملیا میٹ کر دیا!!

تیسری بات یہ ہے کہ قوم سبا کے مستکبرین جو غریب عوام کا اپنے ساتھ بیٹھنا گوارا نہیں کرتے تھے اور انہوں نے سمجھ رکھا تھا کہ گنتی

[۱] تفسیر مجمع البیان، جلد ۷، ص ۳۲۳۔ تفسیر فخر رازی، جلد ۲۵، ص ۱۶۲۔ تفسیر مراغی، جلد ۲۱، ص ۹۷۔ تفسیر قرطبی جلد ۵، ص ۳۵۱ اور

کے چند امیروں اور مستضعف عوام کے درمیان سد مآرب جیسی عظیم حد اور سد حائل ہے، انہوں نے خدا سے درخواست کی کہ ان کے شہروں اور آبادیوں کو غریب اور مستضعف عوام کے شہروں اور آبادیوں سے دور قرار دے تاکہ عام لوگ سفر کر کے آسانی کے ساتھ ان تک نہ پہنچ سکیں اور یہ امتیاز ان کے ساتھ ہمیشہ قائم رہے!! (فقالوا ربنا باعد بین اسفارنا) لیکن خدا نے انہیں ایسا تتر بتر اور منتشر کیا کہ انہوں نے اس سوچ کو ہمیشہ کے لیے دماغ سے نکال دیا۔

چوتھی بات یہ ہے کہ آسودہ اور خوشحال زندگی نے انہیں یاد خدا سے غافل کر دیا اور اس وقت ہوش میں آئے جب ان کا سب کچھ لٹ چکا تھا اور وہ زبان حال سے کہہ رہے تھے:

اے روزگارِ عافیت شکر ت نلقتم لاجرم

دستی کہ در آغوش بودا کنون بہ دندان می گزم

”یعنی اے خوشحالی اور عافیت کے زمانے میں نے تمہارا شکر یہ ادا نہیں کیا۔ اسی لیے جو ہاتھ پہلے آغوش میں ہوا

کر تا تھا اب اسے دانتوں سے کاٹ رہا ہوں۔“

اس طرح سے صبر و شکیبائی اور حوصلے کے ساتھ اور عقل و خرد کے تعاون سے اس داستان کی بہت سی نشانیوں تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ [۱]

## نتیجہ کلام

مندرجہ بالا چاروں آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ جو شخص بھی اسرار و آفرینش اور اسی طرح انسان کی اجتماعی زندگی کے اسرار میں زیادہ سے زیادہ اور گہرا مطالعہ کرے اور پورے صبر و شکیبائی کے ساتھ اس مطالعہ میں مگن رہے اور شکر گزاری کی روح یعنی معرفت کے وسائل و ذرائع اس پر حکم فرما ہوں تو شناخت اور معرفت کا بیشتر حصہ اس کے نصیب میں آجائے۔ اسی لیے صبر اور شکر معرفت کی راہ ہموار کرنے کا موثر ذریعہ ہیں۔

## ۴۔ معرفت خود معرفت کی راہیں ہموار کرتی ہے

### اشارہ

مشہور ہے کہ دولت کو دولت ہی کماتی ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایک مقدار سرمایہ خود ہی بیشتر منافع اور سرمایہ کمانے کا

[۱] توجہ رہے کہ مندرجہ بالا آیت میں لفظ ”احادیث“ جمع منتہی الجموع ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی سرگزشت کی ایک نہیں بلکہ کئی داستانیں ہیں۔

سبب بنتا ہے۔ اس کی مقدار جتنا زیادہ ہوگی، منافع بھی اسی قدر زیادہ ہوگا۔  
 یہی اصول علم و دانش اور معارف پر بھی حکم فرما ہے۔ جو لوگ علمی سرمایہ کے حامل ہوتے ہیں ان کے لیے مزید علمی سرمایہ کے حصول کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ اسی لیے تو ہم کہتے ہیں معرفت بذات خود معرفت کی راہیں ہموار کرتی ہے۔ یعنی ایک مرحلہ کا علم اور دانش سبب بن جاتا ہے کہ اس سے بالاتر کئی دوسرے مراحل تک رسائی حاصل کی جائے۔  
 اب اس سلسلے میں مندرجہ ذیل آیات کی تلاوت کا شرف حاصل کرتے ہیں۔

## آیات

- (۱) وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَالْوَالِدَاتُ  
 إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعَالِمِينَ ﴿۲۲﴾ (سورہ روم ۲۲)  
 (۲) فَبِمَا ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ يَوْمَ يَعْلَمُونَ ﴿۵۲﴾  
 (سورہ نمل ۵۲)

## ترجمہ

- (۱) اور اس کی آیات میں سے ہیں زمین و آسمان کی تخلیق اور تمہارے رنگوں اور زبانوں کا مختلف ہونا۔ اس میں  
 عالم لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔  
 (۲) یہ وہی گھر ہیں جو اپنے ظلم و ستم کی وجہ سے خالی رہ گئے ہیں اور اس میں ان لوگوں کے لیے روشن نشانی ہے جو  
 عالم ہیں۔

## آیات کی تفسیر اور جمع بندی

### پہلے آشنا بنو پھر پتہ چلے

زیر نظر آیات میں سب سے پہلی آیت سورہ روم کی متعدد آیات کے ضمن میں سے ایک آیت ہے جس میں آفاقی اور انفسی آیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور خداوند عالم کی عالم اکبر (اس کائنات) میں اور عالم اکبر (وجود انسان) میں موجود آیات و علامات کو شمار کیا گیا ہے۔ اس آیت میں ایک طرف تو عالم اکبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ”خداوند عالم کی آیات میں سے ہے آسمانوں اور زمین کی تخلیق“

(ومن آیاتہ خلق السموات والارض)۔ اس کے بعد وجود انسانی کی باریکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ’اس کی دوسری نشانی تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے‘ (و اختلاف السننکم والوانکم)۔

نہ صرف ظاہری زبان اور رنگ کا اختلاف بلکہ اندرونی زبان اور رنگ ذوق اور سلیقوں کا رنگ بھی، جو اس قدر مختلف اور متفرق ہے کہ ممکن نہیں ہے کہ دو ایک جیسے انسان مل جائیں، حتیٰ کہ یہ اختلاف دو جڑواں بھائیوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

یہ فرق ایک طرف تو لوگوں کی پہچان اور ایک دوسرے سے شناخت کا سبب ہوتا ہے، کیونکہ اگر یہ چیز نہ ہوتی تو اجتماعی زندگی کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ چنانچہ جو لوگ ایسے جڑواں افراد کے ساتھ رہتے ہیں جو ایک دوسرے سے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں بسا اوقات سخت مشکل کا شکار ہو جاتے ہیں اور اس قدر دھوکے میں پڑ جاتے ہیں کہ اگر ان میں سے ایک سفر سے واپس آتا ہے تو وہ دوسرے کو ملنے چلے جاتے ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ اس کے قریبی رشتہ دار دھوکے کھا جاتے ہیں، بیمار ایک ہوتا ہے دو اور دوسرے کو دی جاتی ہے۔

اب آپ خود ہی سوچئے کہ اگر تمام لوگ ہر لحاظ سے ایک دوسرے جیسے ہوتے تو پھر کیا ہوتا؟

ادھر دوسری طرف یہ انواع و اقسام کا اختلاف اس بات کا سبب ہے کہ ہرگز وہ معاشرہ کی کسی نہ کسی قسم کے پورا کرنے میں لگا ہوا ہے اور یہ معاشرتی ضروریات ہر گروہ کے ذوق کی تسکین اور استعداد کے مطابق پوری ہو رہی ہیں، اور انسانی معاشرے میں کسی قسم کا خلا بھی رونما نہیں ہوتا۔ تو کیا یہ سب خداوند عالم کی آیات اور نشانیاں نہیں ہیں؟ اس خالق کی نشانیاں جس نے اس عظیم کائنات کو خلق فرمایا ہے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ’زبانوں کے اختلاف‘ کے بارے میں مفسرین نے بہت سے احتمالات کا تذکرہ کیا ہے۔ کچھ نے کہا ہے کہ اس سے مراد ’بولیوں‘ (زبانوں) کا اختلاف ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اس وقت دنیا میں ایک ہزار بولیاں (زبانیں) بولی جاتی ہے اور یہ تنوع (سردست ہمیں جس کے اصل سرچشمہ سے سروکار نہیں ہے) مختلف اقوام کی ایک دوسرے سے پہچان کا موثر ذریعہ ہے۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ اس سے لوگوں کے لہجے اور طرز بیان مراد ہیں، جو ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتے ہیں کیونکہ ہر شخص کا اپنا ایک انداز گفتگو ہے جس سے اس کی شخصیت کی پہچان ہوتی ہے۔

بعض صاحبان تفسیر کہتے ہیں کہ اس سے مراد صوتیں یا بااصطلاح اداروں کی ’ٹیوٹیں‘ ہیں جو آپس میں بہت مختلف ہوتی ہیں۔ اسی لیے ناپیدنا لوگ بہت سے افراد کو ان کی آوازوں سے بخوبی پہچان لیتے ہیں، بالکل ویسے ہی جیسے آنکھوں والے کسی کو دیکھ کر پہچان جاتے ہیں۔

اور یہاں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر رنگوں اور زبانوں کے اختلاف کو آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے ساتھ ساتھ بیان کیا گیا ہے تو یہ اس لیے ہے کہ اس بات کی وضاحت کرے کہ کائنات کی عظیم سے عظیم تر چیز سے لے کر (بظاہر) اس کی عام اور سادہ ترین چیز تک سب کی سب ایک باقاعدہ منظم اور مرتب نظام کے تحت موجود ہیں اور اس ذات کر دگار کے علم و قدرت کی نشانیاں ہیں۔

اور قابل توجہ بات ہے کہ آیت کے آخر میں ارشاد فرماتا ہے: ’ان موضوعات میں صاحبان علم کے لیے نشانیاں ہیں‘ (ان فی ذالک لآیات للعالمین)۔ جی ہاں! وہی صاحبان علم جو بڑے غور و خوض اور مویشگافیوں کے ذریعے ایک ایک کر کے ان اسرار و رموز کی تہہ تک پہنچتے ہیں اور ان کی سابقہ آگاہی ان کی آئندہ آگاہی کا موجب بنتی ہے۔

دوسری آیت ان فسادی اور فتنہ پرور ٹولوں کی بات کر رہی ہے جو مفسرین کے بقول سرزمین ”وادی القریٰ“ اور حضرت صالح علیہ السلام کی قوم میں رہتے تھے، جن کی تعداد تو تھی اور وہ کافر اور منافق ٹولے تھے، جن کا کام ہمیشہ تخریب کاری اور فتنہ پروری تھا، جیسا کہ اسی سورہ نمل کی آیات میں آیا ہے ”وكان في المدينة تسعة رهط يفسدون في الارض“ (شہر میں نو گروہ تھے جو زمین میں فساد پھیلاتے تھے)۔ خداوند تعالیٰ نے انہیں توبہ و بازگشت اور اپنی اصلاح کی کافی مہلت دی، لیکن انہوں نے اصلاح کی بجائے غرور اور تکبر کا رستہ اختیار کیا اور دن بدن اس میں بڑھتے گئے۔ انجام کار عذاب الہی نے انہیں آلیا اور کڑا کے کی مہلک بجلیوں اور زلزلوں نے ان کی بے شمار زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ زیر بحث آیت کہتی ہے ”یہ وہ گھر ہیں جو اپنے ظلم و ستم کی وجہ سے خالی رہ گئے“ (فتلک بیوہم خاویہ بما ظلموا)۔ پھر فرماتا ہے ”اس ماجرے میں ان لوگوں کے لیے واضح نشانی ہے جو عالم ہیں“ (ان فی ذالک لایۃ لِّقوم یرعلمون)۔ ”بما ظلموا“ کا جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے گھروں کی ویرانی کا سبب خود ان کے مظالم ہی تھے، اسی لیے ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ وہ کہتے تھے ”میں نے اس حقیقت کو کتاب خدا میں پایا ہے کہ ظلم انسان کا خانہ خراب کر دیتا ہے۔ پھر انہوں نے اسی آیت کو تلاوت فرمایا۔ تورات میں بھی آیا ہے:

”اے فرزند آدم! ظلم نہ کر کیونکہ وہ تیرا خانہ خراب کر دے گا۔“<sup>[۱]</sup>

البتہ اس طرف بھی توجہ رہے کہ ”خاویہ“ کا لفظ اصل ”خالی“ کے معنی میں ہے، لیکن بہت سے مفسرین نے اس کی ”ویران“ کے معنی سے تفسیر کی ہے اور یہ شاید اس لیے ہے کہ جب مکان اپنے کینوں سے خالی ہو جائے تو تھوڑے ہی عرصے میں ویران ہو جاتا ہے۔<sup>[۲]</sup>

## نتیجہ کلام

یہ حقیقت ہے کہ خدا کی آیات، خواہ آفاقی ہوں یا انفسی اور خواہ وہ درس عبرت سے متعلق ہوں کہ جن میں گذشتہ لوگوں کی سرگزشت ہوتی ہے، تمام لوگوں کے لیے یکساں ہیں۔ لیکن چونکہ ان سے تمام لوگ بہرہ اندوز نہیں ہو سکتے اسی لیے قرآن کہتا ہے ”ان امور میں آگاہ اور عالم لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔“ کہیں پر کہتا ہے کہ ”صاحبان تقویٰ لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔“

[۱] تفسیر روح المعانی، جلد ۱۹، ص ۱۹۴

[۲] تفسیر روح البیان میں ”خوی“ کے مادہ کے دو معانی ذکر کیے گئے ہیں، ایک ”خالی ہونا“ دوسرا ”گرنا اور منہدم ہونا“۔ اسی لیے عرب ”خوی النجم“ کہتے ہیں، لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ مادہ صرف اسی پہلے معنی کے لیے ہے اور ”خوی النجم“ وہاں پر بولا جاتا ہے کہ جہاں پر کوئی ستارہ غروب کرے، لیکن وہاں پر بارش نہ ہو۔ (زمانہ جاہلیت کے عربوں کے عقیدہ کے مطابق بہت سے ستاروں کے ساتھ بارش بھی ہوتی ہے اور جب بارش نہیں آتی تھی تو اس ستارے کے بارے میں یہی تعبیر استعمال کرتے تھے)۔

کہیں پر کہتا ہے کہ ”غور و فکر کرنے والے اور صابر و شاکر افراد کے لیے.....“ اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ صرف اس قسم کے لوگ جن کے لیے راہیں ہموار ہوتی ہیں، ان آیات سے استفادہ کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں اور بھی بہت سی آیات موجود ہیں جو اس حقیقت کی طرف اشارے سے خالی نہیں ہیں کہ ہمیشہ علم و معرفت ہی بیشتر علم و معرفت کی راہیں ہموار کرتے ہیں۔ مثلاً: كَذٰلِكَ

نُفِصِلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ﴿۳۲﴾

”ہم اپنی اس طرح کی آیات کو ان لوگوں کے لیے تفصیلی طور پر بیان کرتے ہیں جو عالم ہیں۔“ (اعراف ۳۲)

یا پھر یُفِصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ

”خداوند عالم اپنی آیات کو اس قوم کے لیے تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے جو عالم ہے۔“ (یونس ۱۵)

یا پھر کِتٰبٍ فُصِّلَتْ اٰیٰتُهُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ

”ایسی کتاب ہے کہ جس کی آیات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور فصاحت اور وضاحت ہے اس قوم کے لیے جو آگاہ ہے۔“ (فصلت ۳)

اور یٰۤاٰیٰتِ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ یُبَیِّنُهَا لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ

”یہ تو انین الہی کی حدود ہیں جنہیں وہ ایسے لوگوں کے لیے واضح طور پر بیان کرتا ہے جو عالم ہیں۔“

(بقرہ ۲۳۰)

ضمنی طور پر یہ بھی بتاتے چلیں کہ ان آیات سے اس سوال کا جواب بھی خود بخود مل جاتا ہے کہ ”علماء کو آیات الہی کی تفصیل، تشریح اور توضیح کی کیا ضرورت ہے۔“

